مُصنِّف

نمبر ۱۲

مجلسِ مصنّفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

اکتوبر ۱۹۴۵ء

مدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

قیمت سالانہ: للعہ چار روپے

بیت المصنّف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(باہتمام حالصاحب جمع ابرحان)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا

مُصنّف

جلد ۳ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۱۲

فہرست مضامین

ذکرِ ماضی (اور) فکرِ فردا

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

×

ہندوستان اور بیرونِ ہند کے علمی حلقوں میں اس اطلاع پر اظہارِ امتنان و مسرت کیا جائے گا کہ اعلیٰ حضرت سلطانُ العلوم حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے ۳۶ سالہ عہدِ فرخ مہد میں مملکت حیدرآباد کی تعمیری، صنعتی، تجارتی اور دوسری ملکی ترقیوں کے ساتھ ہی ساتھ تعلیمی، علمی، تصنیفی اور صحافتی میدانوں میں جو ترقی ہوئی ہے اُس میں مزید اضافہ جامعہ عثمانیہ میں ایک تحقیقاتی ادارہ کے قیام سے ہوا ہے۔

×

حکومت سرکارِ عالی نے ایک اسکیم اس سلسلہ میں منظور کی ہے جس کا تین۳ لاکھ روپے سالانہ کا بجٹ ہوگا اس کے علاوہ دس۱۰ لاکھ روپیہ کی یکمشت گرانٹ بھی دوسرے متفرق ابتدائی اخراجات کے لئے دی گئی ہے۔

متذکرۂ بالا تحقیقاتی ادارہ :۔

(۱) ریاضیات و اعداد و شمار (۲) فلکیات اور نجمی طبعیات (۳) طبعیات (اصل و اطلاقی)
(۴) کیمیا (اصل و اطلاقی) (۵) حیاتیات و ارضیات اور (۶) انجینرنگ میں تحقیقاتی کام انجام دیگا۔

اُس کے لائحۂ عمل میں طبی تحقیقات نیز قانون، دینیات، فنون اور دیگر متعلقہ مضامین کے ماسوا تاریخ، معاشیات، فلسفہ اور ادبیات میں تحقیقات کا کام بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ڈائرکٹر مقرر ہوئے ہیں۔ اس ادارہ کے لئے پروفیسر، ریڈر، ریسرچ، اسسٹنٹ نیز فیلوز کا تقرر عمل میں آئیگا۔ مستقل اسٹاف کے علاوہ ممتاز ماہرینِ تحقیقات کو بھی ایک یا دو میقاتوں کے لئے تحقیقاتی کام جاری رکھنے کی دعوت دیجائیگی۔ ریسرچ کے عملہ پر تعلیمی یا تدریسی ذمہ داریاں نہ ہوں گی بلکہ صرف اپنے متعلقہ مضمون کی تحقیقات میں مصروف رہیں گے۔ یہ اصحاب وقتاً فوقتاً ایم۔ ایس۔ سی کے اور تحقیقاتی کام انجام دینے والے طلباء کو توسیعی لکچر دیں گے اور ان کے تحت کتب خانے بھی ہوں گے تاکہ دوسرے اشخاص کی اعانت و رہنمائی کرسکیں۔

تحقیقاتی مقاموں اور کتابوں کی اشاعت اور تقاریر کا انتظام بھی پروگرام میں شامل ہے۔ بالفعل انسٹیٹیوٹ کے ارکان جامعہ عثمانیہ کے متعلقہ شعبہ جات میں اپنی اپنی خدمات انجام دیں گے تاکہ اس طرح شعبہ جات کے عملہ سے

تعاونِ عمل ہو اور انسٹی ٹیوٹ اور متعلقہ شعبہ جات کی کارکردگی میں یکسانیتِ عمل پیدا ہو سکے۔ اعلیٰ تعلیمی وظائف اور بیرونی مقامات میں تعلیم کے لئے انتظامات کئے گئے ہیں تاکہ ایسے فارغ التحصیل لوگ تحقیقات کا تجربہ حاصل کر کے خود ملکی امیدواروں، ادارہ جات کا انتظام سنبھالیں۔

اس دوران میں یہ انتظام ہوگا کہ معینہ مدت کے لئے بعض ممتاز ماہرینِ تحقیقات جامعہ میں بھی اقامت گزیں ہوں۔ اور مختلف شعبہ جات میں تحقیقاتی کام جاری رکھیں۔

عہدہ داران جامعہ کا قیامِ ادارہ سے یہ مقصد ہے کہ تمام تحقیقاتی کام کو ایک مرکزی حیثیت دی جائے اور جامعہ کی جملہ ریسرچ کرنیوالی جماعتوں کو یکجا کر کے ہر ایک شعبہ میں علمی تحقیقات کے کام کو ترقی دی جائے۔

ہمیں یقین واثق ہے کہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا جدید علمی تحقیقاتی ادارہ انشاءاللہ بہت جلد معرضِ وجود میں آکر مندرجۂ بالا مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل کرے گا۔ خوش قسمتی سے اعلیٰحضرت جیسے معارف پرور بادشاہ کے وزیر اعظم نواب سعید الملک بہادر بھی باعتبار علم دوستی ایک گراں مایہ شخصیت کے مالک ہیں اور چونکہ ہندوستان کے سب سے بڑے مرکزِ علم علی گڑھ سے آپ کا مدت العمر نہایت قریبی تعلق رہا ہے۔ اس لئے آپ کے عہدِ وزارتِ عظمیٰ میں حیدرآباد میں بیش از بیش علمی ترقیوں کا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کی یہ بھی خوش بختی ہے کہ نواب علی یاور جنگ بہادر جیسی ذہین و طباع ہستی اُس کی وائس چانسلری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہے۔ اور آپ کی انتھک کوشش سے نہایت قلیل مدت میں نہ صرف امورِ انتظامی اور درس و تدریس کے معیار میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے بلکہ نئی نئی عمارتوں اور نئے نئے شعبہ جات علمی و تعلیمی میں بھی روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

نواب علی یاور جنگ بہادر کی براہ راست نگرانی میں جامعہ عثمانیہ کا ادارۂ تحقیقاتِ علمی ایک مثالی ادارہ ہوگا۔ اور اُس کے نقشِ قدم سے ہندوستان کے دوسرے علمی کام کرنے والے اداروں کی بہت کچھ مفید رہنمائی ہوگی۔

ناظرینِ "مصنف" کو علم ہے کہ ایک ایسے ہی تحقیقاتی ادارہ کا "توارد خیال" بزرگانِ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کو بھی نومبر ۴۲ء سے ہوا ہے۔ مفصل اسکیم مرتب ہو کر ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ علمی حلقوں میں اُس کا پُرجوش خیر مقدم بھی ہوا ہے۔ لیکن مختلف کمیٹیوں کی تشکیل۔ عہدہ داروں کے انتخابات اور فراہمی سرمایہ سے فراغ حاصل ہو تو انسٹی ٹیوٹ قائم ہو۔ ہر قسم کے نیک ارادوں کے باوجود

کانفرنس جیسے "ابیرکمیٹی و چندہ" ادارہ کو جامعۂ عثمانیہ کی سی سہولتیں کہاں حاصل! ؎

روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

کاش اعلیٰحضرت حضور سلطان العلوم اور گورنمنٹ نظام کی ایک نظرِ کیمیا اثر ادھر بھی ہو جائے تو ہمارا بیڑا ابھی پار ہو جائے۔

ہے تجلّی تری سامانِ وجود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رائے بریلی کے ضلع میں قصبۂ سلون اودھ کے مشہور قصبات میں سے ہے۔ یہاں ایک بہت ہی قدیم درگاہ ہے۔ اس سے متعلق ایک بڑی جائداد موقوفہ ہے۔ درگاہ میں سجّادہ نشینی کا سلسلہ گزشتہ تین سَو سال سے جاری ہے۔ وہاں کے صوفی خانوادہ میں بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کی عظمت کا اندازہ اُن کے معاصرین کے خطوط سے ہوتا ہے۔ حلقۂ اثر وسیع ہونے سے ان بزرگوں کے تعلقات سلاطین، امراء اور علماء سے خاص طور پر تھے۔ جسٹس سیّد محمود صاحب مرحوم نے اپنے قیام رائے بریلی کے دوران میں اس خاندان کی تاریخ "میمورینڈم آف دی محمڈن انڈاومنٹ ایٹ سلون" کے نام سے لکھی ہے۔ گورنمنٹ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں بھی حالات موجود ہیں۔

حُسن اتفاق سے قلمی خطوط کا ایک مجموعہ موسوم بہ "منتخب سعید" دستیاب ہوا ہے، اس میں خاندان کے بزرگوں کے نام اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے علماء، امراء اور سلاطین کے خطوط ہیں۔ کتاب سنہ ۱۲۳۶ھ مطابق سنہ ۱۸۲۰ء کی تالیف ہے۔ ان خطوط سے نہ صرف اُس خاندان کا اثر، اُس کی عظمت اور اُس کے بزرگوں کے پایہ کا پتہ چلتا ہے بلکہ اُس عہد کی معاشی، علمی اور ادبی تاریخ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ انھیں خصوصیات کی بناء پر یہ خطوط جن کا ترجمہ ہماری فرمائش پر اسی خاندان کے ایک ہونہار فرد حافظ شاہ محمد ہادی عطاء صاحب حفیدِ اکبر حضرت شاہ مہدی عطاء صاحب قدس اللہ سرہٗ (جو آجکل مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں مصروفِ تعلیم ہیں) نے فارسی سے اُردو میں کیا ہے۔ "مصنّف" میں باقساط شائع ہوں گے۔ اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

کتاب کے پانچ باب ہیں۔ پہلے باب میں اور آخری باب میں خاندانی نجی خطوط ہیں۔ دوسرے باب میں سلاطین و شاہزادگان کے خطوط ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور اُن سے اُن کی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ تیسرے باب میں امراء کے خطوط ہیں۔ بعض مرزا قتیل کی بیاض سے نقل کئے گئے ہیں جو اُس عہد کی زبانِ فارسی کے بہترین نمونے ہیں۔ ان خطوط سے سیاسی معاملات پر بھی کچھ نہ کچھ

روشنی پڑتی ہے۔ چوتھے باب میں علماء کے خطوط ہیں، ان میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب، حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرزا قتیل کے خطوط بھی اسی باب میں شامل ہیں۔ جن سے شاعر کی زندگی کے بہت سے اوجھل پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

پہلے اور پانچویں باب کو چھوڑ کر ہم بقیہ تین ابواب کو فی الحال شائع کریں گے۔ کتاب دراصل ایک بڑے مجموعۂ مکاتیب "اشرف الانشاء" کا انتخاب ہے۔ اسے خاندان کے سجادہ نشین پنجم حضرت شاہ پناہ عطا، صاحب قدس سرہٗ کے چھوٹے بھائی شاہ غفور عطا، صاحب نے منتخب و مرتب کیا ہے۔

خاندانی قلمی کتب و دستاویزات کے علاوہ سبحۃ المرجان (آزاد بلگرامی) ابجد العلوم (نواب صدیق حسن خاں) نزہۃ الخواطر (مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم مصنف "گل رعنا") اخبار الاخیار (حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی) وغیرہ جیسی بلند پایہ کتابوں میں بھی خاندان اور متعلقین خاندان کے جستہ جستہ حالات ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے ایک بہت ہی موثق تحریر ہے۔ جس میں سجادہ نشین ہفتم حضرت شاہ ہدی عطا، صاحب قدس سرہٗ کا عدالت کے سامنے باضابطہ بیان خاندان کی تاریخ کے متعلق ہے۔ جسے ہم مصنف کر اس شمارہ میں شائع کر رہے ہیں۔ خطوط اگلے پرچہ میں ہدیۂ ناظرین ہوں گے۔

———— ———— × ————

جوناگڑھ کے مشہور اہل قلم جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر نے اطلاع دی ہے۔

"میری کتاب (Studies: Oriental & Islamic.) شیخ محمد اشرف صاحب لاہوری نے چھاپ کر تیار کر دی ہے۔ سوا دو سو صفحات کی کتاب ہے۔ کاغذ اور طباعت بہت خوب ہیں۔ عنقریب نکل آئے تو آپ کو ایک نسخہ بھیج دوں۔ مجھے رائلٹی میں صرف پانچ نسخے ملنے والے ہیں۔"

یہ ہے ہمارے ہندوستانی ناشرین کی قدردانی! ایک بلند پایہ عالم و ادیب کو اُس کی عمر بھر کی جانکاہی و عرق ریزی سے لکھے ہوئے شاہکاروں کا جو ناشر صاحب کی نگاہ میں "قابل اشاعت" اور "قابل فروخت" بھی قرار پائے ہیں۔ صلہ "صرف پانچ نسخے" دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی گویا بڑا احسان فرمایا گیا ہوگا۔ ہمیں خود اس قسم کا ذاتی تجربہ ہے۔ لاہور کے ایک معروف پبلشر سے "حیات حافظ رحمت خاں" کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی گفتگو ہوئی۔ فرمایا :۔

"ہمیں اپنی یہ کتاب دو ہزار چھاپنے کی اجازت دیدیجئے۔" عرض کیا گیا:-
"ہمیں حق تصنیف کیا ملے گا؟" جواب دیا:-
"صاحب آپ کا نام ہوگا۔ کیا یہ کم ہے کہ آپ کی کتاب کی اچھی طرح اشاعت ہوگی"۔ ہم نے کہا:-
"کتاب کے سرورق پر جلی قلم سے نام تو آپ کا بھی چھپے گا۔ کچھ دام بھی دلوائیے۔ یا دو ہزار میں سے کم از کم ڈھائی سو نسخے ہی عنایت کیجئے۔" جواب:-
"غور کرکے عرض کیا جائے گا۔ آپ کو اس لائن کا کم تجربہ معلوم ہوتا ہے۔"
گفتگو ختم ہوگئی۔ آج ۲ دو سال گزر گئے، پبلشر صاحب غور فرما رہے ہیں اور ہم اس لائن کا تجربہ حاصل کر رہے ہیں۔

تجربہ یہ ہوا کہ ہر قسم کی گرانی کے باوجود اگر کسی کتاب کی قیمت پبلشر صاحب ایک روپیہ مقرر کرتے ہیں، تو اُس پر اصل لاگت زیادہ سے زیادہ چھ آنے آتی ہے اور دس آنے خالص منافع کے ہوتے ہیں۔

اسی ناواجب حرص اور ناانصافی کا نتیجہ ہے کہ فراہمی مواد سے لیکر پروف ریڈنگ تک کے فرائض انجام دینے والے مصنفین تو ہمیشہ مفلوک الحال اور "تیار مال" کو صرف چھاپ کر بیچنے والے کوٹھیوں اور بنگلوں کے مالک اور موٹر سوار نظر آتے ہیں۔

ہمارے ملک میں جوں جوں تعلیم بڑھ رہی ہے اور سیاسی بیداری پھیل رہی ہے اخبارات و رسائل اور کتابوں کی مانگ میں بھی تیزی کے ساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ اس خوشگوار صورتِ حال کا اقتضا تھا کہ ہمارے ناشرین اخبارات و رسائل اور تاجرانِ کتب بھی ہمدردی، قومی و ملکی سے کام لیتے اور مناسب منافع پر عمدہ سے عمدہ لٹریچر عوام کے ہاتھوں پہونچاتے، مگر معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے بیشتر رسائل اور کتابوں کی خوبی صرف جاذبِ نظر نام اور خوشنما "گرد پوش" تک محدود رہتی ہے۔ اور ان ہی کی گراں قیمت وصول کیجاتی ہے۔ مثلاً کچھ عرصہ سے "کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ" کی جانب سے مختلف اخبارات و رسائل میں کتاب "واجد علی شاہ" کا نہایت دھوم دھام کا اشتہار نظر سے گزر رہا تھا۔ اور عنوانِ کتاب بوجوہ اُس کی خریداری پر طبیعت کو مائل کر رہا تھا، چنانچہ کتاب منگائی گئی۔ دو روپئے میں پہونچی۔ اب جو اُسے دیکھا تو ایک صاحب مسٹر محمد تقی ایم۔ اے کا نہایت سرسری طور پر لکھا ہوا ایک معمولی سا مقالہ تھا جو شاید کسی "واجد علی شاہ ڈے" کے لئے اُنھوں نے اہم اور ضروری ماخذوں سے استفادہ کئے بغیر تیار کیا ہوگا۔

پبلشر صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کہ آخری تاجدار اودھ جانِ عالم واجد علی شاہ پر کوئی کتاب بازار میں نہیں ہے اور ویسی ہی چیزوں کی آجکل مانگ ہے۔ مقالہ مذکور کو ۲۰×۳۰ سائز پر پاشاں کتابت

کرا کے ایک سو سولہ صفحات پر پھیلا دیا۔ اچھی لکھائی، چھپائی، دقتِ نظر سے لکھے ہوئے مضمون اور نفیس کاغذ کی ضرورت نہیں۔ کتاب کا نام اور ''گرد پوش'' شائقین کے دلوں کو بے چین کرنے کے لئے کافی۔ ایک رُوپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک قیمت مقرر کر دی اور شاندار اشتہار دینا شروع کر دیا۔

اس قسم کا بیجا استحصالِ زر بھی اس زمانہ میں بہت ہو رہا ہے جس کا علمی و قومی مفاد کے پیشِ نظر سدِ باب ضروری ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ غریب مصنفین کی ہمت شکنی اور خریداروں کی جیبوں پر ناجائز قیمتوں کا بار ڈال کر ہمارے تاجران و ناشرینِ کتب ''ہندی پرست ہندوؤں'' سے زیادہ ''اردو دشمنی'' کا ثبوت دے رہے ہیں۔

---

۱۵ مئی لغایت ۱۵ جولائی 'مدرسۃ العلوم' علی گڑھ میں تعطیل کلاں اور ۱۰ اگست سے ۸ ستمبر ۱۹۴۵ء تک ماہِ رمضان المبارک کے باعث ''مجلس مصنفین'' کے جلسے نہ ہو سکے۔ ۵ اگست ۱۹۴۵ء کو صرف ایک جلسہ جناب مولانا سید عابد شبّر صاحب بی۔ اے۔ ناظم شعبۂ شیعہ دینیات و جناب مولوی سلطان حیدر صاحب جوش ممبر مسلم یونیورسٹی کورٹ کی علی الترتیب صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں دعوتِ عصرانہ جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی ایم اے صدر شعبۂ اردو و فارسی آگرہ کالج آگرہ کی جانب سے تھی اور اُس میں مشہور ادیب جناب ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی نے اپنا مقالہ ''روسی ادب کی عالمگیر اہمیت'' پڑھا۔ مقامی ارکان کے علاوہ بیرونی مہمانوں میں پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی داعیٔ مجلس اور ل۔ احمد صاحب۔ نیز جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی اور سید مدثر علی صاحب 'زائر امریکہ' نے بھی شرکت فرمائی۔ چھ بجے شام سے دس بجے شب تک جلسہ کی کارروائی جاری رہی۔ مقالہ پر بحث و گفتگو میں سید مدثر علی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مولوی سلطان حیدر صاحب جوش اور راقم السطور نے حصہ لیا۔

---

۱۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کو 'مجلس مصنفین' کے ایک معزز رکن پروفیسر محمد عبدالستار خیری کا اچانک قلب کی حرکت بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ خیری صاحب ایک سچے۔ پکے اور پُرجوش مسلمان تھے۔ ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں گزاری اپنی اسی دُھن میں بے انتہا مصائب بھی جھیلے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اُن دنوں آپ جرمنی میں تھے جہاں نظر بند ہو گئے۔ بیس سال بعد وطن اور عزیزوں کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی۔ اپنے اسی قیام جرمنی کے سلسلے میں خیری صاحب نے دوسرے ممالک یورپ و ایشیا کی سیاحت بھی کی اس زمانہ میں خیری صاحب علامہ راشد الخیری مرحوم کے رسالہ ''عصمت'' دہلی میں اقوام یورپ کی تعلیمی صنعتی اور معاشرتی ترقیوں کے بارے میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

جو بالعموم بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں ہندوستان واپس آئے تو مدرستہ العلوم علی گڑھ اور یہاں کی اسلامی تحریکوں سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد فرنچ اور جرمن زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور آخر دم تک اپنے فرائض نہایت خلوص و انہماک سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ شروع ہونے پر خیری صاحب تین ۳ سال سے زائد جھانسی اور نینی تال میں دوبارہ نظر بند رہے۔ گزشتہ سال رہا ہوئے تو مسلم لیگ کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ آپ مسلم یونیورسٹی مسلم لیگ کے بانی اور صدر تھے۔ "مجلس مصنفین" کے جلسوں میں بھی پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۵ء کی باونویں مجلس میں آپ کا "اسلامی مخیّلہ" کے عنوان پر مقالہ ہوا تھا۔ غرض ؎

تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں   جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

۔۔۔ پر پروفیسر خیری کا پورا پورا عمل تھا۔ مرحوم بڑے خلیق، ملنسار، دوست نواز اور محبت کرنے والے انسان اور مسلمان تھے۔

۱۳ ستمبر کو بعد نماز جمعہ خیری صاحب کے ہزاروں مداحوں نے اُن کی نماز جنازہ پڑھی۔ اُسوقت غالب کا حسب ذیل شعر ہمارے وردِ زبان تھا: ؎

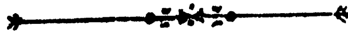
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

———— × ————

سیّد الطاف علی بریلوی

پریم رس
یا
شرح مسدس ہندی حضرت شاہ وجیہ اللہ صاحب المتخلص بہ جیون

(از پروفیسر ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔اے۔ فاضل مصر)



"ہندی بھاشا" میں خواہ اُس کو "برج بھاشا" کہا جائے یا "اودھی بھاشا"۔ ہندوستان کے مشاہیر شعراء نے بلا امتیاز مذہب و ملت جو جو گلفشانیاں کیں اور دنیائے ادب ہند کے سامنے جو اپنے کلام پیش کئے ہیں اُن کے متعلق اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میری رائے میں پھر بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ فی الحقیقت کچھ عرصہ سے "ہندی اور اردو" کی جنگ زرگری نے ایسی فضا خراب کر دی کہ اس ادبی تحقیقات یا تجسس کا دروازہ یا تو بند ہو گیا یا اگر کھلا رہا تو وہ طبقہ واری ہو گیا۔ حالانکہ ملک کی ادبیت وہ ورثہ ہے جو کسی حالت میں مخصوص طبقہ کا حصہ نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہر اُس شخص اور جماعت کا حصہ ہے جو اُس کی خدمت کا بیڑا اٹھائے اور اُس سے استفادہ کرکے افادہ کے لئے ہمہ تن مصروف ہو جائے۔

ہندی ادبیات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ہندی ادبیت کو فروغ دینے والے نہ صرف "سورداس"۔ "تلسی داس" اور "کبیر داس" تھے جن کے متعلق ایک ہندی شاعر نے حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تقلید میں کہ:

در شعر سہ کس پیمبر انند — ہر چند کہ لا نبیَّ بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

صرف تین ہندی شاعروں کو شاعر قرار دیا اور باقی شاعروں کو جھوٹا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

تو۔ تتو سورا کہی تلسی کہی انوٹھ — بچی کھچی کبیرا کہی اور کہی سب جھوٹ

یعنی "پاکیزہ تر باتیں سورداس جی نے کہیں۔ عجیب و غریب باتیں تلسی داس جی نے، ان دونوں سے جو بچ رہیں وہ کبیرداس جی نے کہیں اور باقی جس نے جو کچھ کہا وہ سب جھوٹ کہا"

یہاں میں اس سے بحث نہیں کرنی چاہتا ہوں کہ اس شاعر کے قول میں کہاں تک حقیقت ہے اور آیا حقیقت ہے بھی یا نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اُس نے مذہبی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ یا کلیہ قائم کیا ہو۔ بلکہ فی الحقیقت مجھے یہ بتانا ہے کہ جس کو ہندی ادب کہتے ہیں اُس کے اُستادُ الاساتذہ حضرت امیر خسرو تھے جنھوں نے ہندی ادب کے ہر صنف پر سب کچھ لکھدیا اور جس نے اگلی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام کیا۔ اوحدی نے اپنی کتاب "تذکرۂ عرفات" میں حضرت امیرؒ کے ہندی کلام کی تعداد اُتنی ہی بتائی ہے جتنی فارسی کی ہے جس کے متعلق سوانح نگاران کا یہ قول ہے کہ وہ تین لاکھ ابیات پر مشتمل ہے۔ اگر اہلِ ذوق تجسس کریں تو اُن کے ہندی کلام کا ملنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ البتہ غیر معمولی محنت درکار ہے۔ یہ عرض کرنا غالباً مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان کے ہندی کلام نے ہندی سبھا کو ایسا رچایا اور سجایا کہ اُس میدان میں اب کسی کے لئے گویا گنجائش ہی نہیں رہی۔ اپنے پیرو مرشد حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز کی منقبت میں وصال مرشد کے بعد مزار پر اُنھوں نے عشقِ مجسم ہو کر اپنے ہندی کلام سے جو "جگمگاہٹ" پیدا کی اُس کی جگمگاہٹ اِس وقت بھی سُننے والے کو جگمگادیتی ہے۔ چنانچہ حضرت امیرؒ فرماتے ہیں:۔

کوئی اوڑھے چندریا سووت ہے	کچھو جگ مگ جگ مگ ہوت ہے
وا صورت ماں اک مورت ہے	بن مورت کی ایک صورت ہے
کچھو جگ مگ جگ مگ ہوت ہے	تک دیکھت ہے کچھو کہہ نہ سکت

سبحان اللہ! حیاتِ ابدی کی تصویر کھینچ دی۔ روحانی تجلی کا جیتا جاگتا نقشہ پیش کردیا۔ فانی کالبد اور لافانی روح کی حقیقت ظاہر کردی۔ مورت اور صورت کے اُلٹ پھیر نے مجاز و حقیقت کی شرح کردی۔ "دیکھنے اور نہ بول سکنے" نے ارشادِ نبوی کی تفسیر کردی۔ کالبدی تعلق کے انقطاع اور روحانی تعلق کی وابستگی کا ثبوت پیش کردیا۔ سلسلۂ چشت کے شیدائی حضرت شاہ عبدالصمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جگمگاہٹ کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

اُس کے اندر ہو اک موت پر لاکوئی لکھتا ہے	پہلے دل میں چندا اوبھے جگمگ کرتا ہے

(ترجمہ :- دل میں پہلے جگمگاتا ہوا چاند نکلتا ہے جس کے اندر ایک مورت ہوتی ہے جو ہمیشہ لکھتی رہتی ہے۔)

اسی کا نام قادر الکلامی ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے جس سے دوسروں میں بھی جذبۂ صادق پیدا ہو۔ اور عرفان و وجدان کے دروازے کھل جائیں۔ غرضکہ حضرت امیرؒ کے علاوہ عبدالرحیم خانخاناں۔ ملا داؤد۔ ملک محمد جائسی وغیرہم وہ لوگ تھے جو شمالی ہند میں ہندی ادبیت کو رونق دے رہے تھے۔ اور دکن میں پانچسو سوا پانچسو برس قبل حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ۔ نظامی۔ فیروز۔ محمود۔ وجہی وغیرہم اپنے مقبول ہندی کلام سے وہاں کے لوگوں کو متوالا کر رہے تھے۔

بہرحال یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی عمومی زبان کی ابتدا ہندی ہے اور اُس کی انتہا موجودہ زبان ہے، جس کا نام لیتے یا رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر اُس کو اردو نام دیا جاتا ہے تو وہ زبان "مسلمان" ہو جاتی ہے، اور اگر "ہندوستانی" کہا جاتا ہے تو وہ "غیر مسلم" بن جاتی ہے۔ ہندوستان کے لطائف میں سے یہ بھی ایک مضحکہ خیز لطیفہ ہے کہ جو چیز پیدا ہو گئی۔ پرورش پا گئی حتّٰی کہ اپنے ثمرات سے سب کو بلا استثنا بہرہ ور بھی کر رہی ہے لیکن وہ اُس عمومی نام سے محروم کی جا رہی ہے جو اس بے زبان کی زبان کا سب کی زبانوں پر ہو۔

زمانہ کے تغیر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی تغیر کا یہ نتیجہ ہے کہ آبادیاں ویران ہو گئیں۔ ویرانے آباد ہو گئے۔ تمدّن کا نقشہ بدل گیا۔ معاشرت منقلب ہو گئی۔ صنعتیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ محدود ضرورتیں لامحدود اور دنیا کی کم و بیش جملہ زبانیں ایک دوسرے سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ ان ہی تغیرات کا دوسرا نام ترقی ہے۔ جو کچھ غیر موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ زمانہ کی بعض چیزوں یا بعض باتوں میں بعض اعتبار سے انحطاط ہے تو بعض دوسرے اعتبار سے ارتقا بھی۔ یہ کہنا کہ اس زمانہ میں ترقی ہوئی یا ہو رہی ہے اور پچھلے زمانہ میں نہیں ہوئی۔ یا اس کے برعکس۔ یہ دونوں نظریے صحیح نہیں ہیں۔ ہر زمانہ نے ترقی کی اور ہر زمانہ ترقی کرے گا۔ ہر زمانہ میں انحطاط ہوا اور ہر زمانہ میں ہوگا۔ اور یہ سلسلہ تا قیام قیامت جاری رہے گا۔ غرضکہ زبانِ انسانی بھی تغیر یا ترقی کے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کی زبان کا نام خواہ ہندی رکھا جائے یا اردو یا ہندوستانی۔ ہے وہ ایک ہی چیز۔ یہی سبب ہو کہ اس عمومی زبان کو فارسی رسم الخط میں بھی داہنے سے بائیں طرف اور سنسکرت رسم الخط میں بھی بائیں سے داہنی طرف جس کو ناگری کہتے ہیں لکھا جاتا ہے۔ لیکن بولتے وقت یہ امتیاز بھی باقی

نہیں رہتا۔ ورنہ اردو دونوں ہونٹوں کے داہنے زاویہ کی طرف سے بولی جاتی اور ناگری کے لکھے ہوئے الفاظ بائیں زاویہ کی طرف سے بولے جاتے۔

فی الحقیقت ہندوستانی ادبیت کو قدیم شعرا متصوفین اور غیر متصوفین دونوں نے رونق دی۔ اس کو مقبول عام بنایا۔ اپنے مطالب سے ہر کہ ومہ کو آشنا کر کے نام نہاد "اردو ہندی" جھگڑے کو کبھی سامنے تک نہ آنے دیا۔ بلکہ انھوں نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ ملک کے لوگ اپنی زبان سے زیادہ سے زیادہ پریم اور محبت کر کے اس کو بڑھائیں اور پھیلائیں۔

ان ہی متصوفین شعرا میں سے حضرت وجھن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جن کا مسدس ایک زمانہ میں " الف بائے وجھن " کے نام سے معروف تھا اور بالخصوص پچھلی صدی میں وہ اودھ کے مکتبوں میں بچوں کو زبانی یاد کرایا جاتا تھا۔ اسی مسدس کی شرح بنام "پریم رس" میں ناظرین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ مگر قبل اس کے کہ میں اس کی شرح پیش کروں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب کے مختصر سوانح اور اس مسدس کی نوعیت سے بھی ناظرین کو روشناس کرا دوں اور اپنی اس کم مائگی کو بھی ظاہر کر دوں جس کی وجہ سے میں شرح کا حق ادا نہیں کر سکوں گا۔

مسدس کا قلمی نسخہ اور اس کی اہمیت

مجھے یہ قلمی مگر ناقص نسخہ دہلی کے ایک پرانے کتب فروش کی دکان پر اور کتابوں کے ساتھ ملا۔ جس پر نہ کتاب کا نام تھا اور نہ مصنف کا۔ البتہ جگہ جگہ بعض مصرعوں میں سرخی سے " وجھن " لکھا ہوا تھا۔ نسخہ اردو یا فارسی رسم الخط میں نہایت صاف لکھا ہوا ہے۔ لیکن لکھنے والا چونکہ ہندی سے شاید ناواقف تھا اس لئے ہندی کے الفاظ کو اس نے اس طرح سے لکھا کہ جن کا سمجھنا ہی دشوار ہو گیا، جہاں چاہا اس نے نقطے لگا دئے۔ اور جہاں ضروری تھے وہاں سے غائب کر دئے۔ اس کے علاوہ بعض ہندی تلفظ کو اردو کے حروف صحیح طور پر ادا بھی نہیں کر سکتے اس کی وجہ سے بھی کاتب کو دشواری ہوئی اور وہ صحیح طور پر ان کو نہ لکھ سکا۔ مگر میں نے بہر نہج پوری اور مسلسل کوشش کے بعد اس پر قابو پایا تو دیکھا کہ عجیب و غریب مسدس ہے جو ہندی زبان میں انوکھا ہے اس کے علاوہ جس نئے انداز میں حضرت شاہ صاحب نے " معرفت و حقیقت " کے مشکل مضامین کو ضروری ہدایتوں کے ساتھ بیان کیا ہے وہ بھی کچھ کم انوکھا اور اچھوتا نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ نے عربی حروف تہجی کو جن کی تعداد (۲۸) ہے لیکر ہر حرف پر ایک

"بند" اس طرح سے لکھا ہے کہ "حرف" کو بحر اور وزن سے خارج نہیں ہونے دیا بلکہ اسی بحر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے ان "بندوں" کو کسی حد تک "ترکیب بند" کہا جا سکتا ہے۔ کسی حد تک اس لئے میں نے کہا کہ بند کے آخری شعر کی بحر بند کے دو پہلے اشعار سے مختلف ہی۔ بہر حال انھوں نے ہر "حرف" کے لئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ حرف نہیں ہے بلکہ مطالب و معانی کا خزانہ ہے۔ مثلاً "الف" سے اللہ کی ذات بے ہمتا کو ثابت فرماتے ہوئے اس پر یہ کہہ کر سخت حیرت کا اظہار کیا ہے کہ "قطرہ میں سمندر سما گیا" تفصیلات آپ کو آیندہ اوراق میں ملیں گی۔

مصنف مسدس کا نام خاندان اور مدفن

گو میں نے اس مسدس کو بارہا پڑھا اور کوشش کر کے پڑھا لیکن پھر بھی بعض الفاظ میں مجھے دشواری رہی۔ دوسرے یہ بھی خلش رہی کہ مصنف کے نام اور خاندان و وطن کا پتہ بھی چلانا ضروری ہے۔ دکن میں بعض اصحاب ذوق سے میں نے پوچھا تو اکثر نفی میں جواب ملا۔ البتہ بعض سن رسیدہ بزرگوں نے جو اُسی طرف کے تھے اور جنھوں نے اپنے عہد طفلی میں اِس کو پڑھا تھا۔ صرف یہی بتایا کہ اس قسم کی چیز انھوں نے پڑھی تھی اور بس۔ قیاس سے میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ بزرگ ضرور خطۂ اودھ کے ہیں۔ کیونکہ مسدس "اودھ بھاشا" میں ہے لیکن تفصیلی معلومات کے لئے محض یہ قیاس کافی نہیں تھا۔ ایک روز مجھے یہ خیال آیا کہ یہ ایسی چیز ہے جو مطبع نولکشور میں ضرور چھپی ہوگی۔ لہٰذا میں نے وہاں ایک خط بھیجا۔ مطبع نے دو آنہ میں ایک مطبوعہ رسالہ "مجموعۂ توحید" بھیج دیا۔ جس میں یہ مسدس بھی تھا۔ اور دوسرے ہمعصر اساتذہ کا ہندی کلام بھی۔ لیکن وہ رسالہ بھی سوانح اور اُن کے نام سے معرّا تھا۔ اس کے علاوہ قلمی سے زیادہ اس میں غلیاں دیکھیں جو اس قدیم مطبع کی قدیم خصوصیت ہے۔ غرضکہ اس کو دیکھ کر بھی بہت مایوسی ہوئی۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ اس سے زیادہ غلط نکلا بلکہ اس لئے کہ صاحب مسدس کا پھر بھی پتہ نہ چلا۔ کچھ عرصہ کے بعد بسلسلۂ تعطیلات میں دکن سے وطن آیا اور میں نے اس کی ٹوہ شروع کی۔ "جو یندہ یا بندہ" معلوم ہوا کہ ان کا پتہ خیرآباد ضلع سیتاپور میں چل سکتا ہے۔ میں وہاں گیا۔ جو میرا اپنا ننھال ہے۔ اعزّا سے دریافت کیا۔ بعضوں نے لاعلمی ظاہر کی اور بعضوں نے رہنمائی کی۔ اور بتایا کہ یہ بزرگ سندیلہ ضلع ہردوئی کے رہنے والے اور وہاں کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ ان کے ایک صاحبزادہ شاہ اصلح اللہ صاحب تھے اور ان کے بیٹے میرے ماموں حضرت قبلہ مولوی غضنفر احمد صاحب مرحوم رئیس خیرآباد ولاہرپور تھے۔ جن کی اولاد ماشاءاللہ خوشحال نیک و تعلیم یافتہ ہے

اور کنبہ پروری اور سادگی میں اپنی آپ ہی مثال ہے۔ وہاں سے میں سندیلہ پہونچا اور اُس گھرانے میں گیا جو اُنہی کا کہلاتا تھا۔ میں اُسی گھر کے ایک بزرگ سے ملا اور اُن سے جو اجمالی حالات اِس مختصر ملاقات میں معلوم ہوئے۔ وہ درج ذیل ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے کچھ اور اُن کا ہندی کلام بھی مجھے دیا۔

وہیں مجھ کو معلوم ہوا کہ ایک اندھے حافظ وہاں ہیں جو اس مسدس کو اس نواح میں مجلس میلاد شریف کے موقع پر پڑھتے ہیں۔ میں نے اُن کو بلایا اور اُن سے میں نے اِس کو سُنا۔ اُن سے سُنکر اُن کی بھی اصلاح کی اور کتاب کی بھی۔ حضرت وجھن شاہ صاحب کا اسم مبارک شاہ وجہ اللہ فاروقی تھا۔ وجھن تخلص فرماتے تھے۔ حضرت شاہ ولی محمد صفی پوری سے بیعت تھے۔ اور ان ہی نے خرقۂ خلافت مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن باوجود اجازت بیعت کے آپ نے کسی کو مُرید نہیں کیا۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ آپ کو "جذب" زیادہ مرغوب تھا اور سلوک میں بہت کم رہتے تھے۔ اسی لئے نہ کوئی خلیفہ ہوا اور نہ کوئی سجادہ۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کے بزرگ ہیں۔ صحیح تاریخ ولادت و وفات نہ معلوم ہو سکی۔ مولد آپ کا سندیلہ تھا اور مدفن آپ کا بارہ بنگی ہے اور عین بڑے ڈاک خانہ کے قریب ہی کھلا ہوا مزار ہے۔ اس کے متصل ہی ایک مسجد بھی ہے۔ سالانہ عُرس بھی ہوتا ہے۔ میں مزار پر حاضر ہوا۔ اور ایصالِ ثواب کا فرض ادا کر کے مبدءِ فیض سے فیوضِ روحانی کا طالب ہوا اور ہوں۔ اس سے زیادہ اُن کی سوانح حیات کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اگر مزید جستجو کی جائے تو اُن کا اور ہندی کلام بھی مل سکتا ہے۔ اور غالباً مزید حالات بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔ بشرط موقع و فرصت میں ہی انشاءاللہ مزید کوشش کروں گا۔

پریم رس کی وجہ تسمیہ اور شارح کی طرف سے معذرت

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس رسالہ کو عرف عام میں "الف بائے وجھن" کہا جاتا تھا۔ مگر میں نے اس کو "پریم رس" کا نام دیا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل تو یہ رسالہ خدا تعالیٰ سے محبت کی تلقین کرتا ہے اور طالبوں کو طریقت سے روشناس کر کے معرفت اور حقیقت کا راستہ بتاتا ہے۔ اس لئے اس کا نام "پریم رس" رکھنا مناسب تھا۔ اور یہ۔ دوسرے حضرت شاہ صاحب نے اسی مسدس میں ایک جگہ خود فرمایا ہے:۔

ڈال دیا جو من میں را سکھے ۔ "پریم کا رس" کیسے نا چاسکھے

(جو دل میں رحم و کرم رکھتا ہے وہ محبت کے شربت کو کیسے نہیں چکھے گا)

یہ کہہ کر اِس کا نام اُنھوں نے خود ہی تجویز کر دیا تھا۔

اس مسدس کی شرح لکھنے میں مجھ سے کوتاہیاں ہوں گی۔ اوّل تو ہندی زبان یا "برج بھاشا" اور "اودھ بھاشا" پر جن کا اگرچہ میں نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اتنی قدرت نہیں اور اگر ہو بھی تو مسلۂ "معرفت" اور پھر اُس کا سمجھانا میرے حیطۂ اقتدار سے باہر۔ "معرفت" اور اس کے بعد "حقیقت" کو وہی شخص سمجھا سکتا ہے جو اس کو خود سمجھ چکا ہو۔ اور یہ وہی ہو سکتا ہے جو "معرفت" کے میدان کو طے کر چکا ہو یا کم از کم طے کر رہا ہو۔ لیکن یہ وہ کٹھن منزل ہے جس میں قدم رکھنا مجھ جیسے ناکارہ۔ بوالہوس۔ دنیا دار اور گنہ گار کے لئے نہ تو ممکن ہے اور نہ ایسے انسان کو وہ اعلیٰ اور ارفع چیز اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس طرف جانے یا ارادہ کرنے کے لئے سب سے پہلے "شریعت" کا سخت امتحان ہے۔ جس میں "نفس امّارہ اور نفس لوّامہ" کو قابو میں لانا پڑتا ہے۔ جس پر قابو پانا ہی سب سے بڑا معرکہ اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس کے بعد "طریقت" کے منازل طے کرنے پڑتے ہیں جہاں ریاض و مجاہدہ کے پہاڑوں سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر انسان پہلے امتحان میں کامیاب ہو جائے تو اس امتحان میں نسبتاً آسانیاں ضرور ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی کامیابی آسان نہیں ہے۔ اس کے بعد "معرفت" کا جاہ و جلال شانِ کبریائی سے جلوہ گر ہو کر تسلیم و رضا کا طالب ہوتا ہے اور نفس کو "راضیہ و مرضیہ" کا خطاب دے کر اُس کے لئے "حقیقت" کے دروازوں کو کھولتا ہے۔ اُس وقت وہ نفس "صافیہ و کاملہ" کے مرتبہ پر پہونچ کر۔ حضرت پیرانِ پیر۔ پیر دست گیر۔ غوث الثقلین۔ محبوبِ سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی حسنی والحسینی رضی اللہ عنہ کے الفاظ گہربار میں اس خطاب کا مستحق ہوتا ہے [۵]

هَلُمَّ اِلَیَّ لَا تَقْصُدْ سِوَائِیْ اَنَا الْمَنَّانُ۔ فَاطْلُبْنِیْ تَجِدْنِیْ

(ترجمہ:۔ میری (خدا کی) طرف آ۔ اور سوائے میرے کسی کو اپنا مقصد نہ بنا۔ میں ہی احسان کرنے والا ہوں میری طلب کر میں تجھے مل جاؤں گا)

اور اس کے بعد مسلسل یہی صدائیں آتی رہتی ہیں:۔

---

[۵] یہ ابیات عربی و فارسی حضرت پیرانِ پیر دستگیر امام ربّانی محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے "قصائدِ ربّانی" سے نقل کی گئی ہیں۔

بیا بشتاب سوئے من بزاری ۔ کہ جز من خالق دیگر نداری
نہ جوئے غیر من در ہیچ وقتے ۔ بخاطر نا امیدی را نیاری
اگر یادم کنی در شب نہانم ۔ من اسرار ترا اے بندہ دانم
منم سامع بہر چیزے کہ گوئی ۔ ترا از لطف خود ہر دم بخوانم

ان شرائطِ عائرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں اپنے لئے حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشہور شعر کو دوہراتا رہتا ہوں :۔

صلاحِ کار کجا و من خراب کجا ۔ ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

ان حالات میں "عارف" کی معرفت کو سمجھانے کے معنیٰ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہیں کہ "عارف" کے ہی الفاظ کو دُہرا کر مطلب بیان کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ ایک ناواقف انسان مشکل مطالب کو سمجھانے کے لئے مشکل الفاظ ہی کی آڑ لے کر اپنی ناواقفیت کو پردہ دری سے بچاتا ہے۔ اور گویا مطلب سمجھا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ مزید تشریح کے مطالبہ پر آخر کار مجبور ہو کر حضرت مولانا رُومؒ کے الفاظ میں کہدیتا ہے :۔

من چہ دانم یک رگم ہشیار نیست ۔ وصف آں یارے کہ آں را یار نیست

اس مشکل مسئلہ میں میرا بالکل یہی حال ہے۔ ایسی صورت میں "مسائلِ معرفت" پر میرا کچھ لکھنا یا کہنا ایسا ہی ہے جیسے کہ :۔

"طبیبٌ یُداوی النّاس وھو مریض"

(ترجمہ :۔ بیمار طبیب لوگوں کے علاج کی کوشش کرے۔)

دعا بہ مبدءِ فیض

آخر میں حضرت شاہ صاحب قبلہؒ کے فیض روحانی اور مبدءِ فیض کی بارگاہ میں یہ استدعا اور التجا کرتا ہوں کہ وہ نہ صرف "معرفت" کے مسائل کے سمجھانے کی کوشش میں مجھے کامیاب فرمائے بلکہ مجھے ایسا سمجھا دے کہ میں بھی یہ کہنے کے قابل ہو جاؤں :۔

بے جہت گشتم نہ گشتم بے جہت ۔ عارفم امّا ندارم معرفت

اَللّٰھُمَّ رَضِّنِی بِقَضَائِكَ وَصَبِّرْنِی عَلٰی بَلَائِكَ وَاَوْزِعْنِی شُکْرَ نَعْمَائِكَ وَاَسْأَلُكَ تَمَامَ نِعْمَتِكَ وَدَوَامَ عَافِیَتِكَ وَالثَّبَاتَ عَلٰی مَحَبَّتِكَ۔

شرح مسدس

بنام شاہد نازک خیالاں

عزیز خاطرِ آشفتہ حالاں

| حمد۔ معرفت و وحدانیت | بند ۱۔ "الف"۔

الف، ایک بہو رنگی سائیں　　ہر گھٹ میں واکی پرچھائیں

جہاں دیکھو تہاں روپ ہی نیارا　　ایسا ہے بہو رنگی پیارا

وجیسن کہے تو کیا ہی کچھ کہنے کی نہیں بات

سمندر سمایو بوند میں اچرج بڑو و کھات

تشریح۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے حمد میں "معرفت" اور "معرفت" میں "حمد" کو جس انداز سے بیان فرمایا ہے وہ اسی عرفان و وجدان کا پرتو تھا جس میں وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ "الف" سے خدا کی "وحدانیت" کو حضرت رئیس الاولیاء والاتقیاء حکیم سنائی ابوالمجد مجدالدین آدم غزنوی قدس سرہ العزیز نے بھی نہایت خوبی سے ثابت فرمایا ہے چنانچہ "حدیقۃ الحقیقہ" میں یہ فرماکر کہ ؎

باالف، ب وت بود ہمرہ　　ب وت بت شمر الف اللہ

وحدانیت کو ثابت کرتے ہوئے "الف" کے اس امتیاز کو بتا دیا جو نہ صرف "اللہ" کا پہلا حرف ہے بلکہ "کتاب اللہ" میں بھی اس کو اولیت کا درجہ ملا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی سبق کو دہرایا ہے۔ لیکن اس طرح سے کہ موصوف کا نام نہیں لیا بلکہ "بہو رنگی" کہہ کر اور "ہر جگہ روپ" اس کا بتاکر اس کی تمام صفات کو جو لاتعد و لاتحصیٰ ہیں بیان کر دیا اور کہہ دیا کہ ہر جسم میں اس کے جمال کا پرتو ہے۔ حضرت پیران پیر سے منقول ہے کہ خدا سے دریافت کرنے پر آپ کو یہ جواب ملا تھا کہ انا مُکَوِّنُ المکان ولَیْسَ لی مکانٌ اِلَّا مِنَ الاِنسان (ترجمہ۔ میں مکان کا پیدا کرنے والا ہوں میرا مکان تو راز (قلب) انسان ہے۔) اسی مفہوم کو حضرت شاہ صاحب نے یہ فرما کر ظاہر کیا "ہر گھٹ میں واکی پرچھائیں" ان صفات کے بیان کے بعد وہ فی الحقیقت اس سمجھنے سے قاصر اور عاجز، حیران اور ششدر رہیں کہ وہ ذات سب سے بیے ہمتا جس کے بے اندازہ صفات

ہیں اور جو اپنی وسعت و پہنائی میں ایک سمندر ہے اس ایک قطرہ میں جو "الف" کی شکل میں ہے کیسے سما گئی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ "الف" ظاہر میں قطرہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ وحدت ہے جس میں کثرت پنہاں ہے اور یہی وہ حیرت انگیز بات ہے جو سمجھ سے بالا، ادراک سے اعلیٰ اور علم سے ارفع ہے۔ اسی لئے حضرت پیران پیر غوث اعظم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ خدا نے ان سے فرمایا لَیْسَ لِصَاحِبِ الْعِلْمِ عِنْدِیْ سَبِیْلٌ مَعَ الْعِلْمِ اِلَّا بَعْدَ انکارہٖ۔ ترجمہ۔ علم والے کا مع اپنے علم کے میرے پاس گزر نہیں ہے مگر علم سے انکار کرنے کے بعد۔) حضرت شیخ حامد فرید الدین محمد بن ابراہیم عطار نیشاپوری نے اس کو مان کر آخر کار اعلان کر ہی دیا کہ:۔

گر صد ہزار سال ہمہ عقل کائنات   فکرت کنند در صفت عزت خدا

آخر بہ عجز معترف آیند کائے خدا   دانستہ شد کہ ہیچ نہ دانستہ ایم ما

نظیری نیشاپوری اسی مفہوم کو اس طرح ادا کرتا ہے۔ ؎

گر کشف حجب خواہی بہ ستاں مئے ناب اوّل   در علم ازل جوئی بگزر ز کتاب اوّل

ترجمہ۔ (اگر تو پردہ کشائی چاہتا ہے تو پی کر مست ہو جا اسی طرح اگر تو علم الٰہی چاہتا ہے تو پہلے کتابی علم سے درگزر کر)

اسی حیرانی کو حضرت شاہ عبدالصمد قدس سرہ العزیز المتخلص بہ مست نے یوں ظاہر فرمایا ہے کہ ؎

کیا ہے اچرج دیکھو سادھو بوند میں سمدر سمایا ہے
جو کوئی اس کو پہچانے مستا گرو ہمارا ہے

طریقت کی تعریف و تلقین | بند ۲۔ "ب"۔

بے بن گرو سے بھید نہ پایا   دھرتی سے آکاس لو دھایا

پہلے پریت گرو سے کرنی   پریم ڈگر میں پگ تب دھرنی

بن گرو جھن لیت ہیں جو کوئی بس رنگائے

یہ سچ کے تم جانیو وہ دونوں اور سی جائے

تشریح۔ صاحب ممدوح فرماتے ہیں کہ بغیر استاد کے اگر کوئی چاہے کہ اس کو راز سربستہ معلوم ہو جائیں تو یہ ممکن نہیں ہے خواہ وہ کتنی ہی محنت ریاض و مجاہدہ کیوں نہ کرے۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ باوجودیکہ زمانۂ دراز سے علوم سینہ بسفینہ میں آچکے ہیں۔ اور شرح و بسط سے ان کو مدون کر دیا گیا ہے لیکن پھر بھی بغیر استاد کے ان کا حصول ممکن نہیں ہے۔ یہی کلیہ روحانیات پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اسی لئے علوم روحانی میں بھی استاد کی ضرورت ہوتی ہے

لیکن بقول صاحب ممدوح علیہ الرحمہ جو کوئی اپنے تئیں اس کلیہ سے مستثنیٰ کرکے اس ''درس'' کو شروع کرتا ہے اور اپنا خود ہی رہبر بن جاتا ہے اس کے لئے گمراہ ہو جانا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ وہ نہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا۔ بلکہ ساری عمر بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ فرماتے ہیں کہ ''محبت'' کے درس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے اُستاد سے ''محبت'' کرے یعنی اس کی اطاعت و فرمانبرداری اپنا فرض جانے۔ کیونکہ محبت کے اظہار کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بصورت عدم اطاعت و عدم محبت اُستاد سے اس کو فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے پہلے اظہار اطاعت کرے پھر درس ''محبت'' لے تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ حضرت فنائی گنجوی نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسفؒ نے اسی ''بھید'' کی تلاش میں آخر کار اُستاد کو تلاش کر لیا اور ''بھید'' پا لیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

چونکہ ندیدم ز ریاضت گزیر — گشتم ازاں خواجہ ریاضت پذیر
رائض من چوں ادب آغاز کرد — از کرۂ نہ فلکم باز کرد

ترجمہ: (جب میں نے ریاضت سے بچاؤ نہ دیکھا تو میں نے ان خواجہ (استاد) سے ریاضت کا سبق لیا۔ جونہی کہ استاد نے تعلیم دینی شروع کی تو نو آسمانوں کے طبق کھل گئے)۔

اسی کی تلقین حضرت شاہ عبد الصمد قدس سرہ العزیز یوں فرماتے ہیں کہ:۔

ہے سب مستا دل کے اندر گرو سے سیکھو اس کا منتر
بنا گرو یہ گیان نہ آوے نگر اوسر کو دھنتا ہے

ترجمہ:۔ (اے مست سب کچھ دل کے اندر ہے اس کے جاننے کا منتر پیر سے سیکھو۔ کیونکہ بغیر استاد کے یہ علم نہیں آتا ہے اور بے استاد والا سر کو دھنتا ہی رہتا ہے)۔

انانیت کی نفی اور وصال محبوب | بند ۳ ''ت''۔

تے، تب جوگ تیرا بنی ای ہے — جب بیرن یہ دو بدھا جتی ہے
وہی ہے من میں کپٹ کی تائی — جن سب کھیل کیا ہے، مائی

جو من کی "میں میں" چھٹے اور تیں میں کا بندھ تار
وجھن صاحب ابھی ملیں تنک نہ لاگے بار

تشریح۔ حضرت شاہ صاحب قبلہ ظاہری لباس فقیری کو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ ضروری ہے۔ البتہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دل کی صفائی کی جائے جس کا واحد ذریعہ یہ

ہے کہ دل سے "خودی" اور "انانیت" کو فنا کر دیا جائے۔ کیونکہ یہی "انانیت" "دوئی" یا بالفاظ شاہ صاحب "دُبدھا" کا سبب بن جاتی ہے۔ جو قاصد و مقصود، طالب و مطلوب، عاشق و معشوق اور محب و محبوب میں حجاب بن کر ان تجلیات سے طالب کو محروم کر دیتی ہے جو فی الحقیقت مقصدِ حیات ہے۔ اسی "دوئی" یا "انانیت" یا خودی کا نام حضرت مولانا رُومؒ نے "گاؤخر" رکھا اور فرمایا:۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤخر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

ترجمہ:۔ (زبان پر تسبیح اور دل میں گائے وگدھے (معاملات دنیا) کا خیال، ایسی تسبیح کیا اثر کر سکتی ہے)۔

اسی کی تلقین تلسی داس جی مشہور سادھو اپنی زبان میں یوں کرتے ہیں:۔

مالا ساجی کاٹھ کی اور منکے لئے پروئے من میں گھنڈی پاپ کی رام جپے کا ہوئے

ترجمہ:۔ (دانوں سے تسبیح کو آراستہ تو کر لیا لیکن دل میں گناہوں کی گرہ لگی ہوئی ہے ایسی تسبیح اور اللہ کا نام لینے سے کیا فائدہ)۔ عبدالرحیم خانخاناں نے اس کو اخلاقی پہلو سے یوں بیان فرمایا ہے:۔

رام نام کڑوا لگے میٹھے لاگیں دام دُبدھا میں دونو گئے مایا ملی نہ رام

(اللہ کا نام کڑوا لگتا ہے اور روپیہ کا اچھا نتیجہ یہ ہے کہ اس دُبدھا میں نہ مال ملا نہ خدا)

اسی کا ترجمہ سید عا سادھو ایک شاعر نے یوں کیا ہے:۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اس "انانیت" سے جو نقصان اور اس کی فنا سے جو فائدہ ہوتا ہے اس کی مثال ایک سادھو اس طرح پیش کرتا ہے:۔

بکری جو "میں، میں" کرے سہج ہی ماری جائے
"مینا، مینا" جو کہے میٹھی شکر کھائے

بند ۴ "ث"۔ | تصفیہ و تزکیۂ قلب کے لئے ذکر اور توجہ کی ضرورت

ثے ثنابت ہوئی دھیان جو لاگے آپوں ہی آپ بھرم سب بھاگے
اجپا جاپ تو جپ رے بھائی چھوٹ جائے درپن کی کائی
دھجن کہت ہے جاپ کر بیٹھو رہو دھیان لگائے
سرت پھرت وہ دا کھئے بِرتھا سانس نہ جائے

تشریح:۔ شاہ صاحب اس بند میں خصوصیت سے دو باتوں پر زور دیتے ہیں۔ ایک "ذکر" خواہ خفی ہو یا جلی، دوسری توجہ جس کو دھیان کہتے ہیں۔ قلب کی صفائی اور اس کی روشنی کا

یہی ایک طریقہ ہے۔ "قلب حاضر" اور "عین ناظر" کی صفات اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت پیران پیر دستگیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ کا یہ حکم سُنکر کہ کھانے پینے حتیٰ کہ سونے میں قلب (توجہ) اسی ذات واحد کی طرف رہے من وعن تعمیل فرمائی۔ اِس کے بعد آپنے فرمایا:۔ فَمَا اَکَلْتُ طَعَامًا وَّلَا شَرِبْتُ شَرَابًا اِلَّا عِنْدَ رَبِّیْ وَمَا نِمْتُ نَوْمًا اِلَّا بِقَلْبٍ حَاضِرٍ وَّعَیْنٍ نَاظِرٍ۔ ترجمہ:۔ (میں نے اپنے رب ہی کے پاس کھایا اور پیا، میں سویا ضرور مگر میرا قلب "حاضر" رہا۔ اور "عین ناظر" رہی)۔ ذکر اور توجہ کا یہی مقصد ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیاوی خدمات انجام دیتے ہوئے قلب اپنی خدمت یا اپنے مقصد سے غافل نہ ہونے پائے۔ وہی قلب قابل ستائش ہے جو اس قالب میں رہ کر اپنے مقصد کو فوت نہیں ہونے دیتا۔ یہ قالب دنیا ہی کے کاروبار کے لئے ہے اور دنیا ہی میں فنا ہو جائے گا۔ خدا سے "قالب" کے غافل ہونے کے کچھ معنی نہیں ہیں بلکہ "قلب" کا غافل ہونا باعثِ ہلاکت اور سبب گمراہی ہے اور اسی کا نام دنیا، دوں ہے۔ مولانا روم نہایت واضح طور پر فرماتے ہیں:۔

چیست دنیا، از خدا غافل بُدن ... نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ترجمہ:۔ (دنیا کیا ہے خدا سے غافل ہونا۔ کپڑا، زر، بیوی بچے دنیا نہیں ہیں۔)

چونکہ "عشق و محبت" کے راستے میں بھرم یا عزّت کا خیال ایک سخت رکاوٹ ہے اس لئے اس کے دفعیہ کے لئے یادِ الٰہی کی مزاولت ہی بہترین تدبیر ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا۔ حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس "تخیل عزّت" کو یہ فرما کر ختم ہی کر دیا:۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی ... کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

(محبت کا جب تو غلام ہو چکا ہے تو خیال نسب و خاندان کو جامی اب دل سے نکال دے کیونکہ اس راستے میں بڑا ہونا یا کسی کا بیٹا ہونا کوئی چیز نہیں۔) حضرت جامی نے فی الحقیقت حکم الٰہی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کا ترجمہ معہ تفسیر پیش کر دیا۔ ترجمہ:۔ (اللہ کے پاس سب سے زیادہ تم میں عزت دار وہی ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے خوف (محبت) کرتا ہے)

غفلت کے نقصانات | بند ۷ "ح"۔

ح، حد بھر یہ بھول ہے تیری ... ایکو بات نہ مانی میری
اب لگ تو ئیں ایسا ہو جاتا ... جیسے کوئی بھلا مدھ ماتا
کہاں گئی تھی بدھ تیری اور کہاں گیا تھا چیت
ایسی مایا پائی کہ جو ہر سے کی نہ ہیت

تشریح:۔ یہ بند پہلے بند کی ایک حد تک کڑی ہے اس میں شاعر اپنے ہی "نفس امارہ" سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ڈاکوؤں سے بچنے کی جتنی میں نے تدبیریں تجھ کو بتائیں ان کو تو نے نہ مانا اور نہ ان پر عمل کیا۔ اگر کہیں تو میرا کہنا مان لیتا تو ایسا ہو جاتا جیسے کوئی "مست مئے الست" ہوتا ہے۔ آخری شعر میں نفس کی بدعقلی پر آنسو بہاتے ہوئے کہتا ہے کہ آخر تیری عقل و ذکاوت کو کیا ہو گیا تھا کہ تو نے ایسے بہتر موقع کو کھو دیا۔ ایسی مفید نصیحت کو نہ سنا اور ایسے اعلیٰ مشورہ کو نہ مانا اور مال میں مبتلا ہو کر خدا کی محبت سے گریز کیا۔ کاش تو مان لیتا تو آج تو اس کا ہوتا اور وہ تیرا حتیٰ کہ آگے چل کر یہ بھی فرق نہ رہتا۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے حضرت پیران پیر پیر دستگیر رضی اللہ سے یوں خطاب فرمایا ہے کہ:۔ جِسْمُ الْاِنْسَانِ وَنَفْسُهٗ وَرُوحُهٗ وَقَلْبُهٗ وَسَمْعُهٗ وَبَصَرُهٗ وَلِسَانُهٗ وَيَدُهٗ وَرِجْلُهٗ كُلُّ ذَالِكَ اَظْهَرْتُ لَهٗ بِنَفْسِي لِنَفْسِي لَاهُوَ اِلَّا اَنَا وَلَا اَنَا غَيْرُهٗ۔ ترجمہ:۔ (انسان کا جسم، اس کا نفس، اس کی رُوح، اس کا قلب، اس کے کان، اس کی آنکھیں، اس کی زبان، اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں یہ سب چیزیں جو میں نے اس کو دیں وہ اپنے ہی لئے اپنے ہی میں سے دیں۔ وہ وہ نہیں ہے بلکہ میں ہوں اور میں اس کے سوا نہیں ہوں۔) اسی قول اور حقیقت کو سامنے رکھ کر شاہ صاحب نے بیہوش انسان کو "مدہوش" بننے کی تلقین فرمائی اور اس غفلت سے بیدار کیا جو اس کی بیہوشی کا سبب ہے۔ اسی کی تلقین حضرت شاہ عبدالصمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز المتخلص بہ مست انداز مستانہ میں یوں فرماتے ہیں:۔

جاگ لے رے مورکھ سووت کا ہے	دیکھ تو جگ میں ہووت کا ہے
لاکھ کہو اور سمجھایو	دھیان میں تو رے ایک نہ آیو
منہ پھاڑے دھرتی تو ہے بیٹھی	اورن کو تو رووت کا ہے

ترجمہ:۔ (اے بے وقوف! جاگ جا تو سوتا کیا ہے۔ اور دیکھ کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ لاکھ بار کہہ کر سمجھایا لیکن تیرے خیال میں ایک بات بھی نہ آئی۔ (اب بھی سن لے) کہ زمین تیرے لئے منہ پھاڑے ہوئے بیٹھی ہے تو دوسروں کو کیا روتا ہے)

اس سخت تنبیہہ کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ سب کچھ تجھ میں ہے تو ادھر اُدھر کیوں ڈھونڈھتا پھرتا ہے:۔

تین ترلوک اور صاحب تو میں	تو ڈھونڈے ہے درس تو میں
اندھرا مورکھ دیکھت ناہیں	دیکھ تو، تو میں بولت کا ہے

ترجمہ:۔ (تینوں طبق کا مالک تجھ میں ہے تو اِدھر اُدھر ڈھونڈھتا ہے۔ اندھے بیوقوف! دیکھتا بھی نہیں ہے! دیکھ تو سہی کہ تجھ میں کیا بول رہا ہے) اور اس کا ثبوت آیتِ قرآنی "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدُ" (ہم شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں) اور حدیثِ نبوی مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا) یوں پیش فرماتے ہیں:۔

نَحْنُ اَقْرَبُ مالک بولا — مَنْ عَرَفَ نے یا کو کھولا

بیگ سے یا کو بوجھ لے مستا — ناحق جنم کو کھووت کا ہے

ترجمہ:۔ ("نَحْنُ اَقْرَبُ" خدا نے فرمایا اور "مَنْ عَرَفَ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما کر اس کو واضح فرما دیا۔ تو اب فوراً اس کو سمجھ لے۔ لے مست! بلا وجہ زندگی کیوں خراب اور ضائع کر رہا ہے)۔

ذکر اور اس کی قسم "ارہ" کی تعریف و تلقین | بند ۷ "خ"

خ، خاوند کیا کہیں ہے نیارا — موند دیکھ تو دسوں دوارہ

سُن پڑی ہے ان حد کا باجا — پر جاسے ہوئے جبی ہے راجا

سبھئے ساج تن مین بجیں اور ان سے بجی ہیں راگ

و جھن جا کو سُن پڑی ہے بڑے ہیں واکے بھاگ

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحب نے اس بند میں "ذکر" کی ایک خاص قسم کی طرف جس کو اصطلاح صوفیا میں "ذکر ارہ" کہتے ہیں اشارہ فرماتے ہیں اور اس کا اجمالی طور پر طریقہ بھی بتاتے ہیں "ذکر ارہ" ذکر خفی کی ایک قسم ہے جس کو بہت مشکل بتایا جاتا ہے۔ اس میں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بیک وقت منھ دونوں نتھنے اور دونوں کان بند کئے جاتے ہیں اور صرف قلب سے کام لیا جاتا ہے۔ جس کو حضرت مولانا روم نہایت واضح طور پر اس طرح بیان فرماتے ہوئے "دیدار الٰہی" کا دعویٰ بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

لب بہ بند و چشم بند و گوش بند — گر نہ بینی سرِّ حق بر ما بخند

ترجمہ:۔ (ہونٹ بند کر لے، آنکھ بند کر لے، کان بند کر لے اگر تو (اس کے بعد) اللہ کا بھید نہ دیکھ پائے تو (پھر) ہمارا مذاق اڑانا یا ہم پر ہنسنا)۔ بعینہٖ اسی مفہوم کو تلسی داس جی نے بھی یہ کہہ کر رام بھگتوں کو فہمایش کی ہے:۔

آنکھ، کان، منھ ڈھانپ کے نام نرنجن لے

انتر کے پٹ جدھ کھلیں جدھ باہر کے پٹ دے

ترجمہ:۔ آنکھ، کان اور منھ بند کر کے اللہ کا نام لے۔ اندر کے پٹ (حواس باطنی یا قلب) اسی وقت

کھل سکتے ہیں جب باہر کے پٹ (حواس ظاہری) بند ہوں گے۔ اسی کے قریب قریب بہ تبدیل الفاظ کبیر داس جی اسی مسلک کی تلقین کرتے ہیں ؎

سمرن سرت لگائے کے مکھ تے کچھ نا بول
باہر کے پٹ موند کے انتر کے پٹ کھول

ترجمہ:۔ (یاد الٰہی میں خاموش بیٹھ جا اور منہ سے کچھ نہ بول (اس طرح) باہر کے پٹ بند کر کے اندر کے پٹ کھول دے)

حضرت مولانا روم کی تلقین کا یہ اثر تھا کہ ذکر کے اس طریق کو ان سب نے بلا استثناء مذہب وملت اختیار کیا بلکہ باوقات مختلفہ اس کی تلقین بھی کی۔ کسی نے اشارہ سے کام لیا تو کسی نے اجمال سے۔ حتیٰ کہ کسی نے نسبتاً اس کی تفصیل بھی بیان کر دی۔ حضرت شاہ صاحب انہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے اس "ذکر" کے ثمرات کی کسی حد تک تشبیہ واستعارہ میں وضاحت بھی کر دی۔ مثلاً محکوم حاکم ہو جائے گا، جسم انسانی مجسم وہ ساز ہو جائے گا جس میں سے ایک ہی قسم کے راگ نہیں نکلیں گے بلکہ ایسے ایسے راگ نکلیں گے جن کو سن کر سننے والوں کی روح کو تازگی ہوگی اور یہی وہ خوش نصیبی ہے جو حقیقی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ "صرف حواس خمسہ" ہی کے بند کرنے کی تلقین نہیں کرتے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ "ظاہری اور باطنی" دسوں حواسوں کو کام کرنے سے روک دیا جائے اور صرف قلب سے کام لیا جائے تاکہ بعد میں ہر حصۂ جسم سے قلب کے ساتھ یاد الٰہی کی آواز نکلے۔ اسی یاد الٰہی کے متعلق ارشاد نبوی ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَلْعُوْنَۃٌ مَا فِیْھَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ۔ ترجمہ:۔ (دنیا اور دنیا کی سب چیزیں قابل لعنت ہیں مگر اللہ کی یاد یا وہ چیزیں جو اس ذکر میں مدد کریں) حضرت شاہ صاحب قبلہ بھی اسی ذکر الٰہی کے نتیجہ کو "ان حد باجا" فرماتے ہیں۔ اسی کے سننے والے کو "بھاگوان" کہتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ "اندر کی آواز یا ندا" اس کو ہر وقت باریاب ہونے کے لئے بزبان عراقی یوں اجازت دیتی ہے ؎

در دیر می زدم من زدروں ندا برآمد　　که درآ درآ عراقی که ز خاصگانِ مائی

ترجمہ:۔ (دیر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے (فوراً) آواز آئی کہ اے عراقی! آجا، آجا تو ہمارے خاص لوگوں میں ہے) ورنہ "دیر" تو علیحدہ چیز ہے "حرم" میں بھی اس کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا ہے جس نے باہر رہ کر غفلت اور بھول میں زندگی گزار دی ہو۔ چنانچہ وہی شاعر اس "بھول" کی تصویر کو یوں پیش کر کے اپنی "محرومی" کا اعلان کرتا ہے ؎ (عراقی)

بطوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند　　کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

ترجمہ :۔ (کعبے کے طواف کے لئے جو میں گیا تو انھوں نے مجھے حرم میں بھی داخل نہیں ہونے دیا (اور یہ کہا) کہ بارِ تو نے کیا کیا جو اب اندر آرہا ہے) غفلت کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی ہے، ناکامیابی کی اس سے بڑھ کر دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔ دنیا دار العمل ہے جب یہیں عمل نہ ہوا تو پھر آخرت میں جا کر جہاں عمل کا سوال ہی نہیں ہے کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (جو میرے ذکر سے پھرا اس کی زندگی مصیبت ہے) یہی ذکر "ان حد" کا باجا ہے جس کو صوفیاء کرام نے سن کر دوسروں کو کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ حضرت شاہ عبد الصمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں ؎

اس ان حد میں لاکھوں باجے اس کو کوئی نہ سنتا ہے

اس ان حد کو جو کوئی سن لے رعیت سے شاہ بنتا ہے

خلاصہ درس معرفت اور راز حقیقت | بند ۲۸ "ی"۔

ی، یاری ہر سے ہی کرنا　　یہی اچھر ہردے بیچ دھرنا

بنت بنت بن جئی ہے ایسا　　کوئی دن منصور تھا جیسا

وچھن اچھر ایسے کہے ہیں سادھن کے ہتھیار

برہا کے میدان میں پت کے راکھن ہار

حضرت شاہ وچھن صاحبؒ۔ اس آخری بند میں اپنی تلقین کا صرف دو لفظوں میں خلاصہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اللہ سے دوستی" کا بس سبق یاد کر لو۔ اسی سبق کو رٹتے رٹتے تم بھی اسی مرتبہ کو حاصل کر لو گے جو منصورؒ کو حاصل ہوا تھا۔ اور جب اس مرتبہ کو حاصل کر چکو گے تو مفارقت اور جدائی کے جملہ خطرات سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ کیونکہ یہ حروف جو وچھن نے لکھے ہیں یہ اللہ کے سپاہیوں کے وہ ہتھیار ہیں جو ہمیشہ ان کی محافظت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مفارقت کے میدان میں یہی اُن کی آبرو بچاتے ہیں۔ یعنی بحالتِ مفارقت بھی عملاً جدائی نہیں ہوتی ہے۔ انھیں حروف کا دوسرا نام محبت ہے اور یہی اصل چیز ہے۔ یہی وہ آخری درجہ ہے جس کو حقیقت کہتے ہیں کیونکہ "حقیقت" کی تعریف حضرت غوث اعظم پیر دستگیر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمائی ہے :۔

وکل طور بین الجبروت واللاهوت فهي حقيقة

ترجمہ :۔ (جبروت اور لاہوت کے درمیان جو راستہ ہے وہی حقیقت ہے)

یہ راستہ انھیں حروف سے ملتا ہے۔ جن کی طرف حضرت شاہ صاحب قبلہ نے رہبری فرمائی ہے۔

اسی کی تلقین و تبلیغ مزید وضاحت کے ساتھ نظیری اس طرح کرتا ہے :-

کتاب ہفت ملت گر بخواند آدمی علّامہ است ‌ ‌ ‌ نخواند تا از جزوِ آشنائی داستانے را

ترجمہ :- (اگر انسان ساتوں مذہبوں کی کتابوں کو پڑھ لے پھر بھی جب تک کہ وہ محبت کی داستان کو نہیں پڑھے گا وہ صحیح آدمی نہیں ہوگا) فی الحقیقت اصل علم محبت ہے ورنہ اگر محبت نہ ہو تو وہ علم جہل سے بدتر ہے -

چنانچہ ایک سادھو اس کو یوں بیان کرتا ہے :-

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

ترجمہ :- (کتابیں پڑھ پڑھ کر ایک زمانہ مرگیا لیکن کوئی عالم نہ ہوا۔ البتہ جس نے ڈھائی حروف "پریم" (عشق) کے پڑھ لئے وہ عالم ہوگیا۔)

حضرت شاہ صاحب نے اپنے مسدّس کو معرفت سے شروع کرکے معرفت ہی پر ختم فرمایا اور اپنی تمام تلقین و ہدایت میں محبت ہی پر زور دیا جو شریعت سے طریقت۔ طریقت سے معرفت اور معرفت سے حقیقت تک پہنچا کر حیاتِ انسانی کی تکمیل کرتی ہے۔

ابرار حسین

نوٹ :- (چونکہ پورا مسدّس معہ شرح زیرِ طبع ہے، اسلئے تھوڑے سے بند معہ مقدمہ جو بشکل مقالہ "مجلس مصنفین" میں پڑھے گئے وہ ہدیۂ ناظرین کئے گئے۔ مدیر)

رُباعیاتِ عرشؔ فاروقی بیکلومی مرحوم

جب ماہِ منیر پر گھٹا چھاتی ہے ‌ ‌ ‌ بیتابیِ شوق پاؤں پھیلاتی ہے
ہرچند بھلا چکا ہوں تجھ کو دل سے ‌ ‌ ‌ پھر بھی کبھی تیری یاد آجاتی ہے

ناسازِ زمانے کی ہوا ہے مجھ کو ‌ ‌ ‌ غیروں کا تو کیا اپنا گلہ ہے مجھ کو
تو نار کو گلزار بنا دیتا ہے ‌ ‌ ‌ مولا تیرا ہی آسرا ہے مجھ کو

مرحوم کیفی حیدرآباد میں

(از جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدرآباد دکن)

سرزمین دکن نے اردو زبان کے ایسے ایسے باکمال شعرا پیدا کئے ہیں جن پر خود اردو زبان کو فخر اور ناز ہو سکتا ہے، ان کا کلام اپنے محاسن اور خوبیوں کے لحاظ سے بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ شمالی ہند کے اربابِ علم و فضل ان کی شاعری سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، ایک عرصہ دراز تک اہل دکن نے اپنے جواہر پاروں کو پیش کرنے میں غفلت برتی ہے، مگر اب گزشتہ پچیس[۲۵] تیس[۳۰] سال سے حیدرآباد کے بعض باہمت اصحاب نے اردو کی خدمت گزاری کا جو بیڑا اٹھایا ہے اس کی وجہ سے اب دنیائے اردو دکن کے اردو کارناموں سے بہت کچھ واقف ہو چکی ہے۔

حیدرآباد کے ممتاز شعرا جو گزشتہ نصف صدی میں اپنے کلام معجز بیان کے باعث شہرت رکھتے ہیں ان میں سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہے، ان کو دکن کا حالی کہا جائے تو بیجا نہیں ہے؛ کیونکہ انھوں نے ہی دکن میں پہلے پہل جدید شاعری کی بنیاد رکھی اور قومی نظموں کی بنا ڈالی ہے۔

مختصر حالاتِ زندگی

سید رضی الدین حسن متخلص بہ کیفی کے والد سید نظام الدین حسن طبقہ مشائخین سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کا خاندان جنیر (متصل پونہ) کا متوطن تھا، جہاں آپ کے بزرگوں کی درگاہ موجود ہے۔

کیفی کی پیدائش حیدرآباد کے محلہ مغل پورہ میں سنہ ۱۲۹۷ھ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی اس کے بعد مولوی عبد الجلیل نعمانی صدر مدرس مدرسہ آصفیہ کے شاگرد بنے، پھر حیدرآباد کے مشہور مدرسہ دار العلوم میں شریک ہوئے، اس زمانہ میں دار العلوم

کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے تھا، اگرچہ کیفی مرحوم نے صرف منشی میں کامیابی حاصل کی مگر خانگی طور پر انھوں نے مولانا الٰہی بخش، مولانا سید نادرالدین، مولانا حبیب ابوبکر بن شہاب اور مولوی عبدالقدیر، مولوی جمال الدین نوری مرحوم سے فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم پائی، اور اپنے وسیع مطالعہ کے باعث بہت اچھی قابلیت پیدا کرلی تھی، منشی فاضل کے طلبہ کو خانگی طور پر مفت درس دیتے تھے۔

کیفی مرحوم کے والد سرکاری ملازمت میں منسلک تھے، اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا اکلوتا فرزند کیفی بھی اسی زمرہ میں شریک ہو جائے، چنانچہ انھوں نے اپنے فرزند کو سررشتہ فوج میں جہاں وہ خود مامور تھے ملازم کرادیا، ملازمت کیفی مرحوم کی آزادمنش طبیعت کے خلاف تھی، کچھ عرصہ کے بعد وہ اس خدمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے بعد سررشتہ تعلیمات، پھر پولیس میں کچھ عرصہ تک کارگزار رہے، مگر کہیں بھی مستقل طور پر کام نہیں کیا، آخر زمانہ میں جامعۂ عثمانیہ کے تحت دارالترجمہ میں مامور ہو گئے تھے، دو ایک سال کام کیا تھا کہ پیغامِ اجل نے ہمیشہ کیلئے ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔

رجب ۱۳۳۸ھ کو اجمیر میں جہاں وہ زیارت کے لئے گئے ہوئے تھے انتقال فرمایا، اس زمانہ میں کیفی کے والد بقید حیات تھے، ایک دختر اور ایک فرزند مرحوم کے یادگار ہیں، دونوں صاحب اولاد ہیں۔

کیفی مرحوم ہمیشہ آزادمنش رہے، جوانی میں رندی بھی کی، وہ نہایت خوش مزاج، بذلہ سنج اور ظریف تھے، طبیعت میں سادگی، منکسر المزاجی اور تواضع تھی، ہمیشہ زندہ دل رہے، خوش رہو، ہنسو، بولو، شاد رہو پر ان کا عمل تھا، حسن پرستی اور عاشقانہ طبیعت رکھتے تھے۔ اپنی حالت کا نقشہ ایک شعر میں خوب موزوں کیا ہے ؎

حضرتِ کیفی سے مل کر دل ہمارا خوش ہوا
عاشقانہ ہے طبیعت شکل درویشانہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ کیفی ایک فقیر تھے، اور فقیری کو پسند کرتے تھے، ان کی اہلیہ ایک بڑے جاگیردار خاندان سے تھیں، مگر ان کو اُس دولت سے کچھ سروکار نہیں تھا، وہ ہروقت دوستوں شاگردوں میں گھرے رہتے اور ان کو کھلا پلا کر خوش ہوتے تھے، کیفی حضرت سید عمر صاحب کے مُرید ہو گئے تھے، اور اس کے بعد ان پر مذہبی رنگ غالب آگیا، عمر صاحب نے اپنی خلافت

بھی دی تھی، اس طرح اگرچہ کیفی مذہبی آدمی تھے، لیکن اس کے باوجود وہ ضروریاتِ زمانہ سے باخبر اور روشن خیال تھے، ملک اور قوم کی اصلاح اور ترقی کا ان کو بڑا خیال تھا، خدمتِ خلق میں وہ مصروف رہے، قوم کے جمود اور پستی کا ان کو نہایت رنج تھا، دردِ قومی سے ان کا دل لبریز تھا، ان کی زندگی کے آخری چودہ سال زیادہ تر قومی نظموں کے موزوں کرنے میں بسر ہوئے، حیدرآباد کا کوئی علمی اور معاشرتی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں کیفی شریک ہو کر اپنی روح پرور نظم سنا کر مجمع کو متاثر نہ کرتے ہوں۔

مرحوم کیفی کو شاعری کے ساتھ نثر نگاری سے بھی دلچسپی تھی، ان کی نثر بھی انشاء پردازی کا عمدہ نمونہ ہے، انھوں نے شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مدیری کے فرائض بھی انجام دئے ہیں، رسالہ صحیفہ پہلے پہل ان ہی کی اڈیٹری میں شائع ہونے لگا تھا،

کیفی اپنی شاعری، نثر نگاری اور مدیری حیثیت سے علم کی خدمت گزاری میں مصروف رہے، وہ اپنے زمانہ میں نہ صرف علمی اور معاشرتی انجمنوں کے جلسوں میں پوری طرح حصہ لے کر عام جلسوں میں نظمیں سنا کر جوش پیدا کرتے تھے، بلکہ انتظامی جلسوں میں شریک ہو کر ارکانِ انجمن کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان کے علمی خدمات ہر آئینہ قابلِ ستایش ہیں، کیفی ایک آرٹسٹ اور حسن کار تھے، ان کی پوری زندگی کائنات کی صوری حسن اور معنوی روحانیت کو سمجھنے میں بسر ہوئی۔

کیفی کی شاعری

حضرت کیفی کو بچپن سے شعرگوئی کا ذوق تھا، وہ فطری شاعر تھے، طالب العلمی کے زمانہ میں مولوی عبدالجلیل نعمانی کو اپنا کلام بتاتے رہے: اس زمانہ میں ان کا تخلص رضی تھا، اس کے بعد وہ حضرت نیض کے شاگرد رشید حفیظ الدین یاس سے اصلاح لینے لگے اور اپنا تخلص زخمی قرار دیا، ان کے بعد میکش کے شاگرد بنے، میکش دراصل ایک برہمن تھے، کسی باخدا فقیر کی تلاش میں حیدرآباد آئے، یہاں میر امداد علی علوی کے متعقد ہو گئے، مسلمان ہو کر ان سے بیعت کی اور شمس الحق کے نام سے مشہور ہوئے، میکش کی شاگردی کے زمانہ میں کیفی کا تخلص "ملکی" تھا۔ نعمانی، یاس، میکش کے بعد کیفی داغ کے شاگرد بنے، جب تک حضرت داغ زندہ رہے ان ہی سے تعلق رہا۔ اس کے بعد تو وہ خود استاد ہو گئے تھے، کیفی کو داغ سے بڑی محبت ہو گئی تھی، دن رات ان کے یہاں ہی رہا کرتے تھے، اور خود داغ کو اپنے شاگرد سے اس درجہ خلوص ہو گیا تھا کہ وہ ان کو اپنے خاندان کا فرد سمجھنے لگے تھے۔

حضرت داغ کے انتقال کے بعد کیفی اپنے زمانہ کے ایک مشہور شاعر بن گئے تھے، انھوں نے استادِ سخن

کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ صدہا اشخاص نے ان سے تلمذ کا شرف حاصل کیا؟ صفی آپ کے جانشین خیال کئے جاتے ہیں۔

بعض اصحاب نے کیفی کی شاعری کو چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے، پہلا دور ابتدا شاعری سے ۱۳۱۱ھ تک قرار دیا ہے، اِس زمانہ میں اُنھوں نے یکے بعد دیگرے رمضی اور زخمی تخلص سے شاعری کی ہے، دوسرا دور میکش کی شاگردی سے شروع کیا گیا ہے، تیسرا دور حضرت داغ کی شاگردی سے شمار کرتے ہیں، اور چوتھے دور کو کیفی کی وفات سے چودہ[۱۴] سال قبل یعنی ۱۳۲۴ھ سے مقرر کیا گیا ہے، اسی زمانہ سے وہ قومی شاعر کی حیثیت میں جلوہ گر ہو چکے تھے،

ہمارے خیال میں کیفی کی شاعری کے تین[۳] دور قرار دئے جا سکتے ہیں، پہلے دور میں ان کی شاعری کی ابتدا ہوکر اس کے مدارج ابتدائی طے ہونے لگے، اُس زمانہ میں اُنھوں ذٰ نعمانی، یاس، اور میکش سے فیض پایا۔ دوسرا دور میکش کی وفات کے بعد حضرت داغ کی شاگردی سے شروع ہوتا ہے، اسی وقت سے اُن کی فطرت کے اصلی جوہر نمایاں ہونے لگے، داغ کی صحبت نے اُن کی شاعری کو جلا دیدی۔ اور ان کے طبعی رجحانات پختہ ہوگئے، ان کی فطری آزاد نفسی، استغنا، خوش طبعی اور ظرافت ان کے کلام میں جھلکنے لگی، داغ کی شاگردی کی وجہ سے زبان کی لطافتیں اور اسلوب، بیان کی رعنائیاں جلوہ گر ہونے لگیں۔ کیفی کی شاعری کا تیسرا دور حضرت داغ کے انتقال کے بعد سے شمار کرنا چاہئے، جبکہ وہ خود اُستاد ہوگئے تھے: اور غزلوں کے ساتھ نظمیں موزوں کرتے رہے، اس زمانہ میں کیفی کی انفرادی زندگی ختم ہوکر قومی زندگی آغاز ہوئی۔

کیفی کی غزل گوئی

کیفی کی غزلیں خود ان کے زمانہ میں خاصی مقبول ہو چکی تھیں، ہر مشہور مشاعرہ میں جس میں وہ شریک ہوتے ان کا کلام اشتیاق سے سنا جاتا۔ اور کیفی سے مشاعرہ کی رونق سمجھی جاتی۔ طرب و نشاط کی محفلوں اور مجلس سماع میں ان کی غزلیں محفل کو گرمانے میں بہت کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

کیفی کی غزلیں اپنے ماحول کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں امیر اور داغ کی وجہ سے ساتھ ساتھ دونوں کی پیروی کی جاتی تھی، امیر اور داغ کے شاگرد اپنے اپنے اُستاد کے رنگ میں غزل گوئی میں مصروف تھے، داغ کا طوطی (مرحوم اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں کی اُستادی کی وجہ سے) بول رہا تھا۔

کیفی کے کلام میں اگر ایک طرف داغ کا رنگ نظر آتا ہے تو وہ دوسری طرف اپنے اُستاد

بالکل علیحدہ نظر آتے ہیں، جن اُمور میں کیفی اپنے اُستاد سے مشابہ ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) زبان اور اسلوب بیان، داغ کی طرح کیفی نے زبان کا خاص خیال رکھا ہے، وہ داغ کی طرح دہلی کی زبان میں غزل گوئی کرتے تھے ۔

(۲) وہ اپنے استاد کی طرح محاورہ اور روزمرہ کا برمحل استعمال کرتے تھے، بعض مرتبہ دکن کے مخصوص الفاظ اور ضرب المثلیں بھی استعمال کی ہیں۔

(۳) تیسری چیز کلام کی شوخی، رنگینی اور بانکپن ہے، داغ کی طرح کیفی کے کلام میں رنگینی اور شوخی پائی جاتی ہے، کیفی کے کلام میں بالکل داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔

(۴) داغ کی پیروی میں کیفی معاملہ بندی بھی کرتے تھے، داغ کی یہ خصوصیت ان کو دوسرے شعرا سے ممیز کرتی ہے، کیفی بھی اپنے استاد کی طرح اس پر عمل کرتے تھے۔

جن امور میں کیفی داغ سے علیحدہ نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) کیفی داغ کے خلاف سخت سے سخت زمین اختیار کرتے تھے، اور اس میں زیادہ سے زیادہ شعر موزوں کرتے تھے، اس خصوص میں کیفی اپنے زمانہ اور ماحول سے مجبور رہے تھے، مشکل سے مشکل قافیئے اختیار کرنے میں کیفی ذوق مرحوم کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) کیفی کی دوسری خصوصیت جس میں وہ اپنے اُستاد سے علیحدہ نظر آتے ہیں وہ ان کی علمیت ہے، ان کی علمی قابلیت اور لیاقت ان کی شاعری سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت جو داغ سے بالکل جداگانہ ہے وہ کیفی کے کلام کا سوز و گداز اور اثر ہے، اس کی وجہ سے کیفی زبان اُردو کے ایک زبردست شاعر قرار دئے جا سکتے ہیں۔

کیفی کی غزلیں ان کی زندگی اور کردار کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں، اس قسم کی ہم آہنگی اور مطابقت بہت کم شعرا میں پائی جاتی ہے، کیفی کے کلام کی تین ۳ بڑی خصوصیتیں ہیں۔

(۱) اوّل شوخی، بذلہ سنجی، اور لطف زبان، ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ کیفی ایک آزاد منش، لطیفہ گو، بذلہ سنج شاعر تھے، ان کی شاعری میں یہی رنگ نظر آتا ہے، بطور نمونہ ملاحظہ ہو :-

کیفی شراب خانہ ہی نکلا نصیب سے　　رستہ سمجھ کے آئے تھے ہم خانقاہ کا

کل کا کل پھر دیکھ لیں گے ہو نہ ہو وعدہ وفا　　آج تو لطف تقاضا ہی بسر ہی ہو گیا

کیا خفا ہوتے ہو مجھ مست پہ اے حضرت شیخ	میں گنہگار خدا کا ہوں تمہارا تو نہیں

میں ہوں کہیں، جہان کہیں، ہے نظر کہیں	کچھ چیز رکھ کے بھول گیا ہوں مگر کہیں

خدا کی یہ خدائی ہے حسیں اکثر نکلتے ہیں	مگر کیفی کہیں ایسے پری پیکر نکلتے ہیں

دل میں جو شکل تھی زاہد وہ بتادی تجھکو	یہ نہ سمجھا تھا بدل جائیگی نیت تیری

کیفی تم، اور اتنی خوشامد پھر اس کی ہائے	اللہ! اس قدر بھی نہ مجبور ہو کوئی

تم بھی تو روز دیکھتے رہتے ہو آئینہ	سچ بولو کیا پسند یہ صورت مجھی کو ہے

کیسی خلش یہ بعد ملاقات رہ گئی	کیا چوک مجھسے ہو گئی کیا بات رہ گئی

تم غیر کو دیکھو جو محبت کی نظر سے	تڑپے کہ نہ تڑپے کوئی ترسے کہ نہ ترسے

---

(۲) دوسری خصوصیت رندی اور عاشق مزاجی کیف اور مستی ہے، یہی وصف ان کی زندگی کی ایک خصوصیت رہی، وہ جوانی میں رند مشرب رہے، اور مریدی اور خلافت کے بعد عشق حقیقی کے باعث حسن پرست ہو گئے تھے، ذیل کے اشعار اس خصوصیت کے آئینہ دار ہیں:۔

دل شکستہ برے کر بیٹھے ہیں نسبت پیدا	ٹوٹ پڑتے ہیں یہ ٹوٹے ہوئے پیمانوں پر

گھٹا چھائی فلک پر دم گھٹا جاتا ہے کیفی کا	سلامت میکدہ تیرا رہے ساقی قیامت تک

چھوڑ کر تجھ کو کہاں جائے یہ کیفی ساقی	تیری بھٹی کے سوا کوئی ہمارا تو نہیں

تیرے میخانہ میں سب مست ہیں اے پیرِ مغاں — کوئی ہشیار نہیں کوئی خبردار نہیں

کیفی کی میکدہ میں ہے کیوں اتنی آبرو — یہ آدمی تو ایسا کوئی معتبر نہیں

تم اگر آفتابِ حشر نہیں — نیرِ محشرِ خیال تو ہو

پارسا بن بیٹھنے سے کیا ملا کیفی تجھے — ہائے وہ رسوائیاں وہ ذلت و خواری تری

پڑے رہتے تھے پی کر مست ہم تو ہوں یہ ساقی کے — کہاں کی عید کیسی عید کس کی عید ہوتی تھی

شرابِ عشق سے کرنے کو تھا توبہ کہ یاد آیا — مرے آڑے یہ نیکی کب کی لے پروردگار آئی

---

(۳) ان کے کلام کی تیسری خصوصیت تصوف اور عرفاں ہے، وہ حضرت سید عمر صاحب کے مرید اور پھر خلیفہ ہو کر صوفی بن گئے تھے، ان کے کلام میں تصوف اور حقیقت نگاری کی جھلک پوری طرح نظر آتی ہے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے:-

اپنے یوسف کے سوا آنکھ کسی پر نہ پڑی — چشم بیدار کو میں خواب زلیخا سمجھا

اب چشم امتیاز کی منت اٹھائے کون — پنہاں ہوا تو کیا کوئی ظاہر ہوا تو کیا

در دو بن کر بھی قدم اٹھ نہیں سکتے افسوس — تھک کے کچھ بیٹھ گیا ہوں سر منزل ایسا

وہی نظر میں ہے لیکن نظر نہیں آتا — سمجھ رہا ہوں سمجھ میں مگر نہیں آتا

جو تجھ کو جان دے ہم جانتے ہیں اس کو جاں اپنی — جو تجھ کو دل سے چاہے اس کو اپنا دل سمجھتے ہیں
چمن کا پھول، مے خانہ کا شیشہ، چرخ کا تارا — کوئی ٹوٹی ہوئی شے ہو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

نہ میں مقدور والا ہوں، نہ میں مجبور ہوں کیفی   خدا رکھے مجھے، میں بھی خدا کی ایک قدرت ہوں

میری طرح نہ عاشق مجبور ہو کوئی   نزدیک اس کے رہ کے نہ یوں دور ہو کوئی

میں اپنے آپ پر ہرگز تصرف کر نہیں سکتا   کسی کے سامنے رکھی ہوئی گویا امانت ہوں

خیال میں ہے مثال اور خواب میں ہے خیال   عجیب رنگ بدلتی ہے تیری صورت بھی
پتہ ترا نہ ملے جب بسیطِ عالم میں   گلہ کرے نہ کرے پائے جستجو تم سے

اس نمونہ کے بعد ہم کچھ اور غزلیں پیش کرتے ہیں تاکہ کیفی کی غزل نگاری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکے:۔

اب بھی شیدا ہے زمانے کا زمانہ تیرا   ہائے دن بن وہ تیرے اُف وہ زمانہ تیرا
صدا لڑکپن کی گئی اب ہے جوانی کا غرور   نہ رہا وہ نہ رہے گا یہ زمانہ تیرا
یہ شبِ وصل ہے اے شمع تو ہو جا خاموش   کہہ نہ دے سوزِ جگر ان سے زمانہ تیرا
میں ہوں دیوانہ یہ ویرانہ ہے تو کیوں آیا   کیا یہاں دفن ہے اے شیخ خزانہ تیرا

کس سے شکوہ ہو شکایت ہو یہ کس سے کیفی
کوئی بے گانہ یہاں ہے نہ یگانہ تیرا

وہاں تو بزم میں دشمن چلے آتے ہیں دشمن پر   یہاں فریاد پر فریاد ہے شیون ہے شیون پر
حسینوں کے جوش ہیں ثابت گریباں رہ نہیں سکتا   مرا احسان رہتا ہے ہمیشہ میری گردن پر
تمنّا اور پھر کیسی تمنا ان کے آنے کی   بر آئے گی مگر کب؟ بعد میرے میرے مدفن پر
دلِ بیتاب کو تسکین دیتے جاؤ رہ رہ کر   کہیں سبقت نہ لے جائے تمہارے چلبلے پن پر

وہی کیفی وہی رستہ ہے آندھی ہو کہ بارش ہو
چلے آتے ہیں حضرت میکدے سے ایک ہی دُھن پر

گنہ گار اور پھر مجھ سا خدائی میں نہیں کوئی   وہ عاصی ہوں کہ مجھ پر مغفرت کو ناز ہوتا ہے
عجب کچھ گو مگو ہے داستانِ عشق بھی یارب   نہ مخفی بات رہتی ہے نہ افشا راز ہوتا ہے

عزلت گزین کوئے ملامت کو ہر طرح — آسایشِ وطن بھی ہے لطفِ سفر بھی ہے

بے نیازانہ ادائیں تری اللہ اللہ — کوئی ایسا نہ ہوا، کوئی نہ ایسا ہوگا
دل نہ دینا تھا دیا، پیار نہ کرنا تھا کیا — جو نہ ہونا تھا ہوا، اور پھر اب کیا ہوگا
گرم آغوش رہے گا مرا ہر پہلو سے — تو نہ ہوگا، تو ترا داغِ تمنا ہوگا
آئینہ سے نہ ملی داد تو منہ پھیر لیا — دیکھتا ہے کہ کوئی دیکھنے والا ہوگا

اب تو یہ مسئلہ طے پا یا ہے معشوقوں میں
جس پہ کیفی کا دل آئے وہی اچھا ہوگا

خُم، سبو، ساغر، صراحی، جام، پیمانہ مرا — میرے ساقی جب مرا تو ہے تو مے خانہ مرا
بے نیازانہ طبیعت دل ہے شاہانہ مرا — بھیس تو یوں دیکھنے کو ہے فقیرانہ مرا
ساز و ساماں ہے مری یہ، بے سر و سامانیاں — باغ جنت سے بھی اچھا ہے یہ ویرانہ مرا

شعر کیا، نعرہ بھی سنکر کہتے ہیں کیفی ہے یہ
چھپ نہیں سکتا کہیں اندازِ مستانہ مرا

تھم تھم کے ٹپکتا ہے مرے دیدۂ تر سے — آتا ہے لہو دل میں جو رس رس کے جگر سے
تم غیر کو دیکھو جو محبت کی نظر سے — تڑپے کہ نہ تڑپے کوئی ترسے کہ نہ ترسے

کیفی کی نظمیں

جیسا کہ گزشتہ مضمون میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۳۲۴ھ کے بعد کیفی کی نظم نگاری کا سلسلہ شروع ہوا، ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حیدرآباد کے شعری مذاق کی اصلاح کی، جامعہ عثمانیہ کے قائم ہونے کے کئی سال پہلے انھوں نے جدید شاعری کی بنا ڈالی تھی، اگر شمالی ہند میں مولانا آزاد اور حالی جدید شاعری کے علم بردار ہیں تو وہی کام دکن میں کیفی نے انجام دیا ہے، کیفی کے سر دکن کی جدید شاعری کا سہرا باندھا جا سکتا ہے؛ جس زمانہ میں شمالی ہند میں حالی اور آزاد کی جد و جہد سے جدید شاعری کا آغاز ہو رہا تھا، اُس زمانہ میں دکن میں امیر اور داغ کی وجہ سے ان کی پیروی کی جا رہی تھی، اور اہل دکن ہنوز حالی اور آزاد کی شاعری سے متاثر نہیں ہوئے تھے، امیر اور داغ کی اُس وقت تک پیروی کی جاتی رہی جب تک کہ کیفی نے نظمیں کہہ کر جدید شاعری کی بنا نہیں ڈالی، کیفی کی نظموں نے حیدرآباد کی علمی فضا اور علمی سوسائٹی

پر بہت بڑا اثر ڈالا، ان کی ابتدا کے بعد ہی لمعہ، مست، علی شیر، رعد، ذہین وغیرہ بیسیوں شعراء نے کیفی کی پیروی میں جدید شاعری کا آغاز کیا اور نظمیں کہی جانے لگیں، اس طرح دکن میں جدید شاعری پروان چڑھی۔

اگرچہ کیفی کی نظمیں متفرق طور پر شائع ہوئی ہیں، مگر اب تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ ان کے نظموں کی تعداد تقریباً ایک سو ہے، بعض نظمیں نہایت طویل ہیں، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ حیدرآباد کا شاید ہی کوئی علمی اور معاشرتی جلسہ ایسا ہوتا ہوگا جس میں کیفی نے اپنی نظم سنا کر خراج تحسین حاصل نہ کیا ہو،

ہمارے کانوں میں ہنوز وہ نغمہ سنجی گونج رہی ہے جو مختلف قومی جلسوں میں کیفی کے خاص انداز میں ہم سنا کرتے تھے، اور وہ جوش اور سماں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا جو مرحوم کی ولولہ انگیز حیات بخش اور روح پرور نظموں کے سننے سے پیدا ہو جاتا تھا۔

کیفی کی نظموں میں حالی اور شبلی دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ داغ کی شاگردی کی وجہ سے زبان کا حسن بھی پیدا ہو گیا ہے، کیفی کی نظموں کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں، اوّل تو یہ کہ ان کو اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے ملک کی معاشرت اور تہذیب کی اصلاح پیش نظر تھی، ان کی نظموں کا بڑا حصہ اصلاح اور ترقی سے متعلق ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ واقعات کو نہایت صفائی اور صداقت سے بیان کر دیتے تھے، واقعہ نگاری میں ان کو کمال حاصل تھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ان کی نظموں میں مولانا حالی کا رنگ موجود ہے، ان کی اس قسم کی نظمیں کئی ہیں جن میں سے جاہلیت کی انسانیت، سچا دوست، شکر نعمت، چٹکلہ قرہ قابل تذکرہ ہیں۔

”جاہلیت کی انسانیت“ امراء القیس اور سموائیل کے مشہور قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے، اور سموائیل کی وفاداری کو کیا خوب ادا کیا ہے ؎

ایک نوخاستہ فرزند سموائیل پئے صید — اتفاقاً جو کہیں گھر سے گیا تھا باہر
گھر کو واپس جو ہوا دشت سے وہ صید افگن — دستِ صیاد اجل سایہ فگن تھا سر پر
یعنی اس بچے کو حارث نے گرفتار کیا — اور سموائیل سے کہا غیظ و غضب میں آ کر
دیکھ! ہے خیر اسی میں کہ وہ دیدے ہتھیار — ورنہ یہ تیغ ہے، یہ ہے ترے فرزند کا سر

اس جواں مرد نے خاطر میں نہ لا کر اس کو　　غیر کی ملک کو فرزند سے سمجھا بڑھ کر
باپ کے سامنے بیٹے کو تہِ تیغ کیا　　پھر بھی ناکام پھرا گھر کو وہ ظالم کا پسر

یہ طویل نظم ہے، جس کا صرف آخری حصہ پیش کیا گیا ہے، مولانا حالی کے قطعے "رعیت پر نااہل کو مسلط کرنا" کے مقابل کیفی کی ذیل کی نظم ملاحظہ ہو ؎

ہارون نے ایک بار دیا حکم کہ کل صبح　　حاضر مرے دربار میں ہوں چار اطبّا
ہوں ہندی و رومی و عراقی و سوادی　　اور ان میں کا ہر ایک فنِ طب میں ہو یکتا
جب جمع ہوئے سارے اطبّا سرِ دربار　　ہارون نے ہر ایک سے یہ مسئلہ پوچھا
ایسی بھی دوا ہے؟ کہ نہ ہو کچھ ضرر اس میں　　ہندی نے کہا" ہاں وہ دوائی ہے"ہلیلہ"
رومی نے کہا پانی اگر گرم کیا جائے　　پھر اس میں مضرت نہیں رہتی کوئی اصلا
بعد اس کے عراقی نے کہا تخم سپنداں　　ایسی ہے دوا جس میں نہیں نام ضرر کا
تھا تجربہ کار اور مسن ان میں سوادی　　ہارون سے کی عرض میں قائل نہیں ان کا
معدے کے لئے تینوں دوائیں یہ مضر ہیں　　ہیچ اس سے، رقیق اور ضعیف ان سی ہو معدہ
ان سب نے سوادی سے کہا آپ تو کہئے　　ہے آپ کی دانست میں پھر ایسی دوا کیا؟
کی عرض سوادی نے مری رائے تو یہ ہے　　کچھ کھائے نہ انسان ہو جب تک نہ وہ بھوکا
پھر کھانے سے ہاتھ اپنا وہ ایسے میں اٹھائے　　باقی رہے دو چار نوالوں کا تقاضا
کی سارے اطبّا نے اسی قول کی تصدیق　　پابند جو اس پر ہے وہی شخص ہے دانا

شبلی کی طرز کے لئے ہم "وفائے عرب" کیفی کی نظموں سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ کیفی کو شبلی کی طرح ماحول نصیب نہیں تھا اس لئے شبلی کے کلام کا جوش کیفی کے یہاں نہیں ہے، "وفائے عرب" طویل نظم ہے، ایک دو بند یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

پڑے تھے جو نعمان کے دل میں چھالے　　اڑے تھے جو سینے میں جانکاہ نالے
بڑے شد و مد سے سر اپنے نکالے　　ہوئے ظاہر اس طرح صورت بدل کر
دیا حکم نعمان منذر نے فوراً
عمر ابن مسعود و خالد کا مدفن

بنے خوش نما خوش فضا رشک گلشن
کلس قبۂ و گنبد و قبر و منظر

عمارت بنی شان دار اور گنبد لگائے گئے قیمتی سنگ مرقد
مٹا اس کے دل سے نہ یہ رنج بے حد۔ تو کی اس نے یہ رسم انوکھی مقرر

کہ اس کی رہے یادگار ایک باقی
جو ظاہر کرے شان شادی و غم کی
برس دن میں دو بار ہو بات ایسی
بھلائے نہ جس کو کوئی زندگی بھر

"تاثیر محبت" کے نام سے کیفی نے ایک انگریزی نظم کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، یہ نظم انگلستان کے نامور شاعر لارڈ ٹینی سن کی نظم "لیڈی کلیر" کا ترجمہ ہے، قافیہ کی سنگلاخی سے کہیں سلاست و روانیِ کلام میں فرق نہیں آیا، ایک ایک شعر پر مترجم شاعر کی کامیاب کوشش کی داد بے ساختہ دینی پڑتی ہے، پھر اس امر کا خیال رہے کیفی انگریزی سے ناواقف تھے، صرف ترجمہ سُنکر اس کو نظم کر دیا ہے، نظم طویل ہے، ہم اس کا صرف ایک حصہ پیش کرتے ہیں، لیڈی کلیر اپنے اصلی حال سے آگاہ ہونے پر جبکہ عقد کا صرف ایک دن باقی رہتا ہے وہ اپنی دایہ پر خفا ہوتی ہے اور اس کی سچائی یہاں معلوم ہوتی ہے، کہ وہ متعاقب شوہر بننے والے کو فوراً اس حال سے آگاہ کر دیتی ہے، تاکہ وہ اس دھوکہ میں نہ رہے کہ اصلی لیڈی کلیر یہی ہے:۔

اماں اگر یہ سچ ہے تو تم نے کیا وہ کام اس سے زیادہ اور نہ ہو گا کوئی گناہ
اک بہترین خلق شریف المزاج کو محروم اپنے حق سے رکھا تم نے دیر گاہ
دایہ تڑپ کے بولی مری جان میں فدا یہ راز فاش کرکے نہ کرنا مجھے تباہ
اس نے کہا کہ جھوٹ نہ مجھ سے بن آئیگی افشائے راز میں نہ کرو سعی انتباہ
رانیلڈ سے ضرور کہوں گی یہ سرگزشت دریافت ہو گی اس کی وفا کی بھی اس کو تاہ
دایہ ہزار پیچتی چلاتی رہ گئی لیڈی نے ایک بھی نہ سُنی اس کی آہ واہ
زیور تمام سر سے قدم تک اُتار کر جوڑے میں رکھ لیا فقط اک پھول کچھ گیاہ
پوشاک فاخرہ سے سبکدوش ہو گئی اک سیدھا سادا گون پہن کر وہ رشکِ ماہ
اس وضع سے مکان پر رانیلڈ کے گئی لینے کو آیا اس کے وہ بیرون خوابگاہ

جیساکہ بیان کیا گیا ہے کہ حیدرآباد کا کوئی قومی، علمی اور معاشرتی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں کیفی اپنی نغمہ سنجی سے جوش نہ پیدا کرتے ہوں۔ چنانچہ شکرِ نعمت، قرضۂ حسنہ، تعلیم نما، جامِ حیدری، ثمرہ، خدا حافظ، بادۂ بے غش، مغزِ سخن، رایتِ علم وغیرہ اس قسم کی نظمیں ہیں۔ "شکرِ نعمت" حجاز ریلوے کے خوشی کے جلسہ میں، "قرضۂ حسنہ" انجمن معین المسلمین کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھیں۔ "تعلیم نما" "جامِ حیدری" "بادۂ بے غش" "رایتِ علم" وغیرہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں سنائی گئی تھیں۔ "خدا حافظ" مولوی الٰہی بخش کے وداعی جلسہ میں، "ثمرہ" انجمن ثمرالادب کے سالانہ جلسہ میں، "مغزِ سخن" دارالعلوم کے ساٹھ سالہ جشن کے موقع پر لکھی گئی تھیں۔ ان سب کا نمونہ موجب طوالت ہے، ایک دو نظموں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

"تعلیم نما" اگرچہ تعلیم اور حصول علم کے متعلق لکھی گئی ہے، اس قسم کی نظمیں اردو میں بکثرت ہیں لیکن جو خاص کیفیت اس نظم میں ہے وہ ملاحظہ سے ظاہر ہو سکتی ہے ؎

پس از حمدِ خدائے پاک و نعتِ احمدِ مرسل
مسلمانو! بزرگو! بھائیو! سننا مری سننا

یہ میں کہتا نہیں تعلیم میں ہیں خوبیاں یہ یہ
میں یہ کہتا نہیں ہے بہتری تعلیم سے کیا کیا

میں یہ کہتا نہیں ہے لکھنے پڑھنے کی ضرورت کیوں
نہ یہ کہتا کہ ہے اندازِ تعلیمِ دکن کیسا

نہ میں قرآن سے ثابت کروں گا علم کی خوبی
نہ میں دوں گا حوالہ اب بخاری اور مسلم کا

نہ لاؤں گا دلیل ایسی میں اقوالِ ائمہ سے
نہ تاریخوں سے یہ ظاہر کروں گا علم ہے ایسا

نہ میں بغداد یونیورسٹی کا تذکرہ کرتا
نہ میں قصہ سناتا ہوں نظام الملک طوسی کا

نہ یہ کہتا گزشتہ دور میں تعلیم کیسی تھی
نہ یہ کہتا کہ چرچا علم کا اگلوں میں کیسا تھا

کہ پہلے تو نہیں ہے خود مجھی کو اتنی آگاہی
اگر ہو بھی تو ان باتوں سے اب اس وقت مطلب کیا

یہ باتیں سنتے سنتے بھر گئے کان اک زمانہ سے
ہزاروں ایسے لکچر ایسی اسپیچیں سنیں صدہا

اثر ایسی تقریروں میں ڈھونڈو تو نہ پاؤ گے
بجز دردا و دریغا ہائے حیف افسوس واویلا

تمھیں معلوم ہے دیتا ہے عزت کون انساں کو
غذا؟ کپڑا؟ حویلی؟ ہاتھی گھوڑا روپیہ پیسا

نہیں ہرگز نہیں انسان کی اس سے نہیں عزت
کہ ہے انسان کی عزت کا باعث شانِ استغنا

اگر تحصیل علمی سے غرض تحصیلداری ہو
تو سمجھو ایسے عالم کو ہوا تعلیم میں دھوکا

غرض تعلیم سے یہ ہے کہ اطمینانِ خاطر ہو
بھروسہ آپ اپنی ذات پر انسان کرے پیدا

وہی تعلیم ہے تعلیم انساں جس سے انساں ہو ‌ ‌ ‌ ‌ وگرنہ پیٹ بھرنے کے لئے جیتا ہے اک کتا

بس اب کیفیؔ بہت کچھ کہہ چکے آؤ ادھر آؤ

متی ماتلق من تھوی فدع الدنیا و اھملھا

انجمن ثمرۃ الادب، مدرسہ دار العلوم کی ایک یونین تھی۔ دجامعہ عثمانیہ کے قایم ہونے کے بعد کالج یونین میں ضم ہوگئی، راقم الحروف بھی اپنے زمانۂ تعلیم میں انجمن ثمرۃ الادب کا عرصہ تک سکرٹیری رہا ہے۔ انجمن کے ایک سالانہ جلسہ میں حضرت کیفیؔ نے "ثمرہ" کے نام سے ایک نظم سنائی تھی، ملاحظہ ہو کہ زمین کس قدر ناہموار اور دشوار گزار ہے، مگر کیفیؔ کا توسن طبع کس روانی و جولانی سے اس میدان کو طے کرتا ہے ؎

دار العلوم جس کی ہے باسٹھ برس کی عمر ‌ ‌ ‌ ‌ سیدھا سا ہو رہا ہے اب اس کا خمیدہ قد
چہرے پہ تازگی ہے تبسم لبوں پہ ہے ‌ ‌ ‌ ‌ منت پذیر شانہ و غازہ ہیں زلف و قد
پہنی ہے اس نے اب کے قبا اور رنگ کی ‌ ‌ ‌ ‌ وہ دلق کہنہ خرقۂ پارینہ کرکے رد
ہر شخص کو ہے اس کی ترقی کا اب خیال ‌ ‌ ‌ ‌ جس کو نہ ہو خیال یہ ہوگا وہ لاولد
امید ہے بہار کہ کچھ رنگ لائے گی ‌ ‌ ‌ ‌ بیلیں منڈھے چڑھیں گی کھلیں گے گل خرد
پھولے پھلے گی انجمن ثمرۃ الادب ‌ ‌ ‌ ‌ دریا نوال شاہ نے دی ہے اسے مدد

طویل نظم ہے، اس لئے اسی پر اکتفا کیا گیا، "خدا حافظ" یہ نظم حسن تخیل کا بہترین نمونہ ہے، یہ نظم مولوی الٰہی بخش مرحوم صدر دار العلوم کے وداعی جلسہ میں سنائی گئی تھی۔

یوں تو ہر گلزار میں آتی اور جاتی ہے بہار ‌ ‌ ‌ ‌ رنگ لاتی ہے نئے گل بھی کھلاتی ہے ہزار
جانے والی ہر بہار اپنا دلاتی ہے یقین ‌ ‌ ‌ ‌ ہر درخت باروراس کی ہے تازہ یادگار
ایک امید قوی ہے ایک ہے کامل یقین ‌ ‌ ‌ ‌ فرق ان دونوں میں ہے، فرق نہال و آشکار
آنے والے کی خوشی اور جانے والے کا ہے غم ‌ ‌ ‌ ‌ اس خوشی سے ہے مقدم ایسے غم کا اعتبار

.. ..

رخصت اے کہنہ بہار گلشن دار العلوم
ہاں خدا حافظ، خدا حافظ، خدا حافظ، بہار

"مغز سخن" کے نام دار العلوم کے ساٹھ سالہ جشن کے موقع پر کیفیؔ مرحوم نے ایک غزل

نظم جو (۱۶۰) شعر پر مشتمل تھی قلمبند فرمائی تھی، اس نظم میں دار العلوم کی ساٹھ سالہ تاریخ کا خلاصہ بیان کر دیا ہے، واقعہ نگاری کے لحاظ سے یہ نظم قابل قدر ہے۔ اس کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہم ہیں شاعر، شاعری بے سود ثابت ہو چکی — اس لئے اصناف شعری کا ہوا ہے سدباب
جو غزل گو ہیں، وہ شہدے ہیں قصائد گو ہیں بھاٹ — مرثیہ گو ہیں شکم پرور، رباعی گو خراب
شاعری کی علت غائی ہوئی تفریح طبع — اور اب تفریح کے ساماں ہیں بے حد و حساب
چھوڑ کر فٹ بال ٹینس کون سیکھے شاعری — پھر عروض و قافیہ پڑھ کر کریں کیوں دن خراب
سب پہ طرہ یہ کہ ٹھہری شاعری منحوس بھی — پھر تو اس کی چھاؤں سے بھی چاہئے ہو اجتناب

. . . .

یعنی ملک حیدرآباد دکن رشک عدن — داغ و حالی سے کئی اک ہیں یہاں سے فیضیاب
ہے قدامت سے دکن فیاضیوں میں مشتہر — ہُن کبھی برسایا کرتا تھا یہیں آ کر سحاب
تھا ظہوری بھی نمک پروردۂ ملک دکن — اور طغرا نے بھی پایا تھا یہیں آکر خطاب
کیسے کیسے تھے دکن میں قدردان علم و فن — لوگ کیا کیا جمع ہوتے تھے فضیلت انتساب
شیخ عین الدین گنج العلم تھا جن کا لقب — تھے یہی "اطوار الابرار" ان کی ابتک ہے کتاب
ملا فتح اللہ شیرازی و حبیب اللہ شاہ — شیخ علم اللہ محدث جس کا علامہ خطاب
اور علامہ محمد ابن خاتوں بافقیہ — مولوی عبد الکریم ایک ایک فرد لاجواب
مولوی حافظ شجاع الدین صاحب قلوری — درس گاہیں ان سبھوں کی تھیں نہایت کامیاب
آصفیہ سلطنت جب سے یہاں قائم ہوئی — شاہ عالم نے اپنے رخ سے الٹی ہے نقاب
علم کے چرچے یہاں پہلے سے بھی افزوں ہوئے — سہل سب پر ہو گیا علم و ہنر کا اکتساب

. . . .

اس سرے سے اس سرے تک ملک میں ہے مردگی — ٹس سے مس ہوتے نظر آتے نہیں ہیں شیخ و شاب
اس لئے جو دل میں ہے وہ لب تک آسکتی نہیں — چپ رہو کیفی کہاں تک اور کب تک پیچ و تاب

اب تک جس قدر نظموں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ علمی جلسوں کے متعلق نہیں، اب ایک نظم ایک معاشرتی جلسہ کی پیش کی جاتی ہے، یہ نظم انجمن معین المسلمین جو "قرضہ حسنہ" کی ایک انجمن تھی اس کے سالانہ جلسہ میں سنائی گئی تھی ۵

آج پھر اپنی نہ رونے سے طبیعت ہے اداس
دل میں رہ رہ کے چلے آتے ہیں کیا کیا وسواس

ہائے جی کھول کے رونا بھی تو قابو میں نہیں
کیا بات کہ آنکھوں پہ نہ آئے آماس

ایک ایک بات کا غم کیجئے تو اتنا غم ہو
کر سکے جس کا احاطہ نہ کبھی وہم و قیاس

غیرت و شرم و حمیت تو رہی کوسوں دور
اب تو قسمت سے ندامت بھی بھٹکتی نہیں پاس

دے مجھے تھوڑے سے آنسو کوئی قرضِ حسنہ
کہ کسی طرح نکل جائے مرے دل کی بھڑاس

سود سے بھی کہیں مل جائیں تو آنسو لے لوں
گو ادائی کا ذریعہ نہیں کچھ بھی مرے پاس

کیوں کہ اب کے علماء سود کو رکھتے ہیں روا
نفع اپنا ہو تو پھر کچھ بھی نہیں دین کا پاس

کیفی نے ڈرامہ کے طور پر ایک نظم "بے فکری کا کرشمہ" کے عنوان سے لکھی تھی، اس کے متعلق پروفیسر سروے نے اپنی کتاب "جدید اردو شاعری" میں حسب ذیل صراحت کی ہے:-

"اس نظم کے ڈرامائی انداز کی خوبی کے متعلق کچھ شبہ نہیں، لیکن نام کا استعمال بحر کی روانی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔"

جمیلہ بی (پڑوسن سے) "لڑیں گے اے پڑوسن آ!
حمیدہ (اس کی ہمسائی) "لڑے تجھ سے بلا میری"
جمیلہ بی، "بلا تیری ترے سر پر ترے گھر پر"
حمیدہ "اسے تجھے صدقہ کردں گھر پر سے کیوں لونڈی"
جمیلہ بی۔ "اری لونڈی کی لونڈی بے حیا بدذات
مجھے صدقہ کرے گی تو؟ ذرا منھ دیکھ کل موئی"
حمیدہ (آگے بڑھ کر) "منھ سنبھال اپنا تو اے کتیا
نہیں تو مارے جوتوں کے ترے سب دانت توڑوں گی"
جمیلہ (دوڑ کر بال اس کی چٹیا کے پکڑ کر) "مار!
ذرا میں بھی تو دیکھوں کتنی لمبی ہے تری جوتی"
حمیدہ (سر پکڑ کر) "مر گئی میں مر گئی! اللہ!
ارے لوگو! مجھے اب تو یہ ڈائن مار ڈالے گی"

جمیلہ! "کیوں مزا چکھا نہ اپنی لن ترانی کا؟
ذرا اترا کے، کیوں اب سے کسی کے دانت توڑے گی"
حمیدہ (ہو کے جزبز) مارتی ہے لات پیڑو میں!
جمیلہ (گرتے گرتے بچ کے اٹھتی ہے بصد سختی)
ہوا سارا محلہ ایک، ان دونوں کی اودھم سے
کرشمہ ہے یہ بے فکری کا یا ہے مفت کی کشتی"

کیفی کی نظموں میں منظر نگاری اور مناظرِ قدرت کے نمونے بھی موجود ہیں، چنانچہ "بہارِ بمبئی - گڑیا - غروبِ آفتاب - مینھ کا برسنا" وغیرہ کئی نظمیں ہیں، یہاں ہم "بہارِ بمبئی" کا تذکرہ کرکے اِس طویل مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

بہارِ بمبئی

دید کے قابل ہے ہر نقش و نگارِ بمبئی — دیکھنے والوں ہی سے پوچھو بہارِ بمبئی
کیا کھنڈالا کیا سمندر سب ہیں حیرت کے مقام — اک تجربہ گاہ ہے قرب و جوارِ بمبئی
غیر آبادی بھی آبادی سے ہرگز کم نہیں — ہیں، بجائے خود تماشا کوہسارِ بمبئی
جمع ہیں کیا کیا یہاں حوران و غلمان و قصور — ہند میں ہے جنت الماویٰ دیارِ بمبئی
گردشِ چشمِ فسوں گر کی ادا نے خاص ہے — یا ہے یارب گردشِ لیل و نہارِ بمبئی
ذرّہ ذرّہ سے عیاں ہے قدرت پروردگار — سرمۂ چشمِ تماشا ہے غبارِ بمبئی

تبصرہ صفحات گزشتہ میں کیفی کی غزلیں اور نظموں کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے، جس سے کیفی کی شاعری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کیفی کی شاعری ان کی کم سنی سے شروع ہوئی یعنی تقریباً چودہ سال سے شاعری کا آغاز ہوا اور ستّائیس سال تک وہ میدانِ شاعری داد سخنوری دیتے رہے۔ کیفی ایک پُرگو شاعر تھے، اگرچہ ہنوز ان کا کلیات زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے، لیکن "نظمِ کیفی" "تصویرِ افکار" "کیفِ سخن" کے نام سے تین کتابوں میں ان کا کچھ کلام شائع ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کیفی نے دکن میں اصلاح شعر و سخن کا جو بیڑا اٹھایا تھا اُس نہایت عمدگی کے ساتھ کامیابی پر پہونچا دیا۔ اُنھوں نے نہ صرف جدید شاعری کا خیال پیدا کر دیا بلکہ جدید شاعری کے مذاق کو بھی ترقی دی۔ سچّے جذبات کا اظہار، زبان کی صفائی اور پاکیزگی ان ہی کی رہبری کا نتیجہ ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بصراحت بیان کیا ہے کہ جدید شاعری میں انھوں نے حالی اور شبلی کا رنگ اختیار کیا تھا مگر داغ کی شاگردی کے باعث زبان کی لطافت بھی ان کے کلام کا ایک خاص جوہر ہے۔

کیفی کی نظموں سے اس امر کا بھی پتہ چل سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ قائم ہونے کے پہلے حیدرآباد کی علمی اور سماجی فضا کیسی تھی، کیفی ایک فطری شاعر تھے۔ اُنھوں نے سوائے شعر و سخن کے کبھی اور کام میں دل نہیں لگایا۔ اس لئے ان کی غزلیں اور نظمیں ان کی زندگی کا آئینہ دار ہیں اور جس طرح کیفی کی شاعرانہ زندگی کی تفسیر کرتی ہے۔ اسی طرح اس زمانہ کے ماحول کی بھی سچی تصویر ہے۔

کیفی کے کلام سے حیدرآباد کے ماحول اور فضا کا پوری طرح پتہ چلتا ہے۔ کاش اُن کا پورا کلام شائع ہو جاتا۔

نصیر الدین ہاشمی

فلسفۂ مصائب

اک بچّہ کی بغل میں دُنبل ہوا نمایاں
بیتابیوں سے اُس کی، ماں باپ تھے پریشاں

جرّاح کو بلا کر، چیرا اگر دلاتے
اُلجھن سے رات دن کی اکبارچھوٹ جاتے

لیکن یہ مامتا میں دیکھا نہ اُن سے جاتا
پھوڑے کے چیرنے سے بچّہ جو تلملاتا

آخر کو رفتہ رفتہ دُنبل یہ رنگ لایا
تھا گور کے کنارے گودوں کا وہ کھلایا

فاسد مواد کو جب رُو کا بدن کے اندر
ممکن نہ تھا کہ بچتہ، ہو سکتا اُس سے جانبر

قوموں کے جسم میں بھی فاسد مواد یوں ہی
ہوتا ہے جمع جس دم، لاتا ہے وہ تباہی

لازم ہے یہ کہ جنگیں، در پیش اُن کو آئیں
قحطوں کی، زلزلوں کی، یا آفتیں اُٹھائیں

ہے حادثوں میں پنہاں حکمت کا اک اشارا
جرّاحیاں ہیں گویا قدرت کی آشکارا

نشتر سے حادثوں کے، چیرے نہ گر وہ پھوڑے
فاسد مواد اُن کو زندہ کبھی نہ چھوڑے

(علامہ سلیم پانی پتی مرحوم)

"ہماری زبان" میں املا اور رسم خط کی اصلاح

(از جناب شمس العلماء مولانا محمد امین عباسی صاحب چریاکوٹی)

"ہماری زبان" کی یکم مئی ۴۸ء کی اشاعت میں ایک مضمون املا پر نظر سے گزرا، اسی پرچہ میں ایک خط بنام ایڈیٹر صاحب شائع ہوا جس کے سمجھنے سے ہر ذی علم جس کو زبان عربی سے ادنیٰ واقفیت ہے عاجز ہے۔ یا تو لکھنے والے نے زبان عربی سے معاندانہ استہزا کیا ہے اور مخالفین زبان عربی کو اس طرح کے استہزا کی جرأت دلائی ہے۔ جیسا کہ اس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے یا خود اتنا کم علم ہے کہ اس کو صحیح لفظ لکھنے پر قدرت نہیں اور اپنی اس کمی کو اس پیرایہ میں چھپانا چاہتا ہے۔

اب آئیے خط کے الفاظ اور اس کے معانی پر غور کیجیے، اس سے ظاہر ہوگا کہ یہ خط کس قدر مہمل اور بے ربط ہے کہ ایک عربی داں کو اس کے الفاظ کا سمجھنا ترتیب عبارت میں کتنا دشوار ہے۔

خط

مکرمی (میرے بزرگ) موازمی (میرے دانت کاٹنے والے) ساھب (ایسا لالچی جس کو کسی چیز سے سیری نہ ہو) مادہ "سھب"

تسلیم ارز (اگر اُرْز ہے تو بمعنی صنوبر اور اگر اُرُزّ ہے تو بمعنی چاول) ہے ادیزہ (کھرا)

خت (نیزہ مارنا) جافر (وہ لڑکا جس کا گوشت پھول گیا ہو) ہُسیں (مہمل لغتاً)

اسی طرح پورا خط ہے جو از سرتاپا مضحکہ انگیز ہے اس کے پورا نقل کرنے کا مقصود پڑھنے والوں کو ہنسانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ (مھمو دلغت میں مردہ) ہامد (مرنا۔ بے نور ہونا۔) یہ ہے اعلیٰ تعلیم کا نمونہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر لفظ جس کو واضع نے کسی مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وضع کیا ہے وہ ہمیشہ اسی ہیئت سے اسی معنی و مفہوم پر دلالت کرے گا جس ہیئت سے واضع نے اس کو وضع کیا ہے۔ لفظ کا ہر تغیر معنی میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ اگر لفظ کا تغیر حروف کی زیادتی سے اصل مادہ کے بقا کے ساتھ ہے تو معنی میں بھی زیادتی ہو گی۔ یہی لفظ "حمد" (تعریف کرنا) اگر اس پر ایک الف بڑھا دیا جائے اور 'احمد' بنایا جائے تو اس کے معنی (کسی کو قابل تعریف بنانا) ہوں گے جو اصل معنی پر زائد ہے۔ اسی طرح اگر اس میں ایک تؔ اور مؔ بڑھا دیا گیا تو "تحمد" ہوا، تو معنی (اپنی تعریف کرنا) حاصل ہوئے۔ علماء کے نزدیک یہ مسئلہ مسلّمہ ہے کہ الفاظ کی وضع اپنے معانی میں توقیفی ہے۔ (دیکھو رسالہ وضعیہ ملّا علی قوشجی اور اور رسالہ عقیدیہ قاضی عقید الدین فی علم الوضع) اس موضوع پر علٰحدہ مضمون مبسوط لکھا جائیگا۔ اب سنئے۔

ایڈیٹر صاحب اپنے ذاتی اجتہاد لسانیات میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہر زبان کی املا میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور ہے۔ ہمارا رُدئے سخن اردو املا کی طرف ہے۔ املا کی دقتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، ایک داخلی دوسری خارجی، داخلی دقتوں کی بنیاد عموماً متعلقہ زبان والوں کی قدامت پرستی ہوا کرتی ہے (یعنی اردو کی املا بدلنا روشن خیالی ہے) اور خارجی دقتیں وہ ہیں جو باہر سے آئے ہوئے الفاظ پیدا کرتے ہیں، اُردو بھی انگریزی کی طرح ایسی ہی دقتیں پیش کرتی ہے جبکہ دیوناگری میں دوسری قسم کی یعنی داخلی دقتیں پائی جاتی ہیں" (یعنی دیوناگری خارجی دقتوں سے پاک ہے اس لئے دیوناگری اختیار کرنی چاہئے اور قدامت پرستی چھوڑنا چاہئے)

آپ نے یہ کُلیہ بیان فرمایا کہ "ہر زبان کی املا میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور ہمیشہ ہے" اس کلّیہ کا ثبوت اگر عقلی وجوہ سے ہے تو اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی، اور اگر بذریعہ استقراء آپ کو اس کا علم ہوا تو یہ کلّیہ از سرتاپا غلط ہے۔ یہ تو صرف انھیں زبانوں میں پایا جاتا ہے جن کا تلفظ رسم خط سے مختلف ہے مثلاً سائیٹ SIGHT–SITE یا پُٹ PUT اور کٹ CUT لیکن جن زبانوں کا تلفظ اور رسم خط یکساں ہے۔ جس طرح الفاظ مُنھ سے نکلتے ہیں اسی طرح لکھے جاتے ہیں، یا یوں کہئے کہ کتابت کے مطابق تلفظ ہے تو ان میں نہ تو دقت پیش آئی اور نہ اصلاح کی حاجت ہوئی۔ کیا ایڈیٹر صاحب تکلیف فرما کر بتا سکتے ہیں کہ زبان عبرانی کی املا میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش آئی جس کی اصلاح کی حاجت ہوئی؟ زبان سُریانی۔ کلدانی کے

املا میں بہود کو کیا وقت محسوس ہوئی اور ان کی اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوئی؟ باوجود اس کے کہ یہ زبانیں بہت قدیم ہیں اور آپ کے کلیہ کے مطابق ان زبانوں میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوئی اور ہے۔ آپ اپنے کلیہ کے مطابق بتا سکتے ہیں کہ زبان ترکی میں ترقی اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی اور اب تک ہے۔ ممکن ہے کہ آپ ترکی کے متعلق یہ کہیں کہ مصطفےٰ کمال نے کچھ زمانہ تک ترکی کے حروف ہی بدلے تھے اور ترکی زبان لاطینی حروف میں لکھی جاتی تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ اصلاح نہیں ہے بلکہ یہ تغیر سیاسی مصالح پر مبنی تھا جب وہ غرض حاصل ہوگئی تو پھر زبان ترکی اپنی اصلی حالت میں آگئی اور جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ دوسرے یہ تغیر وقتی ایک محدود دائرہ میں تھا، بقیہ ان تمام ممالک میں جہاں زبان ترکی رائج ہے اس کا کوئی اثر نہ تھا۔

آپ اپنے سے قریب تر زبان فارسی کو لیجئے جو ۱۳ سو برس سے عربی حروف میں لکھی جاتی ہے اس کے املا میں کون سی اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اب بھی ہے۔ زبان عربی کی املا میں کون سی اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ دوسرے جن ممالک میں زبان عربی بولی یا لکھی جاتی ہے ان لوگوں کے احساس ضرورت اصلاح و ترقی املا کا آپ کو کیونکر علم ہوا نہ تو عربی زبان اُن کی زبان ہے اور نہ اہل زبان نے عربی املا کی اصلاح کی ضرورت کو کسی رسالہ یا مضمون میں ذکر کیا اور نہ عربی حروف پر جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن میں سے کسی میں اس کا کوئی ذکر ہے۔ چنانچہ علامہ ابو العباس احمد القلقشندی نے صبح الاعشیٰ علم الانشاء پر ایک کتاب چودہ جلدوں میں لکھی ہے جس کی تیسری جلد میں عربی حروف ہجا سے بحث کی ہے، اس میں عربی املا کی ضرورت اصلاح کا کوئی ذکر نہیں۔

زبان عبرانی کی املا کی ضرورت اصلاح کا آپ کو کیوں کر علم ہوا اور اس کی املا میں کسی قسم کی اصلاح کی حاجت ہے۔ تاتاری۔ قزانی۔ کوہ قاف کے چودہ صوبوں کی زبان ترکی ہے ان کو اپنی ترکی زبان کی املا کے اصلاح کی کیا ضرورت پیش آئی اور اگر پیش آئی تو اس کا آپ کو کیوں کر علم ہوا، اگر آپ نہیں بتا سکتے تو مدعی سست گواہ چست اور آپ کا کلیہ غلط۔

آپ دُور نہ جائیے ہندوستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور بولی جاتی تھیں جیسے سنسکرت جس کو دیو بانی کہتے ہیں اور اس کی بڑے بڑے فضلا نے تشریح کی ہے جیسا کہ ڈنلی کوی ناضل علم البلاغہ نے کاوی داس ۱-۳۳ میں لکھا ہے یا اور پراکرت بھاشائیں جو پہلے رائج

تھیں جیسے ماگدھی ۔ شورسینی ۔ مہارا شٹھری ۔ پیشاچی ۔ آونتک اور اپ بھرانش یا اب لے جو ہیں جیسے کنڑی ۔ تامل اور تیلگو ان میں کس کے اصلاح کی حاجت پیش آئی ۔ ہاں ۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ہر چیز اپنی ابتدائی حالت میں قابل اصلاح ہوتی ہے اسی طرح کتابت اور املا بھی ہے لیکن جب اس کی تمام خامیاں امتداد زمانہ سے دور ہو گئیں تو پھر اس میں اصلاح کی حاجت باقی نہیں رہتی ۔

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ " ہمارا روئے سخن اردو املا کی طرف ہے " اب آپ کلیت سے جزئیت پر آئے اور محض اردو کی املا کی اصلاح کو ذہن نشیں کرنے کے لئے اپنے من گھڑت اصول اور کلیئے قائم کئے تو واضح رہے کہ یہ محض لفظی دھوکا ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اردو کی حروف وہی ہیں جو عربی کے حروف ہیں یا دنیا کی وہ تمام زبانیں جو عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں ۔ لہٰذا آپ کا روئے سخن اصل میں عربی حروف ہجا کی طرف ہے ۔ انھیں حروف ہجا میں فارسی بھی لکھی جاتی ہے ترکی بھی لکھی جاتی ہے اردو کی کیا خصوصیت ہے ۔

آپ فرماتے ہیں کہ " املا کی دقتیں کئی ہوا کرتی ہیں ایک داخلی اور دوسری خارجی ، داخلی دقتوں کی بنیاد عموماً متعلقہ زبان والوں کی قدامت پرستی ہوا کرتی ہے " اس عبارت کا کوئی مفہوم محصل نہیں ہے اس وجہ سے کہ ہر زبان کے حروف اسی وقت سے ہیں جیسے اس زبان کی کتابت وجود میں آئی اور اس کے حروف ہجا بنے جب تک وہ زبان قائم رہے گی وہ حروف بھی رہیں گے یہاں قدامت پرستی کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، یہ کوئی وضع نہیں ہے کہ آج ترکی ٹوپی ہے تو کل کلاہ اور پرسوں ہیٹ ، پہلی زبان سنسکرت کہ جس کے صحیح اور حروف علت کا مجموعہ پچاس حروف ہیں جو دنیا کی سب سے قدیم زبان ہے جب تک یہ زبان زندہ ہے یہ حروف بھی زندہ ہیں جب تک زبان عبرانی قائم ہے عبرانی حروف بھی قائم ہیں ۔ یہاں مسئلۂ املا میں قدامت پرستی کا کیا ذکر رہا ۔ دقت کا سوال تو عربوں کو عربی املا میں کوئی دقت نہیں اور نہ ان کو دقت کی کوئی شکایت سنسکرت والوں کو زبان سنسکرت کی املا میں کوئی دقت نہیں اور نہ ان کو اس کی کوئی شکایت ۔ مدعی سست گواہ چست ۔ اگر ان میں سے کسی اہل زبان نے اپنی زبان کے املا میں کوئی شکایت کی ہو تو اس کتاب کا حوالہ دیجئے ۔

حروف ہجا کا تعلق زبان سے جسم و جان کا تعلق ہے جب تک جان باقی ہے جسم باقی ہے ، اور جسم کا بقا اس کے حروف ہجا کے بقا سے ہے ۔ کسی زبان کے حروف ہجا کو کبھی دوسری زبان کے

حروف ہجا سے بدل دیا جائے تو وہ زبان باقی نہیں رہتی بلکہ جس زبان کے حروف ہجا سے بدلی جائے گی اسی زبان کا غلبہ ہوگا اور اصلی زبان باقی نہیں رہے گی۔

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ "خارجی دقتیں وہ ہیں جو باہر سے آئے ہوئے الفاظ پیدا کر دیتے ہیں اُردو بھی انگریزی کی طرح ایسی دقتیں پیش کرتی ہے۔" یہ تو ہر زبان کا حال ہے جس کو مختلف اقوام بولتی ہیں کچھ اُردو اور انگریزی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ عربی زبان میں فرانسیسی لفظ جیسے شمندوفر (ریل) شماد وغیرہ۔ جرمنی لفظ جیسے قرش۔ غرش Groschen یونانی الفاظ تو ہزاروں ہیں جن میں اب تمیز مشکل ہے۔ اسطبل۔ قولنج۔ مصطگی وغیرہ۔ عبرانی שמש شمش (شمس سورج) اسپینی بوصی (چھوٹی کشتی) Bozzo سریانی تموز (مہینہ) دندرمہ طوشعدرمہ (بالائی) ترکی وغیرہ زبانوں کے الفاظ ہزاروں کی تعداد میں عربی زبان میں موجود ہیں جن کی اجنبیت کثرتِ استعمال سے جاتی رہی۔ آپ نے ہندی بھاشا کو اس کلیہ سے نظر انداز کیا حالانکہ ہندی میں عربی۔ فارسی کے سیکڑوں الفاظ قدیم زمانہ سے مستعمل ہیں بالخصوص نظم میں۔ سوُرداس کہتا ہے ؎

شاہ کو پکڑت چور کو چھوڑت چغلن کو اعتبار	اود ھو دھن تمہرو بیوہار
سور داس کیسے نبھے گی۔ اندھ دھند دربار	

شاہ فارسی۔ چغل ترکی۔ اعتبار عربی۔ دربار فارسی۔

بہاری لال جو بہترین شاعر ہے سمت ۱۸۷۶ مطابق ۱۸۱۹ء میں کہتا ہے ؎

(۱) مان ہو بدھی تن رچھ سوچھ راکھے کاج	درگ پگ پوچھن کو بھوشن کئے پا انداج (پاانداز)
(۲) چھوٹی نہ ششوتا کی جھلک جھلکیو جوبن رنگ	دیپتی دیہہ دوہوں مل دیپتی تاپھتا رنگ (تافتہ)
(۳) ملی بی ہرت بچھرت مہت دیتی آتی رس لین	تو تن بدھی بھیت سب جگت جراپھا گین (زرافہ)

ترجمہ (۱) گویا کہ جسم کی خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لئے خدا نے پائے نگاہ کو صاف کرنے کے لئے زیور کو پاانداز بنایا۔

〃 (۲) لڑکپن کی جھلک نہیں چھوٹی تھی کہ جوانی جسم پر ظاہر ہو گئی دونوں کے ملنے سے جسم کا رنگ تافتہ کی طرح ہو گیا۔

〃 (۳) دونوں عاشق و معشوق مل کر نشاط کرتے ہیں۔ جدائی سے مُردہ کی طرح ہو جاتے ہیں۔ جاڑے نے عجیب رنگ سے دنیا کو زرافہ کی طرح بنا دیا ہے (زرافہ اونٹ کی طرح ایک جانور ہوتا ہے)

زبان بنگلہ میں بھی سیکڑوں عربی اور فارسی کے الفاظ موجود ہیں ؎

آئے رے چاند یر کونا آور رے چاند کے ٹکرے
تورے کھیتے دیبو پھولیر مدھو پرتے دیبو سونا

ترجمہ :- تیرے کھانے کو پھول کا شہد دوں گی۔ غیروں کو سونا دوں گی۔

آتر دیبو شیشی بھورے گولاب دیبو کاربا کرے

ترجمہ :- عطر دوں گی شیشی بھر کر۔ گلاب دوں گی قرابہ بھر کر۔

افسوس ہے آپ نے اُن دقتوں کا ذکر نہیں کیا جن کو بھود۔ ایرانی۔ بنگالی وغیرہ اہلِ زبان محسوس کرتے ہیں۔ غالباً یہ آپ کا سوءِ ظن ہے۔ اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ مضحکہ انگیز مضمون یہ ہی کہ ۱۳ سو برس سے زبان عربی اور فارسی کے حروف کا استعمال ہے لیکن کسی نے عربی زبان کی داخلی اور خارجی دقتوں کا آج تک ذکر نہیں کیا۔ ممکن تھا کہ عرب بقول آپ کے قدامت پرستی کے شکار تھے لیکن غیر عرب جنھوں نے عربی حروف اختیار کئے ان میں سے مسلم اور غیر مسلم کسی نے بھی آج تک اُن دقتوں کا اظہار نہیں کیا جن کو آپ محسوس کر رہے ہیں۔ جیسے تاتاری قبضۂ بغداد کے بعد مسلمان ہوئے اور تاتاری زبان حروف عربی میں لکھی جانے لگی۔ تاتاریوں کو حروف عربی میں نہ تو داخلی دقتوں کا احساس ہوا اور نہ خارجی دقتوں کا اور وہ قدامت پرستی کا شکار بھی نہ تھے اگر اُن کو اس میں کوئی دقت محسوس ہوتی تو وہ اس کو اختیار ہی کیوں کرتے۔

آپ لکھتے ہیں ”جبکہ دیوناگری میں دوسری قسم کی یعنی داخلی دقتیں پائی جاتی ہیں۔“ آپ کے اُصول مسلمہ کے مطابق دیوناگری میں بھی خارجی دقتوں کا وجود متصور ہونا چاہئے اسلئے کہ ہندی بھاشا میں جو دیوناگری میں لکھی جاتی ہے ہزاروں خارجی الفاظ جو آپ کے خیال میں دقت پیدا کرنے والے ہیں موجود ہیں۔ پھر بھی آپ نے کسی مصلحت سے دیوناگری کی خارجی دقتوں کو ظاہر نہیں کیا اور اس سے صریح چشم پوشی فرمائی۔

حیرت تو یہ ہے کہ اُردو زبان عربی۔ فارسی اور ہندی بھاشا سے بنی ہے اگر عربی اور فارسی الفاظ جو بقول آپ کے خارجی دقت پیدا کرنے والے ہیں نکال دئے جائیں تو اردو زبان ہی باقی نہیں رہتی خالص ہندی بھاشا رہ جاتی ہیں اور یہی اس عبارت کا مقصود ہے۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ انسان کو ہڈی۔ چمڑا۔ گوشت کی وجہ سے خارجی اور داخلی دقتوں یعنی امراض کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اگر انسان سے کم سے کم چمڑا دور کر دیا جائے تو یہ سب زحمتیں اور

دقتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ یہ اقتراح (Suggestion) کس قدر مضحکہ خیز ہوگا۔

اس تمام عبارت کا ماحصل صرف اتنا ہے کہ الفاظ عربی جو اردو میں مستعمل ہیں عام اس سے کہ ان میں سے بیشتر ہندی بھاشا میں بھی مستعمل ہوں اردو زبان سے نکال دئے جائیں یا کم سے کم ان کی صورت مسخ کر دی جائے کہ ان کی عربیت باقی نہ رہے۔ یہ مُدعا اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اردو کا رسم خط نہ بدلا جائے اور اس کو دیوناگری کی صورت میں تبدیل نہ کیا جائے۔

آئیے ہم آپ کے سامنے اس مغالطہ (Falacy) سنسکرت میں (ہیتوابھاس)[۵۱] کو پیش کر دیں جو اس نتیجہ تک پہونچنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس طرح کہ غیر مسلمہ مقدمات استدلال کو مسلمہ تسلیم کر کے نتیجہ نکالا گیا ہے۔ اسی کو مغالطہ کہتے ہیں۔

(۱) "ہر زبان کی اِملا میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور ہمیشہ سے ہمارا رُوئے سخن یہاں اردو املا کی طرف ہے۔"

یہاں ایک کلیہ بیان کیا گیا کہ "ہر زبان کی املا میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی محسوس ہوتی رہی ہے اور ہمیشہ رہی" اس کلیہ کے اندر تمام زبانیں ہیں لیکن اردو کو خاص کیا گیا اور یہی مقصود تھا کہ اردو کے املا کی اصلاح کی ضرورت ثابت کی جائے۔ اس لئے کہ جب یہ کلیہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہر زبان کی املا کی اصلاح اور ترقی کی ضرورت ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اردو کے املا کی اصلاح ضروری ہے حالانکہ یہ کلیہ جو اوپر بیان کیا گیا بالکل غیر مسلّم اور غلط ہے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا۔ لہٰذا اس غیر مسلّم کلیہ سے اردو کے املا کی ضرورت کا ثبوت مغالطہ (Falacy) ہے۔

(۲) "املا کی دقتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں ایک داخلی اور دوسری خارجی۔ داخلی دقتوں کی بنیاد عموماً متعلقہ زبان والوں کی قدامت پرستی ہوا کرتی ہے۔"

اس عبارت میں بھی وہی مغالطہ Falacy استعمال کیا گیا اس مدعا کے ثبوت میں کہ زبان اردو کی موجودہ رسم خط پر قائم رہنا قدامت پرستی ہے جو باعثِ دقت ہے جس طرح تمام زبانوں میں ہے اِس میں بھی ہے۔ یعنی ایک غیر مسلمہ کلیہ کے تحت اس کو لا کر غلط نتیجہ نکالنا جیسا کہ اوپر اس کے متعلق کافی ذکر کیا جا چکا ہے۔

---

[۵۱] دیکھو شرح مطالع بحث قیاس ونیائے درشن ۱-۲-۴۔

(۳) "خارجی دقتیں وہ ہیں جو باہر سے آئے ہوئے الفاظ پیدا کر دیتے ہیں اردو بھی انگریزی کی طرح ایسی ہی دقتیں پیش کرتی ہے۔"

اس عبارت سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اردو میں عربی الفاظ یا فارسی الفاظ یا دونوں کی وجہ سے جو خارجی دقت پیدا کرنے والے ہیں دقتیں پیدا ہیں جس کلیہ کے تحت میں اردو کو داخل کر کے یہ مدّعا ثابت کیا ہے وہ کلیہ بالکل غیر مسلّم اور غلط ہے اِس کے متعلق بھی اوپر کافی بحث ہو چکی ہے جس سے اس کلیہ کا غلط ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔

(۴) "جبکہ دیوناگری میں دوسری قسم کی یعنی داخلی دقتیں پائی جاتی ہیں۔"

اس عبارت سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اردو اگر دیوناگری میں لکھی جائے تو خارجی دقّت سے پاک ہو جاتی ہے یہ مضمون بھی صحیح نہیں ہے اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ دیوناگری میں لکھی جانے والی ہندی بھاشا میں بھی خارجی دقت موجود ہے لہٰذا اگر خارجی دقتیں کسی زبان میں ہو سکتی ہیں تو وہ ہندی میں بھی موجود ہیں تو ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنا ترجیح بلا مرجح ہے جبکہ دونوں میں کوئی ما بہ الامتیاز نہیں ہے۔ یہ بھی مغالطہ ہے۔

میرے خیال اور سمجھ میں یہی آیا ہے اگر ایڈیٹر صاحب نے اس تمام عبارت میں کوئی اور مدّعا رکھا ہے تو اس کو ظاہر فرمائیں جو اس عبارت سے سمجھا جاتا ہو "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" تو پھر لکھا جائے اور اُس پر غور کیا جائے۔ ہم یہاں رسم خط کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

رسمِ خط ہر زبان کے رسم خط کو اُس زبان سے جسم و جان کا تعلق ہے۔ رسم خط کا مرتبہ زبان کے بعد ہے۔ زبان الفاظ سے بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاظ مجموعۂ حروف ہیں جن کا تعلق مخارج سے ہے۔ قدرت نے مخارج حروف کو جسم انسانی میں باجے کی صورت میں ترتیب دیا ہے جن سے مختلف آوازیں مختلف ضغطوں سے ہوا کے لہرانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب ہوا ان مخارج سے ٹکراتی ہے تو اس سے حرف پیدا ہوتا ہے ان حروف کی کیفیت ثقل و خفت کا دار مدار ہوا کے مخارج سے ٹکرانے کی شدت و خفت پر ہے۔ اگر ہوا ان مخارج میں سے کسی مخرج سے شدت اور سختی سے ٹکراتی ہے تو حرف ثقیل پیدا ہوتا ہے اور اگر اس کی ٹھوکر ہلکی ہوتی ہے تو ہلکا حرف بنتا ہے۔ اس لئے حروف حقیقت میں مختلف آوازیں ہیں جو مختلف مخارج میں ہوا کی ٹکر کھا کر لہرانے سے پیدا ہوتی ہیں اور انھیں حروف کے باہم دیگر ترتیب سے لفظ بنتا ہے۔ انھیں حروف کے ثقیل و خفیف ہونے سے لفظ کو بھی ثقیل اور خفیف کہتے ہیں۔

چونکہ حروف مخارج سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے مخارج کی جتنی وسعت ہوگی اور اس کے جتنے ٹکڑے ہوں گے اسی قدر حروف ہوں گے۔

شیخ بوعلی ابن سینا نے اپنی کتاب "حروف کے پیدائش کے اسباب" میں لکھا ہے کہ مخارج کی ساخت میں ہر ملک کی آب و ہوا کو بڑا دخل ہے۔ بیشتر دیکھا جاتا ہے کہ جس ملک کے لوگ فطرتاً لحیم و شحیم اور قوی اور لانبے ہوتے ہیں ان کے مخارج سے جو حروف پیدا ہوتے ہیں وہ ثقیل ہوتے ہیں جیسے افغانستان کی زبان پشتو بخلاف اس کے جس ملک کے لوگ کمزور ہوتے ہیں اُن کے مخارج سے جو حروف پیدا ہوتے ہیں وہ ہلکے اور سہل الادا ہوتے ہیں جیسے برمی۔ جاوی۔ چینی۔ بنگالی وغیرہ۔ چونکہ عرب اقلیم متوسط میں واقع ہے اس لئے ان کے مخارج سے پیدا ہونیوالے حروف ثقل و خفت میں اوسط درجہ میں ہیں جعلناکم امۃ وسطا (یعنی ہم نے تم کو درمیانی قوم بنایا ہے) اس لحاظ سے اس قوم کی زبان بھی ثقل و خفت میں متوسط ہوگی۔

ان مخارج میں سے کچھ ایسے مخارج بھی ہیں جو مختلف اقوام میں مشترک ہیں۔ لہٰذا ان مخارج سے پیدا ہونے والے حروف بھی مشترک ہوں گے اور کچھ مخارج مخصوص ہیں جو ایک قوم میں پائے جاتے ہیں اور دوسری قوم میں نہیں ہیں تو ان سے پیدا ہونے والے حروف بھی مخصوص ہوں گے جو دوسری قوم میں نہیں پائے جاتے۔ اس صورت میں کسی ملک کے مخصوص حروف کا تلفظ دوسرے ملک والوں کے لئے دشوار ہوگا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جو حروف جن ملکوں کے ساتھ مخصوص ہیں اُن میں وہ مخارج ہی نہیں ہیں بلکہ اس مخرج کا بچپن سے ان میں استعمال نہیں ہے اس لئے اس مخرج کے متروک ہونے سے ان مخارج سے پیدا ہونے والے حروف ان مخارج سے حاصل نہیں ہوتے۔ اصولاً ہر قوت جس کو اللہ تعالےٰ نے جسم انسانی میں رکھی ہے اگر استعمال نہ کی جائے تو وہ بیکار ہو جاتی ہے پھر اس کے از سر نو کام میں لانے کے لئے مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر زبان کے حروف توقیفی ہیں اس لئے کسی زبان میں کوئی حرف نہ تو مکرر ہے اور نہ بیکار ہے اور نہ کوئی حرف کسی دوسرے حرف کی قائم مقامی کرتا ہے ہر حرف اپنی جگہ پر مستقل ہے چاہے حروف کی تعداد کتنی ہی ہو اس لئے کہ ہر حرف اپنے مخصوص مخرج سے پیدا ہوتا ہے۔ مخرج مشترک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہر حرف اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ عربی میں ذ۔ ز۔ ض۔ ظ۔ بظاہر متحد الصوت ایک قسم کی آواز دینے والے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں باوجود باہم بڑا فرق ہے جو اہل زبان ہی کے تلفظ سے بدیہی طور پر نمایاں ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک مخرج میں بڑا فصل ہے۔ یہ کیفیت ہر زبان کے حروف میں پائی جاتی ہے جیسے سنسکرت میں ا نو۔ سو ر

اور چندر بندو (چندر بندوں اور म - न - ञ - ण - ङ) بظاہر ان میں سے ہر
ایک کی آواز یکساں معلوم ہوتی ہے۔ ان کا مخرج ناک ہے۔ ان کو انوناسک کہتے ہیں لیکن ہر ایک
حرف اپنی حدوات میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور اپنی جگہ پر مستقل ہے اسی طرح श اور ष
کی آوازیں یکساں معلوم ہوتی ہیں لیکن ان دونوں کے مختلف مخارج ہیں جن کو اہلِ زبان صحیح
ادا کرتا ہے श کا مخرج تالو ہے اور ष کا مخرج دماغ ہے جس کو مور دھنیہ کہتے ہیں ان میں
سے ہر ایک حرف اپنی جگہ پر مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ کیا کسی صاحب نے اس کی تحریک کی ہے کہ بجائے
چاروں کے ایک ہی न لکھا جائے یا کسی سنسکرت داں نے کبھی یہ صدا بلند کی ہے کہ بجائے न-
ण - ञ - ङ کے ایک ہی न لکھا جائے۔ کسی سنسکرت داں نے اس میں کوئی دقت
محسوس کی ہے؟

زبانِ عبرانی میں ط اور ت کی آوازیں یکساں معلوم ہوتی ہیں ט طیث ת تا و یا
ה ہے (ہ) اور ח حیث (ح) بظاہر یکساں ہیں لیکن ان دونوں کے مخارج جداگانہ
ہیں جن کا تلفظ یہود صحیح کرتے ہیں۔ کیا کسی یہودی کو اس میں دقت پیش آئی؟

اس کے بعد الفاظ کا مرتبہ ہے جو انھیں حروفِ ہجا کی ترکیب سے بنتے ہیں۔ ہر لفظ انھیں حروف
کی ترکیب سے اپنے معانی بتاتا ہے جن کو واضع نے اس لفظ کے لئے بنایا ہے جیسے محمود کا لفظ جب
استعمال کیا جائے گا تو اس کے معنی تعریف کیا ہوا ہوں گے اور مہمود کا لفظ ہاءِ ہوز سے جب
استعمال کیا جائے گا تو اس کے معنی مُردہ۔ بجھے ہوئے ہوں گے۔ واضع نے جس لفظ کو جس ہیئت
سے جس معنی کے لئے وضع کیا ہے اس معنی سے وہ لفظ خالی نہیں ہوسکتا۔ وضع الفاظ اپنے معانی
میں توقیفی ہے۔ جب لفظ مہمود ہائے ہوز سے استعمال کیا جائے گا تو زبانِ اردو میں اس کے معنی مُردہ
اور انگریزی میں Dead ہوں گے۔ موازی کا استعمال جس جگہ اور جس وقت اور جس حیثیت سے
ہو (میرے دانت کاٹنے والے) کے ہوں گے۔ اسی طرح ساہب کا لفظ ہر جگہ "لالچی" کے معنی
سے خالی نہ ہوگا۔ البتہ اگر اس مہمود کو انگریزی میں Mahmud لکھئے تو دونوں معانی
کا احتمال ہوگا۔ انگریزی میں س اور ص کا فرق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی جس کی
مادری زبان انگریزی ہو وہ H کی پیروی میں ح اور ہ کے فرق کو اپنی آسانی کے لئے مٹا دے
اور عربی حروف میں بھی انگریزیت کو دخل دے اور انگریزی حروف کے سانچہ میں ڈھالے لیکن
یہ ایک اصطلاح ہوگی۔ جو اسی کے گھر تک محدود ہوگی لغت نہیں بدلے گی ہمیشہ لغت میں مہمود مُردہ

ہی رہے گا اور محمود تعریف کیا ہوا ہی رہے گا۔

چونکہ الفاظ ہوا کی مدد سے منھ سے نکلتے ہیں وہ ہوا کے ساتھ غائب ہو جاتے ہیں۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی میں تعلقات کی وسعت لازم ہے اس لئے اس امر کی حاجت پیش آئی کہ جو الفاظ منھ سے نکلتے ہیں قائم ہوں اور ضرورت کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچائے جا سکیں اور ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ تک محفوظ رکھے جائیں۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے جو تمدنی زندگی سے پیدا ہوئی نقوش ایجاد ہوئے جو آوازوں کے قائم مقام ہیں اور بصورت حروف منھ سے نکلتے ہیں اسی کو کتابت کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر نقش جس حرف کی قائم مقامی کرتا ہے اُسی کیفیت کا حامل ہوگا جو اس حرف کے ساتھ مخصوص ہے اس وجہ سے کہ وہ نقش اس آواز کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی قائم مقامی کرتا ہے جس کو اہلِ زبان اپنے مخصوص لہجہ اور کیفیت سے ادا کرتا ہے اسی کتابت سے انسانی تمدن درجۂ تکمیل کو پہونچا۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں چند افراد لکھ سکتے تھے۔

عربی زبان میں ۲۹ حروف ہیں اور انھیں حروف میں قرآن پاک نازل ہوا جیسا کہ عبرانی زبان میں ۲۸ حروف ہیں جن میں صحف انبیاء بنی اسرائیل اترے۔ ان ۲۸ حروف میں [illegible] (گیمل) گ اور [illegible] (پے) پ عربی میں نہیں ہیں اور عربی کے ۲۹ حروف میں سے ج۔ ض۔ ظ۔ عبرانی میں نہیں ہیں بقیہ حروف مشترک ہیں۔

امام ابو العباس بونی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "لطائف الاشارات فی اسرار الحروف المعلومات" میں لکھا ہے کہ:۔

> ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ جتنے انبیاء بھیجے گئے وہ کون سی چیز لے کر بھیجے گئے۔ آپ نے فرمایا کہ کتاب جو اُن پر اتاری گئی۔ پھر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آدم پر کون کتاب اُتاری گئی۔ آپ نے فرمایا ا ب ت ث ج الخ پھر میں نے پوچھا یا رسول اللہ کتنے حروف ہیں۔ آپ نے فرمایا ۲۹۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو ۲۸ شمار کئے تھے۔ اس پر آپ کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے اللہ تعالےٰ نے آدم پر ۲۹ حروف نازل کئے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ ان میں لام الف ہے؟ آپ نے فرمایا کہ لام الف ایک حرف ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے آدم پر ایک صحیفہ میں نازل فرمایا اور اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہیں جس نے لام الف کی مخالفت کی اس نے

اُوم پر نچی ہوئی کتاب سے کفر کیا اور جس نے لام الف کو شمار نہیں کیا اُس سے اور مجھ سے کوئی واسطہ نہیں
اور جو شخص اس پر ایمان نہیں لایا کہ ۲۹ حروف ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

دُنیا کی ہر قوم کی زبان اُس کی کتابت سے زندہ ہے۔ بہت سی زبانیں اِس وقت موجود ہیں جن کے بولنے والے اب باقی نہیں رہے مگر وہ اُسی طرح زندہ ہیں جیسے پہلے تھیں۔ زبان سنسکرت دُنیا کے کسی حصہ میں بولی نہیں جاتی مگر وہ اُسی آب و تاب سے زندہ ہے جیسی پہلے تھی۔ بلکہ اب تو یورپ کے مختلف ممالک میں اُس کی باقاعدہ تعلیم ہے جو پہلے نہ تھی۔ عبرانی زبان کہیں بولی نہیں جاتی پھر بھی کتابت کی وجہ سے زندہ ہے۔ پہلوی زبان جو قدیم فارسی زبان تھی جس میں زردشت کے صحیفے تھے اب زندہ نہیں ہے اس لئے کہ اُس کی کتابت اور اُس کے حروف مر چکے اور اُس کی جگہ پر نئی فارسی پیدا ہو گئی جس کے حروف عربی ہیں اور عربی حروف کی وجہ سے عربی الفاظ اور اسلامی ثقافت (کلچر) داخل ہو گئے۔ یہی حال اُردو زبان کا ہے عربی حروف ہونے کی وجہ سے فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے لیکن فرق یہ ہے کہ فارسی زبان کے شامل ہونے سے ہندی زبان کی مماثلت اور اُس کا اثر غالب رہا۔ چونکہ فارسی اور سنسکرت میں تھوڑا فرق ہے اس لئے اس کی اجنبیت جاتی رہی اور عربی الفاظ نے فارسی کی طرح غلبہ نہیں کیا بلکہ فارسی اور ہندی نے باخود با کی یک رنگی سے غلبہ پایا اور عربی الفاظ موجودہ اُردو میں برائے نام رہ گئے۔ اگر اس کے حروف ہندی یعنی دیوناگری سے بدل دئے جائیں تو اسلامی تمدن ہند سے ختم ہو جائے گا۔ ہند میں اسلامی تمدن جو کچھ مسلمانوں میں باقی رہ گیا ہے وہ صرف اُردو زبان کی وجہ سے ہے۔ سو اس کا حال یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب اُردو زبان کی املا پر داخلی یعنی قدامت پرستی اور خارجی دقتوں کی بے جا تہمت لگا کر اس کو بھی مٹانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ایسی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں لیکن اب تک اس کے لئے حروف ہجا نہیں بنے ہیں اور وہ لکھی نہیں جاتی ہیں جیسے چاٹگامی زبان جو صرف ضلع چاٹگام میں بولی جاتی ہے جو عربی۔ فارسی اور بنگلہ زبانوں سے مل جل کر بنی ہے اگر اس کے حروف نہ بنے اور کتابت میں نہ آئی تو کچھ زمانہ کے بعد جب اس پر خارجی اثر غالب ہوگا تو یہ زبان دُنیا سے مفقود ہو جائے گی۔ لہٰذا ہر زبان کے لئے اِس کے حروف ہجا اُس زبان کی زندگی کے سب سے بڑے رکن ہیں۔ ہر لفظ جن حروف سے جن معانی کے لئے وضع کیا گیا ہے وہی اُس کی حقیقت اور اُس کی ہستی ہے کوئی عرب ضَرَبَ کا لفظ ذ۔ ز یا ظ۔ سے تلفظ نہیں کر سکتا۔ ضَرَبَ کے معنی مارنے کے اُسی وقت ہوں گے جب ض سے تلفظ کیا جائے

جس کی قائم مقامی یہ مخصوص نقش ض کرتا ہے لیکن اگر اسی کو ز سے تلفظ کریں تو اس کے معنی "سور (خنزیر) کو اس کے رہنے کی جگہ میں لے جانے کے" ہوں گے۔ ز ر ب سے کبھی ضَرَبَ کے معنی پیدا نہیں ہو سکتے اور اگر اسی کو ذ سے ذَرَبَ تلفظ کریں یا لکھیں تو اس کے معنی "تیز ہونا" سمجھے جائیں گے اور اگر ظ سے ظَرَبَ تلفظ کیا جائے یا لکھا جائے تو اس کے معنی "کسی چیز سے چپکنا" یا "حضور سرورِ کائنات ؐ کے گھوڑے کا نام" ہوگا۔ زَرَبَ یا ذَرَبَ یا ظَرَبَ لکھ کر ضَرَبَ کے معنی لئے جائیں تو اس کی مثال یہ ہوگی کہ کوئی بیرسٹر ہائی کورٹ میں ننگے بدن۔ ننگے پیر اجلاس پر کسی مقدمہ میں بحث کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے تو کیا ہائی کورٹ کا کوئی جج اس کو بیرسٹر سمجھ سکتا ہے؟ جب تک اس کی پیشانی پر نہ لکھ دیا جائے کہ "یہ بیرسٹر ہے مصلحتاً اس نے جامۂ عریانی زیب تن کیا ہے" یہ مثال اُس مدعا کو ذہن نشین کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے کہ جب انسان لباس سے پہچانا جاتا ہے الناس باللباس تو لفظ جس کی حقیقت ادائے معنی مقصود ہیں انھیں حروف سے مشخص ہوتی ہے جس کو واضع نے انھیں حروف میں وضع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان حروف کے بدلجانے سے وہ حقیقت کیونکر باقی رہ سکتی ہے جو اُس کی ہستی اور فطرت کے خلاف ہے۔

یہی لفظ عرض جو پیش کرنے کے معنی کو ادا کرتا ہے جس کی حقیقت ض سے مشخص ہوتی ہے اور لفظ ارز جو "چاول" یا "صنوبر" کے معنی کے ادا کے لئے مخصوص ہے۔ اب ارز کو عرض کے معنی میں لینا دو جداگانہ افعال ہیں۔ ایک تو ارز کو صنوبر کے معنی سے خالی کرنا جو اس لفظ کی فطرت کے خلاف ہے۔ دوسرے اس کو عرض کی وضع میں لینا جو اس لفظ عرض کی فطرت کے خلاف ہے۔ یہ دونوں افعال خلافِ وضعِ فطری لفظ ہے۔

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "جب میں نے تالیم (ستانا) بالعالن کا کام شترو (معنی شہد یا مسخراپن) کیا تو بہت سے لوگوں نے اُردو اس وجہ سے چھوڑ دی کہ اس کی املا میں دقت تھی" کیا حضرت یہ فرما سکتے ہیں کہ کسی نے زبان سنسکرت اس وجہ سے چھوڑ دی کہ اس میں ख اور घ میں فرق مشکل ہے یا न - ञ - ग - ज्ञ میں امتیاز دشوار ہے۔ کسی نے زبان انگریزی محض اس وجہ سے چھوڑ دی کہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے پر بھی اس کے الفاظ کی املا پر قدرت نہیں ہوتی اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر عربی نے کیا جرم کیا ہے کہ آپ نے اِس کے گلا گھونٹنے کیلئے آستینیں چڑھالیں ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

کسی لفظ کی ہیئت کو اس لئے بگاڑنا کہ اس کا صحیح تلفظ دشوار ہے اور اس کی املا بدل کر لغتِ عرب میں تصرف کرنا کہاں تک قرینِ عقل ہے۔ ایک شخص جو ضاد کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتا وہ لفظ وَلَا الضَّالِّينَ کو ز سے لکھے اور اس کو دعویٰ ہو کہ معنی میں کوئی تغیر نہیں ہوگا۔ سوائے ہٹ دھرمی اور ہیرہ دستی کے کیا کہا جا سکتا ہے۔

کسی شخص نے ایک کبڑے سے پوچھا کہ تمہاری پیٹھ سیدھی کی پشت ختم کر دی جائے اس نے جواب دیا کہ تمام آدمیوں کی پیٹھ کے کہ آپ ضاد اور ز اور ظ میں فرق کی استعداد پیدا کریں تمام جائیں۔ تمام لغاتِ عرب مسخ کر دی جائیں۔ گویا نظامِ عالم کا پورٹ

اُردو زبان میں جتنے الفاظِ عربی مستعمل ہیں وہ سب قرآن پاک میں موجود ہیں جو مسلمان قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے یا جس نے بچپن میں قرآن پاک پڑھا ہے اور اُردو کی کتابوں سے بہرہ اندوز ہے وہ تو کبھی عارض کو عارز لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس کے کانوں میں پیدائش کے وقت سے اخیر تک عربی الفاظ کی صدا کانوں میں پڑتی رہتی ہے یا اس کو امید ہے کہ مرنے کے وقت زندگی کی اخیر لمحات میں جبکہ یارائے گویائی نہیں رہے گا آیاتِ قرآنی کی صحیح صورتِ مکتوبی ہی پیشِ نظر ہوگی وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بسم اللہ الرھمٰن الرھیم (رحمان۔ عدد کثیر۔ رھیم۔ ضعف سے جھک جانے والا۔ خاموشی) کی صورت میں پیشِ نظر رکھ کر اپنی عاقبت برباد نہیں کرے گا۔ وہ کبھی صاحب کو ساھب لکھنا گوارا نہیں کرے گا۔

یہ واضح رہے کہ عربی حروفِ ہجا وہ ہیں جن میں قرآنِ پاک نازل ہوا ہے اس کے حروفِ ہجا کو بگاڑ کر الفاظ عربیہ کو بگاڑنا الفاظِ قرآنی کو بگاڑنا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے ہم جن الفاظِ عربیہ کو روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور اردو کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ سب بعینہٖ یا بتصرف بہ بقائے مادہ یا مصدر قرآنِ پاک میں موجود ہیں۔ کوئی شخص ایسا لفظ عربی جس کو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں بجز اعلام مخصوصہ کے نہیں بتا سکتا جو قرآنِ پاک میں موجود نہ ہو۔

کیا کسی پی۔ ایچ۔ ڈی نے کبھی یہ بھی تحریک کی ہے کہ Right کو Rite یا Judge کو Jaj لکھا جائے ایسا کبھی نہیں ہوا اس لئے کہ یورپ کی کورانہ تقلید اس کی مانع ہے حالانکہ یہ کچھ مفید نہیں ہے۔ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ترجمہ :۔ تم سے یہود اور نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک ان کے طریقہ پر نہ چلو۔

کیا کوئی مسلمان جس کے دل میں ایمان کی ادنیٰ روشنی ہے اور اُس کے دماغ میں دہریت کی ہوا سمائی نہیں ہے لفظ محمدؐ کو جو حضور سرورِ کائنات روحی فداہ کا اسمِ گرامی ہے۔ ہائے ہوز سے لکھ کر جس کے معنی "مُردہ یا بے نور" ہیں اپنے رسول کی توہین گوارا کر سکتا ہے۔ مشرکینِ عرب حضور سرورِ کائنات کی عداوت سے محمدؐ کو ہائے ہوز سے تلفظ کرتے تھے۔ کون مسلمان آج تیرہ سو برس کے بعد مشرکینِ عرب کی سنت کو محمد لکھ کر زندہ کرنا چاہتا ہے۔ کیا کوئی شخص جو خدا کو حیّ و قیوم ۔ اُوِناشن۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا" یقین کرتا ہے۔ اور اُس کا اِس پر ایمان ہے وہ بجائے الحمد للہ کے الھمد للہ لکھ کر خدائے برتر کو موت کی صفت سے متصف کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کو مرنے کے بعد خدائے بزرگ کے سامنے جانے کا یقین ہے اس طرح خداوند کریم سے عداوت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ (نعوذ باللہ من ذالک)

کسی مذہب کا پیرو ہو جس کو ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان ہے۔ اعم اس سے کہ اُس کو وہ اللہ کہے یا ایشور یا گاڈ یا یہوا کبھی اُس ذاتِ پاک کی توہین، چاہے عربی زبان میں ہو۔ یا فارسی یا سنسکرت یا عبرانی میں گوارا نہیں کر سکتا۔

جو شخص تعلیم کو تالیم لکھنا پسند کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے علیم کو آلیم لکھنے پر مجبور ہے اُس صورت میں خداوند کریم کو صفت دردمندی سے متصف کرے گا۔ کیونکہ الیم بمعنی دردمند۔ ؛ Painful (نعوذ باللہ من ذالک)

علامہ عبدالفتاح عبادہ مصری نے اپنی کتاب "انتشار الخط العربی فی الشرق والغرب" میں لکھا ہے کہ "دنیا کے ۱/۴ حصہ کی زبانیں حروفِ عربی میں لکھی جاتی ہیں"۔ میں اُن میں سے چند ملکوں کا مختصراً ذکر کرتا ہوں جہاں کی زبانیں حروفِ عربی میں لکھی جاتی ہیں۔

نوبیا۔ جنوبی ابی سینیا۔ نائجریا۔ سومال۔ کیپ کالونی۔ زنجبار۔ مڈغاسکر۔ ترکستان۔ قارص۔ باطوم۔ کریمیا۔ دیگر صوبجات کوہ قاف۔ ایران۔ کردستان۔ تاتار۔ قزان۔ داغستان۔ کاشغر۔ افغانستان۔ بلوچستان۔ جزائر بحر الکاہل (جاوا۔ سماترا۔ بورنیو۔ وغیرہ) ایشیائے کوچک۔ ہندوستان (پنجاب۔ صوبۂ متحدہ۔ صوبۂ سرحد۔ صوبۂ سندھ۔ کشمیر۔ مدراس "ملایالم" حیدرآباد۔ برار۔ ریاست گوالیار) بحر متوسط کے سواحل۔ جبل الطارق سے مصر تک ٹیونس۔ الجزائر۔ مراکو وغیرہ۔ قسطنطنیہ۔ ایڈریانوپل۔ وغیرہ امریکا کے بعض جزائر وغیرہ۔

مقاماتِ مذکورہ کے مسلمانوں نے اپنی زبانوں کا رسم خط عربی رکھا ہے۔ تاکہ قرآنِ پاک کی تلاوت میں آسانی ہو اور نہ زبانِ عربی کا غلبہ ہو جس کے ذریعہ سے فارسی زبان کی طرح اسلامی ثقافت (کلچر) داخل ہو۔ چنانچہ سیکڑوں برس سے یہی حروفِ عربی رائج ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی اس کی املا میں کوئی دقت محسوس نہیں کی اور نہ تصرف جائز رکھا۔

یہ ہے اعلیٰ تعلیم کا نمونہ

انّ اللہ یھدی من یشاءُ الیٰ صراطٍ مستقیم۔ من یھدی اللہ فلا مُضلّ لہٗ ومن یضلِلہُ فلا ھادیَ لہٗ

توان بحلق فرو بُرد استخوانِ درشت
ولے شکم بدرد چوں بگیرد اندر ناف
(سعدی)

محمد امین عباسی

تندرستی ہزار نعمت ہے

(از حضرت گویا جہان آبادی)

دل ہے مسرور تو جہاں مسرور — ورنہ کیفِ بہار میں کیا ہے
ایک تنویر ہے مسرت کی — ماہ زیبا نگار میں کیا ہے
اپنی ہی زندگی کے دو رُخ ہیں — اور لیل و نہار میں کیا ہے
خوش ہیں شادابیٔ طبیعت سے — سبزہ و لالہ زار میں کیا ہے

لطف، شرمندۂ طبیعت ہے
سچ تو یہ ہے کہ لطفِ صحت ہے

سیرِ گلزار، چاندنی راتیں — راتیں اور باتیں اور ملاقاتیں
آسماں سے خوشی برستی ہے — کس قدر پُر طرب ہیں برساتیں
چاند، سورج، ستارے، شام و سحر — رُوح پرور فضائی سوغاتیں
تندرستی نہیں تو کچھ بھی نہیں — تندرستی کی ہیں کراماتیں

سچ ہے گویا بقول سالک کے
تندرستی ہزار نعمت ہے

غالبؔ کا نظریۂ اقدارِ اخلاق!

(از جناب سید شوکت علی سبزواری صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ لکچرر اسلامیہ کالج بریلی)

فلسفہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک نہایت وسیع لفظ ہے۔ یونانی تو علم کے ہر شعبہ کو فلسفہ میں شامل سمجھتے تھے۔ لیکن آجکل طبعیات اور تجربیاتی حکمت یعنی سائنس کے خاص خاص شعبوں کو چھوڑ کر باقی علم کی تمام شاخیں فلسفہ ہیں۔ مابعد الطبعیات تو فلسفے کی ایک مخصوص قسم ہے لیکن اخلاقیات، نفسیات، اور جمالیات بھی فلسفے سے الگ نہیں۔ غالبؔ نے ان گوناگوں مباحث میں سے ہستی اور حیات کے مسائل کو اپنے فکر کی جولان گاہ بنایا۔ یہی حکیمانہ شعبہ غالبؔ کا وہ مخصوص فلسفیانہ نظام ہے جس کی طرف میں نے اپنی تمہیدی سطور میں اشارہ کیا ہے۔ اور اس کا ثبوت پچھلی وہ سطریں ہیں جن میں غالبؔ کے مخصوص فکر کی کسی قدر تشریح کی گئی ہے۔ اگر کسی شاعر کے فلسفیانہ نظام کا ثبوت بس یہی ہے، جیسا کہ مسٹر اکرام نے فرمایا ہے، کہ اس کے یہاں چند خیالات کی تکرار کی جائے اور ان کو بار بار دُہرایا جائے تو میرا خیال ہے کہ سطور ماسبق میں ہستی یا حیات سے متعلق خیالات کی تکرار کافی پائی جاتی ہے اور کچھ اسی وجہ سے مجھے بھی بعض بحثوں کو بار بار دُہرانا پڑا ہے۔

ترتیب یا تبویب کے اعتبار سے ہستی اور حیات کے مسائل کا تعلق مابعد الطبعیات سے ہے جس میں اشیاء اور ان کے حقائق سے بحث ہوتی ہے۔ حیاتِ انسانی اور اس کے بعض مظاہر کی بحثیں نفسیات سے متعلق ہیں۔ غالبؔ کے کلام میں نفسیاتی اشارے بھی ہیں۔ اگر اُن اشاروں کو یکجا کر لیا جائے اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر لیا جائے تو غالبؔ کے فلسفۂ نفس پر ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نفسیات صرف انسان کے خلقی امتیازی نقاط اور اُس کی سیرت کے بعض ان پہلوؤں کا مطالعہ نہیں جو چار و ناچار پھوٹے پڑتے ہیں۔ یہ بات تو ہر معمولی مشاہد کو حاصل ہو سکتی ہے۔ نفسیات دراصل اس جزوی اور وقتی مطالعے سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس کا مطالعہ جزوی نہیں بلکہ کلی ہونا چاہیئے اور مختلف انسانی امتیازی خطوط کو ترتیب دیکر اس کی سیرت کی ایک مکمل تصویر تیار کرنا چاہیئے۔ انسانی کردار کی تصویر اس کے امتیازی خطوط اور مشاہدے کے ذاتی تجربات

کے رنگوں کی آمیزش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ غالب کے کلام میں جو نفسیاتی اشارے بکھرے ہوئے ہیں اُن سے انسان کے کردار کی کوئی پوری اور مکمل تصویر تیار نہیں ہوتی۔ وہ نامکمل اور ادھورے اشارے ہیں جو زیادہ سے زیادہ شاعر کی کلیاتی ژرف نگہی اور دِقتِ مشاہدہ کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اخلاقیات اور نفسیات (Ethics and Psychology) ایک ہی چیز کے دو مختلف پہلو ہیں۔ دونوں کا تعلق نفس اور حیاتِ انسانی سے ہے۔ نفسیات نام ہے انسان کی نفسی قوتوں اور ان کے اعمال و آثار کا جو بغیر ارادہ اور کبھی کبھی غیر شعوری طور پر انسان سے سرزد ہوتے ہیں۔ یہ اعمال، افعال، اور آثار انسان کے فطری اور جبلی نقوش ہیں جو نفس اور اس کی قوتوں میں کندہ ہیں۔ انسان کے اختیار اور ارادے کو ان اعمال میں دخل نہیں۔ وہ ان دھاروں کے رُخ کو بدل نہیں سکتا۔ اخلاقیات کا میدان انسان کے وہ اعمال ہیں جو ارادے اور اختیار کے ماتحت ہیں۔ جن میں تغیر و تبدل راہ پا سکتا ہے۔ اور ان کے دھاروں کا رُخ بھی دوسری طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ فطرت انسان کا نفسیاتی ٹھہراؤ اور سیرت ایک طرح کا اخلاقیاتی بناؤ ہے۔ اور چونکہ سیرت انسان کی اختیاری چیز ہے اس لئے اخلاق میں حسن و قبح یا نیک و بد کی بحثیں بھی ہوتی ہیں اور ان کے اعتبار سے اخلاقی قدریں Moral values متعین کی جاتی ہیں۔

اخلاقی قدریں اخلاقیات کے وہ غیر متبدل قوانین ہیں جن میں ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ اور جن کی بنیادیں کم سے کم اخلاقیات پر نہیں بلکہ مابعد الطبیعیات پر ہیں۔ عام طور پر اخلاقی قدروں کو ذاتی رجحانات (Tendencies) یا شخصی میلانات (Personal inclination) پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کوئی فطری یا نفسی شعور نہ ہو بلکہ تمام تر ماحول یا گرد و پیش کا اثر ہو۔ جو چیزیں ایک طویل مدت سے آس پاس کے لوگ ناپسند کرتے آئے ہیں اُن کی طرف سے ایک طرح کی نفرت انسان کی طبیعت میں متمکن ہو جائے اور پسندیدہ اشیاء و اعمال سے اُسے محبت ہو جائے۔

نفرت اور رغبت کا تعلق نفسیات سے نہیں بلکہ معاشرت سے ہے۔ معاشرہ جن چیزوں سے نفرت دلاتا ہے قدرتی طور پر فرد معاشرہ ان سے نفرت کرنے لگتا ہے اور جن چیزوں کو بہتر اور خوبتر صورت میں پیش کرتا ہے ان سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ نفسیاتی اصول ہے اور اسی اصول کے پیش نظر بچوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ اجتماعی یا عمرانی ہیجانات برپا کئے جاتے ہیں۔ عوام کے عواطف و جذبات سے کھیل کھیلے

جاتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ اخلاقی قدریں انسان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر مبنی ہیں۔ یا کم سے کم انھیں ان پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔

کانٹ نے اخلاقیات کو مابعد الطبیعات سے وابستہ کیا ہے اور اس نے اخلاقیات پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے "اساسیات مابعد الطبیعات اخلاق" (Fundamental of the metaphysics of ethics) اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اخلاقیات دراصل مابعد الطبیعات کی ایک شاخ ہے۔ اور شاید اس وجہ سے کہ اخلاقی قدریں، جنھیں کانٹ نے فرائض سے تعبیر کیا ہے، کھلم کھلا مابعد الطبیعات سے متضاد ہیں یا مابعد الطبیعاتی اصول پر قائم ہیں۔ اسی مابعد الطبیعاتی عنصر کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اخلاقی قدروں میں کبھی کوئی تغیر یا تبدل راہ نہیں پاتا۔

لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (القرآن)	تم کبھی خدا کی سنت یعنی الہیاتی اصول میں کوئی تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔

فطری مذہب کے اصول انہی غیر متغیر اخلاقی قدروں پر مبنی ہوتے ہیں جن کا معیار تربیت نفس اور اس کا ارتقاء ہے۔ اور یہی اصول فلسفۂ اخلاق کی غایات ہیں جن کے لئے ایک انسان کو جد و جہد کرنا چاہئے۔

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا۔ (القرآن)	کامیاب وہی ہے جس نے اپنے نفس کی تربیت کی اور جس نے اسے مہمل چھوڑے رکھا وہ ناکام رہا۔

کمال نفس کے لئے بے شبہ کچھ اسباب ہیں اور یہ اسباب ضرور ہے کہ نفس اور اس کے اعمال کے مناسب ہوں۔ جسم انسان کی تربیت و تمرین کے لئے بھی کچھ اعمال ہیں جن سے اس کی تربیت ہوتی ہے اور اس میں قوت و استحکام آتا ہے۔ ان اعمال کا جسم سے تعلق ہے اس لئے کہ وہ ہر حال میں اور ہر مقام پر اس کو فائدہ پہنچاتے اور اس کے بنانے یا بگاڑنے میں حصہ لیتے ہیں۔ اسی طرح اعمالِ نفس بھی ہیں۔ وہ بھی نفس کی تعمیر اور اس کی سربراہی میں بہت کچھ اپنی ذات سے دخل رکھتے ہیں۔ معاشرہ یا سوسائٹی کی رسوم و روایات اور اس کے معتقدات سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ اعمال دراصل صحیح اخلاقی ہدایات و تعلیمات ہیں جنھیں عصر حاضر کی اصطلاح میں اخلاقی قدروں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی بابت کانٹ وغیرہ حکماء نے جو درحقیقت جدید فلسفہ کے معمار ہیں، یہ کہا ہے کہ وہ خالص الہیاتی معیار ہیں جن سے کسی عمل یا فعل کے حسن و قبح کو پرکھا جا سکتا ہے۔

تزکیۂ نفس کے لئے عبادت یعنی خالق انفس و آفاق کی پرستش، اخلاقیات مذہب میں ایک ضروری سی چیز ہے۔ نفس کا اعلیٰ کمال ہے خالقِ کائنات کی صفات اپنے میں پیدا کرنا اور اُس کے لئے

ضروری ہے کہ خدا کی صفات میں غور و فکر کیا جائے اور اُس سے قریب تر ہو کر ان صفات کی جھلک بھی حاصل کی جائے۔ عبادت اسی فکر و نظر اور پرتو حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے۔

وَیتفکرُون فی خلق السمٰوٰت والارض	وہ برابر زمین اور آسمان کے خلق میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔
ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا۔	اور کہتے ہیں کہ اے خدا! تو نے ان کو لاحاصل پیدا نہیں فرمایا۔

ویدانت میں اعمال عرفاں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سنیاس یوگ اور کرم یوگ کرم یوگ کے معنی ہیں گیان حاصل کرنے کے لئے عملی جدّوجہد کرنا جس میں استتی (حمد) اور اُپاسنا (عبادت) بھی شامل ہیں۔ سنیاس یوگ ترک عمل سے حاصل ہوتا ہے اور ویدانت کی رُو سے وہ کرم یوگ کے بعد کا درجہ ہے جو طاعت و عبادت کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے گیتا میں کرم یوگ کو سنیاس سے افضل و برتر بتایا گیا ہے۔

سنیاسہ۔ کرم یوگش چہ۔ نی شریسَں کرَو۔ اُبھو۔	یوں تو سنیاس اور کرم یوگ دونوں بہتر ہیں۔
تیوستُو۔ کرم سنیاسات۔ کرم یوگو۔ وشِشتے۔	لیکن کرم یوگ سنیاس سے بھی اچھا ہے۔

(ادھیائے ۵ شلوک ۲)

دراصل سنیاس یوگ بھی ایک اعتبار سے کرم یوگ ہی ہے۔ بس اس قدر فرق ہے کہ سنیاس کیلئے ضروری ہے کہ یوگی (مجاہد) جملہ خواہشوں اور تمنّاؤں سے پاک ہو۔ اگرچہ یہ بات کرم یوگ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ نِشکام کرم (عملِ بے آرزو) ویدانت کی رو سے سب سے بڑی ریاضت اور سب سے اعلیٰ عملِ خیر ہے۔ ویدانتیوں کا خیال ہے کہ کرم پھل آسنگ (کرم کے پھل کی خواہش) ترک کر دینے سے جیو آتما (روح) کرم کے بندھن سے آزاد ہو جاتی ہے۔ کرم ہندو فلسفے میں تمام مصائب و آلام کی علت ہے اس لئے اس بلا سے محفوظ رہنے کے لئے وہ کچھ ضروری سا خیال کرتے ہیں کہ کرم یعنی عمل سے مجتنب رہیں۔ اس کی صورت ان کے نزدیک یہ ہے کہ نفس انسانی کرم بھی کرے اور اس سے پاک بھی رہے اور وہ اس طرح کہ کرم کے پھل کی خواہش قلب سے دُور کر دی جائے شری کرشن فرماتے ہیں:۔

برہمنی آدھائے کرمانی۔ سنگم تیکتوا۔ کروتی یہ۔ لِپیتے نہ سر پاپین۔ پدم پترم۔ اَمبھسا۔ (ادھیائے ۵ شلوک ۱۰)	جو پھل کی خواہش ترک کر دیتا ہے اور خدا پر اعتماد کرتے ہوئے کرم کرتا ہے وہ کبھی گناہ آلود نہیں ہوتا جس طرح کنول کی پتیاں پانی میں رہتے ہوئے بھی پانی سے پاک رہتی ہیں۔

جہاں تک ہندوؤں کے متصوفانہ رسائل یعنی اُپنشدوں کا تعلق ہے یہ غلط ہے کہ ان میں کرم یا عمل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کمال نفس کے لئے کم سے کم ان رسائل میں بھی عمل کو اتنی ہی اہمیت دی گئی ہے جتنی معرفت یا گیان کو۔ گیتا میں تو اس اعتبار سے علم و عمل میں سرے سے کوئی تفریق ہی نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ سانکھیہ (علم) اور یوگ (عمل) دونوں کو ہم معنی ظاہر کیا گیا ہے۔

سانکھیہ یوگو۔ پرتھگ۔ بالا۔ پرودنتی۔ نہ پنڈتا (ادھیائے ۵ شلوک ۴)	وہ نادان بچے ہیں جو سانکھیہ اور یوگ کو جدا جدا بتاتے ہیں۔

اس کے بعد ہے۔

ایکم۔ سانکھیم چ۔ یوگم چ۔ یہ پشیتی۔ سرپشیتی	جو سانکھیہ اور یوگ کو واحد دیکھتا ہے وہی دراصل بینا ہے۔

اپنشدوں کی تعلیم بھی یہی ہے کہ نجات یا کمال نفس کے لئے علم و عمل دونوں ضروری ہیں۔ لیکن اسلام اور ویدانت کی تعلیم میں ایک اساسی فرق ہے اور وہ ہے ویدانت کا کرم اور سنسار یعنی رُوح کا کرم کے چکر میں پڑ کر بار بار مختلف اجسام میں گھومنا۔ ویدانت کی تعلیمات کی رو سے گیان اور عرفان نفس انسانی کا سب سے بڑا کمال ہے اور اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ فلاح و کامرانی کا دارو مدار نفس کے برتو کمال پر ہے جو ریاضت، فکر کائنات، اور عبادت خالق آفاق کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ اعلیٰ کمال حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کے نزدیک جیو آتما کو بار بار جنم لینا پڑتا ہے اور گزرے ہوئے تمام تجربات سے پھر گزرنا پڑتا ہے۔ مگر اسلام اس چکر کو بے معنی خیال کرتا ہے۔ تجربات کی جو لہریں ایک بار گزر جاتی ہیں اس کے نزدیک پھر واپس نہیں آتیں۔ رُوح انسانی کا قدم اگر آگے نہیں بڑھتا تو پیچھے ہٹتا ہے اور یہ دونوں تجربے اس کے لئے نئے اور بالکل انوکھے ہیں۔

یہ سب کچھ سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عمل کا مقصد عمل کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہئے۔ عمل خود ایک بہت بڑی اخلاقی قدر ہے۔ وہ ایک بہت بڑا محرک ہے جو نفس انسان کے باطن میں ایک ہلچل پیدا کرتا ہے جس سے اس کی تمام خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ افسردہ صلاحیتوں میں ایک جوش و نشاط رونما ہوتا ہے اور وہ یک بیک اُبل پڑتی ہیں۔ خواہش نفس کے لئے افیونی اثر رکھتی ہے۔ وہ نفس کی جملہ فطری صلاحیتوں کو لوریاں دے دے کر سُلا دیتی ہے۔ اس لئے خواہش اور عمل دونوں میں ایک طرح کا تضاد ہے۔ خواہش دو طرح کی ہے۔ ایک ارتقا اور عمل کی خواہش دوسرے ثواب اور صلے کی خواہش۔ جو خواہش افیونی اثر رکھتی ہے وہ پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔ دوسری خواہش ہی عمل کی تحریک کو کم اور اس کے اثر کو زائل کرتی ہے۔ عمل اپنی ذات سے محرک ہے اور اس وجہ سے محرک ہے کہ وہ

خود ایک قدر ہے۔ ہر قدر اپنی ذات سے محرک ہوا کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ قدریں بے اثر نہیں۔ ان کا طبعی یا فطری طور پر ایک اثر بھی ہے جو ان کا نتیجہ یا حاصل کہلاتا ہے۔ عمل بھی ایک قدر ہے اور ضرور ہے کہ اس کا بھی ایک اثر ہو۔ لیکن یہ اثر اصل محرک نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ قدر قدر نہ رہے گی۔ اخلاقیات میں قدریں ایسی ہی ہیں جیسے ہندسیات میں دائرہ کے لئے اس کا مرکز۔ جب تک مرکز متعین نہ ہو دائرہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ اور اگر مرکز تبدیل ہو جائے تو اس کا اثر دائرہ پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ایک سے زائد مرتبہ اعمال کی جزا و سزا کا ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جزا یا سزا اُن اعمال کا اثر ہی اور اُن پر مترتب ہوتی ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا (القرآن)	جس نے کوئی نیک عمل کیا تو اپنے فائدے کے لئے اور اگر کوئی بُرا کام کیا تو اپنے نقصان کے لئے۔

یہ اخلاق اور فلسفے کا بنیادی اصول ہے۔ عمل صالح کی جزا صالح ہے اور کارِ بد کی سزا بد۔ گیہوں سے گیہوں پیدا ہوتا ہے اور جَو سے جَو۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اعمال اس لئے کئے جائیں کہ ان کا پھل ملے اور اس سے کوئی لذت حاصل ہو۔ عمل خود ایک لذت ہے۔ اگر اس سے الگ کسی دوسری لذت کی خواہش کی جائے تو یقیناً عمل کی لذت محسوس نہ ہو گی اور عمل خود محرک نہ رہے گا بلکہ اس کی یہ صفت اُس دوسری لذت میں منتقل ہو جائے گی۔ مابعد الطبیعاتی نقطۂ نگاہ سے اس میں سب سے بڑا ضرر یہ ہے کہ اس طرح اخلاقی قدروں میں جو الٹ پلٹ اور اول بدل ہوتی ہے اس سے سارا نظامِ اخلاق برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خالص اخلاقی زاویۂ نظر سے بھی اس میں بہت کچھ معائب ہیں۔ انہی مضرات اور معائب کے پیش نظر دیانت وغیرہ اخلاقی نظاموں میں روحانی ارتقا کے لئے جن اعمال پر زور دیا گیا ہے وہ بے غرضانہ اعمال ہیں۔ یہ اعمال جو شائبۂ حرص و طمع اور لوث طلب ثواب سے پاک ہیں نفس میں ایک خاص قوت اور استحکام کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کی تربیت کرتے ہیں اور اُسے خدا سے قریب تر بنا کر وہ قابلیت بخشتے ہیں جن سے وہ قدسی صفات کا پرتو قبول کر سکے۔ طاعت و عبادت کی غایت ہرگز یہ نہیں کہ جنت اور اس کی نعمتیں حاصل کی جائیں۔ کم سے کم عابد کا مطمح نظر یہ نہ ہونا چاہیئے اور اگر جنت یا اس کی نعمتوں کی طمع عبادت کے لئے محرک ہے تو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے وہ عبادت عبادت ہی نہیں۔ فیلسوف اسلام بوعلی سینا نے لکھا ہے۔

العارف یُرید الحق الاول لا یشئی غیرہ ولا یُوثر شیئاً علیٰ عرفانہ ویعبدہ لہ فقط ولا نہ مستحق	عارف کا نصب العین خدا کی ذات اور اس کی معرفت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے اسکی پرستش

للعبادة ولا هنا نسبة شريقة اليه لا لرغبة او لرهبة (لباب الاشارات مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲۱)

کرتا ہے کہ وہ اس کا مستحق ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی غرض و غایت نہیں۔

بہادر وہ ہے جو اپنی طبیعت سے شجاعت کے نشئے میں سرشار ہو کر جوانمردی کے جوہر دکھاتا ہے۔ سخی وہ ہے جو عطا اور بخشش کو انسان کا جوہر شریف سمجھ کر دستِ سخا بڑھاتا ہے۔ عفت کا بھی فضائل اخلاق میں شمار ہوتا ہے لیکن اس وقت جب اُس کی غرض و غایت عفت کے سوا کوئی اور تحصیل طمع نہ ہو۔ یہ سب فضائل ہیں جو اپنی ذات سے اخلاقی قدریں ہیں اور اُسی وقت قابلِ قدر ہیں جب اپنی ذات سے محرک بھی ہوں۔

قرآن شریف میں جنت اور اُس کی لذتوں کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ اس سے بعض اصحاب کو یہ شبہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے عبادت کی غرض و غایت جنت اور اس کی بے شمار لذتوں کی تحصیل ہے۔ یہ سراسر غلط اور قطعی بے بنیاد ہے۔ بہرحال طاعت کا اجر ہونا چاہیئے۔ یہ سب کچھ اجر طاعت ہے اور ضرور ہے کہ ایک عابد اس سے بہرہ اندوز ہو۔ لیکن طاعت کی غرض دراصل یہ اجر نہیں بلکہ اس سے بالاتر ایک اخلاقی قدر ہے۔ یہی اخلاقی قدر عابد کا مطمحِ نظر اور اُس کا اعلیٰ نصب العین ہے۔ قرآن شریف میں اس کو "تقویٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے جو اپنے معنی کے اعتبار سے بہت وسیع ہے اور شاید جدید فلسفۂ اخلاقیات کی تمام قدریں اسی ایک مختصر سے لفظ میں سمائی ہوئی ہیں۔ فلسفۂ قرآن کی رو سے نفسِ انسانی کے جملہ ارتقائی مراحل اسی ایک قدر یعنی تقویٰ سے وابستہ ہیں۔ روح تقویٰ کے سہارے ترقی کرتی ہے۔ روح کی بالیدگی نام ہے اس کے کمال کا جو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک روح میں تقویٰ کے تمام امکانی محاسن نشوونما نہ پا جائیں۔ ملاحظہ فرمایئے خدا نے عبادت کی غایت کیا بتائی ہے۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

اے لوگو! اپنے اُس پروردگار کی جس نے تمہیں اور تمہارے بزرگوں کو خلق فرمایا پرستش کرو۔ تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔

روزہ بھی عبادت کی ایک قسم ہے۔ اس کی بابت ارشاد ہوا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

روزہ اس لئے تم پر فرض کیا گیا کہ تم میں صفت تقویٰ پیدا ہو جائے۔

قربانی جو مناسکِ حج میں بہت اہمیت رکھتی ہے اس کی غایت بھی یہی تقویٰ ہے۔

لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن

قربانی کا گوشت یا اُس کا خون خدا تک نہیں پہنچتا۔ وہ

ینالھا التقوی منکم۔	تمہارا تقویٰ ہے جو اُس کی خوشنودی کو پا لیتا ہے۔

لاکھ مسجدیں تعمیر کرائیے۔ اگر تقویٰ نہیں تو سب ہیچ ہے۔

لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ۔	جس مسجد کی بنیادیں روز اول سے تقویٰ پر ہیں آپ کو اُسی میں نماز ادا کرنا چاہئے۔

کہاں تک تفصیل کی جائے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور عبادت کی کوئی صورت ایسی نہیں جس کی روح اسلام یا قرآن نے تقویٰ نہ بتائی ہو۔ لباس کی بابت فرمان ہے۔

ولباس التقوی ذالك خیر۔	تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے۔

توشے کے متعلق ارشاد ہے۔

وتزودوا فان خیر الزاد التقوی	کھانے کا سامان کرو اور یاد رکھو کہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

یہ آیات ونصوص کافی شہادت ہیں اس امر کی کہ اسلامی عبادات کی غایت تحصیل اجر وثواب نہیں۔ اسلام نے بڑی عبادت یہی بتائی ہے کہ وہ عبادت کے سوا کسی اور منفعت یا مقصد کے لئے نہ کی جائے۔

دراصل اس عبادت سے نفس کا تزکیہ بھی نہیں ہوتا جس میں اخلاقی قدر سے پست تر کسی دوسری غرض کا شائبہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ عبادت نفس میں بہت سی اخلاقی بیماریاں پیدا کر دیتی ہے جس سے نفس انسانی آیندہ ارتقا کی راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ پندار سب سے بڑی اخلاقی بیماری ہے جو رُوح کے لئے زہر کا سا اثر رکھتی ہے۔ یہ بیماری خصوصیت کے ساتھ اس عبادت سے پیدا ہوتی ہے جو تحصیل اجر وثواب کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک طرح کا سودا ہوتا ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے اور جس میں "لے اور دے" یعنی give and take والی ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔ اس عبادت کا تصور مبنی ہے عمل اور اس کی اثر کی بے تعلقی پر اور کلیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ بے تعلقی ایک عظیم ترین بے راہ روی ہے عمل دراصل رُوح کی ایک صفت ہے یا اس کی ایک خاص کیفیت ہے۔ اوّلاً روح کی بناوٹ پر عمل کا ایک گہرا اثر ہوتا ہے۔ پانی کی موجیں پانی سے کس طرح جدا کی جا سکتی ہیں۔ سطح آب پر ہر لہر پانی کی عمیق تہوں تک جاتی ہے اور اس میں ایک ہلچل پیدا کرتی ہے۔ عمل بھی روح میں ایک طرح کا باطنی انقلاب پیدا کرتا ہے جس کے زیر اثر اس کی دنیا ہی بدلجاتی ہے۔ پندار رُوح کی گرمی کو کم کرتا ہے۔ اس کی اصلی تڑپ اور بیچینی کو دُور کر کے اس میں موت کی سی بے حسی اور جمود پیدا کر دیتا ہے۔ نظیری کہتا ہے ؎

طاعت مانیست غیر از ورزش پندار ما
ہست استغفار ما محتاج استغفار ما

(۲)

غالب اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ طاعت و زہد فضائل اعمال و اخلاق میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ طاعت ہی کیا جو طلبِ ثواب کے لئے ہو اور وہ زہد ہی کیا جو حور و غلمان اور لذات و شہوات پر مقصود ہو۔ ترکِ طمع، طمع کے لئے اور ترکِ حرص، حرص کی غرض سے فلسفۂ اخلاق کا شاید سب سے بڑا خیال محال (Paradox) ہے۔ ایک مفلس اور نادار کی امداد کسی رقم سے کی جائے اور اس سے زیادہ خطیر رقم کی آرزو رکھی جائے کم سے کم اخلاقیات میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ ایک طرح کا سودی کاروبار ہے اور طاعت کے نام سے معصیت کا بیوپار ہے۔ اس سے بڑھکر الفاظ میں اور کوئی تصرف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ماہیتوں کا انقلاب اور حقیقتوں کا مسخ ہے جو نہ صرف یہ کہ ایک اخلاقی جرم ہے بلکہ ادبی خطا بھی ہے۔ غالب فرماتے ہیں ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ ہمارے شاعر کی سلامتِ طبع اور استقامتِ ذوق کی واضح شہادت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ طاعت و زہد کا اجر ملنے والا ہے لیکن وہ نہیں چاہتے کہ اس اجر و ثواب کے لئے طاعت ایسی متاعِ بے بہا کا سودا کریں۔ طاعت و زہد اپنی جگہ قابل قدر اعمال ہیں اور ان میں وہ جذب و کشش بھی ہے جو ایک انسان کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ ان اعمالِ خیر کو اجر و ثواب کی قربان گاہ پر چڑھانا گویا حسنِ عمل کو ذبح کر دینا ہے۔ غالب کے شوخ نگار قلم نے جنت اور اُس کی نعمتوں کے ساتھ جو مزاحیہ چھیڑ چھاڑ کی ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ جنت کے منکر ہیں یا اسلام کی بتائی ہوئی جنت کے ساتھ تمسخر کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ ان حقائق کی طرف اشارے ہیں۔ شوخ اور لطیف اشارے۔ جن کو بے نقاب کرنے کی سطور بالا میں سعی کی گئی ہے۔ غالب کے فکر و قلم کی ایک خصوصیت ہے ظرافت اور شوخی۔ کچھ اس لئے وہ مجبور ہیں کہ ان فلسفیانہ حقائق کا ذکر اپنے مخصوص رنگ میں فرمائیں ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

بیخودی ایک کیف ہے جس پر ہزار حالتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ یہ کیف ایک قسم کی خود فراموشی اور جسمانی بے سروسامانی ہے۔ اس کا اوّلین تقاضا ہے کہ خود کا ہیاں خواہ وہ کسی شکل و صورت میں بھی ہوں یکسر محو کر دی جائیں۔ اسی سرور آمیز کیف کا حصول غالب کو مے نوشی پر مجبور کرتا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

یہی کیف ہے جس نے باغ رضواں کو ان کے لئے "گلدستۂ طاق نسیاں" بنایا۔ ہو سکتا ہو کہ شاعر کے زاویۂ نگاہ سے بھی جنت کا وجود ہو اور ان ہی حسّی یا مادّی لذتوں کے ساتھ جن کا ذکر دانایان دین کیا کرتے ہیں لیکن خود شاعر پر جو کیف بیخودی طاری ہے اس نے کم سے کم جنت اور اس کی عیش سامانیوں کی یاد کو اس کے تحت الشعور سے بھی محو کر دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ جنّت کی یاد سے اپنا دل بہلائے۔ وہ اپنی یاد کو اُس سے بالاتر تصور سے آباد رکھنا چاہتا ہے اور شاید اسی لئے جنت تو رہی یک طرف وہ اپنی ہستی کے احساس کو بھی مٹا دینے کا آرزومند ہے ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عبادت اور جنّت کے خیال سے غالب کے نزدیک اس سے بدتر ذہنیت نہیں ہو سکتی۔ جنّت دل کو خوش رکھنے کے لئے ہو سکتی ہے لیکن عبادت کی غرض و غایت دل خوش رکھنا نہیں بلکہ اس سے برتر اور فائق تر ایک اور تصور ہے جو اگر جنّت میں دستیاب نہیں تو اس کے لئے جنت کو بھی خیرباد کہا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنّت حور و غلمان سے آباد ہے اگر یہ صحیح ہے تو غالب حور و غلمان سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ اپنی کیف بیخودی کو ان نعمتوں سے بدرجہا بہتر خیال کرتے ہیں ؎

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

غالب مئے گلفام کے دلدادہ ہیں اور ساغر و مینا پر اس درجہ ریجھے ہوئے ہیں کہ انھیں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی جدائی گوارا نہیں۔ جب تک آنکھوں میں دم ہے اور وہ ساغر و مینا کو دیکھ سکتے ہیں انھیں سامنے سے ہٹانا نہیں چاہتے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ان کا عقیدہ ہے کہ بادۂ گلفام حیاتِ تازہ کا پیغام ہے ؎

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ان کے یہاں شراب بھی کئی طرح کی ہے۔ اور جن شیشوں میں اس کو بھرا گیا ہے ان پر مختلف قسم کے لیبل لگے ہوئے ہیں۔ واعظ نے انھیں بتایا ہے کہ جنت میں بھی جام شراب کے دَور چلیں گے اور میگساران ازلی وہاں بھی خم پر خم لنڈھائیں گے۔ لیکن واعظ کی اس شراب طہور کا یہ حال ہے کہ ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

قرآن شریف نے اس شرابِ طہور کی بابت اس قدر فرمایا ہے۔

لَا یُصَدَّعُونَ عَنھَا وَلَا یُنزِفُونَ | اس کا اثر یہ ہے کہ نہ اس سے خمار ہوتا ہے اور نہ یاوہ گوئی۔

ایک دوسرے مقام پر ہے۔

لا لغوٌ فیھَا وَلا تاثیم۔ | نہ اس میں یاوہ گوئی ہے اور نہ کسی قسم کا گناہ۔

غالب کی وہ چیز جس کے لئے بہشت انھیں عزیز ہے نہ مئے مغانہ ہے جو ساغر و مینا میں جلوہ فرماتی ہے اور نہ واعظ کی "شراب طہور" ہے جس کے تصور سے شب بیدار عابد کو طاعت و عبادت کی تلخیاں تک گوارا ہیں بلکہ اس سے بالکل مختلف اور سراسر جُدا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

غالب کی یہ شراب مشاہدۂ حق کی شراب ہے اور وہ جنت میں اُس وقت تک جانے کے لئے آمادہ نہیں جب تک انھیں یقین نہ دلا دیا جائے کہ مشاہدۂ حق کی شراب سے جس کے لئے انھوں نے 'گلفام' اور 'مشکبو' ایسے حسین الفاظ استعمال کئے ہیں' شادکام ہوسکیں گے ؎

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی بہشت کے طالب ہیں۔ لیکن کس بہشت کے جو شبستانِ حور و غلماں ہے جس میں شہد و شیر کی نہریں مستانہ لہریں مار رہی ہیں۔ جہاں شادکامی و کامرانی کے دل نواز نغمے فضا کو نغمہ زار بنائے ہوئے ہیں۔ ہرگز نہیں وہ اس بہشت کو شایدزینتِ طاق نسیاں بنانے کے لئے

بھی تیار نہ ہوں۔ وہ جس بہشت کے خواہاں ہیں اس کی بابت ان کی معصوم آرزو ہے ع
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

شاہد ازلی کا دیدار جنت کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے اور اگر غالب کو یہ سعادت جنت میں حاصل نہ ہو تو شاید وہ اس پر دوزخ کو ترجیح دیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ طاعت ایسا جذبۂ بے بہا حور و غلماں اور شیر و شہد کے لئے وقف نہ ہونا چاہئے۔ عبودیت نام ہے عجز و افتادگی کا۔ اظہار ارادت اور بذل نفس کا اور یہ چیز کچھ مناسب نہیں کہ معمولی یا حقیر ترین لذتوں اور نفسانی خواہشوں پر قربان کر دی جائے۔ اس سے زیادہ اس شریف جذبے کی توہین نہیں ہو سکتی، انسان فاطر ہستی کا شاہکار ہے اور اس وسیع ترین کائنات میں اس کا جانشین بھی۔ اس کے مقاصد اور نصب العین ہی سے اس کی فطرت کی بلندی کا ثبوت مل سکتا ہے۔ رفعت فطری کی آبرو ریزی ہے کہ جس کے روبرو ملائک زمین بوس ہوں وہ کمترین لذائذ کے لئے اپنی روحانی عظمتوں کو پامال کرے۔ غالب اس جذبے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور مجبور ہو کر انھیں کہنا پڑتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

کلام کی گرمی اور تخیل کی حرارت ملاحظہ فرمائیے۔ اگر بہشت انسان کے بلند ترین جذبات و حسیات کی بے آبروئی کا باعث ہے تو اسے ضرور نذر آتش کر دینا چاہئے۔ اس بہشت کا مقام دوزخ کے اسفل ترین طبقات ہی ہو سکتے ہیں۔

مولانا حالی نے غالب کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں ؎

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

غالب کی بابت یہ نہایت صائب رائے ہے۔ اور جہاں تک غالب کے فلسفہ کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ وہ زہد و طاعت کو تزکیۂ نفس اور طہارت قلب کے لئے کچھ زیادہ موثر خیال نہیں کرتے ان کی نگاہ میں رسم پرستی انسان کی فطرت میں ایک بدترین جذبہ ہے جو روح کو برتر بنانا تو بہت بڑی بات ہے اس کی فطری صلاحیتوں کو بھی ہمیشہ کے لئے دفن کر دیتا ہے۔ رہ و رسم عام کی غالب نے ہمیشہ مذمت کی اور وہ اس جذبے کو سراہا کئے جو نئی راہیں اور خاص روشیں طلب کرنے پر انسان کو ابھارتا ہے۔ دراصل یہی جذبہ ہے جو انسان کی سوئی ہوئی قوتیں بیدار کر سکتا ہے اور

اس کی دبی ہوئی چنگاریاں سُلگا سکتا ہے۔ رسم پرستی ایک طرح کی روحانی بے حسی اور جذباتی خمود ہے۔ قدیم رسمیں گویا فضول زنجیریں ہیں جن میں چار و نا چار انسان اُس وقت تک جکڑا رہتا ہے جب تک اس میں خاص امنگ پیدا نہ ہو۔ اور یہ امنگ اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب رسم کی قیدیں کسی باطنی جوشش اور گرمی کے زیر اثر ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ اور اس میں اُن سے رہائی حاصل کرنے کا شوق کسی قدر تیز تر ہو جاتا ہے۔ محبوب کے لئے جان دینا مذہب عشق و محبت کا صالح ترین فعل ہے۔ لیکن غالب اسے ناپسند فرماتے ہیں اگر یہ کام قدیم رسوم کے ماتحت انجام دیا گیا ہو ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

فرہاد تو راہِ محبت کا دیوانہ تھا۔ جو اپنے کو فرزانہ کہتے ہیں وہ بھی کچھ کم پابند رسم و رہِ عام نہیں ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں

پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

عبادت کی نوعیت بھی رسم پرستانہ ہے۔ عام طور پر عابد و زاہد اسی طرح زہد و عبادت کے خوگر ہو جاتے ہیں جس طرح غالب دُکھ سہنے اور اندوہ و الم اُٹھانے کے ع

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

اس اصول کے مطابق " زہد کا خوگر ہوا زاہد تو پھر وہ زہد کیا؟ اور شاید یہی مفہوم اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے۔ لا یبقیٰ مِنَ الاسلام اِلّا اِسمہ وَمِنَ الایمان اِلّا رسمہ (اسلام کا نام اور ایمان کی رسم رہ جائے گی اور بس)۔

اس کے علاوہ زہد متعارف میں ایک خطرہ اور بھی ہے اور وہ ہے ریا اور سمعہ۔ یعنی ارادت مندوں اور معتقدوں کو دکھانے اور سنانے کے لئے عبادتیں کرنا۔ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے اس قسم کی طاعت و عبادت قطعی بے سود ہے اور یقین ہے کہ وہ متاع کاسد کی طرح عابد کے مُنہ پر ماری جائے گی۔ لیکن غالب کا نقطۂ نظر اس باب میں زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عبادت وہی ہے جس میں پاداش کی طمع نہ ہو اور جو طلب اجر و ثواب کے لئے نہ کی جائے۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی اعلیٰ تر غایت یہی بے غرضی ہے اور غالب نے بہشت یا اس کی نعمتوں کے ساتھ جو استہزا کیا ہے اس کی وجہ بھی یہی اخلاقی نکتہ ہے ؎

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

سکونِ خاطر اور طمانیت قلب بھی اخلاقی قدروں میں شامل ہیں اور یہ صفات دراصل نتیجہ ہیں روحانی استحکام اور نفسی ارتقا کا۔ عام انسان کی فطرت ہے کہ وہ حالات کے ساتھ ساتھ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ خود ہی نظرئے بناتا ہے اور پھر خود ہی بگاڑ دیتا ہے۔ اپنی طبعی خواہش کے مطابق مورتیاں بنا بنا کر ان کی پرستش کرتا ہے اور یہ مورتیاں اس قدر نازک ہوتی ہیں کہ ذرا سی ٹھیس انھیں چور چور کر دینے کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عہدِ جاہلیت میں عرب کے ایک قدیم قبیلے نے بھی مٹھائی کی ایک مورتی بنائی تھی اور مدتوں وہ اُس کی پرستش کرتے رہے، لیکن جب گرسنگی کے احساس نے انھیں بے چین کیا تو بے باکانہ انھوں نے اشتہا کے دیوتا پر اُسے بھینٹ چڑھا دیا۔ انسانی مزاج کا یہ تلون نفسیات میں بہت مشہور ہے اور مذہب کی تاریخ میں اس کی نہایت دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن شریف میں بھی عام انسان کی اس ہمہ گیر فطرت کا ذکر ہے۔

فان اصابہ خیر اطمأن بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علیٰ وجھہ	اگر انسان اچھی حالت میں ہے تو مطمئن ہے اور اگر اُسے کوئی چشم زخم پہنچتا ہے تو کفر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

نفس کی سب سے بڑی کمزوری یہی نا استواری ہے جس سے اُس کی اخلاقی پستی کا اظہار ہوتا ہے۔ کمالِ نفس کی علامت ہے اس کی استواری اور استحکام اور جب یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے اور مجاہد اس درجے پر فائز ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک کوہِ گراں کی طرح وہ عالمِ مادّی کے جملہ انقلابات، تغیرات، اور حوادث کا پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ یہ حالت اوّلیں منزل ہے عشق و شیفتگی کی اور غالب اس منزل کی تمام راہوں سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ وہ اس وفادارانہ استواری کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں ؎

موجِ غم سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ایمان کا حاصل بھی یہی وفادارانہ استواری ہے۔ حدیث میں ہے علیکم بدین العجائز (بیرزنوں کا سا ایمان اختیار کرو) پیرزن کے دین و ایمان کی خصوصیت ایک طرح کی استواری ہوتی

بختہ کاری ہے۔ اگرچہ اس استواری کی وجہ اُن کے ایمان کا استحکام اور نفس کی استقامت نہیں تاہم ان میں متشددانہ استواری پائی جاتی ہے۔ اور ان کے عقیدہ میں بھی ایک خاص قسم کا استحکام ہوتا ہے۔ اخلاقیات میں یہ استحکام نفس کی استواری اور ہموارانہ کیفیت کا رہینِ منت ہوتا ہے اس لئے اس کی پائندہ حیثیت ہے اور سزاوار ہے کہ اُسے اخلاقی اقدار میں امتیاز بھی حاصل ہو۔

غالبؔ نے اسی نکتہ کے پیشِ نظر اس وفاداری کو سراہا ہے جو استواری کے ساتھ ہے اور نہ صرف یہ کہ سراہا ہے بلکہ ایمان کی اصل اور اس کا ضمیر مایہ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ایمان کی حقیقت اگر استوارانہ وفاداری ہو تو کفر اس حالت کا نام ہو جو قرآن شریف کی مذکورۂ بالا آیت میں بیان کی گئی ہے اور جسے ہم تلوّن یا نا استواری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کفر ایک قسم کی وقت پرستی ہے۔ ایک طرح کا بے اصولا پن ہے۔ ایک نازک اور ہلکے سے پر کی طرح ہوا کے ساتھ اِدھر اُدھر اُڑتا ہے۔ یہ کیفیت در اصل نتیجہ ہے نفس کے باطنی ضعف کا اور اخلاقی طور پر اس کی پستی کا۔ جب تک یہ ضعف قائم رہتا ہے نفس کے اعمال میں کوئی گیرائی، اثر اور خلوص پیدا نہیں ہوتا۔ عمل کی گیرائی نفس کا عشق اور اس کی گیرائی ہے اور نفس کی گیرائی اس کے ایمان کی استواری ہے۔ یہی ایمان کی استواری انسان کی تمام کامیابیوں اور شادکامیوں کا سبب اصلی ہے جسے عام مذاہب کی اصطلاح میں نجات و فلاح کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

انسان کی زندگی میں انقلاب ممکن نہیں جب تک اس کی روح میں ایمان کی استواری رونما نہ ہو یا جب تک اس کے نفس میں گہرائی اور عمل میں گیرائی کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ نفس کی یہ کیفیت در اصل اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک اصل حقیقت تک اس کی رسائی نہ ہو۔ کاذب محبت اور باطل معبودوں کی پرستش کا جذبہ کبھی اتنا استوار اور پائدار نہیں ہوتا کہ وہ انسان کے قلب میں عشق اور اس کے اعمال میں خلوص یا راست بازی کا کوئی شائبہ بھی پیدا کر سکے۔ انسان آخری منزل پر پہنچنے سے پہلے بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ جب تک اس منزل کے آثار نظر نہ آئیں اس کی بے راہ روی اُسے ہر طرف سرگرداں رکھتی ہے۔ اس لئے غالبؔ نے یہ تو بجا فرمایا "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے" لیکن برہمن کا بت خانے میں مر کر کعبہ میں دفن ہونا اس کے شوخ قلم کی شوخ نگاری ہے۔ غالبؔ کی بابت یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ

اگر وہ اس منزل تک رسائی حاصل نہ کرسکے تو وہ اس کی پُر پیچ راہوں سے آگاہ ضرور تھے بلکہ اپنے کلام میں جس طرح انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ اس منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ذیل میں جو شعر دیا جا رہا ہے اس کا زور، خلوص، اور بلند آہنگی اس کا واضح ثبوت ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

حیات بھی ایک اخلاقی قدر ہے جس کے لئے جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حیات کی بھی کئی صورتیں ہیں اور وہ سب جاذبِ توجہ نہیں۔ ان میں سے بعض صورتیں اس قابل ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے۔ فرشتے بھی حیات ہیں اور شیطان بھی، لیکن فرشتے کی زندگی ہی اس قابل ہے کہ اُس پر رشک کیا جائے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کی سعی کی جائے۔ شیطان نے روزِ ازل خدا سے عمرِ دراز کی درخواست کی۔ خدا نے بخوشی اس کی درخواست کو منظور فرمایا اور کہا انک من المنظرین (تجھے مہلت دی جاتی ہے) شیطان نے یہ مہلت اس لئے طلب کی تھی کہ وہ آدم اور اس کی بھولی بھالی نسل کو فریب دے کر خدا کا باغی بنائے۔ ظاہر ہے کہ یہ غرض نہایت مکروہ اور حد درجہ قابلِ نفرت ہے اس لئے وہ زندگی بھی یقیناً گھناؤنی ہونی چاہئے جو اس غرض کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ کسی چیز کی قیمت کا اندازہ اس کی قدر (Value) سے ہوتا ہے۔ عام طور پر زر و مال سے اشیاء کی قیمتوں کا حساب لگایا جاتا ہے اور ان کا باہمی تفاوت بھی دریافت کیا جاتا ہے۔ زہر زیادہ قیمتی ہے اس لئے کہ بازار میں اس کی قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے۔ تریاق (زہر مار) اس کے مقابلے میں کم قیمت پر فروخت ہوتا ہے اس لئے کم قیمت ہے۔ یہ ذہنیت ہے عام اہلِ زر کی جو زر و مال کو سب سے بالاتر قیمت یا قدر قرار دیتے ہیں اور اُسے معیارِ قیمت بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا تبادل اِسی حساب سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی جو اخلاقی قدروں کی اہمیت اور ان کے حکیمانہ اثر کا صحیح اندازہ رکھتا ہے اس تاجرانہ ذہنیت کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس سلسلے کی اہم ترین قدر افادیت ([illegible]) ہے۔ وہ اشیاء کی قیمتوں کا حساب افادیت سے کرتا ہے۔ ہرچند زہر تریاق کے مقابلہ میں گراں تر ہے لیکن چونکہ تریاق نافع اور مفید ہے اس لئے اس کی نگاہ میں تریاق زہر سے زیادہ قیمتی اور بہتر ہے۔ مولانا نظیری فرماتے ہیں۔

ہرچند ز تریاق بود زہر گراں تر
زیں جنس بصد من ندہم نیم عدس را

غالب اشیاء اور اعمال کی حقیقی قدروں سے باخبر ہیں اور اسی وجہ سے انھوں نے مذہبی اعمال و

افعال اور عام اسلامی عقائد و شعائر کی حقیقتیں ان سے مختلف بتائی ہیں جو عام ظاہر اصحاب دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی دقتِ نظر اور عمقِ فکر کی ایک بیّن شہادت ہے۔ خضر علیہ السلام کی بابت عام عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہیں لیکن نظروں سے غائب ہیں۔ اِس نوع کی زندگی کو قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تمنا کی جاتی ہے اور اس کی تحصیل کے لئے اوراد و وظائف مخصوص کئے جاتے ہیں لیکن غالب کا خیال ہے کہ خضر کی اس زندگی سے جو اگرچہ زمانہ کے اعتبار سے ایک طویل ترین اور غیر منقطع سلسلہ ہے ہماری یہ مختصر سی زندگی بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں خفا اور استتار ہو۔ جو چوروں کی طرح گمنامی میں بسر کی جائے اور گوشۂ خمول میں گزاری جائے۔ زندگی دراصل وہی ہے جس میں کامل اشتہار و اعلان پایا جاتا ہے۔ اور خلق کی روشناسی اس کا اصل سرمایہ ہے۔ اخلاقی اقدار کی بابت نظریہ کے اس اختلاف کو بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر شاعرانہ اسلوب نہیں ہو سکتا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

مذہب کا فلسفہ درحقیقت مذہبی اعمال و افعال کی رُوح ہے جو عام اصحاب کے لئے روایات، رسوم، اور خرافیات (myths) کے پیکروں میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر دانشمند اور نکتہ رس مبصر مذہب کے اس فلسفے کو آسانی کے ساتھ ان کے ظاہری پیکروں سے مجرد کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت اُن نظر بازوں کو اس طرح عریاں نظر آتی ہے جیسے شرابِ احمر مینا کے شفاف جسم میں لرزاں رہتی ہے۔ اصل مذہب ان حضرات کے نزدیک مذہب کی روح ہے نہ کہ ان کے ظاہری اور محسوس پیکر۔ وہ بادۂ گلفام کے شیدا ہیں نہ کہ جام و مینا کے۔ غالب اسی قسم کے حقیقت بیں نظرباز واقع ہوئے تھے۔ وہ مذہبی رسوم و قیود پر مٹنے والے انسان نہ تھے۔ وہ مذہب کی اصل روح کے شیدائی تھے اور ایک سچے موحد کی طرح، جو کائنات کی اس گوناگوں کثرت میں بھی وحدت ذات و صفات کے جلوے دیکھتا ہے۔ مذہب کے ان بے جان پیکروں کے انبار میں اور رسوم و روایات کے اس انبار کے نیچے مذہب کی روح تڑپتی ہوئی دیکھتے تھے یہ ان کے تجریدی فکر (Process of abstraction) کا عمل تھا جسے سطح بین ناقدین اُن کے مذہبی جذبے کی سستی اور اس کا ڈھیلا پن خیال کئے ہوئے ہیں۔ یہ مذہب کی روح مشہور فلسفی ہیگل کی اصطلاح میں روحِ عصر (Spirit of the Age) ہے جو مختلف افکار، خیالات، تصورات، رسوم کے عمل مجادلہ (Dialectical process) کے بعد بھی اپنی حالت پر باقی رہتی ہے۔ ایک برقرار رہنے والا اور پائندہ جوہر ہے جو مختلف حالات اور گرد و پیش کے لباسِ مستعار میں جلوہ گر ہوتا ہے ایک وحدتِ فکری ہے جو رسوم و روایات کی کثرت میں پنہاں ہے۔ اس وحدت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف ملتوں کی کثرت رفع کر دی جائے اور مستعار لباس کو نوچ کر پھینک دیا جائے۔ اس کے بعد...

حضرت شاہ مہدی عطا صاحب قدس سرہٗ کا بیان

قصبہ سلون کا خاندانِ کریمی

میں محمد مہدی عطا سجادہ نشین سلون اپنے خاندان کے حالات و اقتدار کہ جن کا علم زبانی بزرگان و تحریرات بزرگاں سے مجھ کو حاصل ہے حلفاً تحریر کرتا ہوں :-

مورثِ اعلیٰ فقیر کے حضرت شاہ پیر محمد سلونی قدس اللہ سرہٗ ہیں۔ آپ مجمعِ فضائل کسبی و وہبی تھے۔ مورثان آپکے عرب سے ملکِ یمن میں متوطن ہوئے۔ زاں بعد بوجہ وقوع حوادث ہندوستان میں آئے۔ اور شہر ناگور میں مقیم ہوئے۔ زاں بعد جونپور مسکن آبائے کرام آنحضرت کا رہا۔ قاضی حمید الدین ناگوری آپکے بزرگوں میں سے بہت مشہور و معروف ہیں۔ ذکر اُن کا اخبار الاخیار میں جو مولفہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی ہے صفحہ ۴۴ میں مرقوم ہے۔ یہ کتاب ۹۹۹ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ اور ذکر شیخ بہاء الدین جونپوری و شیخ ادھن جونپوری علیہم الرحمۃ کا کہ یہ بھی آپکے بزرگوں میں تھے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ و صفحہ ۲۲۷ میں موجود ہے۔ والد ماجد آپکے شاہ عبد النبی صاحب سلون میں مقیم ہوئے اور شاہ پیر محمد سلونی کی ولادت سلون میں ہوئی جب آپ سنِ شعور کو پہونچے بقصد تحصیل علوم مانکپور (ضلع پرتاب گڑھ) گئے۔ اُس وقت وہ قصبہ دار العلم تھا مدرسہ مانکپور میں جو مشہور کالا مدرسہ ہے اور اس وقت تک کچھ آثار اُس مکان کے باقی ہیں تحصیل علوم کرتے رہے۔ بعد فراغت تحصیل علوم ظاہریہ کے خدمتِ بابرکت میں حضرت شاہ عبد الکریم صاحب مانکپوری کے حاضر ہو کر کسبِ علوم باطنیہ و سلوک مقاماتِ درویشی کیا حضرت شاہ عبد الکریم صاحب عمدہ ترین اولاد حضرت مخدوم شاہ حسام الحق قدس اللہ سرہٗ و صاحب سجادہ آنحضرت کے تھے۔

شاہ عبد الکریم صاحب نے شاہ پیر محمد سلونی کو تعلیم و تربیت علوم معرفت کی فرمائی۔ اور بعد تکمیل کے آپ کو حکم اقامت قصبہ سلون کا دیا اور فرمایا کہ مسکن قدیم کو ترک کرکے جو ٹیلہ قریب مزار شہدا واقع ہے وہاں سکونت کرو حضرت بموجب حکم اپنے پیر و مرشد کے سلون تشریف لائے۔ اور اس ٹیلہ پر مقیم ہوئے۔ چنانچہ درگاہ و مسجد و خانقاہ و مکانات سکونت و مدرسہ اس جگہ ابتک موجود ہے۔ اس زمانہ میں وہ ٹیلہ مسکن فقرائے ہنود فرقہ سناسی کا تھا بسبب اختلاف دین و مذہب کے قیام مسلمان درویش کا ناگوار کر کے مانع ہوئے اور طالب اظہار کرامات کے ہوئے آخر بمعائنہ کرامات و کمالات معتقد ہو کر داخل دین اسلام ہوئے اور حلقہ ارادت و بیعت میں آئے۔ حضرت شاہ عبد الکریم صاحب نے وقت رخصت کے آپ سے فرمایا تھا کہ سلون پہنچکر ایک چلہ کھینچنا جب ایک دن باقی رہے گا ہم تمہارے پاس پہونچیں گے چنانچہ بموجب حکم مرشد کے سلون پہونچکر چلہ کھینچا۔ جب ایک روز

باقی رہا شاہ عبدالکریم صاحب سلون تشریف لائے اور اپنی ردائے مبارک کو اپنے ہاتھ سے بطور مسند کے بچھا کے شاہ پیر محمد سلونی کو اُس پر بٹھلایا اور فرمایا کہ گوشہ نشینی اختیار کرو۔ چنانچہ حضرت نے اتباع حکم مرشد کی بہت عمدہ طور پر کی۔ شاہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ نے باستماع اوصافِ حمیدہ حضرت کے شقہ مشتمل بر طلب صادر فرمایا آپنے جواب میں عذر تحریر فرمایا اور تشریف نہ لے گئے۔ نقل شقہ و جواب شقہ روضۃ الارواح (قلمی) عرف مناقب چشتیہ صفحہ ۲۴۸ میں موجود ہے اس کتاب کو شاہ محمد پناہ عطا صاحب قدس اللہ سرہٗ نے سنہ ۱۲۴۶ھ میں تالیف کیا ہے۔ اُمرا و حکام وقت آپ کی ملاقات کو تشریف لاتے رہے آپ کسی کے پاس نہیں گئے۔ شاہ اورنگ زیب باستماع کیفیت توکل و قناعت و دیگر کمالات درویشی آپ سے محبت رکھتے تھے سنہ ۱۰۹۹ھ میں آپنے انتقال فرمایا۔ ٹامس ولیم نے جو کتاب مفتاح التواریخ سنہ ۱۲۶۴ھ مطابق سنہ ۱۸۴۷ء میں تالیف فرمائی ہے اس کتاب میں تذکرہ سلاطین عظام و علماء و فقراء و شعراء و اکثر ارباب مراتب کا مندرج کیا ہے۔ چنانچہ شاہ پیر محمد سلونی کی تاریخ وفات بھی صفحہ ۲۸۶ میں لکھی ہے۔

صاحبزادہ شاہ پیر محمد سلونی کے شاہ پیر محمد اشرف صاحب تھے۔ آپ کا مرتبہ ظاہراً و باطناً بہت بڑا تھا۔ آپ سالک طریقہ عالیقدر پدر اپنے کے رہے۔ اور سلسلہ رشد و ہدایت کا آپ کی ذات سے اچھی طرح جاری رہا۔ شاہانِ دہلی دا ؤ دو آپکے کمالات سن کر محبت فرماتے رہے۔ اور علما و مشائخ وقت آپسے خلوص رکھتے رہے۔ (برہان الملک) نواب سعادت خاں بہادر (بانی سلطنت اودھ) و نواب ابوالمنصور خاں بہادر (صفدر جنگ) آپ کی ملاقات کو سلون تشریف لائے۔ کتاب فخر الفقراء (قلمی) کے صفحہ ۹۵ میں تذکرہ تشریف لانے ان دو صاحبوں کا موجود ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۶۹ھ میں شاہ محمد پناہ عطا صاحب قدس سرہٗ نے تالیف فرمائی ہے۔ انتقال شاہ پیر محمد اشرف کا سنہ ۱۱۶۷ھ میں ہوا۔ آپ کی تاریخ وفات بھی کتاب مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۵ میں موجود ہے۔ آپکے دو صاحبزادے تھے پسر اکبر شاہ پیر عطا و پسر اصغر شاہ پیر محمد پناہ صاحب قدس اللہ سرہما تھے۔

شاہ پیر عطا صاحب نے ایک مکان سواد سلون میں تعمیر کرایا تھا اس میں چلہ کش رہا کرتے تھے اور گاہ گاہ عبادت خانہ موضع اشرف نگر (ضلع الہ آباد) و بیہ معافی میں چلہ کشی فرمائی ہے۔ کیفیت ملاقات نواب صفدر جنگ کی حضرت شاہ پیر عطا صاحب سے اور ظہور کرامت کا بسبب استدعا نواب صاحب ممدوح صوف کتاب فخر الفقرا مذکور الصدر کے صفحہ ۹۶ میں مفصل مرقوم ہے۔ بعد انتقال شاہ پیر عطا صاحب کے وہ مکان موردِ مسافران قرار دیا گیا تھا لہذا وہ مکان باسم مسافر خانہ اب مشہور ہے۔ تشریف لیجانا بزرگان فقیر کا مکان اشرف نگر میں اور چلہ کشی کرنا کتاب خزائن اشرفی کے صفحہ ۲۷۳ میں مفصل مرقوم ہے۔ اور شاہ کمال درویش نے ایک مثنوی مکان اشرف نگر کی مدح میں لکھی ہے۔ اُس کے صفحہ ۲ میں بھی کیفیت چلہ کشی بزرگان فقیر کی مکان مذکورہ میں ظاہر ہے۔ شاہ پیر عطا صاحب نے اپنے والد کی موجودگی میں انتقال فرمایا۔ حضرت شاہ پیر اشرف صاحب نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ شاہ پیر محمد پناہ صاحب کو سجادہ نشین اپنا کیا۔ آپ بھی مثل جد و پدر کمالات درویشی میں کامل تھے۔ علما و مشائخ وقت آپکے ثناخواں تھے۔ سلاطینِ زمانہ آپ سے محبت فرماتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی آپ کی ملاقات کو سلون میں تشریف لائے۔ اور نواب شجاع الدولہ بہادر بھی آپ کی ملاقات کو تشریف لائے۔ تشریف لانا شاہ عالم کا واسطے ملاقات کے کتاب خزائن اشرفی صفحہ ۲۶۶ میں جو مذکور الصدر ہے موجود ہے یہ کتاب مولفہ شیخ حسام اللہ بجنوری ہے۔ سنہ ۱۱۸۱ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ موضع ساتوں (ضلع الہ آباد) دیہہ معافی میں آپنے مکان بنوایا تھا اور اسی مکان میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور گاہ گاہ وہاں قیام آپ فرماتے تھے۔ اور مشغول بعبادت رہتے تھے۔ تشریف لانا شاہ عالم کا موضع ساتوں میں مقام الہ آباد سے بقصد ملاقات آنحضرت اسی کتاب خزائن اشرفی میں موجود ہے سنہ ۱۱۹۲ھ میں آپنے انتقال فرمایا تاریخ وفات آنحضرت کی کتاب مفتاح التواریخ صفحہ ۳۵۷ میں موجود ہے آپ کے صاحبزادہ اور سجادہ نشین حضرت شاہ پیر کریم صاحب بہت مشہور و معروف ہیں۔

آپ کے دیکھنے والے خاص سلون و اطرافِ سلون میں بہت لوگ ہیں۔ حکامِ عصر آپ کی بڑی تعظیم کرتے رہے۔ علماء و مشائخ آپ کے بڑے مداح رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی علیہ الرحمہ جن کا ذکر کتاب مفتاح التواریخ مولفہ صاحب موصوف کے صفحہ ۳۸۱ میں موجود ہے آپ کے ہمیشہ ثناخواں رہے مولانا صاحب نے جو شاہ محمد پناہ عطا صاحب قدس اللہ سرہٗ کو خطوط تحریر فرمائے ہیں اُس میں بڑی تعظیم کے ساتھ حضرت کا نام لکھ کر سلام تحریر فرمایا ہے چنانچہ خط مولانا صاحب بمہر خاص اصل موجود ہے — نواب آصف الدولہ آپ کی ملاقات کو سلون تشریف لائے ہیں کیفیت تشریف آوری نواب صاحب کی کتاب لطائف کریمی (قلمی) مولفہ شاہ محمد پناہ عطا صاحب قدس اللہ سرہٗ صفحہ ۱۳۴ میں مرقوم ہے یہ کتاب سنہ ۱۲۳۷ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ اور نیز کتاب فخر الفقراء کے صفحہ ۱۴۴ میں مرقوم ہے۔ وفات آپ کی سنہ ۱۲۴۸ھ میں ہوئی ہے۔ آپ کی تاریخ وفات بھی کتاب مفتاح التواریخ کے صفحہ ۳۸۹ میں موجود ہے۔

آپ کے سجادہ نشین صاحبزادہ اوسط شاہ محمد پناہ عطا صاحب قدس اللہ سرہٗ تھے آپ مجمع فضائل صوری و معنوی سالک مسالک آبائے کرام تھے۔ شاہزادہ مرزا سکندر شکوہ ابن شاہ عالم بادشاہ کہ لکھنؤ میں تشریف لائے تھے اُس وقت عمر شریف حضرت کی شباب پر تھی آپ کے اوصافِ حمیدہ سُن کر شاہزادہ موصوف نے شقہ بطلب صادر فرمایا تھا۔ آپ نے بطریقۂ اتباع بزرگاں اپنے کے جواب عذر کا تحریر فرمایا اور تشریف نہ لے گئے۔ چنانچہ نقل اُن دونوں خطوں کی کتاب منتخب سعید میں جو تالیف کردہ شاہ محمد غفور عطا صاحب مرحوم برادرِ خورد شاہ محمد پناہ عطا صاحب .... ہے۔ اُس کے صفحہ ۵۵ میں مندرج ہے۔ اور سنہ تالیف اس کتاب کا سنہ ۱۲۳۶ھ ہے۔ شاہ محمد پناہ عطا صاحب قدس اللہ سرہٗ نے سنہ ۱۲۷۵ھ میں انتقال فرمایا۔

آپ کے صاحبزادہ حضرت شاہ پیر محمد حسین عطا صاحب قدس اللہ سرہٗ کہ مجھ فقیر کے والد و مرشد ہیں آپ کے سجادہ نشین ہوئے آپ موصوف بصفاتِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ تھے۔ جناب شاہ پیر کریم عطا صاحب حضرت کے ساتھ نظرِ عنایت کا فرماتے تھے۔ اور محبت رکھتے تھے۔ حکام عالیشان اکثر آپ کی ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔ اور اکثر خطوط حکام ذوی الاقتدار کے آپ کے نام آئے ہیں آپ کا انتقال سنہ ۱۲۹۰ھ میں ہوا۔

اب قائم مقام حضرت کا یہ فقیر ہے اور اِس وقت تک حسب قاعدہ بزرگاں اپنے کے قائم ہے۔ کتاب مونس جواہر مصنفہ شاہ قاسم درویش ساکن دریاباد بہت مشہور ہے اِس میں بھی ذکر موروثان فقیر کا عمدہ طور پر آغاز کتاب میں صفحہ ۴ میں واقع ہے۔ خطوط شاہان دہلی و لکھنؤ و بعض شاہزادگان دہلی و دیگر اُمرا جو بنام بزرگان فقیر آئے ہیں بصدق میرے کلام کے اثباتِ مراتب میں ہیں:-

(۱) خط مرزا سکندر شکوہ بہادر شاہزادہ دہلی (۲) شقہ شاہ عالم بناہ سعید الدولہ خواجہ محمد سعید خاں بہادر
(۳) یک شقہ شاہ عالم بنام شاہ پیر محمد پناہ صاحب (۴) مفاوضہ نواب آصف الدولہ بہادر
(۵) و (۶) شقہ جناب بہو بیگم صاحبہ دو قطعہ (۷) خط سبحان علی خاں بہادر
(۸) پروانہ بمہر نظامت بنام میر جعفر علی صاحب تحصیلدار سلون (۹) نقل خط بمہر نواب منیر الدولہ بنام نواب شاکر الدولہ بمہر قاضی سلون
(۱۰) نقل پروانہ احسان حسین خاں بہادر بنام لالہ بہادر سنگھ بمہر قاضی سلون (۱۱) قطعہ پروانہ فتح علی من عمالِ شاہی۔

شیخ محمد جعفر ولد شیخ محمد فاضل بجنوری نے اپنی کتاب الشائے عجیب میں جو خط بنام شیخ خورم کے تحریر کیا ہے اپنا اشتیاق نسبت حضرت شاہ پیر محمد اشرف سلونی کے ظاہر کیا ہے اور بڑے ادب سے اسم مبارک حضرت کا تحریر کیا ہے صفحہ ۱۸ میں وہ خط موجود ہے۔

العبد

شاہ محمد مہدی عطا سجادہ نشین سلون بقلم خود

۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۸۱ء

غلام قادر روہیلا شہید

از

سید الطاف علی صاحب بریلوی بی۔ اے۔ علیگ

مترجمہ

محمد سراج الحق قریشی بی۔ اے

مطبوعہ

مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

پرنٹر

خانصاحب جمے اہرخاں

۷۸۶

غلام قادر روہیلہ شہید

چنگیز۔ ہلاکو۔ میر جعفر اور میر صادق کی طرح غلام قادر روہیلہ کا شمار بھی دنیا کی بدنام ترین ہستیوں میں ہے۔ تاریخ ہند کے صفحات اس کے مظالم کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ انھیں داستانوں سے متاثر ہو کر شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور نظم :۔

روہیلہ کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستمگر نے
یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے[۱]

لکھی۔ غلام قادر کی وجہ سے ہی پوری روہیلہ قوم بدنام ہوئی۔ نہ صرف قوم بلکہ سردارانِ قوم نواب محمد خاں بنگش۔ نواب احمد خاں بنگش۔ نواب علی محمد خاں۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں۔ ولاور الملک

---

[۱] بانگِ درا صفحہ ۲۴۳۔ یہ رقص غلام قادر نے شہزادیوں کا نہیں بلکہ ۱۹ شہزادوں کا کرایا تھا جس میں ولیعہد سلطنت شہزادہ اکبر جو بعد کو اکبر شاہ ثانی کے لقب سے ملقب ہو کر تخت نشیں ہوئے شامل تھے (عجیب التواریخ و دیگر کتب) اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز مرزا اکبر شاہ اور سلیمان شکوہ وغیرہ ۱۹ شہزادوں کو غلام قادر خاں نے اپنے سامنے بلوایا اور کہا کہ مدت سے میں سنتا ہوں کہ شہزادے خوب ناچنا اور گانا جانتے ہیں۔ لہٰذا کمال اشتیاق تھا اب وہ روز آیا ہے کہ میں تمہارا ناچ دیکھوں اور گانا سنوں اور اگر تم نے انکار کیا تو یاد رکھنا کہ اسقدر کوڑے ماروں گا کہ بے ہوش ہو جاؤ گے۔ اور تمہارے ہونٹ اور ناک کاٹ لئے جائیں گے۔ مجبوری جیسا جانتے تھے آوازیں ملا کر کان پر ہاتھ رکھ کر گانے لگے۔ اور ناچ کی حالت میں اپنی کمر د گردنوں کو مٹکا مٹکا ایسی جنبشیں دیں کہ نواب خوش ہو گیا۔
ناچ کے بعد کچھ کھانے پینے کو دیا اور سب کو پاس بٹھا کر اپنے ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔ مرزا اکبر کے زانو پر سر رکھ کر سو گیا اپنی تلوار اور خنجر بھی مرزا اکبر کے سپرد کر دی تھی۔ جب سو کر اٹھا سب کے سر پر ایک ایک دھول ماری اور کہا یہ حوصلہ اور یہ خیال سلطنت کا۔ فقط تمہارا امتحان کر رہا تھا۔ تم ۱۹ تھے ...... مجھے مار ڈالتے ..... اس کے بعد گالیاں دے کر نکلوا دیا۔

نواب دوندے خاں۔ نواب نجیب الدولہ اور نواب امیر خاں کے مجاہدانہ کارناموں کو بھی دنیا نے فراموش کر دیا۔ لیکن یہ سب نتیجہ اس غلطی کا ہے کہ ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رُخ سامنے رکھا گیا۔ اور ہندوستان کی تاریخ صرف بادشاہوں کی تاریخ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ "مسلمانانِ ہند کی تاریخ" اب تک نہیں لکھی گئی جس کسی نے شہنشاہ دہلی سے وفاداری کی نیک نام ہوا، اور جس نے بغاوت کی وہ بدنام ہو گیا۔ بغاوت کے کیا اسباب ہوئے اور باغی کا کیا نقطۂ نظر تھا اسے معلوم کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

غلام قادر روہیلہ کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہمارے مؤرخین کے مطمحِ نگاہ میں اسی تبدیلی کی ضرورت ہے اور جوں ہی اُس وقت کے حالات و واقعات کا بادشاہ پرستی کی عینک اتار کر مطالعہ کیا گیا، آپ غلام قادر کو ظالم کی بجائے مظلوم سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ غلام قادر کے بارے میں مؤرخِ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم کی بھی یہی رائے تھی چنانچہ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا کو غلام قادر روہیلہ کے اس فعل پر کہ اُس نے مغل بادشاہ شاہ عالم کی آنکھیں نکال لی تھیں اظہارِ ملامت کرنے سے بھی انکار ہوتا تھا وہ غلام قادر کو حق بجانب قرار دینے کے لئے تاریخی اسباب بیان کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے جب غلام قادر روہیلہ پر اپنی مشہور نظم لکھی تو مولانا نے اعتراض کیا کہ یہ واقعہ جو نظم میں بیان کیا گیا ہے تاریخی حیثیت سے زیادہ اہم نہیں ہے۔" [1]

وہ تاریخی اسباب کیا تھے جن کے ماتحت غلام قادر "حق بجانب" ثابت ہو۔ کاش! مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم جیسے محقق کے قلم سے ضبط تحریر میں آتے لیکن اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں! تاہم خدا کا شکر ہے کہ روہیلوں کی تاریخ کے ایک دوسرے ماہر ہمارے دوست مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ آپ نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اور غلام قادر خاں کی شخصیت کو پہلی مرتبہ اپنے اصلی خط و خال میں پیش کرنے کی غرض سے ایک محققانہ مقالہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس ششم منعقدہ ۲۶-۲۷-۲۸ دسمبر ۱۹۴۳ء کو بمقام علی گڑھ پیش کیا اور جو بعد ازاں انگریزی اخبار ڈان کی اشاعت ہائے ۴ر فروری اور ۴ر و ۱۱ر مارچ ۱۹۴۵ء میں بااقساط شائع ہوا۔ چونکہ دوسرے تاریخی مضامین کی طرح سید صاحب کے اس مضمون کو بھی مقبولیت حاصل

---

[1] "مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم" از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب۔ آئیڈیل بک ڈپو لاہور مطبوعہ معتف جلد اول ص ۳ صفحہ ۳۴۔

ہوئی اور اس سے اٹھارویں صدی عیسوی کی رُبع آخر کی تاریخ ہند میں ایک نیا باب تحقیق و تدقیق کھلا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا آزاد ترجمہ مجلس مصنفین اور مصنف علی گڑھ کے ذریعہ اپنے اُن اہل ملک کے سامنے پیش کروں جو یا تو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں یا جن کی نظر سے "ڈان" میں یہ مضمون نہیں گزرا[۱] ایک تاریخی مضمون کو مستند اور قابل اعتبار سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اُس کے ماخذوں کو دیکھا جاتا ہے اس لئے ترجمہ کرنے سے پہلے میں نے سید الطاف علی صاحب سے مل کر اُن کے اصل مسودے کو دیکھا جس میں حوالجات درج ہیں اور جن کو اخبار میں مضمون شایع کرنے کی وجہ سے نظرانداز کر دیا گیا تھا۔

سید صاحب کے ماخذ عہد شاہ عالم کی کتابیں۔ مرأت آفتاب نما۔ سیر المتاخرین۔ عمات السعات۔ اور ڈبلو فرینکلن کی تاریخ "شاہ عالم" کے علاوہ جس میں غلام قادر کے مظالم کے حالات ملتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں شایع شدہ سر جادو ناتھ سرکار کی "زوال سلطنت مغلیہ" کی تیسری جلد بھی ہے۔ جس میں غلام قادر پر ایک تفصیلی باب ہے۔ سر جادو ناتھ سرکار کا ماخذ فقیر خیر الدین کا روزنامچہ ہے جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس کے دو قدیم نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہیں۔

(فقیر) خیر الدین یا مولوی خیر الدین احمد خاں مہاداجی سندھیا کے کیمپ میں برٹش ریزیڈنٹ کے میر منشی تھے۔ جس قدر واقعات اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں انگریزوں۔ مرہٹوں۔ بادشاہ دہلی اور روہیلوں کے مابین پیش آئے اُن کی اُنھوں نے قریب قریب عینی تصویر کشی کی ہے۔ لیکن اوّل الذکر تاریخوں کی طرح خیر الدین کی تاریخ[۲] بھی انگریزوں اور مہاداجی سندھیا کی شخصیت سے متاثر ہے۔ اور روہیلہ سردار کو نشانۂ ملامت بنانے میں اُن کے قلم نے بھی کافی جولانی دکھائی ہے۔

ضرورت تھی کہ کوئی شخص مخالف اور موافق مواد کو سامنے رکھ کر ایک کتاب تیار کرے ۔۔۔

اس خدمت کو مولوی مرزا نصیر الدین محمد خاں برلاس خلف مرزا عبدالہادی خاں برلاس ڈپٹی کلکٹر

---

[۱] رسالہ 'افغان' دہلی بابت ماہ اپریل ۱۹۵۸ء میں بھی سید صاحب کے اس مقالہ کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے اور جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے اُس سے کافی استفادہ کیا۔ (قریشی)

[۲] پروفیسر ابرار حسین قادری صاحب مسلم یونیورسٹی کا بیان ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ عرصہ ہوا مرادآباد میں شائع ہو چکا ہے لیکن اب دستیاب نہیں ہوتا۔

خلف مولوی مرزا عبدالقادر خاں برلاس بہادر صدر الصدور سابق مراد آباد[1] نے اپنی کتاب "تجیب التواریخ" لکھ کر انجام دیا۔ مرزا صاحب سبب تالیف کتاب کے ذیل میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے بتلاش کتب تواریخ کہن سالانِ سفید ریش ساکنان نجیب آباد کے اقوال و روایات مستند سے ایسے وقت میں (اس دفتر کو) مرتب کیا کہ جب ۱۲۶۵ھ؁ میں میرا تقرر ابتداءً نائب تحصیلداری ضلع مین پوری سے اوپر عہدۂ جلیلہ تحصیلداری نجیب آباد کے ہوا اور بندوبست دہم مالگزاری کا درپیش تھا اور مجھ کو بسبب صد منصرمی بندوبست علاوہ تحصیلداری کے جنگل اور دیس کے ہر مقام پر گشت و قیام کا اتفاق ہوا کہ بوجہ شوق حالات تاریخی یہ ایک عمدہ موقع ہے فراہمی سامانِ تاریخی من جانب اللہ ہاتھ آیا لہٰذا جن کتابوں کو میں نے دیکھا یا جن معتمدین سے میں نے بطور منقولات کچھ سُنا یا جن واقعات کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا اُن کی تفصیل و تشریح کرنا مناسب سمجھا۔ تاکہ چینانِ زمانہ جو جہل و حسد سے یگانہ اور عقل و دانش سے دور و بیگانہ ہوتے ہیں میری محنت شاقہ کو اپنی خوردہ گیریوں سے ضائع نہ کریں۔"[2]

اس کے بعد مرزا صاحب نے اُن ۲۷ مشہور و معروف قلمی و مطبوعہ کتابوں کی فہرست درج کی ہے جو روہیلوں کی تاریخ کے لئے ناگزیر ہیں۔

فقیر خیر الدین کا روزنامچہ بھی اُن کے پیشِ نظر تھا۔ ساتھ ہی اکیس[۲۱] رؤسائے ذی عزت و متوسلین و مقربان نواب جھنبو خاں (برادر غلام قادر خاں) رئیس نجیب آباد و دیگر مردمانِ کہن سال کے نام مع ولدیت وغیرہ کے درج کئے ہیں جن سے مرزا صاحب نے زبانی حالات سنے۔ اُن لوگوں میں سے ایک شخص غلام رسول خاں آفریدی کی بابت لکھا ہے کہ :۔

"اُس کی عمر ایکسو پچیس[۱۲۵] سال کی ہے اُس نے غلام قادر کے والد نواب ضابطہ خاں کو دیکھا تھا۔ عقل و حواس نہایت درست حالت میں ہیں اور رفو بنوٹ میں یکتائے روزگار ہے۔"

اس اہتمام کے ساتھ لکھی ہوئی مرزا نصیر الدین محمد خاں کی کتاب کو چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ البتہ مصنف کے قلم کا ایک غیر مربوط و نامکمل قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لٹن لائبریری کے مخطوطات "نواب عبدالسلام خاں" اور مصنف ہی کا لکھوایا ہوا ایک دوسرا مکمل نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتاب خانہ

---

[1] مرزا عبدالقادر خاں بہادر کا ایک نہایت مبسوط اور قیمتی روزنامچہ موسومہ وقائع عبدالقادر خانی نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتاب خانۂ حبیب گنج (علیگڑھ) میں موجود ہے۔

[2] تجیب التواریخ صفحہ ۲ - ۳ -

حبیب گنج میں موجود ہے۔

لنڈن لائبریری کے نسخہ کی ایک عمدہ خوشخط نقل یونیورسٹی نے اور کتاب خانۂ حبیب گنج کے نسخہ کی ایک صاف نقل سید الطاف علی صاحب بریلوی نے کرائی ہے آجکل ان نقول دو حبیب گنج کے نسخہ کی ایک دوسرے سے مقابلہ کرکے صحت کی جارہی ہے جس کے مصارف ازراہِ معارف پروری جناب نواب صدر یار جنگ بہادر عنایت فرمائیں گے [۵۱]

نواب عبدالسلام خاں مرحوم "نجیب التواریخ" کے اشاعت پذیر نہونے کی وجہ اپنی فہرست کتب میں یہ لکھتے ہیں کہ :-

> "سرسید احمد خاں نے اُسی زمانہ میں ایک کتاب "حالاتِ سرکشی ضلع بجنور" لکھی تھی جس پر مرزا صاحب نے اپنی کتاب کے اخیر حصہ میں اعتراضات کئے۔ لیکن سرسید کی وجاہت کی وجہ سے اُن کی ہمت نہوئی کہ اپنی کتاب چھپواتے۔ میری استدعا پر مجھے ۱۸۹۵ء میں عنایت کی۔" [۵۲]

سید الطاف علی صاحب نے اپنے مقالہ میں سب سے زیادہ مدد "نجیب التواریخ" سے لی ہے کیونکہ جس شرح وبسط کے ساتھ غلام قادر کے مخالف وموافق حالات اس کتاب میں ملتے ہیں، کسی دوسری جگہ اُن کی نظر سے نہ گزرے۔

سراج الحق قریشی

مترجم

---

[۵۱] امید ہے کہ جناب مرزا امیر الدین صاحب. رٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مقیم علی گڑھ اپنے والد اور دادا صاحب کی کتابوں کو چھپوانے کی سعادت حاصل کریں گے۔

[۵۲] نواب عبدالسلام خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب نے مجھے ایک روزنامچۂ غدر ضلع بجنور بھی عنایت کیا لیکن یہ پتہ نہ دیا کہ اُس کا مصنف کون ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کے مصنف بھی خود مرزا صاحب ہوں اور بوجہ ملازمت سرکاری اپنے نام کا اخفا کیا ہو۔ یہ روزنامچہ بھی لنڈن لائبریری میں نواب صاحب کی کتابوں میں موجود ہے۔

(!!!)

غلام قادر روہیلہ جس نے ۱۷۸۸ء میں دلی تاراج کی بادشاہ شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں اور شاہی خاندان پر ناقابل بیان مظالم اور سختیاں کر کے اپنی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ لگایا۔ ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑا مجرم قرار دیا گیا ہے۔

اُس کی طرفداری میں آج تک نہ کسی نے زبان کھولی اور نہ کسی نے قلم اُٹھایا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے سلطنتِ مغلیہ کی شان و شوکت کو ایسا صدمہ پہونچایا کہ پھر اُس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اِس المناک حادثہ سے پہلے دہلی کے شاہی خاندان کی باوجود بربادی، مفلسی اور شکستہ خوردگی کے ایسی عزت تھی کہ اُجڈ سے اُجڈ اور سفاک سے سفاک قزاق کی ہمت نہ تھی کہ کسی مغل شہزادہ کی اشارۃً یا کنایۃً توہین کر سکے۔ غلام قادر نے ان افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کیوں کیا، یہ ایک سوال ہے جس کا جواب دینے کی اس مقالہ میں کوشش کی جائے گی۔

کیا وہ فاترالعقل تھا۔ نہیں۔ یہ بات نہ تھی۔ "عجیب التواریخ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ۔

"غلام قادر خاں دانائے روزگار تھا"

اُس کی پیدایش ایک امیر اور مہذب گھرانے میں ہوئی تھی اور اُس کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع حاصل ہوئے تھے۔ چنانچہ جب چودہ برس کی عمر میں شاہ عالم اس کو قید کر کے قلعۂ دہلی میں لے آئے تو خود شاہ عالم اور شاہی خاندان کے دوسرے لوگ اُس کے غیر معمولی حُسنِ صورت و سیرت اور دلفریب اندازِ گفتگو سے بہت متاثر ہوئے بہت جلد اُس کو اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگے۔ اور محل کے اہم فرایض اُس کے سپرد کر دئے گئے۔ یہ فرایض اُس نے برسوں انجام دئے۔ کردار کے اس پس منظر کی کیا بالکل کایا پلٹ ہو سکتی ہے اور کیا کسی شخص کی اخلاقی حالت اتنی گر سکتی ہے جیسی کہ غلام قادر خاں کی گری ہوئی نظر آتی ہے۔

کیا اُس نے بلا وجہ رہزنوں کی سی عادات اختیار کر لیں اور اپنے کو مجرمانہ بداعمالیوں کی گہرائیوں میں ڈبو دیا۔ لیکن نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ متواتر دو ماہ سے زیادہ شاہی خاندان پر سخت مظالم توڑنے اور لال قلعہ کا ایک ایک گوشہ تاراج کرنے کے بعد مرہٹوں کے سخت محاصرہ کی وجہ سے غلام قادر جب قلعہ سے نکلنے لگا تو اُس نے اپنی فوج کے سرداروں کو جمع کیا اور قرآن شریف درمیان میں رکھ کر کہا :-

"میں نے اب تک تم لوگوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی ہے۔ جس کسی کو میرے ساتھ مرنا ہے اس قرآن کی قسم کھائے اور جس کسی کو جان عزیز ہو بخوشی ہم سے رخصت ہو جائے۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ سوائے حضور کی ذات کے ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے جب تک جان میں جان باقی ہے جاں فشانی کو حاضر ہیں۔" [۱]

اس کے بعد غلام قادر ہر ایک سے بغلگیر ہوا۔ کیا جرائم پیشہ لوگوں کی یہ خصوصیات ہوتی ہیں۔؟

حقیقت یہ ہے کہ غلام قادر جنگ جو روہیلا قوم کا آخری جانباز سردار تھا اور وہ اپنے جدِ امجد نواب نجیب الدولہ کی طرح سیاسی خرابیوں اور روحانی ظلمت کو دور کرنا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اثر و اقتدار میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتا تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی تمام جدّ و جہد رائگاں گئی۔ اور بعد کو جو واقعات رونما ہوئے اُن کی ذمہ داری کلیتاً شاہ عالم پر ہے۔ ذیل کے واقعات سے اُس وقت کے ملکی معاملات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد سلطنت دہلی کا جہاز نہایت بے سر و سامانی کے ساتھ تباہی کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا اور چاروں طرف سے جاٹ سکھ اور مرہٹے وغیرہ اُس کی لوٹ کھسوٹ پر آمادہ ہو گئے تھے۔

مرہٹوں نے خاص طور سے عروج حاصل کیا اور قریب قریب پورا شمالی ہند مع دہلی اُن کے زیرِ اقتدار آ گیا۔

مغلیہ سلطنت کے آفتابِ حکومت کو ہندوستان میں گہن لگنے ہی والا تھا کہ چند جاں نثار اور قوی دل لوگ تباہی خیز طوفانی موجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ غلام قادر خاں کے دادا نواب نجیب الدولہ ان سب میں پیش پیش تھے اور یہ انھیں کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ کم از کم تھوڑے عرصہ کے لئے سلطنتِ اسلامی موت کے منہ میں پڑنے سے بچ گئی۔

نجیب الدولہ شروع میں ایک معمولی سپاہی تھے لیکن انھوں نے اپنی محنت اور لیاقت کے بل بوتے پر اکابرِ سلطنت میں جگہ حاصل کر لی۔

نجیب الدولہ دہلی کے مشہور رہنمائے ملت اور مجددِ وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

---

[۱] نجیب التواریخ صفحہ ۱۲۰ -

کے مُرید تھے اور اُنھیں کی تحریک پر ہندوستان میں انھوں نے روہیلوں کی تنظیم کی۔ احمد شاہ درانی کو دعوتِ جہاد دی۔[۱۵] مرہٹے اور افغان دونوں طاقت آزمائی کے لئے پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں جمع ہوئے۔ مرہٹوں نے بُری طرح شکست کھائی۔ اور مغلیہ سلطنت پر اُن کا بڑھتا ہوا اقتدار ختم ہوگیا۔ نجیب الدولہ پانی پت کی لڑائی کی قابل قدر خدمات کی وجہ سے سلطنت کے بخشی الملک (کمانڈر انچیف) اور نائب السلطنت مقرر کئے گئے۔ یہ بات سب پر روشن ہے کہ آصفجاہ نظام الملک کے بعد وہ اس اعلیٰ مرتبہ پر اپنے زمانہ کے سب سے بڑے سیاست داں اور فوجی جنرل ثابت ہوئے۔ اُن کی زندگی کا مقصدِ اوّلیں یہ تھا کہ وہ سلطنت کو زوال پذیر ہونے سے بچائیں اور پچھلے نقصان کی بھی تلافی کریں۔ اس ارادے میں وہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے۔ اور ۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء میں جبکہ اُنھوں نے وفات پائی تو سلطنت دہلی کا اُس وقت کوئی مسلم یا غیر مسلم مدمقابل نہ تھا جب یہ واقعات ہو رہے تھے اور سلطنت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ شاہ عالم میدانِ عمل سے دُور تھے نہ صرف یہ بلکہ جس وقت وہ مشرق میں مارے مارے پھر رہے تھے اُنھوں نے غیر ملکی خریدارانِ سلطنت کے ہاتھ ملک کے سب سے زیادہ زرخیز صوبے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے۔ اور پھر یہی غیر ملکی طاقت رفتہ رفتہ مغلوں۔ پٹھانوں۔ مرہٹوں۔ جاٹوں اور سکھوں۔ سب کو ہضم کر گئی۔

نجیب الدولہ جیسے دلیر۔ ایماندار۔ اور مخلص محافظ سلطنت کی وفات شاہ عالم کے لئے ایک زریں موقع تھی۔ اب وہ آزاد تھے کہ اپنے موروثی بقیہ مقبوضات کو بھی زیادہ سے زیادہ بولی بولنے والے کو دے ڈالیں۔ اس دفعہ اپنے محسنوں کو نیچا دکھانے کے لئے اُنھوں نے اُن مرہٹوں سے معاملت کی جن کو دس سال قبل بدشواری ہندوستان سے افغانستان تک مسلمانوں کی متحدہ طاقت بے دخل کر سکی تھی۔

۱۷۷۱ء میں شاہ عالم نے مہاداجی سندھیا کو جو اُس وقت شمالی ہندوستان میں پیشوا کا مدارالمہام تھا اپنے ساتھ الہ آباد سے دہلی ہمرکاب ہونے کی دعوت دی۔ دہلی میں نجیب الدولہ کا لڑکا اور جانشین نواب ضابطہ خاں حکمراں تھا۔ اُس وقت اِس روہیلہ سردار کی فوج دہلی کی حفاظت کر رہی تھی اور پادشاہ کی والدہ محترمہ اور ولیعہد سلطنت کی خدمت پر مامور تھی۔ شاہ عالم نے مہاداجی

---

[۱۵] شاہ ولی اللہ نمبر "الفرقان بریلی" مضمون مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔

غفیہ معاہدہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں نے دہلی پر چار دن طرف سے گولہ باری کی اور لال قلعہ کو ضابطہ خاں کے گماشتہ سے چھڑا کر بادشاہ کے نام پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹوں کی حفاظت میں دہلی جاتے ہوئے شاہ عالم فرخ آباد کے قریب پہونچے تو انھوں نے نواب احمد خاں بنگش کے جانشین کی ریاست ضبط کر لینے کا ارادہ کیا۔

یہ احمد خاں بنگش بھی جنگ پانی پت کے ایک دوسرے ہیرو اور نجیب الدولہ کے حلیف تھے۔ نواب بنگش کے جانشین فخرالدولہ نے اس مطالبہ کا جواب اس طرح دیا کہ روہیلوں کی ایک کثیر فوج مقابلہ کے لئے جمع کر لی۔ مگر جنگ نہیں ہوئی اور بادشاہ نے اپنے سرپرست مرہٹوں کی مدد سے صرف ۶ لاکھ روپیہ لینے پر قناعت کر لی۔

۱۷۷۲ء شاہنشاہ کے دہلی پہونچتے ہی اُن کے نئے محافظوں نے چیخ پکار مچانا شروع کی کہ انھیں جنگ پانی پت کا انتقام لینے کی غرض سے روہیلوں کے ملک پر تاخت کرنے کی اجازت دی جائے۔ اِس پر شاہ عالم نے حملہ کا معقول بہانہ تلاش کرنے کی غرض سے ضابطہ خاں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اپنے باپ کی جائداد کے حقِ جانشینی اور عہدہ کے مروّجہ ٹیکس ادا کرے۔ اور صرفِ خاص کی اُن آراضیات کا جو نجیب الدولہ کے پاس عرصہ دراز تک رہیں حساب پیش کرے۔ اپنے مرحوم والد کے ساتھ احسان فراموشی اور توہین سے ضابطہ خاں مشتعل ہو گیا۔ اِس کے فطری افغانی جذبات برانگیختہ ہو گئے اور اُس نے شاہی قاصدوں کو سخت کلامی کے ساتھ واپس کر دیا۔

اس پر شاہی فوج کا ایک حصہ ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خاں ایرانی نئے وزیر اعظم و سپہ سالار افواج کی سرکردگی میں مع توکوجی ہلکر مہاداجی سندھیا اور ویساجی کرشنا سرداران مرہٹہ کی فوج کے ضابطہ خاں کے حدودِ حکومت میں داخل ہو گیا۔ اس فوج کی روانگی کے گیارہ دن بعد شاہنشاہ بھی دہلی سے روانہ ہو گئے۔ ضابطہ خاں نے اپنے اہل خاندان اور خزانجات پتھر گڑھ میں جو نجیب آباد ضلع بجنور کا سنگین قلعہ تھا پہونچا دئے۔ اور وہ خود اپنی جنگ آزمودہ ایک لاکھ روہیلہ فوج کے ساتھ دریائے گنگا کے شرقی کنارہ پر مقابلہ کے لئے کھڑا ہو گیا۔

روہیلے جو گزشتہ بیس سال سے سلطنت مغلیہ کی خدمت کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگا رہے تھے آج پہلی مرتبہ اپنی حفاظت کے لئے اُن کے خلاف تلوار اُٹھانے پر مجبور ہوئے۔

۲۳ فروری ۱۷۷۲ء کو بمقام سکرتال متصل ہردوار فیصلہ کُن جنگ ہوئی جس میں روہیلے بعض تدابیر جنگ میں مات کھا جانے اور مخالف فوج کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے بُری طرح

مغلوب ہوئے۔ ہزار ہا روہیلے جان سے مارے گئے۔ اور اُن کے افسروں کے سر جسموں سے جدا کر کے بادشاہ کی خدمت میں بھیجے گئے شاہ عالم کو اپنے عہدِ حکومت میں اس پہلی اور نام نہاد شاندار فتح کی بے حد خوشی ہوئی۔

شکست کے بعد ضابطہ خاں اپنی حالت کو غیر محفوظ سمجھ کر شمالی پہاڑیوں کی طرف فرار ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد شاہی فوج نے پتھر گڑھ کے قلعہ پر جس میں افغان سرداروں کے بیوی بچے مقیم تھے چڑھائی کی۔ قلعہ کا سردار اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کو راضی ہوگیا کہ محصور پٹھانوں کی جان اور ان کی عزت برقرار رکھی جائے۔ شرائط طے ہوگئے اور ۱۶ مارچ ۱۷۷۲ء کو پتھر گڑھ کا قلعہ خالی کر دیا گیا۔

لیکن شرائط صلح کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا۔ مرہٹے قلعے کے دروازہ کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ پہلے غربا نکلے تو جامہ تلاشی لی گئی اور انھیں ننگا کر کے بھگا دیا گیا۔ بہت سے افغان خاندانوں نے مرہٹوں سے چھٹکارا پا کر شاہی کیمپ میں پناہ لی تو شاہی فوج کے لٹیروں اور تورانی مغلوں نے اُن کے وہ کپڑے بھی اُتار لئے جو مرہٹوں نے چھوڑ دئے تھے اور مستورات کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اپنے خیموں میں کھینچ لے گئے۔

یہی وہ ذلیل حرکت تھی جس کا ذکر کر کے غلام قادر نے ان لوگوں کو جواب دیا جو قلعہ دہلی کے شاہی حرم پر رحم کی درخواست کرتے تھے۔ اُس نے کہا:-

> "کیا تمہیں یاد ہے کہ بادشاہی ملازموں کے ہاتھوں اس سے زیادہ ہمارے اور ہمارے ناموس کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ تماشہ اُس وقت ہوگا جب میں حکم دوں گا کہ میری روہیلہ فوج کی سپاہ کو بادشاہ زادیاں بروں نکاح مباح ہوں تاکہ اُن کے بطن سے ایک دلیر نسل پیدا ہو۔" ؎۱

پتھر گڑھ لینے کے بعد مرہٹوں نے نجیب الدولہ کی قبر کے تعویذ کی عبارت کو مٹا دیا اور اُس پر مرہٹی زبان میں کندہ کرایا کہ "ہم نے پانی پت کی لڑائی کا بدلہ لے لیا۔" ؎۲

ضابطہ خاں کے توپ خانے اور خزانجات نیز ہاتھی۔ گھوڑے اور دیگر جائداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ لاکھوں روپیہ کا مالِ غنیمت مرہٹہ افسران نے غبن کر لیا۔ جو نہ بادشاہ کو ملا اور نہ پیشوا کو۔

مرہٹہ گورنمنٹ کو سرکاری طور پر جو چوتھائی حصہ ملا وہ دس لاکھ روپیہ اور ۲۲۹۸ گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ انتقام لینے کا جذبہ نجیب الدولہ کے خاندان کے علاوہ ساری روہیلہ تک پہنچا۔ حافظ الملک

؎۱ نجیب التواریخ۔ ؎۲ سرگزشت لماس مسکین۔

حافظ رحمت خاں کے مقبوضات روہیلکھنڈ پر بھی بلا وجہ حملہ کر دیا۔ باوجود اس کے کہ اُس خدا رسیدہ حاکم نے کوئی اشتعال انگیز بات کسی کے خلاف نہیں کی تھی۔ چالیس لاکھ روپیہ کا تاوان اُن پر قایم کیا گیا۔ جس کا ضامن شجاع الدولہ والیِ اودھ ہوا۔ اور جس کے نتیجہ میں کچھ عرصہ بعد ۱۷۷۴ء وہ تباہ کن روہیلا جنگ ہوئی جس میں حافظ الملک شہید ہوئے اور علاقہ روہیلکھنڈ پہلے حکومت اودھ کے قبضہ میں اور اُس کے بعد انگریزی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ واپسی میں دلّی جاتے وقت روہیلکھنڈ کے بہت سے شہروں مثلاً۔ آنولہ۔ بریلی۔ رامپور اور امروہہ وغیرہ میں شاہی فوج نے آگ لگا دی اور انھیں خوب تاخت و تاراج کیا۔ سارا ملک بے چراغ اور ویران کر دیا گیا۔ ضابطہ خاں کے افرادِ خاندان۔ مرد اور عورتیں اور اُس کا خُرد سال لڑکا غلام قادر مرہٹوں کی قید میں رہے اور سخت مصیبت اُٹھانے کے بعد شجاع الدولہ کی سفارش سے رہا ہوئے۔

اِس موقع پر شجاع الدولہ نے مہاداجی سندھیا کو جو خط لکھا تھا درج ذیل ہے:۔

"دشمن کے ناموس کی دوست کے ناموس سے زیادہ عزّت کی جاتی ہے اگر جفا کی ہے یا عیوض خطا لیا جاتا ہے تو کوئی شخص زن و فرزند پر ستم پسند نہیں کرتا۔ تمہارا دشمن یا خطا وار جو کچھ ہے ضابطہ خاں ہے۔ نہ کہ اس کے زن و فرزند۔ اگر زن و فرزند کو قید کرنے سے یہ مقصود ہے کہ نواب موصوف اُن کی محبت سے بے قرار ہو کر اپنے آپ کو تمہارے سپرد کر دے گا تو یہ بھی ممکن نہیں لہٰذا اُس کے زن و فرزند کو اسیر رکھنے سے کیا فائدہ۔ راہِ ثواب یہ ہے کہ برعایت شیوۂ پسندیدۂ سرداران دکن کے آپ متعرض بحالِ ننگ و ناموس شرفا کے نہ ہوں اور نواب کے زن و فرزند کو اِس طرف روانہ فرمادیں۔ بالفرض اگر نواب نجیب الدولہ تمہارے بھائیوں کا بڑا دشمن تھا اور بدسلوکی انواع و اقسام کی عمل میں لایا تو اگرچہ بدی کا بدلہ بدی سے دینا آسان ہے لیکن یہ شیوہ بہادروں کا نہیں ہے۔" ۵ے

۵ے نجیب التواریخ

۱۷۷۴ء کی جنگ روہیلا جس میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ اور پورے روہیلکھنڈ پر شجاع الدولہ نے بادشاہ کی اجازت اور انگریزوں کی مدد سے قبضہ کیا ضابطہ خاں نے نادانی سے شجاع الدولہ کا ساتھ دیا لیکن جنگ کے بعد ضابطہ خاں کے بقیہ علاقے پر بھی ذوالفقار الدولہ نجف خاں وزیر اعظم بادشاہ دہلی نے دھوکے سے قبضہ کر لیا۔ اور جب ضابطہ خاں بے یار و مددگار رہ گیا اور خانہ ویرانی کے بعد ہر چیز سے محروم کر دیا گیا تو یہ بے کس اپنے اہل خاندان کے دہلی لایا گیا اور نجف خاں اس کی خستہ حالی سے فائدہ اٹھا کر اُس

مطالبہ کیا کہ اپنی لڑکی کی شادی اُس کے ساتھ کردے جس کے معاوضہ میں سہارن پور کی جاگیر ضابطہ خاں کو دی گئی۔ ضابطہ خاں اس تجویز پر راضی تھا لیکن اُس کی اولاد اور نجیب آباد کے شرفا کا بیان ہے جنھوں نے کہ اس واقعہ کو اپنے آباؤ اجداد سے سُنا تھا کہ صرف منگنی تھی ہوئی تھی شادی نہیں ہوئی۔ تمام غیرت مند افغانوں اور نجیب الدولہ کے اہل خاندان نے اس ذلت کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ غلام قادر کے اشارہ سے لڑکی کی ماں نے اُس کو زہر دے کر مار ڈالا۔ ضابطہ خاں کی لڑکی .... شاہی تکبر کی قربان گاہ پر جس طرح بھینٹ چڑھی اس کی تائید غلام قادر کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے جو اُس نے ۱۷۸۵ء میں دہلی سے اپنی والدہ کو لکھا تھا:۔

"ہم اس باپ کے زمانہ میں موروثی جائداد سے محروم ہوئے۔ امیر الامرا کا خطاب گیا۔ کافروں کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں ہماری عورتیں اور بچے مرہٹوں کی رُسوا کُن قید میں رہے۔ خانماں برباد ہوئے اور آخر میں اُس نے میری ہمشیرہ کی منگنی غیر کفو میں کردی جس کی وجہ سے ہمیں اُسے زہر دے کر مارنا پڑا۔ اب یہی بہتر ہے کہ تم میرے اس مجرم باپ کو زہر دے کر مار ڈالو۔ ورنہ میں تمہارا اور اُس کا دونوں کا خاتمہ کر دوں گا۔" [1]

۲۸ اپریل ۱۷۷۷ء کو شاہ عالم نے مرہٹوں اور مغلوں کی کثیر فوج سے ضابطہ خاں کی آخری جائے پناہ قلعہ غوث گڑھ پر جو ضلع سہارن پور میں تھا اور جس میں اُس کا مال و متاع تھا اور بیوی بچے رہتے تھے حملہ کر دیا۔ سخت لڑائی کے بعد قلعہ فتح ہوگیا۔ اور ضابطہ خاں اپنی جان بچانے کے لئے سکھوں کے علاقہ کی طرف فرار ہوگیا۔ [2]

ضابطہ خاں کا بیٹا غلام قادر اور اُس کے چچا سلطان خاں کا لڑکا میدان جنگ میں گرفتار ہوئے۔ غوث گڑھ کے لوگوں کا قتل عام اور غلام قادر کی گردن زدنی کا حکم ہوگیا۔ لیکن منظور علی خاں خواجہ سرا بیچ میں آگیا اور اُس نے اپنا لبادہ ڈال کر اُس کی جان بچائی۔

غوث گڑھ کی کُل جائداد پر قبضہ ہوگیا۔ سب سے بُری بات یہ ہوئی کہ ضابطہ خاں اور جملہ روہیلا سرداروں کی عورتوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور شاہی قلماقنیوں نے اُن کی جامہ تلاشی لی

---

[1] عجیب التواریخ۔

[2] سکھوں کے تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہوا ہے کہ ضابطہ خاں نے اس موقع پر مجبوراً سکھ مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔

اس کے بعد گرفتار شدہ عورتیں اور بچے آگرہ کے قلعہ میں بھیج دئے گئے۔ صرف غلام قادر کو قدیم شناسائی کی وجہ سے دہلی لے گئے جسے لال قلعہ میں بادشاہ نے اپنی خدمتِ خاص میں رکھ لیا۔

اُس وقت غلام قادر ۱۸ سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ شاہی محل کے دوسرے قیام میں شاہنشاہ نے محسوس کیا کہ شاہی خواتین حرم کی توجہ اُس کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ لہٰذا امکانی رُسوائی سے بچنے کے لئے ایک دن غلام قادر کو کوئی نشہ آور دوا پلادی جس سے وہ بیہوش ہوگیا۔ اور بیہوشی کی عالم میں آپریشن کر کے اُن کی قوتِ مردمی سلب کر دی گئی۔

افسوس دہلی کی شاہنشاہیت کس درجہ قساوتِ قلبی میں ڈوب گئی تھی۔

غلام قادر خاں ۶ ، اپریل ۱۷۷۳ء کو شاہی دربار سے رُخصت کر دیا گیا اس کے باپ سے صلح ہوگئی۔ کیونکہ شاہی حکومت اُن دنوں جاٹ اور راجپوت قوتوں سے دست و گریباں تھی۔ شمالی دو آبہ سکھوں کی یلغار کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ضابطہ خاں کو سکھوں کے خلاف لڑنے کے لئے منشورِ شاہی کے تحت سہارنپور کے ساتوں محال معہ قلعہ غوث گڑھ دیدے گئے۔

یہ ضابطہ خاں کی وہ پناہ گاہ تھی جس میں اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام عالمِ شکست خوردگی میں گزارے اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے اِس کے بیٹے غلام قادر نے اُٹھ کر ہندوستان کے سیاسی تماشہ گاہ میں شیطانوں کا ساہیبت ناک رقص دکھایا۔

شاہ عالم کے دلّی واپس آنے اور تخت نشیں ہونے کے ۱۰ برس کے اندر اندر وہ بہادر روہیلہ فوجیں جنہوں نے دلّی کے چاروں طرف شاہی خدمت گزاری کی غرض سے ایک حصار عافیت کھینچ رکھا تھا بالکل نیست نابود کر دی گئیں۔ اور ایک شجاع قوم کی شاندار نوآبادیات جو نواب محمد خاں بنگش۔ نواب علی محمد خاں۔ ولاور الملک نواب دوندے خاں۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور نواب نجیب الدولہ کی سرفروشیوں کا نتیجہ تھیں۔ ہندوستان کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹادی گئیں۔ اب کوئی طاقت ایسی باقی نہ رہی جس میں اِتنی سکت ہو کہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے شکست یافتہ مرہٹوں میں اگر ازسرِنو زندگی کی لہر دوڑ جائے تو وہ مشترکہ اسلامی انقلاب میں شامل ہو کر اُن سے ٹکر لے سکے۔

یکم دسمبر ۱۷۸۴ء کو شاہ عالم نے ایک دربارِ عام میں پیشوا کو اپنا نائب اور امیر افواج مقرر کیا۔ ۳، دسمبر کو ایک دوسرے دربار میں مہاداجی سندھیا کو سلطنت کا مدارالمہام (وکیل مطلق) مقرر کیا۔

یہ اعزاز اس سے پہلے بہت کم لوگوں کو دیا گیا تھا۔

سلطنت تیموری کی طویل تاریخ میں اس کی صرف تین ۳ مثالیں ملتی ہیں۔

نئے وکیل مطلق نے ایک لاکھ تیئس (۱۲۳۰۰۰) ہزار روپئے ماہوار کا وظیفہ شہنشاہ کی ضروریات زندگی کے لئے مقرر کر دیا۔ مہاداجی سندھیا کی بغیر اجازت کوئی شخص بھی بادشاہ سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا اور ایک انچ زمین بھی ایسی نہ تھی جس کو بادشاہ اپنی کہہ سکیں۔

جس وقت مہاداجی سندھیا صحیح معنیٰ میں سلطنت کا آمر مطلق تھا — کمزور بادشاہ کم سے کم ایک حیثیت سے ضرور خود مختار تھا اُس نے اپنا خزانہ چھونے کی کسی کو اجازت نہیں دی اور اسلئے مہاداجی کو اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لئے خود ہی روپیہ فراہم کرنا پڑا۔

روپیہ کی خاطر اُس نے بہت سی مہمات کیں اور کتنی ہی لڑائیاں لڑیں لیکن اُن میں سے کسی سے بھی پورے طور پر اُس کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ ایسا ہی ایک حملہ راجہ جے پور پر ہوا۔ راجپوت دلیری سے لڑے اور مہاداجی 'لال سوٹ' کے میدان سے ار اگست ۱۷۸۷ء کو پسپا ہونے پر مجبور رہا۔ ہندوستان کے اس جنگی دَور میں اُس کی یہ کمزوری جب عوام پر عیاں ہوئی تو وہ حریفوں کی نگاہ میں ذلیل ہو گیا۔ غلام قادر پہلا شخص تھا جس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دشمن پر کاری ضرب لگائی۔

نواب ضابطہ خاں کے انتقال کے بعد سہارنپور کا علاقہ ۲۱ر جنوری ۱۷۸۵ء کو اُسے مل گیا تھا اور وہ ڈھائی سال سے باطمینان اور بعافیت وہاں حکومت کر رہا تھا۔ اگر اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہندوستان کی ۳ دوسری پٹھان ریاستوں رامپور، ٹونک اور بھوپال کی طرح اُس کے خاندان میں بھی آج سلسلۂ حکومت موجود ہوتا۔ لیکن واقعات نے اُسے مجبور کر دیا۔ غدر اسی بھی آراضی مرحوم نجیب الدولہ کے پوتے کے قبضے میں لوگوں کو دیکھنا گوارا نہ تھی۔ مہاداجی سندھیا نے جے پور کے معرکہ سے پہلے ہی غلام قادر کے خلاف جنگ کا تہیہ کر لیا تھا۔ تاکہ ضلع سہارنپور کے زرخیز اور سرسبز علاقے پر زبردستی قبضہ کر لیا جائے۔

جوں ہی غلام قادر کو مہاداجی سندھیا کا زوال جے پور کی جنگ سے محسوس ہوا۔ وہ گوشہ نشینی چھوڑ کر بسرعت سہارنپور اور روہیلکھنڈ سے فوج جمع کر کے ہندوستان میں اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی مدافعت کی غرض سے میدانِ عمل میں نکل آیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اُس کے دادا نواب نجیب الدولہ نے سلطنت سے مرہٹوں کا اقتدار دُور کرنے کے لئے اقدام کیا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے دارالحکومت پر یلغار کی اور ۵ر ستمبر ۱۷۸۷ء کو دہلی میں داخل ہو گیا۔ غلام قادر کے طوفانی حملے اور مہاداجی کے

نمائندے کی بزدلی سے بادشاہ فوراً مرعوب ہوگیا۔ اُس نے غلام قادر کو باریابی بخشی اور بخشی الممالک کے عہدے پر سرفراز کیا۔

امیر الامرا اور روشن الدولہ بہادر کا خطاب اور خلعت و تحائف بھی عطا کئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اُس کے عہدے اور مرتبے کے مناسب حال جاگیر کی منظوری کا فرمان بھی جاری کیا جائے۔ نیز اُسے شاہی صرفِ خاص کی جاگیرات کا منتظم مقرر کیا جائے۔

دارالسلطنت پر قبضہ کے بعد غلام قادر شاہ عالم کی تعمیل حکم میں اُس کے سپہ سالار کی حیثیت سے دہلی سے روانہ ہوا۔ تاکہ عطا شدہ جاگیروں کو سنبھالے اور صرفِ خاص کی جاگیرات جو معزول مدار المہام مہاداجی سندھیا کے قبضہ میں تھیں اُنھیں اپنے تحت میں لائے۔ اس مقصد میں بھی اُسے حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔

دس ماہ سے بھی کم عرصہ میں یعنی ۱۲ ستمبر ۱۷۸۷ء سے یکم جولائی ۱۷۸۸ء تک اس نے دوآبہ۔ خورجہ۔ علی گڑھ۔ فیروزآباد۔ اور آگرہ تک نیز دوسرے مشہور مقامات اور کمبھر کا قلعہ جو جاٹوں کے قلمرو میں تھا۔ فتح کر لئے۔ ہر مقام پر جاٹوں اور مرہٹوں کی فوج کی بیخ کنی کر دی گئی۔ غلام قادر نے اپنے حلیف اسمٰعیل بیگ ہمدانی کے ساتھ مل کر جو آگرہ میں اِس کا شریک کار تھا ایسے ایسے بہادرانہ حملے کئے کہ مہاداجی کو مجبوراً اپنے مستقر گوالیار میں پناہ لینی پڑی۔ اور ہندوستان سے اُس کے اثرات بالکل زایل ہو گئے۔

چنانچہ مرہٹہ سفیر مقیم دہلی نے اپنے ایک خط میں اُس وقت یوُں لکھا کہ:۔

"جاٹ راجہ اور سندھیا کی افواج غلام قادر اور اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی فوج سے آٹھ آٹھ دس دس کوس دور رہتی ہیں۔ جدھر یہ دونوں خان اپنا رُخ کرتے ہیں۔ ہمارے آدمی اُن کے مقابلے کی تاب نہیں لاتے۔ اور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔" [۵]

اُس وقت غلام قادر اور اسمٰعیل بیگ کی متحدہ فوجیں بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) سواروں۔ پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) پیدل فوج اور نوّ توپوں پر مشتمل تھیں۔ لیکن ان فاتح جنرلوں کو اپنے لشکر کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔

ان کو اس وقت تک دہلی سے کچھ مدد نہ ملی۔ برخلاف اس کے بادشاہ شاہ عالم جن کو صرف

---

[۵] زوال سلطنت مغلیہ۔ جلد سوم۔ از سر جادو ناتھ سرکار۔

اپنے وظیفہ کا روپیہ اپنے سرپرستوں سے وقت پر ملجانے سے سروکار تھا۔ان دونوں ہی ناراض ہوگئے۔کیونکہ مہاداجی سندھیا کے پاس سے باقاعدہ روپیہ آنے بلکہ بند ہوجانے کے یہی لوگ ذمہ وار تھے۔ بالآخر روپیہ کی قلت اور اندرونی سازشوں نے دونوں بہادروں کی کمریں توڑ دیں۔

علاوہ بریں بعض غیر متوقع واقعات نے بھی مہاداجی کی اعانت کی اور مرہٹوں اور جاٹوں کی متحدہ افواج نے ڈیگ اور آگرہ کے مقامات پر غلام قادر اور اسمٰعیل بیگ کو شکست دیدی۔ غلام قادر اور اسمٰعیل بیگ نے قدرتی طور پر دہلی مراجعت کرکے اپنے آقا شاہ عالم سے امدادی فوج اور مالی مدد کی التجا کی۔لیکن شاہ عالم نے جو فطرتاً مغرور المزاج اور ابن الوقت تھا مہاداجی سے گفت و شنید شروع کردی۔اور ۲۴؍جون ۱۷۸۸ء کو مضطربانہ اُس کی حمایت کی اپیل کی۔مہاداجی نے امید افزا جواب دیا۔اُدھر اسمٰعیل بیگ اور غلام قادر نے دہلی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے اور شاہی فوج اُن کے مقابلہ کیلئے بھیج دی گئی۔مگر غلام قادر نے ۱۴؍جولائی ۱۷۸۸ء کو احسان فراموش بادشاہ کی مخالفت کا قلع قمع کردیا۔اور بغیر کسی خاص دقت کے دارالسلطنت اور لال قلعہ میں داخل ہوگیا۔باوجود اس سخت بے وزدانہ اور غیر ہمدردانہ برتاؤ کے غلام قادر نے صبر و تحمل کو ہاتھ سے نہ دیا اور جب وہ اور اسمٰعیل بیگ شہنشاہ کے سامنے آئے تو وفورِ انکساری سے اُس کے پیروں پر گر پڑے اور بغیر اجازت قلعہ میں داخل ہونے کی معافی چاہی۔شاہ عالم نے ریاکاری سے اُن کو گلے سے لگالیا اور کہا:۔

"تم دونوں میرے فرزندوں کی طرح ہو مجھے تمہاری پاس خاطر دل سے عزیز ہے۔"

اِس پر غلام قادر نے عرض کیا:۔

"حضور والا کو چاہیئے کہ گزری ہوئی باتوں کو خیال مبارک سے دور فرمادیں کیونکہ یہ وقت دستگیری ہم نمک خواران کا ہے۔انشاء اللہ تعالیٰ حضور کے اقبال سے عنقریب کل مرہٹوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا۔تاکہ حضور کے عہد حکومت میں اسلام کی ترقی ہو اور سلطنت کو زیب و زینت حاصل ہو۔"[۵]

[۵] مجمع التواریخ

اس گفتگو کے بعد علاوہ خطابات پیش گاہِ شاہی سے خلعتِ ہفت پارچہ۔کلغی۔سرپیچ۔ مالائے مروارید۔سپر و شمشیر اور فیل و اسپ۔ غلام قادر خاں کو عطا ہوئے اور غلام قادر نے شہر دہلی اور قلعہ پر قابو پاکر مرہٹوں کے خلاف اپنا آئندہ لائحہ عمل بنانے کے لئے تیاریاں

شروع کر دیں۔ دو ہفتہ تک کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ لیکن ۲۹ جولائی ۱۷۸۸ء کو غلام قادر خاں نے بادشاہ سے فوج کے اخراجات کے لئے ۳۰ لاکھ روپئے مرحمت کئے جانے کی درخواست کی۔

بادشاہ جس کا بخل عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا تھا اس پر جھنجھلا اٹھا اور سر دربار غلام قادر کو گالیاں دیں۔ یہ سر دربار توہین اونٹ کے بوجھ پر آخری تنکا تھا ——— جسے وہ برداشت نہ کر سکا۔ غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ مثل ہے کہ افغانی جذبۂ انتقام کو سوئے ہوئے چاہے جگ بیت جائیں لیکن وہ کبھی مرتا نہیں ہے۔ غلام قادر نے اپنی ذات، خاندان اور پوری روہیلہ قوم کے خلاف جاں گسل واقعات کو اب تک صبر کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ شہنشاہ کی انتہائی سخت دلی اور بزدلانہ سرشت نے اسے اب دیوانہ بنا دیا۔ اسے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ جب تک وہ ہندوستان کو شاہی خاندان سے پاک و صاف نہ کرے گا اور ان بزدلوں اور بدچلن لوگوں کو جنھوں نے دہلی کے تخت کو گندہ کر رکھا ہے برباد نہ کرے گا۔ قومی اصلاح ناممکن ہے۔

مرہٹوں سے زندگی اور موت کی کشاکش میں روپیہ ایک فیصلہ کن چیز تھی۔ شہنشاہ اور شاہی خاندان کے مرد اور عورتیں کروڑوں روپیہ کے مالک تھے لیکن سلطنت کے محافظ، فوجی لوگ معمولی معمولی تنخواہوں کے بھی وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے برسوں سے بھوکے مر رہے تھے۔ اس لئے غلام قادر نے تیس (۳۰۰۰۰۰۰) لاکھ روپیہ معہ سود بالائے سود زبردستی وصول کرنے کا تہیہ کر لیا۔

۳۰ جولائی کو بادشاہ کی تخت سے معزولی ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو نابینا کیا جانا۔ شہزادوں شاہی بیگمات کی تذلیل اور اذیت میں بہیمیت اور ستمگری کا بے جا طول اور دہلی کی ہولناک تباہی یہ سب چیزیں اسی کا نتیجہ تھیں۔

تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر شاہ عالم ابتداہی میں تیس (۳۰۰۰۰۰۰) لاکھ روپئے شاہی فوج کے اخراجات کے لئے دیدیتے تو وہ تمام مصیبتیں جو اُن پر اور اُن کے خاندان پر آئیں دفع ہو جاتیں۔ لیکن اُن کو تو دولت زندگی اور عزت سے زیادہ عزیز تھی۔

اگرچہ لارڈ کلایو سے ۱۷۶۵ء میں صلح کر لینے کے بعد سے بادشاہ نے کافی دولت بنگال کی خراج اور پتھر گڑھ اور غوث گڑھ کے مالِ غنیمت سے سمیٹ لی تھی۔ تاہم اس نے ایک پائی بھی ملک کے انتظام اور فوج کی تنخواہ پر صرف نہیں کی۔

مستقل مزاجی کے ساتھ اُس کی تمام بُزدلانہ حرکات۔ خفیہ حکمت عملی اور مکارانہ چالیں محض اپنی ذات کے لئے روپیہ جمع کرنے کے لئے ہوتی تھیں۔ خواہ یہ روپیہ ایمانداری سے جمع ہو یا بے ایمانی سے۔ اسی سبب سے اُس کی تجوریاں بے پایاں دولت سے معمور تھیں۔

مرہٹہ سفیر نے جولائی ۱۷۸۲ء میں پونا لکھا کہ:۔

"مرکزی حکومت میں بڑی ابتری ہے۔ خزانۂ عامرہ خالی ہے اور سپاہیوں کے پاس اشیاء خورونوش کی خریداری کے لئے روپیہ نہیں ہے۔

وزیراعظم نجف خاں کا ذاتی محافظ دستہ فوج بھی بھوکوں مر رہا ہے اور گھوڑے اور ہاتھی چارہ نہ ملنے کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔"

مگر غلام قادر خاں بادشاہ کی مالی حالی سے پورے طور پر باخبر تھا اس لئے ظاہری مفلوک الحالی سے دھوکے میں نہ آسکتا تھا۔ اُس نے الوہیت کے اُس مصنوعی نقاب کو جو دہلی کی شہنشاہیت پڑا ہوا تھا اپنے وحشی افغان ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دیا۔

شہنشاہ کو معزول اور نابینا کرنے کے علاوہ اُس نے ہفتوں اہالیانِ قلعہ پر خورونوش کو بند رکھا۔ شہزادوں کو زدوکوب کیا۔ شاہزادیوں کی توہین کی۔ نوکروں کو مرتے دم تک کوڑے لگوائے اور محل کو تاراج کیا۔ خزانے جو قلعہ سے باہر دبے ہوئے تھے کھدوا ڈالے۔

اس طرح ۲۵ کروڑ روپئے نقد اور دوسری قیمتی چیزیں اُس کے ہاتھ آئیں۔ باوجود اُن سخت مظالم کے جو غلام قادر نے توڑے پادشاہ نے خود اپنی زبان سے اپنی پوشیدہ دولت کا کبھی پتہ نہ دیا۔

اِسی طرح اُس کے متوسلین اُس بے پناہ دولت کو تھوڑا تھوڑا کرکے بتاتے تھے اور وہ بھی جبکہ متواتر ہفتوں اُن کو سخت تکالیف دیجاتی تھیں۔ غلام قادر نے ایک موقع پر کہا:۔

"یہ قوم پادشاہ کی عجب پتھر دل ہے کہ اس قدر لعنت و ملامت پر جو ان کے ساتھ عمل میں آئی مطلق اثر نہیں ہوتا اور ہر مرتبہ کی مار دھاڑ کے بعد بمشکل مال کا پتہ دیتے ہیں اور میں نے جو یہ روپیہ جمع کیا ہے صرف فوج کے خرچ کے واسطے ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے بخل کی متعدی بیماری سارے خاندان میں پھیلی ہوئی تھی ؎

بدستِ خلقِ عالم کاسۂ دریوزہ می بینم
گدا چوں پادشہ گردد گدا سازد جہانے را

بادشاہ شاہ عالم نے خود بھی — آنکھوں کی روشنی کھو دینے اور — بربادی کے بعد اپنی عمر بھر کی غلطی کو بالآخر محسوس کیا چنانچہ اپنے مشہور مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

بُود جاں کاہ زر و مال جہاں ہمچو مرض
دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریٔ ما

بادشاہ کی آنکھیں نکالے جانے کو ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہمیت دی گئی ہے لیکن یہ بات ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اُس زمانہ میں محل شاہی میں حادثاتِ قتل اور دشمن کو تخت سے محروم کرنے کے لئے آنکھیں نکلوانا معمولی باتیں تھیں۔

شاہنشاہ ہمایوں کے زمانہ سے جس نے اپنے بھائی کامراں کو نابینا کیا۔ شاہ عالم کے والد عالمگیر ثانی تک (جنھوں نے احمد شاہ کو اندھا کر کے مقید کر دیا) درجنوں مغل شہزادے اس قسم کے مظالم کا شکار ہوئے۔ اِسی وجہ سے غلام قادر نے شاہ عالم کو مخاطب کر کے کہا:۔

"تم نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ میں نے تو بہت تحمّل سے کام لیا۔ اور انصاف کے قایم کرنے اور تمہاری جان بخشی میں کوشش کی ورنہ لیکہ تم تو اِس کے مستحق تھے کہ تمہارے جسم کے اعضاء کو کاٹ کاٹ کر چیل کوّوں کے آگے ڈال دیا جاتا۔"

خود شاہ عالم نے بھی اپنی تکالیف کو اتنا محسوس نہیں کیا جتنا کہ آج ہم کرتے ہیں۔ اِس کا ثبوت ذیل کے اُس خط سے ملتا ہے جو شاہ عالم نے دلّی سے غلام قادر کو اُس وقت لکھا تھا جبکہ وہ مرہٹوں کے محاصرہ کے دباؤ اور اپنے ساتھی اسمٰعیل بیگ کی غداری کی وجہ سے مع چند شہزادوں کے دلّی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا:۔

"فدویِ خاص۔ لائقِ الاختصاص۔ قابل العنایات والاحسان۔ وکیل مطلق۔ بخشی الممالک۔ نصیرُ الملک۔ امیرالامراء۔ نجیبُ الدّولہ۔ مدارُالمہام۔ مؤیدالسلطنت۔ اساتینِ خلافت۔ سپہ سالار۔ رستمِ ہند۔ منصورِ زماں۔ روشن الدّولہ۔ فرزند خاص الخاص۔ نواب غلام عبدالقادر خان بہادر۔ ثابت جنگ۔ فدوی محمد شاہ عالم بادشاہ۔ خدا کرے کہ تم اعلیٰ مراتب اور شاہی اعزازات سے ہمیشہ سرفراز

ہوتے رہو۔ تم کو واضح ہو کہ جو بدعنوانیاں تم سے گورنمنٹ شاہی کے خلاف سرزد ہوئی ہیں وہ ہماری ہی کوتاہیوں اور گردشِ فلک کا نتیجہ تھیں۔ تمہارا کچھ قصور نہیں ہے۔"

کردہ بودیم گناہے کہ سزایش دیدیم
ہست مصروف کہ بخشند گنہگاریٔ ما

لیکن خدا اُنھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں۔ غلام قادر خاں جو ہندوستان میں سلطنتِ اسلامیہ کے قیام و بقا کے لئے جان کی بازی لگا کر میدان میں آیا تھا۔ اپنے حلیف اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی غداری اور قلعۂ دہلی سے حاصل شدہ خزانہ کے راستہ میں لُٹ جانے کی وجہ سے آخرکار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ دہلی سے نکل کر چھ مہینہ تک بڑی بڑی مہموں اور لرزہ خیز واقعات سے گزر کر اتفاقاً اپنی فوج سے جُدا ہو گیا اور مرہٹہ فوج نے اُس کو تحصیل شاملی ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں 'جتی' یا 'جنتی' میں جہاں وہ ایک برہمن کے مکان میں آرام کر رہا تھا گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اُسے مہاداجی سندھیا کے پاس متھرا لایا گیا جہاں ۲ر لغایت ۴ر مارچ ۱۷۸۹ء میں تین دن تک سخت اذیتیں دے کر ایسی اذیتیں جو اُس کے ہاتھوں شاہ عالم کو بھی نہ پہونچی تھیں۔ شہید کر دیا۔
جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے متھرا میں پھینک دئے گئے۔ سر علی گڑھ میں ساسنی گیٹ کے پاس سپردِ خاک کر دیا گیا[51] اور اُس کی آنکھیں شاہ عالم کے پاس دہلی بھیجدی گئیں۔

---

[51] خاکسار مترجم نے علی گڑھ میں ساسنی گیٹ کو جہاں غلام قادر خاں کا سر دفن کیا جانا بتایا گیا ہے جا کر دیکھا۔ ظاہر ہے کہ جن حالات میں غلام قادر خاں کو شہید کیا گیا اور جس طرح اُس کے سر کو دفن کیا گیا ہوگا۔ اُس کی کوئی مستقل اور پائدار یادگار باقی رکھنے کی بھلا کس نے کوشش کی ہوگی۔ تاہم بعض صورتیں ایسی بھی پیش آجاتی ہیں کہ مستحکم اور پائدار یادگاروں کے نشان تک باقی نہیں رہتے اور کمزور سے کمزور نشانیاں صدیوں باقی رہ جاتی ہیں۔

مہاداجی سندھیا کی فوج کے سپاہی متھرا سے دتی جاتے ہوئے ضرور ساسنی دروازہ کے قریب
(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر)

غلام قادر کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد مہاداجی سندھیا کی فتحمندی اور حکومت کا جھنڈا دہلی پر پھر لہرانے لگا اور بغیر کسی مزاحمت کے مسلسل تیرہ ۱۳ سال تک لہراتا رہا۔ یہاں تک کہ سینٹ جارج کے انگریزی پرچم نے اُس کی جگہ لی۔ اور اس طرح شاہ عالم کی دلی تمنائیں بھی پوری ہوگئیں۔ جن کی جھلک اُن کے ذیل کے اشعار میں پائی جاتی ہے ؎

مہاداجی سندھیا کہ فرزند جگر بند من است
ہست مصروف تلافیٔ ستم گاریٔ ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستورِ من اند
چہ عجب گر بنمایند مددگاریٔ ما

(مترجمہ)

سراج الحق قریشی

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۱ سے) ٹھیرے ہوں گے کیونکہ یہی راستہ تھا۔ مذکورہ گیٹ کے قریب ہی ایک پرانا کنواں بھی ہے جہاں پڑاؤ کی ترغیب ہوئی ہوگی۔ اس پڑاؤ میں غلام قادر خاں کے سر کو ایسی حالت میں دیکھا گیا ہوگا کہ وہ تیزی کے ساتھ سڑ گلا جا رہا ہے اور دہلی تک نہ پہونچ سکے گا۔ تو اُس کو اِسی جگہ زمین میں گاڑ دیا۔ اور ثبوت کے لئے ایک کچا چبوترہ بھی بنا دیا۔ عجب اتفاق ہے کہ اِس جگہ ایک چھوٹا سا کچا چبوترہ آج تک موجود ہے اور اِس کو "کلہ داری" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس کے معنی وہ جگہ جہاں سر رکھا گیا۔ بہ آسانی مفہوم ہوتے ہیں۔
بالخصوص کلہ کے ساتھ فارسی کا لفظ 'داری' اُس عہد کی خبر دیتا ہے جبکہ ہندوستان میں فارسی زبان رائج تھی۔ اِس "کلہ داری" یا غلام قادر خاں کے سر کا مدفن اب تک محفوظ رہنے کا یہ سبب ہوگیا کہ اس نواح کے غریب غربا اور نیچ ذات کے لوگ ایک نٹ کی قبر سمجھ کر اس کو راضی رکھنے کے لئے بھنگ۔ شراب۔ سلفا۔ پانی کی مشک اور پھول چڑھاتے ہیں اور لپائی اور لسھائی بھی کرتے ہیں۔
ضرورت ہے کہ غلام قادر خاں جیسے مرد میدان شہامت اور مجاہد ملت کی اِس مقام پر ایک صحیح اسلامی نمونہ کی یادگار بنائی جائے اور تاریخ شہادت کا کتبہ نصب کر دیا جائے۔

(قریشی)

تصانیف سیّد الطاف علی بریلوی

حیاتِ حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اردو زبان میں پہلی مکمل و مبسوط با تصویر سوانحعمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور ولولہ انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۵ روپے (زیر طبع بار دوم)

مسلمانوں کی تعلیمی جدّ و جہد — (بہ زبان انگریزی) اس کتاب میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کی مسلمانانِ ہند کی بالخصوص اور مسلمانانِ یو۔پی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جدّ و جہد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (زیر طبع بار دوم)

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی دس سالہ 'پبلک لائف' کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت ۸ آنے

معرکۂ انتخاب جداگانہ و مخلوط — جداگانہ یا مخلوط کونسا طریقۂ انتخاب مسلمانوں کے مفید ہے اس سوال کا جواب عام فہم زبان میں دیا گیا ہے۔ قیمت ۲ آنے

رباعیاتِ عرش فاروقی — بریلی (روہیلکھنڈ) کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے درد انگیز حالاتِ زندگی اور بطور نمونۂ کلام اُن کی کیف آور رُباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۸ آنے

صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رُکاوٹیں درپیش ہیں۔ ان پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حلِ مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت ۸ آنے

نواب دوندے خاں — (بہ زبانِ انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار عزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر بہرام جنگ کے مجاہدانہ واقعات اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت ۴ آنے

غلام قادر روہیلہ (سلطنتِ مغلیہ کا آخری محافظ) (بہ زبان انگریزی و اردو) قیمت ۸ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بکڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ یو۔پی

ولی گجراتی

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)



ریختہ گوئی کے موجد اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی احمد آبادی آج سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے گزرے ہیں، لیکن اُن کی زندگی کے حالات ہم کو معلوم نہیں ہو سکے۔ اس کو تذکرہ نویسوں کی غفلت کہئے یا ہماری ناقدر شناسی کہ ہم نے اس نامور شخص کو قابل اعتنا نہ سمجھا جس نے ہماری زبان کے ارتقا اور اس کی اصلاح و ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ آج دُنیا کی دیگر زندہ زبانوں کے ہمدوش ہو رہی ہے۔ اس کی نسبت آزاد مرحوم اپنے مخصوص اندازِ بیان میں اس طرح شکوہ سنج ہیں:-

> "افسوس یہ ہے کہ ہماری زبان کے مؤرخ اور ہمارے شعرا کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدا رسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اس کے ذاتی خصائل و حالات مثلاً دُنیا داری یا گوشہ گیری، اقامت یا سیاحی، راہِ علم و عمل کی نشیب و فراز منزلیں یا اس کی صحبتوں کی مزہ مزہ کی کیفیتیں معلوم ہوں بلکہ برخلاف اس کے سنہ ولادت اور سالِ فوت تک بھی نہ بتایا۔" [1]

ولی کے صحیح حالاتِ زندگی کا جمع کرنا تو درکنار اُن کے صحیح نام تک کا ہمیں علم نہیں ہو سکا، بلکہ ان کے اصلی وطن تک سے ہم بے خبر ہیں اور اب تک ان کے حالات سے عدم واقفیت کی وجہ سے ان کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں، اور اُن کے کلام سے کھینچ تان کر وہ مطالب پیدا کئے جا رہے ہیں جن کا وہ حامل نہیں ہے۔ ع

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ولی کے وطن کی بحث خود ولی کے وطن کی بحث ایک مدت دراز سے چلی آ رہی ہے اور آج تک کئی مصنفین اور اہلِ قلم اِس پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں، لیکن اب تک کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے، جیسا کہ شعرائے اردو کے فارسی تذکروں سے متبادر ہوتا ہے، ولی کی وفات کے

---

[1] آبِ حیات صفحہ ۹۲ مطبع کریمی لاہور

کوئی چالیس[۴] پچاس برس کے بعد ان کے وطن کی نسبت اختلاف پیدا ہوا، اور اس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد اس قدر طویل مدت کے اثنا میں کسی نے ان کے حالات سے اعتنا نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان کے وطن بلکہ خاندان، نام، سنہ ولادت و وفات تک معرضِ خفا میں رہے، اور اسی ناواقفیت کے باعث جس تذکرہ نویس نے جو کچھ معلوم کیا اور سُنا سنایا وہ لکھ ڈالا۔ چنانچہ بعض نے ان کو گجراتی لکھا اور بعض نے دکنی۔

کسی ادیب یا شاعر کا وطن کوئی سا بھی ہو، صرف اس کے کمالِ فن سے عموماً سروکار ہونا چاہئے، لیکن جس ماحول میں اُس نے پرورش پائی، جن لوگوں سے اکتسابِ فیض اور استفادہ اور جو ملکی و وطنی حالات و واقعات اس کی زندگی پر اثر انداز ہوئے، ان کو معلوم کرنا اس کے ادبی اور شعری کارناموں کے مطالعہ و تنقید کے لئے ناگزیر ہے، اور اس لئے ضرورت ہے کہ ولی کے نام۔ وطن اور صحیح حالاتِ زندگی پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ اُردو زبان و ادب کے محققین بھی اب تک اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں، اور بعض متردد ہیں اس لئے کہ ان کو کوئی قطعی ثبوت ابتک نہیں ملا۔ مولوی عبد الحق صاحب ۱۹۳۳ء میں رقمطراز ہیں:۔

> "ولی کو سب سے پہلے اورنگ آبادی میر حسن نا ہی نے لکھا ہے، اگرچہ یہ امر متنازع فیہ ہے اور کوئی قطعی ثبوت ابتک بہم نہیں پہنچا کہ ولی اورنگ آبادی تھا یا احمد آبادی۔"[۵۱]

۱۹۳۵ء میں مولوی صاحب نے اپنی مذبذب رائے کا اظہار یوں کیا ہے:۔

> "یہ اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے"[۵۲]

بایں ہمہ اسی زمانہ میں اُنھوں نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی بھی لکھ دیا ہے۔[۵۳] لیکن بعض محققین[۵۴] جنھوں نے اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی ہے اور ولی کے

---

[۵۱] نکات الشعرا، مقدمہ صـ ۸-۷ (طبع ثانی) انجمن ترقیٔ اردو [۵۲] مخزنِ شعراء، مقدمہ صـ ۶

[۵۳] دیکھو مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون "اُردو" پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ج ۴ صـ ۱۰۲۶) میں: "موجودہ اُردو شاعری کی ابتدا محمد شاہ (۱۱۳۱ھ۔ ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں ہوئی حتیٰ کہ ولی دکنی اورنگ آبادی (۱۰۹۹ھ۔ ۱۱۵۹ھ؟) نے بھی اُس وقت جو اساتذہ دہلی میں تھے اُن سے سیکھا"

[۵۴] ہماری مُراد اپنے فاضل دوستوں پروفیسر شیرانی، مولانا ابوظفر ندوی اور پروفیسر نجیب اشرف سے ہے۔ جنھوں نے گجرات کے اردو ادبیات کی تحقیق کی ہے۔ ہمیں اس بات کے اظہار سے مسرت ہوتی ہے کہ اب ہمارے گجراتی بھائیوں نے اس طرف

(باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وؔلی گجراتی تھے۔

دکنی پروپگنڈا

دوسری طرف بعض دکنی مصنفین اور اہلِ قلم نے حُبِّ وطن کی بنا پر یا عصبیت کے جوش میں آکر وؔلی کو دکنی ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ اُنھوں نے بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود وؔلی کے بعض اشعار کو اپنی قیاس آرائیوں کا ماخذ بنا کر وؔلی کو دکنی بلکہ اورنگ آبادی بنا دیا، حالانکہ ان کے پاس کوئی ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہے جو قطعی اور یقینی ہو۔ صرف استقرائی اور قیاسی استدلال سے اُنھوں نے وؔلی کے متعلق دُور از کار نظریے قائم کئے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی تحقیقات نے ”کوہ کندن“ کا عجیب مضحکہ انگیز پیرایہ اختیار کیا ہے، جس سے وؔلی کے وطن اور ان کے خاندانی حالات پر اور بھی پردہ پڑا رہا اور لوگوں کی توجہ ان کے دکنی ہونے کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی چنانچہ وہ ”کعبہ“ پہنچنے کی بجائے ”ترکستان“ پہنچ گئے! جو بات زیادہ شہرت پکڑ جاتی ہے، عموماً اس کی تاریخی صحت مشتبہ ہوتی ہے، یہی حال وؔلی کے دکنی ہونے کا ہے جس کی شہرت و تشہیر نے ان کے اصلی وطن اور خاندانی حالات کو پوشیدہ اور نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف موجودہ معلومات کی روشنی میں اگر حالات و واقعات پر ایک نظرِ غائر ڈالی جائے تو وؔلی کو ہرگز دکنی نہیں تسلیم کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ بعض محققین ادب اردو نے اس کی نسبت صرف اپنی مذبذب رائے کا اظہار کیا ہے۔ بایں ہمہ وؔلی کے دکنی ہونے کو اب اس قدر مسلّم مان لیا گیا ہے کہ گویا اب اس میں چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہی، اور دکن کے بعض ادیبوں نے جو ”ماہرِ دکنیات“ سمجھے جاتے ہیں، وؔلی کے دکنی ہونے پر گویا اتمامِ حجت کر دی ہے اور اس بارے میں اپنی تحقیقات کو انھوں نے قولِ فیصل کا رُتبہ دے دیا ہے۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہے: [۱]

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۶ سے) توجہ کی ہے، خاص کر وؔلی کے متعلق اب تحقیقات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ اَلسَّابِقُونَ الْاَوَّلُون ہمارے محترم دوست سیّد منظور حسن صاحب علوی ہیں جو خود وؔلی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ہمارے ایک عزیز سیّد ظہیر الدین مدنی (لکچرار گجرات کالج) نے بمبئی یونیورسٹی کو ڈاکٹریٹ کے لئے ”اردو شعرائے گجرات“ پر ایک محققانہ مقالہ پیش کیا ہے۔

[۱] سنہ ۳۶ء میں سٹی کالج حیدرآباد کے طلبہ نے یادگارِ وؔلی کا جشن منایا تھا اور اس تقریب پر کئی مقالات وؔلی کے وطن اور ان کی شاعری وغیرہ پر پڑھے گئے تھے۔ ان مقالات کا مجموعہ کالج مذکور کے رسالہ ”المومن“ کے یادگارِ ولی نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دلائل اسی سے ماخوذ ہیں۔

(۱) تذکرہ نویسوں نے ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی لکھا ہے۔
(۲) خود ولی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دکنی تھے۔
(۳) ولی نے فراق گجرات والے قطعے میں لفظ "سیر" لکھا ہے جس سے صرف بطور سیر و سیاحت ان کا گجرات جانا ثابت ہوتا ہے۔
(۴) ولی کے کلام میں دکنی الفاظ و محاورات بکثرت پائے جاتے ہیں۔
(۵) ولی نے اپنے کلام میں اپنے ہمعصر دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے۔
(۶) دیوان ولی کے ایک قلمی نسخہ (موجودہ کتب خانۂ انڈیا آفس) کے آخر میں کاتب نے جو ولی کے دوست ابوالمعالی کا بیٹا ہے، ولی کو "متوطن دکن" لکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دلائل صرف ضمنی اور جزوی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تردید مناسب مقام پر کر دی جائے گی۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ولی اورنگ آبادی دکن کے تھے تو آخر کیوں ان کے خاندانی اور ذاتی حالات کا پتہ نہیں لگایا جا سکا؟ جبکہ "ماہرین دکنیات" بیسیوں قدیم دکنی شعرا کو ہم سے روشناس کر چکے ہیں اور اُن کے کلام کو انھوں نے قعرِ گمنامی سے باہر نکالا ہے۔ سوائے گجرات میں ولی کی تعلیم و تربیت، طویل قیام اور وفات کے جو تیقن کا درجہ رکھتے ہیں اُن کے حالاتِ زندگی نہیں معلوم ہو سکے حتیٰ کہ ان کے نام اور سنہ ولادت و وفات[۵۱] تک پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ جو لوگ ولی کو دکنی مانتے اور ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کا فرض تھا کہ وہ اُن کے حالات کا سُراغ لگاتے۔ یا کم از کم اتنا ہی ثابت کر دیتے کہ وہ اُن کے مفروضہ وطن اورنگ آباد کے کس خاندان سے تھے اور کس سنہ میں پیدا ہوئے تھے؟ مگر جبکہ ولی دکن کے ہی نہ تھے تو ان کے حالات کا کیسے پتہ لگتا، اور چونکہ وہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اسلئے ان کے خاندانی حالات کی تحقیق خود ان کے وطن میں کی جاتی تو بہت کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں احمد آباد سے ہمیں ایسی معتبر شہادتیں حاصل ہوئی ہیں جو ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں اور جن سے ان کا گجراتی ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اب سے چند سال پیشتر اگر کوشش کی جاتی تو ولی سے متعلق بہت سا قلمی ذخیرۂ معلومات ہاتھ آتا جو بدقسمتی سے خاندانِ ولی کے بعض ہم نسب بزرگوں کے پاس سے پچھلے چند برسوں میں تلف ہو گیا، تاہم

---

[۵۱] ولی کا سنہ وفات گجرات ہی کی بدولت اب یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے۔

اب بھی جو کچھ بچا کھچا سرمایہ موجود ہے اُس سے ولی کے حالاتِ زندگی مرتب کرنے کے لئے کافی مواد مل سکتا ہے، چنانچہ اسی کی بنا پر ہم نے ولی کے خاندانی اور ذاتی حالات مرتب کئے ہیں جو ایک علٰحدہ مقالہ میں آیندہ شائع کئے جائیں گے۔

اگرچہ اس وقت جبکہ ولی کے حالات معتبر اسناد اور مخطوطات کے ذریعہ سے معلوم ہو چکے ہیں، جو اس موضوع پر آخری لفظ اور فیصلہ کُن شہادت کا حکم رکھتے ہیں، اس لئے اب اُن کے دکنی یا گجراتی ہونے کے شواہد سے بحث کرنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے، تاہم چونکہ عرصۂ دراز سے ولی کے دکنی اور اورنگ آبادی ہونے کی تشہیر کی جارہی ہے اور اس پر متعدد دلائل قائم کئے جا چکے ہیں، اس لئے ان پر صرف موجودہ معلومات کی روشنی میں تنقید کرنے اور ان غلط بیانیوں کی تردید کرنے کے خیال سے جو ہماری ادبی تاریخوں میں جگہ پا چکی ہیں، یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے، ولی کے ذاتی حالات پر ایک علٰحدہ مقالہ لکھا گیا ہے، لہٰذا اس مضمون کو اُس کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے۔

شعرائے اُردو کے تذکرے اور ذکر ولی

حالاتِ ولی کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو چیز سامنے آتی ہے وہ شعرائے اُردو کے تذکرے ہیں۔ اُردو شعراء کا کوئی تذکرہ سنہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے نہیں لکھا گیا، اس طرح وفات ولی سے تقریباً پینتالیس[۴۵] برس تک ولی کا تذکرہ کسی نے نہیں لکھا۔ اس طویل مدت میں ان تذکرہ نویسوں نے سُنی سُنائی معلومات اور ولی کے بعض اشعار پر اعتماد کرکے چند سطروں میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، ان میں سے بعض نے محض قیاس آرائی کرکے ولی کو دکنی بلکہ اورنگ آبادی لکھ دیا، جیسے میر، گردیزی اور شفیق، جن میں سے دونوں مؤخر الذکر دکنی تھے اور اوّل الذکر کے متبع؛ لیکن ان کے مقابلہ میں بعض انہی کے ہمعصر اور مابعد کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ولی کے گجراتی خاندان سے اور ساکن گجرات ہونیکا ذکر کیا ہے، جیسے حمید اورنگ آبادی، قائم چاندپوری، میر حسن دہلوی، منشی قدرت اللہ، شیخ غلام محی الدین، علی ابراہیم خاں، ناسخ، آزاد وغیرہم۔ یہاں اُن تذکروں کے بیانات نقل کئے جاتے ہیں:-

۱۔ گلشن گفتار، مصنفہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی، سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ
"ولی محمد احمد آبادی"[۱]

---

[۱] ص ۵

یہ دکن کا سب سے پہلا تذکرہ ہے[51] بقولِ مرتب "گلشن گفتار کی اطلاعات اس لحاظ سے کہ مؤلف خود دکن کا باشندہ تھا، اور اکثر دکنی شاعروں سے شخصی طور پر واقف تھا، زیادہ مستند و معتبر ہیں" (مقدمہ)

۲۔ مخزنِ نکات، مصنفہ شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پوری، سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ

"مولدش گجرات است، گویند بہ نسبت فرزند (ی) شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از او لیائے مشاہیر است، افتخار ہا داشت"[52]

۳۔ تذکرۂ شعرائے اردو، مولفۂ میر حسن دہلوی سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ

"مردے بود از خاکِ گجرات"[53]

۴۔ طبقات الشعراء، مؤلفۂ منشی قدرت اللہ صدیقی مراد آبادی سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ

"طبقات الشعراء میں اس غزل کو حضرت شاہ گلشن کی طرف منسوب کیا ہے جس کو حضرت نے بطور تبرک ولی گجراتی کو مرحمت فرمائی تھی اور اس پر ولی کے ریختہ کی بنیاد ہے"[54]

۵۔ تذکرۂ طبقاتِ سخن، مؤلفۂ شیخ غلام محی الدین قریشی تخلص عشق و مبتلا میرٹھی سنہ تالیف ۱۲۲۲ھ۔ آبرو کے ذکر میں لکھا ہے:۔

"چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آں شد"[55]

۶۔ مخزنِ شعراء، مؤلفۂ قاضی نورالدین حسین رضوی سنہ تالیف ۱۲۶۸ھ مؤلف خود گجرات کے باشندہ اور بھروچ کے مشہور سادات اور قضاۃ میں سے

---

[51] مقالاتِ ہاشمی ص ۱۵۵

[52] ص ۱۰ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، قائم کو اپنے پیشرو میر تقی اور گردیزی کے تذکروں کا علم نہ تھا، اور اسی لئے اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ (دیکھو مقدمہ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائم نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر ولی کو گجراتی لکھا ہے۔

[53] ص ۲۰۴ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو۔

[54] دیکھو کلیات ولی ضمیمہ نمبر ۲ ص ۵۔

[55] ہندوستانی بابت جولائی ۱۹۳۲ء "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز" ص ۳۲۵۔ اس تذکرہ کی نسبت ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے "مؤلف نے ذاتی تحقیق سے حالات لکھے ہیں" (یادگارِ شعراء ص ۵)۔

نہایت ثقہ اور معتبر؛ ان کی تحقیق کے مطابق ولی گجراتی تھے :۔

"محققانِ این فن را در حالِ او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است ویا از دکن۔ بہ راقم آثم از زبانی ثقات بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مزبور را از بلدۂ مسطور بودہ و سالہا بدکھن ہم گزرانیدہ" [۵۱]

۷۔ سخن شعراء، از عبدالغفور خاں نساخ، سنہ تالیف ۱۲۸۱ھ

"ولی تخلص، شاہ ولی اللہ، اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے تھے" [۵۲]

۸۔ گلشن ہند، مؤلفہٗ میرزا علی لطف، سنہ تالیف ۱۸۰۱ء

"ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام دکھنی، وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے" [۵۳]

۹۔ یادگار شعراء، مرتبۂ ڈاکٹر اسپرنگر۔

"ولی شاہ ولی اللہ (شورش و توکا) ساکن گجرات، شاہ وجیہ الدین کی اولاد سے تھے" [۵۴]

۱۰۔ تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود، مؤلفۂ منشی دیبی پرشاد ۱۸۸۵ء

"اور جو ولی گجراتی موجد شعر اردو کا مشہور ہے" [۵۵]

۱۱۔ آثار الشعراء، از حافظ سید ممتاز علی بھوپالی میں ولی کو احمد آبادی اور شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے لکھا ہے۔

۱۲۔ آبِ حیات، از آزاد دہلوی۔

"ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے" [۵۶]۔

متذکرۂ بالا تذکروں میں، جن میں گلشن گفتار، مخزنِ نکات اور تذکرۂ میر حسن دہلوی بارہویں صدی کے نصف آخر کے لکھے ہوئے ہیں جن کو زیادہ قربت زمانی حاصل ہے، ولی کو گجراتی

---

[۵۱] ص ۱۱۰۔ ص ۱۱۱ انجمن ترقی اردو۔ [۵۲] ص ۵۵۶ طبع نولکشور۔

[۵۳] ص ۱۷۵ انجمن ترقی اردو۔

[۵۴] ص ۲۱۷ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد، مترجم صاحب نے اس کے نیچے یہ نوٹ اضافہ کیا ہے "ولی کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ اورنگ آبادی تھے"؟!

[۵۵] جلد دوم ص ۱۴۱ مطبوعہ نول کشور پریس۔

[۵۶] ص ۹۳ مطبع کریمی لاہور۔

لکھا گیا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کلیاتِ ولی کے مرتب نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ "بارہویں صدی کے تمام تذکروں میں جن کو ان حالات سے زیادہ قربت زمانی حاصل ہے، ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی لکھا ہے"۔[۵۱] بارہویں صدی کے تمام تذکروں میں صرف تین تذکرے ہیں جن کی حقیقت حسب ذیل ہے:۔

۱۔ نکات الشعراء، مؤلفۂ میر تقی میر، سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ

"شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد است...... از کمالِ شہرت احتیاج تعریف ندارد، واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست"[۵۲]

گویا ولی کی نسبت مشہور باتیں سنکر حضرت نے ان کو اورنگ آبادی لکھ دیا۔

۲۔ تذکرۂ ریختہ گویاں، از فتح علی الحسینی گردیزی، سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ

اس میں صرف "در دکن چہرۂ ہستی افروختہ"[۵۳] کے سوا ولی کے حالات میں ایک لفظ نہیں لکھا، اور صرف سُنی سُنائی معلومات کی بنا پر ولی کو دکنی لکھ دیا۔

۳۔ چمنستان شعراء، از لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی، سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ

شفیق نے میر کے تتبع میں ولی کو "خاک پاک اورنگ آباد" سے منسوب کیا ہے۔[۵۴] اس کے سوا کسی تذکرہ نویس نے ان کو اورنگ آبادی نہیں لکھا۔

• ان تین تذکروں کے علاوہ مجموعۂ نغز از قدرت اللہ قاسم میں صرف "دی عزیزی بود از سکنۂ دیارِ دکن"[۵۵] لکھا ہے، فتوت نے اپنے تذکرۂ ریاض حسنی میں ان کو دکنی بتایا ہے، ایک اور تذکرہ جلوۂ خضر (سنہ ۱۳۰۲ھ) میں صرف ولی کے نام کے ساتھ دکنی لکھا ہے، تاہم ان کے وطن کے سلسلہ میں دوسرے تذکروں سے ان کے گجراتی ہونے کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔[۵۶] غرضکہ بارہویں صدی اور مابعد کے کوئی درجن بھر تذکروں کے بیانات کو نظر انداز کر کے صرف دو ایک تذکروں کے بیان پر

---

۵۱ کلیاتِ ولی، مقدمہ ص ۱۵ ۔ ۵۲ ص ۹۰ ۔ سنہ ۹۰ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو ۔

۵۳ ص ۱۴۴ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو ۔

۵۴ ص ۱۰۴ ” ” ” ۔ بقول مرتب اس تذکرہ کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی گردیزی کے تذکروں پر رکھی ہے (دیکھو مقدمۂ عبدالحق ص ۱۳) ۔

۵۵ جلد ۲ ص ۲۹۹ ۔ ۵۶ دیکھو جلد اوّل ص ۶۰ ۔

اعتماد کرلینا سراسر دیانت کے خلاف اور انصاف سے بعید ہے۔

زمانۂ حال کی تصانیف میں ذکرِ ولی

ولی کے جو حالات ان تذکروں میں درج ہیں ان میں نام، وطن، صاحب دیوان ہونا، عہدِ عالمگیر (اور پھر محمد شاہ کے زمانہ میں) سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی جانا، وہاں شاہ گلشن سے ملاقات، مدرسۂ شاہ وجیہ الدین میں تعلیم پانا، ریختہ کی ایجاد، برہان پور کا قیام اور احمد آباد میں وفات کے سوا ولی کے حالاتِ زندگی کی تفصیل کسی تذکرہ میں نہیں لکھی گئی۔ لیکن زمانۂ حال کے بعض مصنفین اور اہل قلم نے کلام ولی کے مطالعہ نیز بعض شعرائے اردو کے بیانات کی بنا پر چند باتوں کا اضافہ کیا ہے، مثلاً ۱۰۶۹ھ؁ میں اورنگ آباد میں ولی کی ولادت، اور احمد آباد میں ۱۱۵۵ھ؁ (یا ۱۱۴۱ھ؁ کے بعد) میں ان کی وفات، ۱۱۴۱ھ؁ میں مثنوی دہ مجلس کی تصنیف، ۱۱۴۱ھ؁ میں دہلی سے واپسی، مولانا نورالدین احمد آبادی سے بیعت، اورنگ آباد میں بیس سال کی عمر تک تحصیلِ علم، اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے ہونا، شاہ وجیہ الدین صاحب کے خاندان میں بیعت ہونا، سفر حجاز اور حج بیت اللہ، ان میں سے سفر حجاز اور حج بیت اللہ کا پتہ ان کی مدح بیت الحرام سے چلتا ہے، اس کے سوا کوئی یقینی شہادت موجود نہیں ہے۔ سنہ وفات غلط ثابت ہو چکا ہے، اسی طرح سنہ ولادت بھی صحیح نہیں ہے، اورنہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ کے خاندان سے ہونا اور وہاں بیس برس تک تحصیل علم کرنا ثابت ہے۔ "دہ مجلس" کے انتساب کی بھی تردید ہو چکی ہے، مولانا نورالدین سے بیعت بھی غلط ہے۔ غرضکہ مابعد کے تذکرہ نویسوں نے جتنی باتیں لکھی ہیں تقریباً سب ہی غلط ہیں۔

زمانۂ حال کے مؤرخینِ ادب اردو اور اہل قلم نے بھی تحقیق کی محنت گوارا نہ کر کے محض یکطرفہ شہرت و اشاعت کی بنا پر ولی کو نہ صرف اورنگ آبادی اور دکنی بتایا ہے، بلکہ اپنی کتابوں اور تحریروں میں ولی سے متعلق بعض ایسے بیانات درج کئے ہیں جو تحقیق سے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ ولی کے نام میں اختلاف کو دیکھ کر ادب اردو کا ایک مؤرخ لکھتا ہے:۔

> "ہمارے نزدیک اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہو گیا۔" [۵]

---

[۵] تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ اردو ترجمہ صفحہ ۵۳ و صفحہ ۵۴ مطبوعہ نولکشور پریس۔ اس کتاب میں ولی سے متعلق بعض عجیب و غریب ایرادات ہوئے ہیں۔ جن کی بنیاد تمام تر آصفی کے تذکرۂ شعرائے دکن پر ہے۔

اس بیان کے لئے نہ تو کوئی حوالہ دیا گیا ہے، نہ کوئی سند پیش کی گئی ہے، لیکن ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس نام کے کوئی بزرگ احمد آباد میں ولی سے پہلے یا اُن کے زمانہ میں، بلکہ اُن کے بعد بھی نہیں گزرے۔

زمانۂ حال کی تصانیف میں جو ادب اُردو کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں، ولی کی نسبت متعدد غلط بیانیاں پائی جاتی ہیں، خصوصًا یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ ہر مصنف نے ولی کو اورنگ آبادی اور دکنی لکھا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے حالات کے ضمن میں غیر محققانہ اور قیاسی باتیں بھی درج کر دی ہیں۔ یہاں ہم ایسی کتابوں کے نام پیش کرتے ہیں جو ہماری نظر سے گزر چکی ہیں :۔

۱۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن، از عبدالجبار خاں آصفی ملکاپوری ۱۳۲۹ھ میں یہ کتاب دو جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔ اس میں ولی کے اشعار اور تذکروں سے ولی کے حالات لکھنے اور اُن کو دکنی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ولی کو دکنی بنانے کی غالبًا یہ پہلی باقاعدہ کوشش ہے اور بعد کی تمام غلط بیانیوں کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

۲۔ گلِ رعنا، از مولوی عبدالحی ناظم ندوہ، یہ سنہ ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی ہے اور اس میں بھی ولی سے متعلق آصفی کا تتبع کیا گیا ہے۔

۳۔ دکن میں اُردو، از نصیرالدین ہاشمی مطبوعہ سنہ ۱۹۲۵ء۔ اس میں ولی کا دکنی ہونا بیان کیا گیا ہے اور بعض غلط باتیں اُن سے منسوب کی گئی ہیں۔

۴۔ تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ (انگریزی) مطبوعہ سنہ ۱۹۲۷ء۔ اس میں ولی سے متعلق آصفی کی غلطیوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔

۵۔ کلیاتِ ولی، مرتبہ احسن مارہروی مطبوعہ سنہ ۱۹۲۷ء۔ مرتب نے مقدمہ میں ولی کے حالات اکثر غلط لکھے ہیں اور اُن کو دکنی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۶۔ اردو شہپارے، از محی الدین قادری زور مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء قدیم دکنی شعرا کے کلام کا انتخاب۔ اس میں دکنی شعرا کے حالات بھی دئے گئے ہیں۔ ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے اور بعض حالات بھی غلط لکھے ہیں۔

۷۔ تاریخ ادب اردو، از گراہم بیلی مطبوعہ سنہ ۱۹۳۲ء۔ بشرح صدر۔

۸۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مطبوعہ سنہ ۱۹۲۴ء جلد چہارم میں "اردو" پر ایک مبسوط مقالہ مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے درج ہوا ہے۔ جس میں ولی کو اورنگ آبادی بتا کر اُنکا سنہ ولادت

و وفات دونوں غلط لکھے ہیں۔

۹۔ **یادگارِ ولی**، سٹی کالج حیدر آباد کے طلبہ نے ۳۷ء میں ولی کی یادگار منائی تھی۔ اس موقعہ پر جو مقالات ولی پر پڑھے گئے تھے اُن کا مجموعہ۔ ولی کے حالات اور وطن کی بحث اور پیشرو تحریرات کا اعادہ خصوصاً آصفی کا تتبع۔

۱۰۔ **دی پامس**، اسماعیل کالج جوگیشوری (بمبئی) کے طلبہ کا سہ ماہی اور سہ زبانی رسالہ۔ کالج مذکور کی بزم ادب نے ۱۹۳۶ء میں یومِ ولی بصدارت پروفیسر سیّد نواب علی منایا تھا۔ اس میں ولی پر چند مقالات پڑھے گئے تھے ان کا مجموعہ اس رسالہ کے حصۂ اردو میں شایع ہوا ہے جن میں ولی کے مشہور حالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔ صدرِ جلسہ اور بعض طلبہ کی ولی کو گجراتی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کے ساتھ ان کے دکنی ہونے کا اعتراف۔

۱۱۔ **نذرِ ولی**، جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد کے درجۂ ایم۔اے کی طالبات کے ولی پر چند مضامین کا مجموعہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۸ء۔

ممکن ہے ان کے علاوہ اور کتابیں بھی ہوں جن میں ولی کی نسبت غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہو یا ان کی نقل در نقل کی گئی ہو۔ بہرحال اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ولی سے متعلق غیر محققانہ باتوں نے ہماری ادبی تاریخوں میں ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی ہے جن کی تردید ایک ضروری امر ہے، اور اس لئے ہم پر یہ ادبی فرض عائد ہوتا ہے کہ صحیح تحقیق کے بعد جو امور دریافت ہوئے ہیں اُن سے ان غلط بیانیوں کی تصحیح کریں اور اس موضوع پر مزید معلومات کا اضافہ کر کے اس عام ہوا کا رُخ پلٹ دیں تاکہ اس موضوع پر ہمارے مصنفین اور اہلِ قلم جو ایک غلط راستے پر جا پڑے ہیں، آیندہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر اُردو شاعری کے اس "محسنِ اعظم" کے کارناموں پر اپنے شبدیزِ قلم کی جولانیاں دکھا سکیں۔

ولی کو دکنی کہنے سے کیا مراد ہے؟ خود ولی کے بعض اشعار نیز بعض تذکروں میں ولی کو "شاعرِ ملکِ دکن" یا "متوطن دکن" لکھا گیا ہے۔ اس سے ولی کے دکنی ہونے پر استشہاد کیا گیا ہے، لیکن یہاں ملکِ دکن سے وہ خاص خطہ مراد نہیں ہے جو گجرات سے الگ نربدا کے جنوب میں واقع ہے، بلکہ عام طور پر دکن کا اطلاق گجرات پر بھی ہوتا رہا ہے اور جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا کہ خود مصنفین گجرات اپنے ملک کو دکن میں شمار کرنے کے عادی تھے۔[۱] ولی نے خود کو

---

[۱] آج سے چالیس برس پیشتر احمد آباد کے بعض لوگوں کے نام جو خطوط ہندوستان سے آیا کرتے تھے ان پر پتہ میں احمد آباد دکن لکھا جاتا تھا

اور دوسروں نے اُن کو ملک دکن سے کیوں منسوب کیا اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ شمالی ہندوستان سے گجرات جنوب یا دکن کی سمت میں پڑتا ہے اس لئے اس کو دکن کہا گیا ہے جیسا کہ گجرات کے ایک تذکرہ نویس نے وَلی کے تذکرہ میں اس کی تصریح کی ہے :-

"وخطا کرد میر تقی میر کہ در تذکرۂ خود اورا از اورنگ آباد نوشت ، شاید بدیں شعر اورا از دکھن خیال کرد۔ فرد

وَلی ایران و توران میں ہے مشہور   اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

امّا گروہ کہ ولایت گجرات بہ نسبت دہلی و اکبر آباد سمت جنوب کہ ہندیان دکھن گویند واقع است۔" ؎۵۱

اور یوں بھی جغرافیائی قرب کی وجہ سے گجرات دکن میں شامل ہے اس لحاظ سے گجرات پر دکن کا اطلاق ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ مرہٹہ حکومت سے قبل دہلی والے گجرات کو دکن میں شمار کرتے تھے کیونکہ گجرات دہلی سے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب جغرافیہ نویسوں کی تقسیم ملک ہند بھی اسی طرح پر ہے : سندھ، ہند اور دکن۔ ہند سے مراد راوی سے برہم پتر تک، اور دونوں کے نیچے سب دکن ہے۔ گجرات دکن میں شامل سمجھا جاتا تھا، اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن کو ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

۱۔ گجرات کی تاریخ فارسی "مرآۃ احمدی" میں اس کا استعمال ہوا ہے، مثلاً شیخ کمال مالویؒ کی زبانی ان کا یہ قول نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت قطبِ عالمؒ کے جواب میں کہا تھا :-

"بر لوح محفوظ نظر کنید کہ ملک گجرات از جبطۂ بادشاہانِ دکن برآمدہ و بنام سلطان محمود خلجی ثبت گشتہ۔" ؎۵۲

یعنی کارکنانِ قضا و قدر کے ہاتھوں ملک گجرات شاہانِ دکن کے ہاتھ سے نکل کر سلطان محمود خلجی کو مل چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں سلاطینِ گجرات ہی کو شاہانِ دکن کہا گیا ہے، حالانکہ نسل و وطن دونوں کے اعتبار سے یہ سلاطین گجراتی تھے۔

۲۔ مشہور مؤرخ صدر جہاں گجراتی جو محمود بیگڑہ کے زمانہ میں تھے انھوں نے اپنی تاریخ "طبقات محمود شاہی"

؎۵۱ مخزن شعرائے اردو ص ۱۱۱ "گروہ کہ ولایت گجرات" صحیح نہیں معلوم ہوتا، یہ "گرد کہ" ولایت گجرات ہونا چاہیے۔

؎۵۲ مرآۃ احمدی (خاتمہ) ص ۹ طبع کلکتہ۔

کے آخری صفحہ پر "دارالملک دکن محمد آباد (چانپانیر) گجرات" لکھا ہے۔ چاپانیر خاص گجرات میں واقع ہے نہ کہ دکن میں۔

۳۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے پوتے کے ایک شاگرد جنھوں نے مُلا جامی کی شرح لکھی ہے اس کے آخر میں خود کو احمد نگری اور دکن گجرات کا بتاتے ہیں۔ احمد نگر وہی ہے جو ایڈر کے پاس احمد شاہ اوّل نے آباد کیا تھا، آج اس کو ہمت سنگھ کے قبضہ کی وجہ سے "ہمت نگر" کہتے ہیں۔

۴۔ میر حسن دہلوی نے ولی کو از "خاکِ گجرات" لکھا ہے، پھر بھی وہ لکھتے ہیں:۔

"چوں دکھنی است اکثر بزبان خود حرف زدہ است" [۵۱]

اسی کے تتبع میں آزاد نے لکھا ہے:۔

"وہ خود دکنی تھے اس لئے ان کے کلام میں بعض الفاظ دکنی بھی ہوتے ہیں۔" [۵۲]

۵۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں ولی کو خاص احمد آباد گجرات کا باشندہ لکھا ہے، ان کی مندرجہ ذیل تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دکن کو گجرات کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ولی کے دیوان کی ترتیب کی نسبت تذکرۂ فائق کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دیکھو تذکرۂ فائق کہ خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے اور وہیں تصنیف ہوا ہے۔" [۵۳]

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مخزنِ شعراء فائق خاص گجرات کے اُردو شعراء کا تذکرہ ہے جو گجرات کے شہر بھروچ میں لکھا گیا ہے اور جس کے مصنف خاص گجراتی ہیں۔ ذکرِ ولی کے سلسلہ میں آزاد رقمطراز ہیں:۔

"شاعر قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے، مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہوا اور ستارے اس کے دلی کے افق سے طلوع ہوا کریں۔" [۵۴]

۶۔ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب نے بھی گجرات کو دکن میں شمار کیا ہے۔ اپنے انگریزی مقالہ "اردو" مندرجۂ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھتے ہیں:۔

"اور جب یہ صوفیائے کرام اپنے دورانِ سیاحت میں دکن کے ان حصوں دولت آباد، گلبرگہ، احمد آباد، بیجاپور اور پٹن (گجرات) وغیرہ میں پہنچے۔"

---

۵۱ تذکرۂ میر حسن ص ۲۰۴ — ۵۲ آبِ حیات۔

۵۳ آبِ حیات۔ — ۵۴ آبِ حیات۔

"دکن میں اُردو کے تین بڑے مرکز تھے، گولکنڈہ قطب شاہیوں کا پایۂ تخت، بیجاپور، عادل شاہیوں کا پایۂ تخت اور احمد آباد (گجرات)۔" [51]

مندرجۂ بالا مثالوں سے واضح ہوگا کہ خود ولی نے اپنے تئیں اور دوسروں نے ان کو شاعر ملکِ دکن لکھا ہے تو اس سے مُراد گجرات ہے جو ملکِ دکن میں شامل سمجھا گیا ہے۔

دیوان ولی کے ایک مخطوطہ موجودۂ "کتب خانۂ انڈیا آفس" مکتوبۂ ۱۱۵۶ھ کے آخر میں اس کے کاتب محمد تقی نامی نے جو اپنے تئیں" ولد سید ابوالمعالی" لکھتا ہے، "تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکن" لکھا ہے، جس کو آخری حجت اور فیصلہ کُن شہادت ولی کے دکنی ہونے کی مان کر گویا ولی کے وطن کی بحث کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔

اوپر متعدد مثالیں دکن سے گجرات مراد لینے کی پیش کی گئی ہیں لہٰذا یہی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں بھی متوطن دکن سے مراد متوطن گجرات ہے۔ البتہ متوطن اورنگ آباد لکھا ہوتا تو اور بات تھی۔ ابوالمعالی کے حالات معلوم نہیں ہیں نہ یہ معلوم ہے کہ ان کی اولاد میں سے کون کون تھا۔ ایسی صورت میں اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ محمد تقی انہی ابوالمعالی کے بیٹے ہیں جو ولی کے محب خاص تھے، محض اسلئے کہ انھوں نے دیوان ولی کی کتابت کی ہے؟ بالفرض اگر یہاں دکن ہی مراد لی جائے تو بھی یہ لازم نہیں آتا، نہ اس کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے، کہ کاتب کو ولی کے وطن کا علم تھا، اور اُس نے تحقیق کر کے متوطن دکن لکھا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ کسی نسخۂ دیوان کی نقل ہو اور کاتب نے اس میں متوطن دکن والی عبارت بعینہٖ نقل کر لی ہو؟ جیسا کہ اکثر قلمی نسخوں میں یہ صورت پیش آتی ہے۔ علاوہ ازیں محمد تقی نے ولی کا نام " ولی محمد" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ نسبت نامہ میں ان کا نام شاہ ولی اللہ لکھا ہے۔ خود ولی کی مُہر موجود ہے جس میں ان کا نام " ولی اللہ" چھپا ہوا ہے۔ حالانکہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ " ابوالمعالی ولی کے خاص دوست اور رفیق تھے اس لئے ان کے بیٹے کا ولی کے نام کو غلط لکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا"[52] جبکہ ولی کے خاص دوست کا بیٹا ان کے صحیح نام تک سے واقف نہیں ہے تو اس کی تحریر پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ غرضکہ یہ شہادت امور متذکرۂ بالا کے اعتبار سے بالکل بیکار اور تنکے کا سہارا لینے کے برابر ہے۔

---

[51] جلد چہارم ص ۱۰۲۴ مطبوعہ ۱۹۳۴ء

[52] مقالات ہاشمی ص ۱۵۵

کیا ولی کا کلام دکنی زبان میں ہے؟ ولی کے دکنی ہونے کے ثبوت میں خود ولی کا یہ شعر ایک مستقل شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:۵۰

دکنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں لے ولی
لیکن نہیں بولیا ہے کئی ایک شعر شیریں زیں نمط

تاریخ زبانِ اردو کا ہر متعلم جانتا ہے کہ دلی کی اردو کے مقابلہ میں دکن اور گجرات کی اردو کو دکنی کہا جاتا تھا، اور خود اس ملک کے لوگ بھی اس کو ہندی یا دکنی کہتے تھے، چنانچہ اسی معنیٰ میں یہاں ولی نے بھی اپنی زبان کو دکنی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی بعض غزلیں ٹھیٹھ قدیم دکنی زبان اور لب و لہجہ میں ہیں، لیکن موجودہ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معتد بہ حصہ دکنی شعراء کا کلام ہے جو دیوان ولی کے بعض نسخوں میں درج کر دیا گیا ہے۔ خود کلیات ولی کے مرتب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:۔

"ان واقعات و اختلافات کی بے ترتیبیوں کے بعد دیوان پر نظر ڈالی جائے تو وہاں کا عالم ہی دوسرا ہے، ہر صفحہ نہیں بلکہ ہر ہر غزل میں اکثر مصرعے و اشعار ایک دیوان سے دوسرے دیوان میں مختلف پائے جاتے ہیں۔ کسی میں غزلیں کی غزلیں نادارد ہیں۔ بعض دیوانوں میں مرتب کرنے والوں نے اصلاحیں دیکر دَورِ عالمگیر کے شاعر کو حکومت برطانیہ کے عہد کا شاعر بنا دیا ہے۔ کسی ساعی اور جلد باز مؤلف نے انتخاب اشعار میں یہ کتر بیونت کی ہے کہ دوسروں کے اشعار ولی سے منسوب کر دئیے ہیں۔"۵۱

لیکن خود مرتب صاحب نے کیا کم ستم ڈھایا ہے کہ ایسے سب کلام کو جو ولی کے نام سے منسوب تھا، یا جو کسی نسخۂ دیوانِ ولی میں پایا گیا۔ انھوں نے لیکر "کلیاتِ ولی" میں شامل کر دیا ہے جس سے بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی اور یہ جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کونسا کلام ولی کا ہے اور کونسا غیروں کا۔ ایک دکنی اہلِ قلم نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"کلیاتِ ولی کے فاضل مرتب مولوی احسن مارہروی نے بڑی تلاش و جستجو کے ساتھ دیوانِ ولی کے متعدد نسخوں کے مطالعہ اور کم و بیش تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کے بیانات پر محققانہ نظر ڈال کر جو کلام اس کے نام سے منسوب کیا ہے اور جو حالات اس کے بیان کئے ہیں، دونوں میں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔"۵۲

---

۵۱ مقدمۂ کلیاتِ ولی ص۵ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو۔

۵۲ مقدمۂ گلشنِ گفتار ص۳۔

بقول صغیر بلگرامی دیوان ولی میں ایک ثلث اشعار دکنی زبان میں ہیں، باقی تمام کلام میر و مرزا کی زبان میں جس کی اس وقت تک اصلاح نہیں ہوئی تھی، اور پھر ناسخ اور اُن کے بعد آنے والوں کی زبان میں ہے[۵۱] اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس ایک ثلث کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں غزلیں اور اشعار دوسرے شعرا کے ولی سے منسوب کر دئے گئے ہیں، اسی لئے خود مرتب کلیات کو لکھنا پڑا کہ:-

"ردیف الف میں بیاسی غزلیں ہیں جن میں حسب ذیل غزلیں عام زبان اور پرانے مشترک محاورات سے الگ خالص دکنی زبان میں کہی گئی ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ غزلیں ولی آنے سے پہلے اپنی وطنی صحبتوں میں کہی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ متعاقبین نے کسی اور قدیم شاعر کی کہی ہوئی ولی کے دیوان میں شامل کر دی ہوں"۔[۵۲]

ہمارے ایک فاضل دوست کا خیال ہے کہ عزلت کا کلام بھی مرتب نے کلیات میں شامل کر دیا ہے۔ ان الحاقی اشعار کو ولی کے کلام سے دُور کرنا بہت مشکل ہے۔ احسن صاحب نے تو یہ کلیہ قائم کر دیا ہے کہ "جس غزل میں طاق سے زیادہ اشعار ہیں ان میں ضرور الحاق ہوا ہے"۔[۵۳]

کلام ولی میں بعض محاورات و الفاظ یا روزمرہ اور لب و لہجہ پر دکنی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے وہ دراصل دکنی نہیں ہیں اور جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں گجرات اور دکن دونوں میں مشترک ہیں، بلکہ جو الفاظ اور محاورے خاص گجرات سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی دکنی سمجھ لیا گیا ہے۔ مثلاً کلیات کے مرتب نے شعر مندرجۂ ذیل کو دکنی زبان کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے:-

تمہیں ملنے سوں گر اپنے سُہاگن نا کرو گے مجھ ٭ تو جوڑا گجگری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

اس کے متعلق اُنھوں نے یہ تصریح کی ہے کہ:-

"اس غزل کی ردیف بھی دکنی لہجہ کا پتا دے رہی ہے۔۔۔۔۔ گجگری جوڑا اور کریلا دھار جوڑے اور چوٹی کی خاص بناوٹ اور وضع کو صوبۂ دکن میں کہتے ہیں"۔[۵۴]

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہی لب و لہجہ گجرات کا ہے۔ یہاں اُنھوں نے اس شعر کا جو مطلب سمجھایا ہے وہ محض غلط ہے۔ اول تو سہاگن نہ ہونے کی حالت میں جوڑا یا چوٹی نہ باندھنا یا نہ گوندھنا کسی جگہ کی رسم نہیں ہے۔ صرف لفظ "جوڑا" دیکھ کر اس کو وہ معنی پہنا دئے جو عرفِ عام میں

---

۵۱ تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول صفحہ ۱۸
۵۲ کلیات ولی صفحہ ۵۹ کا نوٹ۔
۵۳ کلیات صفحہ ۲۳ کا نوٹ۔
۵۴ مقدمۂ کلیات صفحہ ۳۵۔

مشہور ہیں، اور اس کی وضع اور بناوٹ "گجگری اور کریلا دھار" بھی صوبۂ دکن میں بتائی جواب تک تشنۂ ثبوت ہے۔ اصل میں یہ لفظ "جوڑا" نہیں بلکہ "چوڑا" (بجیم فارسی) ہے[۱] اور لفظ "گجگری" صحیح طور پر "گجگرہی" ہے۔ صفیر بلگرامی نے ولی کے زمانہ کے الفاظ کی تبدیلی میر و مرزا کے زمانہ کے الفاظ سے بتاتے ہوئے ایک فہرستِ الفاظ پیش کی ہے، اس میں "جوڑا گجگری" کا بدل "گجکڑے کی چوڑی" دیا ہے[۲] اہل گجرات "چوڑی" کا مذکر "چوڑ" اس کو کہتے ہیں جو ہاتھی دانت سے بنایا جاتا اور بہ نسبت چوڑی کے زیادہ چوڑا ہوتا ہے اور شادی کے وقت دلہنوں کو پہنایا جاتا ہے۔ گجگری مرکب ہے گج بمعنی ہاتھی اور کر بمعنی ہاتھ سے، یعنی ہاتھی دانت کا بنا ہوا۔ اور اگر گجکڑے پڑھا جائے تو کچھوے کی کھال مراد ہوگی۔ ہاتھی دانت اور گجکڑے کی چوڑیاں گجرات اور کاٹھیاواڑ، خصوصاً ویو میں بہت خوبصورت بنتی ہیں، اور آج بھی یہ صنعت ان مقامات میں رائج ہے۔ "کریلا دھار" دراصل ایک قسم کا کنگن ہے جس پر کریلے کے سے ابھرے ہوئے نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں گجرات کے مشہور زیور ہیں اور عورتوں کے سہاگ کی علامت ہے۔ غرضکہ ولی کا کلام دراصل گجراتی ہے جسے دکنی سمجھ لینے میں بڑا مغالطہ ہوا ہے جو گجراتی اور دکنی اردو کے فرق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گجراتی اور دکنی اردو کے فرق پر روشنی ڈالی جائے۔

گجراتی اردو اور اس کا اثر دکنی اردو پر

ہر شخص جس نے اردو کے ارتقائے لسانی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان کا ہندی ڈھانچہ ہر صوبہ میں یکساں رہا ہے، البتہ مقامی پراکرتوں نے اس کو مقامی رنگ دیدیا تھا۔ گجرات میں ۱۶ھ کے بعد سے برابر چھ صدیوں تک مسلمانوں کی آمد و رفت رہی ہے اور اس طویل مدت میں ممالک غیر سے مسلمانوں کے کئی خاندان یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ سواحل گجرات سے عرب و عجم کے لوگوں کی بکثرت آمد و رفت کی وجہ سے عربی فارسی زبانوں کے اثرات گجرات کی مقامی بولیوں پر ہوتے رہے، اور خاص کر روزمرہ کی تمدنی اور معاشرتی ضروریات اور بول چال کے لئے ابتداءً یہاں کے مسلمانوں نے جو زبان اختیار کی وہ گویا گجراتی اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تاریخی حیثیت سے اردو کا پہلا مرکز ہونے کا فخر گجرات کو حاصل ہے جہاں اردو کا

---

[۱] دیکھو فہرست اختلافاتِ نسخ، ضمیمۂ کلیاتِ ولی صـ۴۴۔

[۲] جلوۂ خضر جلد اول صـ۳۰، اس میں کریلا دھار کی بجائے "گلے کا ہار" لکھا ہے۔

سنگِ بنیاد سب سے پہلے نصب ہوا۔ ساتویں صدی کے بعد خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ سے
گجرات حکومت دہلی سے وابستہ ہوگیا۔ اُسی زمانہ سے یہاں اُردو کی اس ابتدائی شکل نے ترقی
کرنی شروع کی اور آٹھویں صدی تک ایک ایسی زبان وجود میں آچکی تھی جس کو گوجری یا ہندی کہا
جاتا تھا۔ شاہانِ گجرات کے زمانہ میں بھی یہی زبان عوام کی بول چال میں رائج تھی، اگرچہ علمی اغراض
کے لئے عربی اور فارسی مستعمل تھیں۔ سلاطینِ مغلیہ کے عہد میں یہاں اُردو نے خاصی ترقی کرلی تھی اور
اورنگ زیب کے عہد تک یہ زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کرکے بہت صاف ستھری ہوچکی تھی اور اس
کی ادبی تشکیل بھی اسی جگہ ہوئی، چنانچہ ولی نے اس زبان کی اصلاح کرکے اس کو اس قابل بنادیا کہ
وہ شعراء اردو کی مستقل زبان بن گئی، اور ان کے جدید رنگِ تغزل نے تمام ملک کے شعرا کو ایسا گرویدہ
کردیا کہ انہی کے نہج اور اسلوب پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔

دکن میں اُردو کی اصلاح و ترقی گجرات کے صوفیائے کرام اور شعراء و ادبا کی رہینِ منت رہی
ہے۔ اہلِ دکن کی آمد و رفت گجرات میں رہی ہے، اور عہدِ اکبری میں کئی اہلِ علم و ادب گجرات سے دکن
گئے ہیں۔ اسی سبب سے گجرات کی اُردو نے دکن کی زبان و ادب پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے۔ اُردو
شہپارے کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات سے بہت سے ادیب اور
عالم بیجاپور آیا کرتے تھے۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں
کو اپنے دربار میں بلالیا، چنانچہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اردو کا ادبی ذوق بڑھانے
میں بڑا حصہ لیا ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجاپور کے بعض اردو مصنفین اپنی زبان کو گجراتی
کہتے ہیں۔" ؎

گجرات اور شمالی ہند کی طرح دکن کی اُردو میں بھی ولی نے ایک نیا دبستان قائم کرکے دکنی
شاعری کا انداز اور اسلوب بدل دیا اور شعرائے دکن انہی کے تتبع میں صاف اُردو لکھنے لگے، ورنہ
اس سے پہلے دکنی شعرا کے کلام کو شعرائے ہند کسی وقعت کا مستحق نہ سمجھتے تھے، جیسا کہ میر تقی، میر حسن
اور قائم وغیرہ کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے اور جداگانہ
اظہارِ خیال چاہتا ہے۔

دکنی اور گجراتی اُردو کا فرق

دکنی اور گجراتی اُردو میں جو فرق ہے وہ بہت باریک ہے اور جب تک
کوئی شخص اردو زبان کی ارتقائی کیفیت سے واقف نہ ہو، اس کو

نہیں سمجھ سکتا۔ یہ عام طور سے معلوم ہے کہ شمالی ہند سے بہت پہلے گجرات اور دکن میں اُردو زبان میں شعر و سخن کا آغاز ہو چکا تھا، اور جبکہ سلاطین دہلی کے دربار میں فارسی زبان کو دفتری زبان کا رُتبہ حاصل تھا، گجرات اور دکن میں ہندی آمیز اُردو نشو و نما پا رہی تھی جو گجراتی اور مرہٹی کے اثر سے خاصی ترقی کر چکی تھی۔ یہی زبان جو شمالی ہند میں آگے چل کر اُردو کے نام سے موسوم ہوئی، دکن میں ہندی یا دکنی اور گجرات میں گوجری یا ہندی کہلائی، لیکن قواعد اور محاوروں کے لحاظ سے اِن میں مقامی الفاظ و محاورات کے سوا کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ گجرات اور دکن یا بالفاظِ دیگر صوبۂ بمبئی اور صوبۂ مدراس کے مسلمانوں میں جو زبان مروّج ہے وہ یہی دکنی ہے اور دونوں صوبوں کی زبان میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہے۔ دکن اور گجرات دونوں ہمسایہ ملک ہیں، اس کی وجہ سے گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج ہے، البتہ اِن میں مقامی رنگ کی جھلک موجود ہے۔ اس لئے اگر ولی کی زبان دکنی سے مشابہ ہے تو محض اس مشابہت کی وجہ سے اس کو دکن سے مخصوص کر دینا انصاف سے بعید ہے۔ اس سلسلے میں احسن مرحوم کا یہ قول ان کے علی الرغم ہماری تائید کرتا ہے کہ:۔

"بعض الفاظ گجرات و دکن میں ضرور مشترک ہیں مگر اس شاذ اشتراک کو کثرتِ اختصاص پر ترجیح دینا تحقیق کا خون کرنا ہے"۔[51]

مرحوم کو یہ تسلیم تھا کہ:۔

"ان کی غزلیں نامانوس تراکیب اور دکنی روزمرہ کی بہتات سے پاک ہیں"۔[52]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"ولی کی عمر کا قریب قریب سارا حصہ دکن و گجرات ہی میں گزرا ہے اس لئے بہت ممکن تھا کہ ان کے تمام اشعار نصرتی وغیرہم کی طرح از سرتاپا دکنی محاورات کا لباس پہنے ہوتے، لیکن اہلِ نظر دیکھیں گے کہ عالمگیری اردو کا جو اثر شاہجہاں آباد میں تھا وہی اورنگ آباد اور احمد آباد میں پایا جاتا ہے"۔[53]

اس سلسلہ میں دکنی ادب کا یہ نظریہ بھی قابلِ غور ہے کہ شعرائے اورنگ آباد کی زبان بہ نسبت دکنی کے بہت ترقی یافتہ تھی اور اس لئے وہ عموماً اپنی زبان کو دکنی نہیں کہتے تھے۔[54] اس کا ثبوت اِنکے کلام سے ملتا ہے۔ اس نظریہ کے پیشِ نظر ولی کو جو اپنی زبان کو "دکنی" کہتے ہیں، اورنگ آبادی نہیں کہا جا سکتا۔

بہرحال یہ مسلّمہ امر ہے کہ ولی کے کلام میں جو بعض الفاظ و محاورات آئے ہیں وہ گجرات کی

---

۵۱ مقدمۂ کلیاتِ ولی ص ۱۵
۵۲ مقدمۂ کلیاتِ ولی ص ۶۵
۵۳ " " ص ۹۱
۵۴ دیکھو رسالۂ اردو بابت اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۸۰۰

قدیم اُردو میں ہیں اور دکنی میں مشترک، اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اکثر حصہ ایسی زبان میں ہے جو میرؔ و مرزاؔ کی زبان بن گئی تھی۔ لہٰذا ان کے کلام پر "دکنی" کا اطلاق کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

گجراتی الفاظ و محاورات ولیؔ کے کلام میں

یہاں ہم ایک خاص بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر بہت کم غور کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ولیؔ کے کلام میں خالص گجراتی الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں جو ایک گجراتی کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا۔ دکنی اور گجراتی اُردو میں صرف ایسے الفاظ و محاورات ما بہ الامتیاز ہیں جو مقامی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے کئی گجراتی اُردو کے الفاظ خود دکنی میں بھی مشترک ہیں جس کا سبب اہلِ گجرات کا قیام دکن اور ان کی تصانیف اور شعرائے گجرات کے کلام کے اثرات ہیں۔ لیکن ولیؔ کے کلام میں جو خاص گجراتی الفاظ و محاورات ہم کو ملتے ہیں وہ دکنی زبان میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ چونکہ ولیؔ کے گجراتی ہونے کی یہ ایک زبردست اندرونی شہادت ہے اس لئے ہم یہاں "کلیاتِ ولی" سے بقیدِ صفحات ایسے الفاظ کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں:-

ص۱۹ **اکپٹ** = یہ لفظ اگرچہ ہندی الاصل ہے مگر زیادہ تر گجرات میں مستعمل ہے۔ فرہنگ کلیات میں اس کے معنی حسد و رنج لکھے ہیں، لیکن یہ لفظ بُغض و کینہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔

ص۱۵ **نال** = فرہنگ میں اس کے یہ معنی بیان کئے گئے ہیں "نال: پاس۔ پنجاب میں بھی بولتے ہیں" لیکن یہ پنجابی لفظ نہیں ہے بلکہ یہاں آنول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ولیؔ فرماتے ہیں:

نہ جاوے ملک بیتابی سوں یک لحظہ کدھی باہر — زمیں بیقراری میں گڑیا ہے نال عشق کا

"نال گڑنا" محاورۃً بولا جاتا ہے۔ یعنی وہ سرزمین جہاں کسی کی ولادت ہوئی ہو اور وہاں اس کی نال گڑی ہو تو وہ گویا اس کا وطن ہو جاتا ہے۔ یہ محاورہ دتی کی اُردو میں بھی مستعمل ہے۔

ص۲۳ **بستار** = یہ لفظ سنسکرت वि. स्तार بمعنی پہنائی، وسعت، اور تفصیل و تشریح۔

تجھ زلف کا بستار لکھا آج ولیؔ نے — اس سحر کے طومار کوں پڑھ کون سکے گا

طومار گجرات میں مسل کو کہتے ہیں۔ فرہنگ میں اس کا مطلب غلط اور قیاساً لکھ دیا ہے۔ "بستار: ساز و سامان، طول کلامی، دفتر"۔

ص۲۴ **سینے کا سال** = سال ایک چیز کو دوسری چیز میں بٹھانا جیسے ایک لکڑی میں سوراخ کر کے دوسری لکڑی کو اس میں بٹھایا جائے تو اس کو سال کہتے ہیں اور سینہ میں کوئی چیز مثل رنج و غم کے بیٹھ جائے تو

اس کو سینے کا سال کہتے ہیں۔ فرہنگ میں لکھا ہے: "سال: کانٹا۔ گرو دکنی نے سول کی جگہ لکھا ہے۔"

ص۳۲ دھرم کا کام = بمعنی کارِ ثواب۔ خاص گجراتی محاورہ ہے اور گجراتی زبان میں "دھرم نو کام چھے" محاورۃً بولا جاتا ہے۔

ص۳۹ بھار = بمعنی وزن۔ ع مور ضعیف ہے وَلی خاک قدم بھار اُسے۔ یعنی ایک مور ضعیف کو جتنی مٹی لگ جاتی ہے وہ بھی اس کے لئے بار ہے۔ فرہنگ میں اس کے معنی لکھے ہیں: "بھار بردوتن بار یا باہر"

ص۴۰ اڑکا = بمعنی اٹکا۔ اڑکنا اور اڑکانا عام طور سے گجرات میں بولا جاتا ہے۔

ص۴۹ وِسواس = اصل سنسکرت विश्वास بمعنی اعتبار و اعتماد۔ یہ لفظ فرہنگ میں نہیں دیا گیا۔

ص۵۶ آدھار کرنا = دارومدار رکھنا۔ وَلی سہ

جو کوئی جالے پِرت کی آگ میں تن من کو یوں اپنے
وَلی سنگم بنا ایسے کوں پھر آدھار کرنا کیا

فرہنگ میں اس کی غلط تشریح کی گئی ہے:۔

"ہندی بھاشا کا لفظ ہے بمعنی غذا، خوراک، ادھار بغیر مد بھی بولتے ہیں" لیکن اس میں مغالطہ ہوا ہے۔ غذا کے معنی میں جو لفظ آیا ہے وہ आहार ہے

ص۵۷ چِترنا = تصویر بنانا۔ سنسکرت اور گجراتی میں चित्र بمعنی تصویر مستعمل ہے۔ وَلی ع

تیری کمر مصور چترا ہے کس ادا سوں

فرہنگ میں اس کا صرف مفہوم کھینچنا، لکھنا بتایا گیا ہے۔

ص$\frac{۶۶}{۱۴۲}$ جھلجھلاٹ = جگمگاہٹ، استعارۃً رعب و جلال۔ وَلی: سہ

مکھ اوپر تیرے ہے ایسی جھلجھلاٹ جس کے دیکھے ہوش نے باندھیا ہے رخت

فرہنگ میں "غصّہ، غیظ و غضب کا اثر۔"

ص۷۱ مَیا = بمعنی رحم۔ وَلی سہ

شوخ میرا بے میا ہے الغیاث صاحبِ جور و جفا ہے الغیاث

فرہنگ میں اس کے معنی "مروت، لحاظ، محبت" لکھے ہیں جو صرف قیاسی ہیں۔ ایک اور گجراتی شاعر غلامی (۱۷۲۵ء) لکھتا ہے: سہ

رورو حرم مَیا سیں اوس طفل کو سُناتے ہر یک لے بر میں اس کوں چھاتی سیتیں لگاتے[۱]

---

[۱] اردو شہپارے، جلد اوّل، ص۳۰۰

ص۶۷ چُوتا ہے = ٹپکتا ہے۔ ولی۔ ع چُوتا ہے اُس کی نین سے رنگِ شراب آج۔
فرہنگ میں اس کے معنی نہیں لکھے۔ ٹپک کو گجرات میں چُوک کہتے ہیں۔

ص۷۸، ۱۶۵ چیرا = غالباً یہ ہندی لفظ چیر سے بنا ہے۔ جس کے معنی کپڑے یا لباس کے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور سے پگڑی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ امیر خسرو نے بھی اس کو باندھا ہے:۔

اے دہلی و اے بتانِ سادہ پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

غیاث اللغات میں چیرہ کے معنی دستارِ منقش لکھے ہیں۔ شاید اسی پر سے فرہنگ میں اس کی تعریف "منقش پگڑی" کی گئی ہے۔ اصل میں گجرات میں یہ پگڑی زیادہ مروج رہی ہے اور اب تک اس کا رواج ہے۔ یہ عرض میں بہت کم اور کناروں پر زری بنی ہوتی ہے۔ اور مختلف طریقوں سے باندھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ولی کے کئی اشعار ہیں[۱] جن سے اس پگڑی کا رنگ، طرز بندش، اور وضع قطع سب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک اور پگڑی ہے جس کو پھینٹہ کہتے ہیں، یہ چیرے سے زیادہ چوڑا ہوتا ہے اور رنگین باندھا جاتا ہے۔ ولی۔ ع وہ باندھا جب گلابی سر پہ پھینٹہ

ص۸۳ پٹکا = ایک لمبا چوڑا رومال جو کمر میں باندھا جاتا ہے۔ ولی

ترہ بتاں کی ہیں تجھ غم میں خوب مخمل سُرخ لگی ہے پٹکے کوں گجرات کی یا ململ سُرخ

متن کلیات میں (ص۳۰۳) مصرعۂ ثانی اس طرح چھپا ہے:۔ ع
لگی ہے ترک کے پٹکے کوں یا مسلسل سُرخ

لیکن حاشیہ اور دیوان کے دیگر نسخوں میں اسی طرح ہے۔ کمر میں سُرخ ململ کا پٹکا باندھنے کی رسم گجرات میں پائی جاتی ہے اور مدراس کی سُرخ ململ کی طرح گجرات کی ململ بھی مشہور ہے۔

ص۱۲۲ بتہ = یعنی بس کا بتا، گجرات میں اس کو بتا کہتے ہیں، ولی نے بتخفیف باندھا ہے، سیہ رنگ کا پتھر اور کسوٹی کے سیہ پتھر کو بھی بتا کہتے ہیں۔ بتا اور بٹی اسی پر سے بہ تبدیل واؤ کس وٹی یا کسوٹی بنا ہے۔ یہاں اسی دوسرے معنی میں ولی نے استعمال کیا ہے:۔

وین کے خالص وہ زرِ غم کے بتے کے اوپر حق نے کیا امتحان آہ دریغا و دریغ

فرہنگ میں لکھا ہے: "بتا۔ بوتہ بواو مجہول فارسی والے سونا چاندی گلانے والی گھریا کو کہتے ہیں۔ ولی نے بحذف واو کہا ہے"۔

---

[۱] دیکھو کلیات، ص۳۰۴، ص۲۶۰، ضمیمہ ص۱۰، ص۱۱

ص۱۲۹ آل = خاص گجراتی لفظ، بمعنی گزند، آنچ، ولی ۔ ع کو آل نبی پر نہ آوے گی آل
فرہنگ میں اس کے معنی "تری، نمی، سیلابی" غلط لکھے ہیں۔

ص۱۹۸ کان دھرنا = توجہ سے سُننا۔ ولی ۔ ع ٹک کان دھر کے حال کسی کا سُنا کرو

ص۱۵۲ سُرمے کی سَلی = سلائی کو گجرات میں سَلی کہتے ہیں۔

ص۔ اُچرَج = [Devanagari] کی بگڑی ہوئی صورت ۔ گجرات میں اس کو اُچرِت بھی کہتے ہیں۔

ص۱۶۶ سنجاب = اردو میں اس کو سنجاف بھی کہتے ہیں ۔ چوڑی گوٹ ۔ اہلِ گجرات کی اصطلاح میں وہ رنگین ریشمی اطلس کی گوٹ جو کرتے یا پشواز کے دامن کے نیچے بطور استر ڈالی جاتی ہے۔ ولی اسی معنی میں کہتے ہیں : ؎

اپنے دل پر خوں کو میں لایا ہوں تیرے پیشکش
کر خرچ اگر درکار ہے اطلس تجھے سنجاب کوں

اسی معنی میں کسی شاعر کا شعر ہے : ؎

نہیں ہے گرد دامن سُرخ سنجاف لہو میرا ہے دامن گیر دیکھو

ص۲۱۹/۳۶۸ بھوئیں = زمین ۔ اصل لفظ بھوم یا بھُومی ہے ۔ گجراتی میں اس کو [Devanagari] کہتے ہیں۔

ص۲۲۰ جوکھا = بمعنی تولا ۔ گجراتی لفظ ہے۔

ص۲۳۷ جیاتی = بمعنی حیات، زندگی، عمر، ولی ۔ ع تا حشر کرے سیر جیاتی کے چمن میں

ص۲۴۰ چپل = پھرتیلا، چالاک، ع جہاں مانند بجلی کے مرا چنچل چپل جاوے
فرہنگ میں اس کے معنی "طفل مزاج اور شوخ" لکھے ہیں۔

ص۲۴۰ پُور = سیلاب ۔ فرہنگ میں : "پور، پُر پہلا لفظ بمعنی طفل اور پُر (دیہ) اور دوسرا پُرے کا مخفف" لکھا ہے ۔ ولی : ع

میری انکھیاں کی انجھواں سوں ندی کا پُور چل جاوے

دوسرا شعر ہے : ؎

آج تجھ غم سوں ہے ولی گریاں دیکھ جل پُور کا تماشا ہے

یہ لفظ خاص گجراتی ہے ۔ فرہنگ میں "پنگھٹ، پانی کی جگہ" غلط لکھا ہے۔

ص۲۵۳ ہُلاس = بمعنی خوشی ۔ موجودہ گجراتی میں اس کو [Devanagari] کہتے ہیں۔

ص۲۶۰ فتنے کی جڑ = باعثِ فتنہ ۔ خاص محاورہ اہلِ گجرات کا ہے ۔ ع رقیب روسیہ فتنہ کی جڑ ہے

ص ۲۶۱ ڈاڑم = انار ۔ فرہنگ میں اس کو حرف دا کے تحت میں ڈاڑم لکھا ہے جو غلط ہے۔

ص ۲۸۸/۳۰۸ ہٹ چھٹا = ہٹ چھٹ ۔ پھکیت ۔ وَلی : ؎

نظر کرتا ہے مجھ پر یار کج کر　　　بھلا راوت سپاہی ہٹ چھٹا ہے

ص ۲۸۸ اَجانا = انجان ۔ گجراتی لفظ [illegible] ہے

ص ۳۲۳ ناٹھ گئے = بھاگ گئے، ٹھیٹھ گجرات کا محاورہ ہے۔

ص ۳۵۲ کسبل = اصل میں یہ کسبن کی خرابی ہے، بمعنی قحبہ ۔ دیوان میں اس کو کسبل لکھا ہے۔ گجرات میں کسبی کو کسبن کہتے ہیں ۔ وَلی : ؎

یہ کسی سوں وفا نہ کی ہرگز　　　بے وفا ہے مُدام یہ کسبل

ص ۳۳۵ کُنواں = کنویں کا یہ تلفظ خاص گجراتی ہے، بلکہ عام طور پر کوُا بولتے ہیں۔

ص ۳۸۰ ہاٹ = دوکان ۔ اس کی تصغیر ہٹڑی بھی آتی ہے۔

ص ۳۵۵ اوجھل = پردہ کے معنی میں خاص گجرات میں مستعمل ہے ۔ وَلی : ؎

دُور کر مُکھ اوپر سوں یہ گھونگھٹ　　　پاکبازاں سوں کیوں اِتا اوجھل

اس لفظ کو فرہنگ میں چھوڑ دیا ہے ۔

ص ۹ کاڑنا = نکالنا ۔ جیسے جیب میں سے پیسے کاڑنا ۔ خاص گجرات کا محاورہ ہے ۔

ص ۳۱ چھند = مکروفریب، چالاکی ۔

ص ۴۴ گھانے کا بیل = کولھو کا بیل ۔ خاص گجراتی محاورہ ہے ۔

ص ۴۶ اُدھر = مُعلق ۔ اصل سنسکرت میں اس کے معنی ہونٹ کے ہیں ۔ جیو اُدھر آرہا ہے ۔ یعنی جان مُعلق رُکی ہوئی ہے ۔

ص ۵۰ لڑاہنا = ٹھیٹھ گجراتی محاورہ ہے ۔ اس کو لڈانا بھی بولتے ہیں ۔ اس کے معنی فرہنگ میں نہیں بتائے گئے ۔ کسی چیز کو ہاتھوں پر اُچھالنا، جھُلانا، زیادہ ہاتھ ہلانے کو لڈانا کہتے ہیں ۔ وَلی : ؎

چھبیلی چھب سوں درزن کا ہلانا ہاتھ ٹک دیکھو

یو کچھ سستی نہیں لیکن میرے دل کو لڑاہاتی ہے

سلائی کے وقت ہاتھ کی حرکت کا ذکر ہے ۔

ص ۵۱ دیوی = چھوٹا چراغ : ؎

مہ جبیں پر لگائے کیوں ٹیکا　　　ماہ میں کام کیا ہے دیوی کا

یہ لفظ دکنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ عشرتی :

دیویاں سوں کنگراں ایسے سنوارے   کہ جیوں قوس قزح میانی ستارے

اس فہرست میں صرف وہی الفاظ دئے گئے ہیں جو خاص گجرات میں مستعمل ہیں، ورنہ ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست دی جاسکتی ہے جو دکن و گجرات میں مشترک ہیں۔

ولی کا قیام دکن اور اس کے اسباب

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے غالباً ایک سے زائد مرتبہ دکن کا سفر کیا تھا۔ مگر بعض دکنی مصنفین نے ولی کا دکن سے گجرات محض سیر و تفریح کی غرض سے جانا بیان کیا ہے اور سند میں ولی کا فراق گجرات والے قطعہ کا ایک شعر پیش کیا ہے جس میں لفظ "سیر" استعمال ہوا ہے :[1]

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا   آخر کو اس فراق میں کھینچا خمار دل

جو شہادت ولی کے گجراتی ہونے کی ہے، اسی میں تحریفِ مطلب ڈھونڈھ کر حسب منشا بنا لیا گیا ہے۔ فراق وطن کا ہوا کرتا ہے نہ کہ اُن شہروں کا جہاں انسان محض سیر و تفریح کے لئے جائے، اس نظم کا ایک ایک شعر ولی کے حُبِّ وطن کی تصویر ہے، مثلاً :

ہجرت سوں دوستاں کے میرا دل ہوا گداز   عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں   ہر دم میں بیقرار ہے مثل شرار دل

سب عاشقاں حضور اچھے پاک سُرخ رو   اپنا اپس لہو سوں کیا ہے نگار دل

اس کے ایک شعر میں ولی نے لفظ "سیر" لکھا ہے تو اس سے مراد یہاں اپنے وطن کی سیر ہے۔ انسان جب غربت و مسافرت میں ہوتا ہے تو اُسے اپنے وطن کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، وہاں جو سیر و تفریح کی ہوتی ہے اس کی یاد غربت میں دلوں کو برماتی ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

وطن کی یاد ہیں گلیاں جوانی جس میں کھوئی ہے!

دکن میں "قدر سخن" کا آوازہ سُنکر وہاں پہونچنے سے پہلے ہی "دلی کی گلیاں" ذوق کی چشم تصور میں پھرنے لگ گئی تھیں۔ اگر ہمارے شاعر کو عالمِ مسافرت میں اپنے وطن کی سیر یاد آ گئی تو اس میں کونسا استعجاب اور استبعاد ہے؟ صرف ادنیٰ ملابست لفظ "سیر" سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ پھر ولی کا آخری شعر میں اس قدر جزم کے ساتھ لکھنا کہ :۔ ع

پھر اُس کے دیکھنے کا ہے امید وار دل

---

[1] محبوب الزمن، تذکرۂ شعرائے دکن۔ جلد دوم، صفحہ ۱۱۳۶

بتاتا ہے کہ شاعر عنقریب وطن کو مراجعت کرنے والا ہے۔ اس کا یہ مفہوم پیدا کرنا کہ "ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" محض من گھڑت اور "تاویل مالم یرضیٰ بہ قائلہ" کا مصداق ہے جس کو کوئی صاحبِ فہم تسلیم نہیں کر سکتا۔

عام طور سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ولی نے یہ قطعہ دکن میں بیٹھ کر لکھا ہے اور یہ مفہوم اس شعر کا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس قطعہ کی تحریر ان کے مفروضہ وطن میں فرض کی جائے، ورنہ کسی اور جگہ لکھنا ثابت ہو تو سوائے اپنے وطن گجرات کے فراق کے دوسرا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا لیکن کلیاتِ ولی کے مرتب لکھتے ہیں :-

> "شہر گجرات (؟) کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے جبکہ وہ سید معالی کے ہمراہ صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں۔" [۵۱]

اس چند روزہ عارضی غیبت پر وطن کے فراق میں ایسی گرما گرم نظم لکھنے کی یہ صحیح وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ چنانچہ ایک مضمون نگار مرتب کلیات سے اختلاف رائے کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :- [۵۲]

> "احسن مارہروی کا قیاس ہے کہ "شہر گجرات کے لئے یہ قصیدہ کہا گیا ہے جبکہ وہ سید ابوالمعالی کے ہمراہ صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں" ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ ولی نے سید ابوالمعالی کے ہمراہ پہلا سفر جوانی کے زمانہ میں کیا ہے ۔
>
> اول سوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں — جوں بال ہے اگن کے اوپر بیقرار دل
>
> اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی۔ ولی نے زمانۂ شیب میں ایک دور دراز کا سفر حجاز مقدس کا کیا۔ یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی۔ دل سے نہ رہا گیا، بے اختیار رو دئے اور فراقِ گجرات میں مرثیہ پڑھا لیکن حج کی برکت اور "فیض حق" سے انھیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے ۔
>
> لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں — پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل"

ممکن ہے کہ ولی نے فریضۂ حج اواخر عمر میں ادا کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ارضِ مقدس میں بیٹھ کر انھوں نے فراق گجرات میں یہ آنسو بہائے ہوں، لیکن یہ سب باتیں قیاسی ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ہوں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ولی نے فراق گجرات میں مرثیہ کیوں پڑھا؟ جبکہ یہ ان کا وطن نہ تھا؟ اگر اورنگ آباد ان کا وطن ہوتا تو اپنے طویل قیام گجرات کے زمانہ میں وہ ضرور اس کے فراق میں کوئی پُرسوز و گداز قطعہ لکھ ڈالتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ تھا، ایسا نہ ہوا!!

---

[۵۱] الوسی یادگار ولی نمبر ۳ — [۵۲] کلیات ولی ص ۲۸۵ کا نوٹ

ولی نے غالباً دو مرتبہ دکن کا سفر کیا، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ بار آئے گئے ہوں، لیکن اس کی کوئی تحریری شہادت نہیں مل سکی، صرف قیاس ہی قیاس ہے ولی کے خاندان کے بزرگ ولی سے تقریباً سو سال پہلے احمد آباد سے برہان پور اور بیجاپور جاکر وہاں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے برادر حقیقی شاہ برہان الدینؒ بھی برہان پور میں مقیم تھے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔[۵۱] خود حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے فرزندوں میں سے بعض نے آپ کے عین حیات میں سلاطین فاروقیہ کے عہد میں برہان پور اور بعض نے خاندیس میں سکونت اختیار کی تھی۔[۵۲] خود ولی کے قریبی رشتہ دار چچا زاد بھائیوں کا خاندیس اور برہان پور میں بود و باش رکھنا پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض کی شادیاں سلاطین فاروقی کے خاندان میں ہوئیں۔ اس وجہ سے ان کی اولاد کا اور ان کی آمد و رفت کا سلسلہ مدتوں قائم رہا۔ ولی کے ہم جدی چچا شاہ حفیظ اللہ[۵۳] علوی کے لئے شجرۂ انساب میں لکھا ہے "در دکن رفتہ اند" اسی طرح ولی کے برادر نسبتی مولانا شیخ فرید ابن علامہ شریف صدیقی الاحمد آبادی المتوفی سنہ ۱۰۹۲ھ جو احمد آباد کے مشہور علما میں سے اور مولانا نور الدین صدیقی کے استاد تھے، ان کے فرزند جمیل اللہ اور ان کے بیٹے شیخ فرید کا قیام عالمگیر کے زمانہ میں اورنگ آباد میں رہا۔ اور مؤخر الذکر کا انتقال بھی اورنگ آباد میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔[۵۴] علاوہ ازیں شیخ فرید ابن جمیل اللہ کی دو لڑکیاں ولی کے دو بیٹوں سے منسوب تھیں۔ ان وجوہات کی بنا پر ولی اور ان کے فرزندوں کا اورنگ آباد جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ولی کے پوتے شریف میاں نے اپنے نانا جمیل اللہ بن مولانا فرید صدیقی کی وفات کا قطعہ بھی کہا ہے۔[۵۵]

---

۵۱ ان کا حال تاریخ برہان پور (مطبوعۂ کوثر پرنٹنگ پریس) میں ہے۔ ان کے فرزند شاہ سید ہاشم حسینی علوی قدس سرہٗ مشاہیر اولیائے بیجاپور میں شمار کئے گئے ہیں۔ سنہ ۱۰۵۶ھ میں آپ کا وصال ہوا، آپ کا اور آپ کی اولاد کا حال روضۃ الاولیائے بیجاپور میں مفصل درج ہے۔ ضلع خاندیس میں شاہ برہان الدین کی اولاد اب بھی موجود ہے۔

۵۲ ان کا حال رسالہ خلاصۃ الوجیہ عربی (قلمی) مصنفۂ احمد بن محمد فاروقی (بسنہ ۱۰۸۴ھ) میں ہے۔ مرآۃ احمدی میں بھی شاہ صاحب کی اولاد کا احمد آباد اور برہان پور میں قیام کرنے کا ذکر ہے۔ (دیکھو صفحہ خاتمہ)۔

۵۳ رشد و ہدایت کے سلسلہ میں شاہ حفیظ اللہ کا قیام حیدرآباد و اورنگ آباد میں رہا کرتا تھا (گلزار آصفیہ صفحہ ۳۵۲)۔

۵۴ "میاں شیخ فرید بن جمیل اللہ در اورنگ آباد مدفون شد ۱۶ ربیع الاول سنہ ۱۱۴۸ھ" (اعراس نامہ قلمی)۔

۵۵ تاریخ یافتۂ شریف میاں »—— شریف وقت فرید زماں جمیل اللہ / کہ بود شمع شبستانِ افضل الفضلا
نمود رحلتِ آں سرو بوستان لبید / بسوئے روضۂ رضواں ازیں مقام بلا
(اعراس نامہ قلمی)

ولی کے کلام میں ان کے سفر یا اقامتِ دکن کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ ایک شعر میں صرف بطور تمثیل "بیجاپور کا گڑھ" آیا ہے۔ اس کے سوا دکن کے کسی مقام کا ذکر تک موجود نہیں ہے۔ حالانکہ ان کے دیوان میں گجرات کے بعض مقامات کے نام آئے ہیں۔ مثلاً دریائے پتی، سورت، نربدا، اکرم کا باغ، دمن جو گجرات میں فرنگیوں کا ایک شہر ہے ؎

ہوئے ہیں دنگ تصویرِ فرنگ دیکھ ‏ ‏ ‏ ‏ تری صورت کہ بیرشکِ دمن ہے

ولی کے کچھ عرصہ تک برہان پور میں قیام کرنے کا ذکر حمید اورنگ آبادی نے کیا ہے [۱]

ان حالات و واقعات سے ولی کا دکن کے بعض شہروں میں آنے جانے کا حال اور اس کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً اسی طرح کے عارضی قیام دکن کے سبب بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو اورنگ آبادی خیال کر لیا ہے جو یقیناً غلط ہے۔

گجراتی اعزّہ اور احباب و تلامذہ کا ذکر دیوانِ ولی میں

ولی کے گجراتی ہونے کی ایک اور اندرونی شہادت یہ ہے کہ ان کے بعض گجراتی اعزّہ، پیرِ طریقت، اور احباب و تلامذہ کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے اور اپنے خاندانی بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ خاندانی اعزّہ میں کامل، اکمل، سراج اور شمس الدین کا ذکر آیا ہے۔ کامل ؎

ولی اس ماہ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا ‏ ‏ ‏ ‏ وہ ہرگز نیں سمجھا عالم میں اکمل کے معانی کوں

اکمل۔ ان کی شان میں ولی نے ایک غزل صنعت توشیح میں کہی ہے جس کا مقطع ہے: ؎

نام تیرا ولی نے اسے اکمل ‏ ‏ ‏ ‏ شوق سوں وردِ صبح و شام کیا

شاہ کامل اور شاہ اکمل دونوں سگے بھائی حضرت شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے تھے۔ ولی کی ان سے خاندانی قرابت تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی اولادیں آج بھی احمد آباد میں موجود ہیں۔

سراج۔ شاہ سراج الدین شاعر نہ تھے بلکہ ولی کے ہم نسب اور خاندانی رشتہ دار اور ہم عمر دوستوں میں سے تھے جن کی شادی کے موقع پر ولی نے یہ شعر کہے ہیں: ؎

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں ‏ ‏ ‏ ‏ فانوسِ دل میں شوق تیرا ہے سراج آج

وہ شوخ مجھ سے آ کے ملا اس سبب ولی ‏ ‏ ‏ ‏ شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں راج آج [۲]

---

[۱] گلشنِ گفتار ص
[۲] کلیات میں "لاج" لکھا ہے، لیکن بمبئی اڈیشن میں راج ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے، یعنی کہ اپنے دوست کی شادی میں ولی نے آج حکومت کی۔ راج کرنا بھی گجرات کا محاورہ ہے۔

شاہ سراج نے سنہ ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور مادۂ تاریخ "شیخ قطب زماں" ہے[۵۱] دکنی اہلِ قلم کی ستم ظریفی نے شاہ سراج الدین احمد آبادی کو سراج اورنگ آبادی بنا دیا[۵۲] حالانکہ مؤخر الذکر وفاتِ ولی کے ۷ سال بعد پیدا ہوا تھا! شمس الدین سے

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا　　چین میں ہے شور جن کی ابروئے پُر چین کا

یہ شاہ سراج الدین کے بیٹے تھے اور ولی کے عزیز۔ ان کی اولاد میں آج بھی کئی لوگ احمد آباد میں موجود ہیں۔

بعض تذکرہ نویسوں خصوصاً آزاد، صغیر بلگرامی اور آصفی نے شمس الدین کو ولی کا لقب یا اُن کے نام کا ایک جزو خیال کر لیا ہے۔[۵۳]

ان خاندانی قرابت داروں کے علاوہ ولی کے اشعار میں ان کے پیرِ طریقت اور بعض مسلم و غیر مسلم احباب کا نام آیا ہے۔ علی رضا سے

بعد شاہ نجف ولی اللہ　　پیرِ کامل علی رضا پایا[۵۴]

شاہ علی رضا گجراتی جن کے ہاتھ پر ولی نے بیعت کی تھی۔ فتوت نے "ریاضِ حسنی" میں ولی کے تذکرہ میں لکھا ہے :-

"دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ وارد"[۵۵]

مرآۃ احمدی میں بھی ان کا تذکرہ آیا ہے۔[۵۶] سید ابو المعالی سے

ہوا مجھ دل کی وحشت سوں ہر یک آہ جیوں طوبیٰ　　لٹک چلنا جو دیکھا بسکہ میں سید معالی کا

حمید اورنگ آبادی نے ان کو گجرات کے مشائخ زادوں میں لکھا ہے۔ ولی کے احبابِ خاص میں سے تھے۔ محمد مراد سے

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے　　جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

یہ عہد اورنگزیب میں پہلے احمد آباد صوبۂ گجرات کے پرگنات کی وقائع نگاری اور سوانح نگاری سے ترقی کر کے گودھرا اور تھاسرا (گجرات) کے فوجدار ہو گئے تھے سنہ ۱۱۲۲ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔[۵۷] غالباً قیام گجرا

---

۵۱ دیکھو یادگار ولی ص ۵۶ ۔　۵۲ شاہ سراج کے پوتے شاہ حامد بن علاء الدین ابن شاہ سراج علوی متوفی سنہ ۱۱۸۳ھ کی بیاض میں ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ موجود ہے۔

۵۳ جلوۂ خضر جلد اوّل ص ۷۹ ؛ محبوب الزمن، ج ۲، ص ۱۱۳۴ ،

۵۴ کلیات میں مصرعۂ اولیٰ میں نقد چھپا ہے جو بعد کی تصحیف معلوم ہوتی ہے، یا پھر نجل سے نقد ہو گیا ہو۔

۵۵ مقالات ہاشمی ص ۴۲۵ ،　۵۶ خاتمہ ص ۱۰۵ ،

۵۷ مآثر الامراء ج ۳ ، ص ۶۸۲ تا ص ۶۹۲ ،

کے زمانہ میں ولی کے تعلقات ان سے قائم ہوئے ہوں گے۔ محمد یار خاں ؎

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد یہ ہندوستاں — حسن کی دِتی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

یہ دہلی کے ناظم تھے اور غالباً ولی کے قیام دہلی کے زمانہ میں ان سے تعلقات رہے ہونگے۔ یہاں ان کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ سفر دہلی کے سلسلہ میں بعض دکنی شعرا سے غالباً انہی کے ہاں ولی کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

ولی کے زمرۂ احباب میں گجرات کے بعض ہندو دوستوں کے نام بھی نظر آتے ہیں جو ولی ایسے صوفی اور وسیع المشرب شاعر سے کوئی بعد امر نہیں ہے۔ ان میں گوبند لال، امرت لال، بیر لال، اور کھیم داس بیراگی کے نام اُنھوں نے مستقل غزلیں کہی ہیں ؎ گوبند لال

ہے آج خوش قداں میں کمال گوبند لال — اُستاد چال سرو ہے چال گوبند لال

(امرت لال) شمع بزم وفا ہے امرت لال — سرو باغ دلا ہے امرت لال

(بیر لال) دیکھا ہے بیر لال کوں اکرم کے باغ میں — پہنچی ہی بوئے عشق کی اس کے دماغ میں

(اکرم سے مراد شیخ محمد اکرام الدین خاں شیخ الاسلام عبدالوہاب کے پوتے جنھوں نے احمد آباد میں ایک عالیشان مدرسہ "ہدایت بخش" کے نام سے تعمیر کرایا تھا جس میں علامہ نورالدین درس دیتے تھے۔ انھی کی مدح اور مدرسہ کی تعریف میں ولی نے رسالۂ نور المعرفت لکھا تھا۔)

مندرجۂ بالا تینوں احباب احمد آباد کے بنئے معلوم ہوتے ہیں کہ لال کا لاحقہ عموماً گجراتی بنیوں کے ناموں کے ساتھ آتا ہے، جس طرح دکن میں راؤ اور جی ہندو ناموں کے آخر میں لگتا ہے۔ مصحفی نے ان تینوں کو دتی کا بتایا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ سب گجراتی ہیں ؎ (کھیم داس)

ہے بسکہ آب و رنگ جبا کھیم داس میں — آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

گجرات ہر مذہب اور ہر فرقہ کے آدمیوں کا مرکز تھا خصوصاً ہندوؤں کے جتنے فرقے احمد آباد میں تھے شاید ہی ملک کے کسی اور حصہ میں ہوں۔ یہ کھیم داس بھی بیراگیوں کے فرقہ کا کوئی نوجوان تھا جس سے ولی کے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔

تلامذہ میں سے صرف اشرف کا نام ولی نے اس کے ایک مصرعہ کو تضمین کرتے ہوئے لیا ہی ؎

اشرف کا یو مصراع ولی مجھ کوں ہے دلچسپ
الفت ہے دل و جاں کو میرے پیم نگر سوں

سید محمد اشرف تخلص اشرف۔ احمد آباد کے رہنے اور ولی کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ

حمید نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے[۵۱] اشرف کے متعلق بھی "دکنی" ہونے کا امکان بتایا گیا ہے، چنانچہ ایک صاحب فرماتے "ممکن ہے کہ یہ اشرف دکنی ہی ہو!"[۵۲] حالانکہ آگے چل کر آپ نے اشرف کے گجراتی ہونے کے متعلق حمید کا بیان بھی نقل کر دیا ہے!

اشرف کے علاوہ ولی کے ایک اور شاگرد رضی کا بھی حمید نے ذکر کیا ہے جو احمد آباد کا باشندہ تھا اور اشرف کے ایک ریختہ کے جواب میں رضی کا ریختہ بھی نقل کیا ہے[۵۳]۔

---

۵۱ اشرف کی چند غزلیں مخطوطۂ دیوانِ ولی کے حاشیہ پر چڑھی ہوئی ہیں جو احمد آباد کی بھولاناتھ لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں صفحات ۳۱، ۴۳، ۴۴، ۵۴، ۶۰، ۶۳ پر کُل چھ غزلیں ہیں۔ ان میں سے ایک غزل میں اشرف نے بھی اپنے استاد کا ایک مصرعہ تضمین کیا ہے:-

یو مصرعِ شعرِ ولی اشرف تو کر ورد زباں   غفلت میں وقت اپنا نکھو ہشیار ہو ہشیار ہو

ایک اور شعر میں اشرف نے ولی کے مصرع کو تضمینا ہے:-

کرتا ہے یو مصراع ولی صید دل اشرف   پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا

ولی کی طرح اشرف نے بھی سید معالی کے حسن کی تعریف کی ہے:-

جگت کے خوبرو سارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے   دیارِ حسن میں فرخ سیر سید معالی ہے

اشرف نے اپنے کلام میں گجرات کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عالم کی تعریف کی ہے:-

پیر اشرف کے شاہ عالم ہیں   خلف الصدق سید الاقطاب

اشرف کے کلام کا رنگ بھی وہی ہے جو ولی کا ہے۔ اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۱۱۲۹ھ کا لکھا ہوا "انجمن ترقی اردو" کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (اردو بابت جولائی ۱۹۳۵ء ص ۵۸۶)

اس کا ایک اور نسخہ ہمارے مکرم سید نجیب اشرف صاحب کے پاس موجود ہے۔

۵۲ یادگارِ ولی ص ۴۳ و ص ۲۰۰،

۵۳ گلشنِ گفتار، ص ۱۲، اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے:-

اس مصرعِ رضی کا اشرف ہے دل سوں بھوکا   بے غم ہمارے غم کوں کھاتا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصراع رضی   مصحفِ گل کا سبق بلبل پڑھے

ولی کے ایک اور گجراتی شاگرد ثنا کا ذکر فائق نے کیا ہے۔ (مخزنِ شعرا) ولی کے بعد بھی گجرات میں ولی شناسی کے دعوے ہوتے تھے، چنانچہ احمد آباد کے ایک شاعر میر حسن علی حسن (۱۱۶۰ھ) کہتے ہیں:-

آفریں تجھ کو حسن بعد ولی کے تونے   صبح مضموں سے بدل کیا گجرات کی رات

وؔلی کے معاصرین اور احباب کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وؔلی کے اُستاد شاہ سعد اللہ گلشن[51] بھی گجراتی الاصل تھے۔ ان کے اجداد میں سے کوئی بزرگ سلاطینِ گجرات کے عہد میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ شاہ صاحب کا آبائی وطن احمد آباد گجرات تھا اس لئے وہ بھی احمد آباد میں رہا کرتے اور دہلی میں مقیم ہونے کے بعد بھی وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ برہان پور میں بھی ان کا قیام رہا ہے۔[52] غالباً احمد آباد اور برہان پور کے زمانۂ قیام میں وؔلی کے ان سے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے۔

وؔلی نے اپنے ہمعصر دکنی شاعروں میں سے صرف آزاد اور فراقی کے مصرعے ان کے تخلص کے ساتھ تضمین کئے ہیں:۔ آزاد[1] - فراقی[2]

۱۔ آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب — جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

۲۔ وؔلی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جبکہ وہ ظالم — کمر سوں کھینچ خنجر چڑھاتا آستیں آوے

ایک شعر میں فراقی پر معاصرانہ طنز بھی کی ہے:۔

ترے اشعار ایسے نیں فراقی — کہ جن پر رشک آویگا وؔلی کوں

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وؔلی کی ملاقات ان دونوں سے ہوئی تھی۔ قائم نے آزاد

---

51 تذکرہ نویسوں میں سے صرف میر حسن نے وؔلی کا شاہ صاحب سے استفادہ کرنا لکھا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی نے بھی شاہ صاحب کو وؔلی کا استاد بتایا ہے (خطبات ص۱۳۵) لیکن حاشیہ نگار نے اس پر انکار کا حاشیہ چڑھایا ہے۔ ہمارے پاس خود وؔلی کی تحریری شہادت موجود ہے۔ اپنے رسالۂ نور المعرفت کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"مصنف ایں عبارت کہ بہمن ثنا پردازی بزرگاں بخطاب وؔلی سرفراز است و از شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز۔" (خاتمۂ مخطوطہ)

وؔلی کا یہ رسالہ غالباً آزاد کی نظر سے گزرا تھا مگر وہ بھی اس تردد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:۔

"شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو۔"

وؔلی کے معاصرین میں مولانا نورالدین احمد آبادی سے مرتب کلیات نے وؔلی کا دست بیع ہونا لکھا ہے (مقدمۂ کلیات ص۲۱) اس میں شک نہیں کہ وؔلی نے رسالۂ "نور المعرفت" انہی کی تعریف میں لکھا ہے، لیکن سبب تالیف میں خود وؔلی نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنے "پیر روشن ضمیر" یعنی حضرت شاہ عسکی رضا؟ کے ایماء سے مولانا نورالدین اور ان کے مدرسہ کی توصیف میں یہ رسالہ تصنیف کیا ہے۔

52 ریاض الشعراء قلمی، ص۲۷، سرو آزاد، ص۱۹۵، تذکرۂ بے نظیر، ص۱۰۱،

اور فراقی کا محمد یار خاں کے زمانۂ صوبہ داری میں دہلی جانا بیان کیا ہے۔[۵۱] اور ولی بھی غالباً اُسی زمانہ میں وہیں گئے ہیں۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ وہاں ان دونوں سے صحبتیں رہی ہوں گی۔

دکن کے ایک قدیم شاعر شوقی حسن (م قبل ۱۰۶۶ھ) کا نام ولی نے ایک شعر میں لیا ہے :۔

کہ شوق میرے شعر سوں شوقی حسن آوے
بجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دوجے بار

محض "شوق" کی رعایت سے یہاں شوقی حسن کا ذکر آیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ولی نے رنگین تخلص کے کسی دکنی شاعر کا مصرعہ تضمین کیا ہے :۔

فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا
ولی یہ مصرعِ رنگیں ہوا ہے درد جان و دل

لیکن یہاں رنگین مصرعے کی صفت بھی ہو سکتی ہے، اور بالفرض یہ کسی شاعر رنگین تخلص کا مصرعہ ہو تو اس تخلص کا کوئی دکنی شاعر نہیں پایا جاتا جو ولی کا ہمعصر ہو۔ شفیق اور آصفی نے نورالدین علی خاں رنگین کا ذکر کیا ہے جس نے ۱۱۷۲ھ میں عین عالم شباب میں وفات پائی ہے۔[۵۲] اس حساب سے وہ وفاتِ ولی کے کئی برس بعد گزرا ہے۔

اسی طرح شفیق نے عراقی دکنی کا ذکر ولی کے اس شعر کی بنا پر کیا ہے کہ وہ ولی کا معاصر تھا :۔

ڈوبا عرق کے بیچ عراقی عراق میں
تیرے سخن کے نغمۂ رنگیں کو سن ولی

لیکن یہاں ولی کی مراد فارسی کے مشہور صوفی شاعر عراقی سے ہے۔ آصفی کا بھی یہی خیال ہے۔[۵۳] مختصر یہ کہ ولی نے صرف آزاد اور فراقی کے سوا اپنے کسی دکنی معاصر یا کسی دوست یا شاگرد کا ذکر نہیں کیا۔[۵۴] اور کہ معاصرین میں ولی کے اعزہ، احباب، اور تلامذہ سب کے سب گجراتی ہیں۔

ولی کا سنہ وفات

اب تک ولی کی تاریخ وفات میں اختلاف تھا، چنانچہ کسی نے ۱۱۴۱ھ بتایا تو کسی نے ۱۱۵۵ھ اور کسی نے ۱۱۵۶ھ۔ یہ تاریخیں بھی ہمارے زمانہ میں قیاساً قائم کی گئیں، ورنہ ہمارے تذکرہ نویس تو ولی کی سنہ ولادت و وفات کی نسبت یکسر خاموش ہیں، آخر کار ولی کا صحیح سنہ وفات بھی گجرات ہی سے دستیاب ہوا جو گجرات ہی کے ایک عالم نے قطعۂ ذیل کی صورت میں لکھا تھا :۔

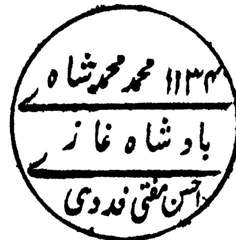
مطلعِ دیوانِ عشق سید ارباب دل
والیٔ ملک سخن صاحب عرفاں ولی

سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت
باد پناہِ ولی ساقیٔ کوثر علی

---

[۵۱] مخزن نکات۔ ص ۴۷،
[۵۲] محبوب الزمن، جلد اول۔ ص ۴۵۸،
[۵۳] جلد دوم۔ ص ۸۴۶،
[۵۴] شفیق نے معتبر خاں عمر اور میر حسن نے فقری کے تذکرہ میں ان کو شاگرد ولی بتایا ہے۔ لیکن اول الذکر کے زمانہ وطن کا حال معلوم نہیں، اور ثانی الذکر کو صرف دکنی لکھا گیا ہے۔

اس تاریخ میں آلہام کے الف سے تعمیہ کیا گیا ہے اس کو ملا کر مصرعۂ چہارم سے سنہ وفات ۱۱۱۹ھ برآمد ہوتی ہے۔ اس قطعہ کے مصنف محمد احسن مفتی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے وَلی کی سنہ وفات پر رسالۂ اردو میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے دیوانِ وَلی کے ایک مخطوطہ (موجودہ کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی) سے قطعۂ مندرجۂ بالا نقل کیا ہے[۵۱] لیکن یہ نہیں بتایا کہ مفتی احسن کون تھے۔ ان کا نام محمد احسن ہے نہ کہ حسن مفتی، جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے! اور وہ محمد شاہ کے عہد میں احمد آباد کے مفتی تھے جیسا کہ اُن کی مُہر سے معلوم ہوتا جو حسب ذیل ہے۔



یہ مُہر ایک کتاب فخر مشہد[۵۲] مطبوعہ ۱۲۷۱ھ کے اندر درج ہے۔

اس تاریخ وفات کے علاوہ چند اور تاریخیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ وَلی کے برادر نسبتی شیخ فرید صدیقی کے فرزند شیخ جمیل اللہ المتوفی ۱۱۴۸ھ نے یہ تاریخ نکالی ہے
مِنْ أَعْيُنٍ بَدْرٌ خَفِيَ (ماہ کامل آنکھوں سے اوجھل ہوگیا) اس سے ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔

۲۔ وَلی کے حقیقی بھانجے شاہ یحییٰ بن غنی علوی متوفی ۱۱۵۰ھ نے دو تاریخیں نکالی ہیں: ۵۳

آہ رفت از جہاں ولی اللہ   اور   او بودہ افضل العلما

یہ تاریخی مادے جن میں سے علی الترتیب ۸۶۷ اور ۱۰۷۶ نکلتے ہیں غالباً پورے اشعار یا قطعات کی شکل میں ہوں گے جن کے اولی مصرعوں میں تعمیہ کیا گیا ہوگا۔ صاحب اعراس نامہ (قلمی) نے ان کو صرف تاریخی مادّے سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔

وَلی کی گجراتی ہونے کے ناقابل تردید شواہد

بیانات مندرجۂ بالا کو سمیٹتے ہوئے، جہاں تک وَلی کے وطن کا تعلق ہے ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ گجراتی تھے اور شواہد ذیل ان کے گجراتی ہونے کے ثبوت میں اس قدر قطعی یقینی اور ناقابل تردید ہیں کہ اب اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی:۔

---

۵۱ یہی قطعہ ایک قلمی بیاض میں لکھا ہوا ہے جو ہمارے کرم دوست سید منظور حسن صاحب احمد آبادی کے پاس موجود ہے۔

۵۲ چند مسائل میں علماء بر ہان پور کا ۱۱۶۱ھ میں اختلاف ہوا تھا، اس کا فیصلہ احمد آباد کے علماء و مشائخ نے کیا تھا، اسی میں مفتی محمد احسن کی مُہر بھی ثبت ہے اور جب یہ کتابی صورت میں چھپا تو مفتی صاحب کی مُہر بھی اس میں بعینہٖ چھاپ دی گئی۔

۱۔ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ گجراتی کے خاندان سے ہونا۔
۲۔ احمد آباد میں اپنے خاندانی مدرسہ میں تعلیم و تربیت۔
۳۔ گجراتی پیر طریقت اور استاد۔
۴۔ خاندانی بزرگوں کی مدح اور عزیزوں کا ذکر دیوانِ ولی میں۔
۵۔ گجراتی احباب و تلامذہ۔
۶۔ وطن کی محبت، فراقِ گجرات والا قطعہ اور مثنوی در تعریف سورت۔
۷۔ کلام ولی میں بعض گجراتی مقامات اور گجراتی لباس وغیرہ کا ذکر۔
۸۔ گجراتی الفاظ و محاورات کا استعمال دیوانِ ولی میں۔
۹۔ احمد آباد میں وفات اور خاندانی قبرستان میں دفن ہونا۔
۱۰۔ تاریخ وفات کا قطعہ از محمد احسن منقی احمد آباد جو گجرات ہی سے دستیاب ہوا۔

حیاتِ ولی کے معتبر ماخذ حالاتِ ولی کے سلسلہ میں اب تک ہمارے پاس صرف تذکروں اور کلام ولی کے سوا کوئی اور ماخذ نہ تھا، لیکن حال میں ان کے ذاتی اور خاندانی حالات سے متعلق بعض معتبر مآخذ دستیاب ہوئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سندات و رقعہ جات فارسی جن میں ولی کی مُہر اور دستخط ہیں۔

۲۔ نسب نامۂ خاندان حضرت شاہ وجیہ الدین۔ یہ شجرۂ انساب خاندانی ہے جو اصل اسوقت اس خاندان کے سجادہ نشین حضرت سید بڑا صاحب کے پاس احمد آباد میں موجود ہے۔ اس میں ولی کا نسب نامہ بھی شامل ہے

۳۔ "مصباح العالم المعروف بہ ملفوظات کبیری" (قلمی) ولی کے خاندان کے ایک بزرگ عبد الملک نے اس کو مرتب کیا ہے۔ اس میں ولی کے خاندانی حضرات کے مختصر حالات اور انصاب درج ہیں۔ اس کا سنہ تالیف ۱۰۶۰ھ ہے۔

۴۔ "تذکرۃ الاعراس" یا "اعراس نامہ فارسی" (قلمی) شیخ شرف الدین بن قاضی شیخ محمد نہروالی کا جمع کیا ہوا۔ اس کی نقل عبد الملک[۱] نے کی ہے اور بارھویں صدی کی ابتداء سے لیکر ۱۱۹۲ھ تک کی تاریخہائے وفات اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہی پیشتر کی تمام تاریخیں خود مؤلف تذکرۃ الاعراس کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس نسخہ کی کتابت عبد الملک نے کی ہے اور خود کو کاتب اعراس نامہ

---

[۱] یہ عبد الملک صاحب مصباح العالم کے علاوہ ایک دوسرے شخص ہیں۔

لکھا ہے۔ اس میں وؔلی اور اُن کی اولاد و خلفا دواعزہ کی تاریخہائے وفات درج ہیں اور ان کے مختصر حالات بھی ملتے ہیں۔

۵۔ ''خلاصۃ الوجیہ عربی'' (قلمی) مصنفہٗ احمد بن محمد فاروقی سنہ تالیف ۱۰۸۳ھ اس میں حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی اولاد اور ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ ہے۔ خصوصاً شاہ صاحب کی ان اولاد و اعزہ کا جو گجرات سے دکن گئے ہیں۔

۶۔ ''نور المعرفت فارسی'' (قلمی) مصنفہٗ وؔلی۔ یہ قاضی نور الدین حسین فائقؔ (مؤلف مخزنِ شعراء) کے نسخہ مکتوبۂ ۲۵ ربیع الاول سنہ ۱۲۵۲ھ کی نقل ہے۔ یہ مشہور رسالہ وہی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نابید ہوگیا۔ اس میں مولانا نور الدین احمد آبادی اور ان کے مدرسہ اور مسجد کی تعریف میں عبارت آرائی کی گئی ہے۔ وؔلی کی فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔

۷۔ ''تذکرۃ الوجیہ اردو'' (قلمی) سید منظور حسن صاحب علوی معروف بہ سید حسینی پیر صاحب احمد آبادی۔ اس کے مؤلف شاہ وجیہ الدینؒ کے خاندان سے اور وؔلی کے ہم نسب ہیں۔ اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مفصل حالات لکھے گئے ہیں اور ان کے خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس میں وؔلی بھی شامل ہیں۔

ان مآخذ کے علاوہ متعدد تذکروں اور تاریخوں کی مدد سے نیز کلیاتِ ولی کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ہم نے ولی کے حالات مرتب کئے ہیں جو مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ نسب و خاندان۔ ۲۔ نام و سنہ ولادت۔ ۳۔ تعلیم و تربیت۔
۴۔ علمی قابلیت و تصانیف۔ ۵۔ سیر و سیاحت۔ ۶۔ اساتذہ و پیر طریقت۔
۷۔ احباب و معاصرین۔ ۸۔ تلامذہ۔ ۹۔ اولاد و اعزہ۔
۱۰۔ وفات اور قبر۔ ۱۱۔ شاعری۔

حیاتِ وؔلی پر ہمارا مقالہ[1] عنقریب (مصنف میں) شائع ہوگا۔ وَالاَمرُ بِیَدِ اللّٰہِ تعالےٰ۔

---

[1] اس کی تیاری میں ہم کو اپنے محترم دوست جناب سید منظور حسن صاحب علوی عرف حسینی پیر صاحب سے بڑی مدد ملی ہے نیز درگاہ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے صاحب سجادہ حضرت سید بڑا صاحب کے خاندانی قلمی ذخیرہ سے بھی بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی امداد کے بغیر وؔلی کے صحیح حالات مرتب کرنا ہمارے لئے ناممکن تھا چنانچہ ہم اس کو تائید غیبی سمجھتے ہیں۔ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند!!!

اختر جوناگڑھی

"بزم مصنف"

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

"مصنف" باصرہ نواز ہوا اور اپنے دامنِ سادہ بگر پُرکار میں رنگارنگ پھولوں کا گلدستہ لایا، جو دیر تک مشامِ جاں کی تازگی کا باعث بنا رہا۔ "ذکر ماضی و فکر فردا" تو البتہ بجائے خود ایک مستقل دلچسپی کی چیز ہے، لیکن کوئی مقالہ ایسا نظر نہیں پڑا جسے معیاری کہہ سکیں۔ یا یوں کہئے کہ میری دلچسپی کا نہ تھا۔ کوئی کلیہ استثنائے سے خالی نہیں۔ اسی طرح کا ایک معزز مستثنیٰ ہے "جنرل بخت خاں روہیلہ" سیدہ انیس فاطمہ کا" وہ فاضلانہ اور انشا پردازانہ مقالہ جو کسی کی "شرکت" کی غمازی کر رہا ہے، جس عالمانہ تحقیق۔ ناقدانہ تدقیق اور مبصرانہ تنقید کے ساتھ یہ مقالہ سپرد قلم ہوا ہے اس کی داد تو ہر علم دوست سے ملے گی۔ لیکن خود آپ سے بھی خراج تحسین وصول کر کے رہا ہو گا۔ ع 'اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ' اگر کاغذ کی کیابی کے عذر سے وہ کے ساتھ پورے رسالہ میں صرف یہی ایک مقالہ درج ہوتا تو بھی یہ نمبر خاصا کامیاب رہتا۔

کاش اس سے ہمارے دوسرے تعلیم یافتہ بھائی اور بہنیں سبق حاصل کریں اور اس روشن مثال کی اتباع کر کے اپنی روشن دماغی اور روشن دلی سے اپنی محدود دُنیا کو منور کریں۔

منشی احمد رضا صاحب علوی ناظر کاکوری بی۔ اے الہ آباد

'مصنف' ملا زیر نظر شمارہ میں آپ کی رفیقۂ حیات کا مقالہ "جنرل بخت خاں روہیلہ" مجکو بیحد پسند آیا، خدا کرے اس سے بہتر وہ آپ کی قلمی امداد کرسکیں۔ محترمی بل۔ احمد اکبر آبادی کا مضمون (اُزبکستان کی علمی سرگرمیاں) بہت اچھا ہے۔ "زاہرہ خاتون شروانیہ" (ز۔ خ۔ ش) بھی غنیمت ہے۔ لیکن تحقیقات سے زیادہ کسی حد تک جذبات سے کام لیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد عُزیر کا مقالہ "دار المصنفین اعظم گڑھ" خاصا ہے۔ موصوف کی محنت و تلاش کی داد نہ دینا جرم ہے۔ مگر کسی قدر تشنگی محسوس کیجاتی ہے۔

کسی وقت "بزم مصنف" بڑے کام کی چیز ہو جائیگی اور اس کی قدر کیجائیگی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور قبلہ خان بہادر پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی کی خدمت میں آداب۔

خان بہادر کپتان مرزا ابو جعفر صاحب کلکتہ

'مصنف' کا اعلیٰ معیار بہرصورت قائم رکھئے اور مضامین کے انتخاب میں آپ ہرگز رعایت و مروّت کو کام میں نہ لاویں۔ خدا سلامت رکھے سید طفیل احمد صاحب کو اب کے نمبر میں اُنکا مضمون "فن طب کی تاریخ" نہ ہوتا اور آپ کی بیگم صاحبہ نے یا پونڈال "جنرل بخت خاں" نہ دلائی ہوتی تو رسالہ کا معیار گر جاتا۔

مولوی عبدالحمید صاحب تاج محلی سکریٹری بزم نظیر آگرہ | "معنف برلا" پہونچا۔ ایک سے ایک بڑھکر مضامین مطالعہ میں آئے، مولانا سید طفیل احمد صاحب مدظلہٗ کا مضمون "تسخیر امراض" عالمانہ اور محققانہ ہے۔ چونکہ طب سے مجھے بھی دلچسپی ہے اس لئے مولانا کے مضمون سے بہت استفادہ حاصل کیا۔ میری خواہش ہے کہ موصوف اس مضمون کو وسیع کرکے کتابی شکل میں شائع کراویں تو زیادہ اچھا ہے۔ "دارالمصنفین اعظم گڑھ" پر جو مقالہ شائع ہوا وہ اپنی جگہ بہت خوب ہے۔ دلی کے "ندوۃ المصنفین" آگرہ کے "دائرۃ المعارف" اور ہندوستان کے ایسے ہی دوسرے علمی اداروں کی خدمات بھی مجلس معنفین میں روشن کی جائیں تو مناسب ہوگا۔

زیر نظر "معنف" کا تاریخی شاہکار مضمون "جنرل بخت خاں روہیلہ" ہے جو محترمہ سیدہ انیس فاطمہ کا ترجمہ ہے، میں نے اس سے پہلے بھی اُن کے کامیاب مضامین دیکھے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک خاتون تاریخ پر اس قدر گہری نظر رکھتی ہیں۔ ایک بے نام ونشان ہستی کو اس وقت روشناس کرا کر انھوں نے مورخین عہد کی آنکھیں کھول دیں۔ آج تک اس عالی مرتبت شخصیت پر کسی نے قلم نہیں اُٹھایا تھا۔ میں سیدہ انیس فاطمہ کو ان کے کامیاب مضمون پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

تعجب ہے کہ اسلامی حکومت کے عہد زوال کے ہیرو حافظ الملک حافظ رحمت خاں۔ نواب نجیب الدولہ نواب دوندے خاں۔ غلام قادر روہیلہ اور جنرل بخت خاں کو ابتک مورخین کیوں نظرانداز کرتے رہے۔ آپ لوگ لائق ستائش ہیں کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی تاریخ ملک کے سامنے رکھ کر ہندوستان کی صحیح تاریخ مرتب کئے جانے میں مدد دے رہے ہیں۔

نصرت حسن صاحب ایم۔ اے۔ کانپور | کچھ دن ہوئے آپ کا فاضلانہ مضمون نواب دوندے خاں "ڈان" میں پڑھا چونکہ میں بھی تاریخ کا طالبعلم رہا ہوں اس لئے آپ کا مضمون اور آپ کی تحقیق میری نظر میں نہایت قابل تعریف ہے مجھ کو اس قسم کے تاریخی مضامین سے بہت دلچسپی ہے اور مجھ کو قوی امید ہے کہ آپ گاہے گاہے ایسے عنوانات پر "ڈان" میں ضرور مضامین لکھتے رہیں گے۔

مولوی عبدالشکور صاحب ایم۔ اے۔ پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور | رسالہ "معنف" پہونچا یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ آپ اس زمانہ میں اس عمدگی کے ساتھ یہ رسالہ نکال رہے ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی بُری نہیں ہے۔ غالباً آجکل اس سے بہتر علیگڑھ میں ممکن نہیں ہے، مضامین سب دلچسپ اور بلند پایہ ہیں جو کافی محنت اور ذوق سے لکھے گئے۔ حضرت مولانا سید طفیل احمد صاحب قبلہ کا مضمون شوق سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی مبسوط تاریخ اگر آپ مرتب فرماویں تو ایک بڑی کمی پوری ہوجائے

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ بغیر کسی خاص کوشش کے آپ کا بیت المصنف ایک کامیاب اکیڈمی بن رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

اس وقت مصنف نشان ۱۱ آیا، ابھی پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، ہائے چوری چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا؟ ورق گردانی کر کے دیکھ لیا کہ خوب ہے۔ سو یہ نئی بات نہیں آپ کا ہر پرچہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ ایک چیز عجیب دکھائی دی۔ سر ورق پر رسالے کی قیمت درج ہے اس میں ایک انگریزی کا نام بنا ہوتا ہے۔ تعجب یہ کہ کیا اردو و فارسی میں یہ ہندسہ نہیں کہ انگریزی سے ادھار لینے کی ضرورت ہوئی!

اسی ورق گردانی میں یہ بھی دیکھ لیا کہ کتابیات کا کام جاری ہے۔ خدا جلد انجام کو پہونچائے۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر صدق لکھنؤ

'مصنف' کا تازہ نمبر ابھی پہونچا۔ ہر سہ ماہی آپ اسی طرح نوازتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ کا نام آپ نے رکھ لیا۔ دفتروں کے ہیڈ اسسٹنٹ کیا ایسے ہی ہوتے ہیں؟ خشک فائلوں اور سرخ فیتے والے غریبوں کو علم و ادب کی چمن آرائی سے آخر واسطہ کیا؟ —— آپ نے اس کلیہ کو باطل ٹھہرا دیا۔

روہیلکھنڈ میں اہل سیف تو سنے تھے...... یہ چھپا رستم۔ اہل قلم نکلا!!

داد اصل میں مصنف ۱۱ کی دینی تھی۔ مضمون "اردو شاعری میں خمریات" (از مولوی ظہیر الدین علوی) پر آپ کا نوٹ خوب، نہیں بہت خوب رہا۔ اس کی بڑی ضرورت تھی آپ نے اپنی عاقبت اس سے سنوار لی یہ خوب فیشن نکلا ہے (آج سے نہیں صدیوں سے) کہ یوں تو مسلمان ہیں لیکن ادھر ادب کا نام آیا اور اُدھر آپ بے جھجک ننگے بہہ گئے۔ شرافت۔ اخلاق۔ ایمان سب کو خیرباد کہہ دیا۔ اور فخر اب بے شرمی پر۔ شراب نوشی پر۔ شاہد بازاری پر اور خدا معلوم کس کس خرافات پر کرنے لگے۔ اسلام گویا بس ایک وردی ہے کہ ڈیوٹی کے اوقات میں اُسے پہن لیا اور پھر جب چاہا مخلّی بالطبع ہو گئے۔ یہ فسق نوازی و کفر پروری خواہ عرب جاہلیت سے آئی ہو۔ خواہ عجم سے۔ بہرحال ملت کے حق میں ایک لعنت ہے۔ اور ہمیں اگر اصلاحی انقلاب پیدا کرنا ہے اور قوم و ملت دونوں کو صالح بنانا ہے تو اس فرسودہ ذہنیت کے خلاف یقیناً جہاد کرنا ہے۔ خواہ اس سے "ادب برائے ادب" کے پرستاروں سے کچھ ہی سننا پڑے۔ آپ نے حقیقتاً ایک کام کیا۔ اور دینی جہاد میں حصہ لیا۔

لفٹنٹ قمر صاحب صدیقی ایم۔ اے گوہاٹی آسام

رسالہ 'مصنف' پابندی کے ساتھ پہونچ رہا ہے۔ کانفرنس گزٹ بھی آجاتا ہے۔ مصنف کے مضامین بلند پایہ ہیں۔ اور مضمون نگار حضرات مضامین کے لکھنے میں کافی کاوش کرتے ہیں۔ مولانا طفیل احمد صاحب مدظلہٗ کا مضمون

ذخیرہ اس آدی کا بہت ہی خوش ہوا۔ مولانا موصوف کی تقریباً تمام تصنیفات پڑھ چکا ہوں۔ چونکہ میں علم المعیشت کا متعلم بھی رہا اور کچھ دنوں تک معلم بھی اس لئے میرے دل میں مولانا کی تصانیف کی قدر بہت زیادہ ہے۔ مولانا طفیل احمد صاحب نے مسئلہ سود کی آواز اٹھائی تھی جو ظاہراً صدا بصحرا ثابت ہوئی مگر میں تو یہی کہونگا کہ مسلمانوں کا لیڈر صحیح معنوں میں وہی ہوسکتا ہے جو ان کی معاشی حالت کی درستگی کا بیڑا اٹھائے اور کچھ کر دکھائے۔ سیاسی وعلمی ترقی سے ایک حد تک اشک شوئی ہو جاتی ہے لیکن اصلی اقتصادی مصیبت بجائے زوال پذیر ہونے کے ترقی پذیر ہے ؎

زاشک زخم پاک کردن چہ حاصل　　　علاج بکن کز دلم خون نہ آید!

مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں میرا سلام و نیاز۔

صاحبزادہ ممتاز علیخاں صاحب بی۔ اے (علیگ) سہارنپور

ماہ جون ۴۵ء کے معنف میں سید لطیف حسین صاحب ادیب بریلوی کا مضمون مسلمان اور سائنس نظر سے گزرا۔ فاضل مضمون نگار کا اقدام لائق ستائش اور قابل تقلید ہے۔ فی زمانا اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ اسلاف کے کارناموں کو بے نقاب کر کے منظر عام پر لایا جائے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ سراسر غلط اور حقیقت سے بعید ہیں۔ اور یہ کہ زمانہ ہائے ماسبق میں جو کارہائے نمایاں انھوں نے انجام دئے ان کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن لطیف حسین صاحب نے صرف اُن مادی اشیاء کا ذکر کیا ہے جنکی تحقیق اور عالم وجود میں لانے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، موصوف نے اُن نظریات پر روشنی نہیں ڈالی جنکی آج دنیائے سائنس میں دھوم مچی ہوئی ہے اور جن کو دنیا سے متعارف کرانے کی اولیت کا شرف عہد حاضر کے سائنس داں بزعم باطل سر اسحاق نیوٹن اور چارلس ڈیریم کو بخشتے ہیں۔ میری مراد نظریۂ ارتقاء اور نظریۂ جر ثقیل سے ہے، تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان اہم نظریات کو بھی سب سے پہلے مسلمانوں نے معلوم کیا حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریات جو رہین منت ہیں قرآن مجید کے متعدد آیات میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں مسلمان ائمہ (ابونصر فارابی۔ ابن سینا۔ ابن مسکویہ۔ ابن ماجہ وغیرہم) نے نظریات مذکورہ کے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ پروفیسر ڈیریوئی رقم طراز ہے "نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے آثار مسلمانوں کی تصانیف میں ملتے ہیں"

ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم بہار

تین برس کے بعد گھر آیا ہوں۔ میں بلی (؟) وہ مقصد رہا علیگڑھ بھی آنیکا قصد تھا۔ لیکن نہ آسکا بہر حال کچھ دنوں کے بعد جب اس طرف پھر آؤنگا تو آپ سے مفصل باتیں کرنیکا موقع ملے گا۔ معنف کی دو جلدیں جلیں یہ رسالہ بھیجتے رہیے، آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے جیل میں آپ کئی بار یاد آئے۔

تمام شد

تصانیف سید الطاف علی بریلوی

حیاتِ حافظ رحمت خاں روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اُردو زبان میں پہلی مکمل و بسوط باتصویر سوانح عمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور دردناک حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۵ روپے (زیر طبع بار دوم)۔

مُسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد (بزبان انگریزی) اس کتاب میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے اسوقت تک کی مسلمانانِ ہند کی بالخصوص مسلمانانِ یو۔پی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جدوجہد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت عہ روپیہ (زیر طبع بار دوم)

مُسلمان کی دُنیا مصنف نے اپنی دس سالہ پبلک لائف کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب وعلل کو افسانہ کی شکل میں مُرتب کیا ہے۔ قیمت ۲ آنے

معرکۂ انتخاب جداگانہ و مخلوط جداگانہ یا مخلوط کون سا طریقۂ انتخاب مسلمانوں کے مفید ہے اس سوال کا جواب عام فہم زبان میں دیا گیا ہے۔ قیمت ۲ آنے۔

رُباعیاتِ عرش فاروقی بریلی (روہیلکھنڈ) کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے دردانگیز حالاتِ زندگی اور بطور نمونۂ کلام اُن کی کیف آور رُباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۶ آنے۔

صُوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رُکاوٹیں درپیش ہیں۔ ان پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حل مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت ۸ آنے۔

نواب دوندے خاں (بزبان انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامرا نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار عزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر بہرام جنگ کے مجاہدانہ واقعات اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت ۴ آنے۔

غلام قادر روہیلہ (سلطنتِ مغلیہ کا آخری محافظ) بزبان انگریزی و اردو۔ (زیر طبع) قیمت ۸ آنے۔

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بکڈپو سُلطان جہاں منزل علی گڑھ

مُصنّف نمبر ۱۱

مجلس مصنّفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

جون سنہ ۴۵ء

مُدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی، اے (علیگ)

قیمت سالانہ 4 چار روپے

بیتُ المصنّف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باہتمام خانصاحب جواہر خاں

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا

مُصنِّف

جلد ۳	بابت ماہ جون ۱۹۴۵ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکرِ ماضی اور فکرِ فردا

غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں! یہ اجارہ نہیں کرتے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ" یا "انڈین اکیڈیمی آف اسلامک ریسرچ" کی تحریک تیز رفتاری کے ساتھ چل رہی ہے۔ دہلی میں منعقد شدہ سب کمیٹی کی رپورٹ ۱۵ اپریل ۴۳ء کو چھ بجے شام صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ میں بڑی کمیٹی کے جلسہ میں پیش ہوئی۔ مقامی ماہرانِ علم و فن کے علاوہ بیرونی حضرات میں آنریبل ڈاکٹر سر محمد عزیز الحق صاحب۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ اور آنریبل خواجہ غلام السیدین صاحب شریک ہوئے۔ کانفرنس کی جانب سے بے تکلف دعوتِ عصرانہ کا بھی زیرِ انتظام خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسہ کا آغاز جناب ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر کے ایک بصیرت افروز پیغام سے ہوا۔ فنی بحث و گفتگو اور غور و خوض کے بعد متذکرہ بالا سب کمیٹی کی رپورٹ منظور کی گئی۔

اس جلسہ کی تمامی کامیابی یہ تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ جناب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب رونق افروز ہوئے اور بحیثیت صدر آپ نے جلسہ کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اظہارِ دلچسپی سے قیام "ریسرچ اکیڈیمی" کا کام قرین کامیابی ہو گیا ہے اور یقین ہے کہ اُن کی مخلصانہ ہمدردی سے بہت کچھ مشکلات کا خاتمہ ہو جائیگا۔

---

۱۰ مئی ۴۳ء کو اکیڈیمی کی اسکیم کانفرنس ورکنگ کمیٹی میں پیش ہو کر منظور ہوئی اور اب عنقریب کانفرنس سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کی منظوری سے مجوزہ ادارہ کی مختلف جماعت ہائے انتظامی و عہدہ داران کا انتخاب اور اسٹاف وغیرہ کا تقرر عمل میں آ جائیگا۔

چونکہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مجلس مصنفین علیگڑھ کے رکن مشترک ہیں۔ اس لئے اوّل الذکر مستطیع اور ذی اثر جماعت کے زیرِ سرپرستی وقت کی اہم قومی ضرورت۔ انڈین اکیڈیمی آف اسلامک ریسرچ کے قیام کا سامان بہم ہوتے دیکھا گیا تو مجلس مصنفین علیگڑھ کو زیادہ وسعت دینے کا خیال بالفعل ترک کر دیا گیا۔ اگرچہ

داشتہ آید بکار

کے حکیمانہ قول کے مطابق اِس کی موجودہ حیثیت کو ضرور برقرار رکھا جائیگا۔ مجلس کے جلسے ہوتے رہیں گے اور اِس کا علمی رسالہ مصنّف بھی بدستور جاری رہے گا۔

کانفرس کی ریسرچ اکیڈیمی۔ مشاہیر علماء مقتدر ماہرانِ فن اور صاحبِ ثروت۔ بزرگانِ ملت کی سرپرستی میں بلند و بالا عمارت۔ اعلیٰ درجہ کی لائبریری و میوزیم۔ فاضل اسٹاف اور دوسرے عمدہ ساز و سامان کے ساتھ قایم ہو کر دن دونی رات چوگنی ترقی کے منازل طے کرے گی۔ اور مجلس مصنفین بالکل 'بے ضابطہ' اور 'بے قاعدہ' اپنے قدیم "خانقاہی" اصول پر اُس غریب بڑھیا کے جھونپڑے کی طرح قایم رہیگی۔ جس کے قریب نوشیروانِ 'عادل' کا شاندار محل تعمیر ہو گیا تھا۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

ناظرینِ مصنف "بیت المصنف" سے متعارف ہو چکے ہیں۔ جس کی عمر اگرچہ عملاً چار سال ہے لیکن حقیقی عمر اس کی صرف سات ماہ کی ہے۔ 'مجلس مصنفین' کے علمی و تحقیقی مقالات کے ساتھ ہی ساتھ جو مصنّف میں شائع ہوئے ہیں۔ 'بیت المصنف' میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور تراجم کا سلسلہ بھی مختصر پیمانہ پر جاری ہے۔

سب سے اہم کام کتابیاتِ اُردو کی تدوین کا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی فرمایش پر ہو رہا ہے۔ کتابیات مذکور میں ابتدا سے اس وقت تک کی تقریباً پچیس ہزار مطبوعہ کتابوں کا احوال باعتبارِ مضمون اور مصنف درج

ہوگا۔ اور اس کے شائع ہونے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جس جس علم و فن پر جس قدر کام ہو چکا ہے۔ ان کی کمیت و کیفیت نگاہ میں آجائے گی۔

مولانا مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی نے اس اہم کام میں مدد دینے کے لئے اپنی قریب قریب مستقل سکونت 'بیت المصنف' میں اختیار کر لی ہے۔

حکیم شریف الزماں صاحب اکبرآبادی نے بنگش پٹھانوں کی مشہور کتاب "تاریخ فرخ آباد" مولفہ مفتی ولی اللہ صاحب کا فارسی سے اردو میں ترجمہ مکمل کر دیا ہے۔ ۱۲۲۹ھ کی نہایت اہم تالیف ہے۔ تقریباً چار سو صفحات کی کتاب ہوگی۔

خاندان نواب نجیب الدولہ کے حالات میں مرزا نصیر الدین برلاس مرحوم کی قیمتی کتاب 'نجیب التواریخ' جو ۱۲۸۶ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس کی ایک نقل 'بیت المصنف' کے لئے کرالی گئی ہے اور زیادہ تر اسی سے حاصل شدہ مواد کی بنا پر "علامہ قادر روہیلہ" کی تائید و حمایت میں رقم السطور کا مقالہ اخبار 'ڈان' کی اشاعت ۲۵ فروری اور ۱۱ مارچ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ مولوی سراج الحق قریشی صاحب بی۔ اے، نے اس مقالہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے جو انشاءاللہ 'مصنف' کے اگلے شمارہ میں شائع ہوگا۔

مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے جب سے حیدرآباد سے علیگڑھ تشریف لائے 'بیت المصنف' سے وابستہ ہیں۔ اس عرصہ میں آپ کی بھی تین کتابیں "مرقع افغان" یا لودیوں کا ہندوستان" "تاریخ خاندانی : الاجاہی گوپاموی" الموسوم بہ "تحفۃ الابرار" اور "بزم برس" یعنی مسدس ہندی حضرت وجیہ شاہ صاحب تیار ہو گئیں۔ ثانی الذکر کی تیاری میں مولانا صاحب کو اپنے خاندانی ذخیرہ کے علاوہ کانفرنس لائبریری کی قلمی کتاب "تحفۃ الاخبار" سے بھی بہت مدد ملی۔ جو کرناٹک کی ابتدا سے نظام نوائت تا نواب والا جاہ اوّل۔ دوم۔ سوم اور عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کی مبسوط تاریخ ہے۔

ایک اور قیمتی قلمی کتاب "سرگذشت طہماس مسکین" جس سے اٹھارویں صدی عیسوی کے تاریخی واقعات دبالخصوص نواب معین الملک عرف میر منّو گورنر پنجاب جنہوں نے دو مرتبہ احمد شاہ درانی کے حملوں کو روکا اور سکھوں کے خلاف زبردست جہاد کیا) پر بالکل نئی روشنی پڑتی ہے۔ کتاب خانہ حبیب گنج سے حاصل کی گئی اور اس کا اردو ترجمہ جناب مولوی معین الدین صاحب نے مکمل کر دیا

تذکرہ بالا جملہ کتابیں کاغذ کی سہولت ہوتے ہی انشاءاللہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوں گی۔ اور مجلس مصنفین یا بشرط منظوری ریسرچ اکیڈیمی کی طرف سے شائع کی جائیں گی۔

علمی کام کرنے کا ایک چھوٹا سا مرکز قائم ہو جانے کی وجہ سے علیگڑھ تشریف لانے والے بعض اہل علم حضرات 'بیت المصنف' میں بھی قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ سہ ماہی میں جناب افضل العلما، خان بہادر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس۔ نجیب اشرف صاحب ندوی۔ پروفیسر اسمعیل انڈسٹری کالج بمبئی۔ مولوی محمود احمد عباسی صاحب امروہہ۔ مولانا نظام الدین حسن صاحب نظامی بدایونی۔ داجو میر احمد علیخاں بہادر آف محمود آباد۔ مولانا ابن حسن صاحب جارچوی۔ مولانا ظفر الملک علوی صاحب۔ قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام۔ اور پروفیسر طاہر فاروقی ایم۔ اے وغیرہم نے اپنی تشریف آوری سے 'بیت المصنف' کو مفتخر فرمایا۔

مجلس مصنفین، رسالہ "مصنف" اور "بیت المصنف" کے سب کاموں کو بالکل اسی طرح چلایا جاتا ہے جس طرح کبھی مولانا حسرت موہانی ڈھائی آنے یومیہ میں بفراغت بمبئی میں گزر اوقات کرتے تھے۔ ع

نداخود میر سامان است ارباب توکل را

پر ہمارا ایمان ہے اور بفضلہ ہم مطمئن ہیں۔

'بیت المصنف' میں کتابوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ حال میں جناب مولوی محمد امین زبیری صاحب نے ستّر کتابیں مرحمت فرمائی ہیں۔ جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی کا موعودہ کتابوں کا ایک بڑا صندوق بھی عنقریب آنے والا ہے۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بجنے کا
کیا بے تاب کانوں میں جنبش جوہر نے آہن کو

اب گزشتہ سہ ماہی کی

بزمِ مصنف

ملاحظہ ہو:-

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب جماعت اسلامی کے ساتھ میری وابستگی کا علم تو آپ کو ہوگا ہی اس سلسلہ میں تہارے سے منتقل ہو کر پنجاب (دار العروبۃ [illegible] جالندھر) چلا آیا ہوں۔ رسالہ "ترجمان القرآن" کو اوٹ تو مولانا ابوالاعلیٰ صاحب ہی کر رہے ہیں۔ البتہ جنگ کے اختتام کے بعد اسی نہج کا عربی مجلہ نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جس کے ذریعہ عربی دنیا کو خطاب کیا جائیگا اور "تحریک" سے متعلق عربی زبان میں ترجمہ و تالیف کا کام بھی ہوگا جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ ترجمان کی اشاعت بابت ماہ رجب و شعبان میں اپنی اسکیم کے متعلق میں خود ہی اظہار خیال کر چکا ہوں۔ اگر کہیں دستیاب ہوں تو ملاحظ فرمالیں۔ تحریک اسلامی کی نوعیت اور حالات سے بے خبر رہنا شاید یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ جیسے باخبر حضرات کے لئے روا نہیں ہے۔ "تحریک وہابیاں" پر میں نے ایک کتاب مرتب کر لی ہے جو اللہ نے چاہا تو مستقبل قریب میں شائع ہو جائے گی۔ عجلت میں یہ چند سطور لکھ رہا بلکہ لکھوا رہا ہوں تفصیلات پھر کبھی عرض کی جائیں گی۔

مولوی عبدالسلام خانصاحب جلال مدیر "افغان" دہلی آپ کا محققانہ مضمون "غلام قادر روہیلہ" جو انگریزی اخبار "ڈان" میں شائع ہو کر نظر سے گزرا اکثر صاحبان علم نے اُسے بہت پسند کیا۔ ادارہ "افغان" کا خیال ہے کہ اس کا ترجمہ "افغان" میں شائع کیا جائے۔ اس میں چونکہ آپ سے استصواب ضروری ہے۔ اس لئے مکلف خدمت والا ہوں کہ رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

ادارے کی استدعا ہے کہ شیر شاہ سوری نے قلعۂ رہتاس پر جو حملہ کیا اگر وہ اُس میں حق بجانب تھا تو اس پر بھی اسی طرح محققانہ روشنی ڈالی جائے۔ ادارہ آپ کا ممنون کرم ہوگا۔

اسلامک کلچر حیدرآباد دکن مجلس مصنفین علیگڑھ نے جو مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور اہل علم حضرات کا ایک جدید قائم شدہ علمی مرکز ہے۔ کافی تعداد میں بہت دلچسپ اور قابل قدر مطبوعات اور رسائل شائع کئے ہیں۔ مجلس مذکور مسلم یونیورسٹی اور بیرونجات کے ماہران علم وفن کو اپنے وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے جلسوں میں مدعو کر کے اُن سے مقالے پڑھواتی ہے۔ جن پر بحث و گفتگو ہوتی ہے اور جو ان کو بصورت پمفلٹ یا مجلس کے آرگن مصنف میں شائع کیا جاتا ہے۔ مجلس کے جلسوں میں پڑھے ہوئے اور شائع شدہ کچھ مقالات حسب ذیل ہیں۔

"انیسویں صدی میں اردو صحافت" "لٹن لائبریری کے چند اردو مخطوطات" اور "میر حسن اور ان کا غیر مطبوعہ کلام" از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی۔ "جدید فارسی شاعری کے رجحانات" اور "کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟" از پروفیسر ضیاء احمد ایم۔ اے لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی۔ "اکبر اور سرسید" از پروفیسر آل احمد سرور صاحب لکچرر شعبۂ اردو۔ "علم معیشت پر ایک فلسفیانہ تنقید" از پروفیسر میاں محمد شریف صاحب ایم۔ اے (آکسن) ریڈر شعبۂ فلسفہ۔ "ترکی صحافت جمہوریت سے پہلے" از مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے۔ "مصر قدیم میں دنیا کی پہلی شہنشاہی" از مولانا سید طفیل احمد صاحب وائس پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ۔ "نواب دوندے خاں" اور "صوبۂ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم" از سید الطاف علی بریلوی۔ "شعرائے اردو اور ہندی شاعری" از مولوی ظہیر الدین علوی صاحب ایم۔ اے۔

مجلس کا ایک سہ ماہی رسالہ (مصنف) بھی ہے۔ جس کے ۲ میں دو مقالے ہیں۔ "بہادر شاہ ظفر کی شاعری" از مولوی حسن عبداللہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) اور "غالب نے اردو خطوط نویسی کب سے شروع کی؟" از قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا پٹنہ۔

خان بہادر حکیم معظم علیخان صاحب میں آنولہ (بریلی) آپ مطمئن رہیں چندہ ماہ دوں گا نہیں۔ حالانکہ اب مضامین ویسے نہیں ہوتے جیسے کہ ابتداء میں مصنف نے دئے۔

(لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ ایڈیٹر)

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدرآباد دکن "مصنف" ۴۵ء بابتہ مارچ موصول ہوا شکریہ قبول فرمائیے۔ جملہ مضامین دلچسپ اور معلومات افزا پائے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالہ مصنف اپنے

مضامین کی وجہ سے اُردو کے معیاری رسالوں میں کافی بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے لئے اہل ملک کو آپ کا ممنون ہونا چاہیئے خصوصًا اہالیانِ حیدرآباد آپ کی محنت و کوشش کے ممنون احسان ہیں۔

نواب زادہ مشتاق علیخاں صاحب ایم، اے، ایل، ایل، بی بھوپال

جن خیالات کا آپنے اظہار کیا ہے اور جو الفاظ میرے متعلق آپنے لکھے ہیں اُن کے لئے تہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ سب علیگڑھ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔ 'معتقف' تو اُسی زمانہ میں معرضِ وجود میں آگیا تھا جب میں زیرِ تعلیم تھا۔ اور احباب میں اس کی ضرورت کے چرچے ہوتے تھے۔ دعائے خیر میں یاد رکھئے۔

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی ایم، اے بمبئی

میں نے بمبئی یونیورسٹی اور اسمٰعیل اندھیری کالج میں خریداری 'معتقف' کی تحریک کی ہے عنقریب یہ کام ہوجائیگا۔ اپنا چندہ بذریعہ چک روانہ کرتا ہوں۔ اِدھر پھر کب آنا ہوگا۔ یہاں کی خشک تجارتی فضا سے دل پریشان رہتا ہے۔ (علیگڑھ آنے کی تمنا ہے)

مولوی خصلت حسین صاحب صابری اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولس جھانسی

تحسین ناشناسی سے ڈرتا ہوں، مگر 'خمریات' علوی صاحب کے مقالہ کے تحت جو حاشیہ آپنے (مذمتِ شراب میں) ثبت فرمایا ہے اُسے دیکھکر جی نہ مانا اور لکھنے کی جرأت ہوئی ؎

ملتی ہے وہ نہ ساقیِ کوثر سے یہ خدمت
اس طرح کوئی پیرمغاں ہو نہیں سکتا

یہ تو ہمارے ریاض صاحب نے کہا ہے جنہیں میں نے خود بھی برتا ہے اور یقین ہے کہ وہ آپ کے (علوی صاحب) کی "مے" سے مبرا تھے۔ سے داغ و غالب ایسے میخوار بھی ہم جیسے زاہد (خشک) سے بہت پاکیزہ۔ بقول غالب ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یا یہ کہا ہے! داغ نے ؎

صبر لے زاہد نا فہم نہ مے خواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

آپ کا یہ لکھنا "تاہم یہ لوگ سیہ و جو خود گنہگار اور دوسروں کی ترغیب کا باعث ہوئے۔ کہاں تک ان بے گناہوں کے

روح افزا ہوگا۔ اور پھر یہ ہدایت "اگر مسلمان اپنے پچھلے قومی نقصانات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو منظم و کارآمد بنا کر ملک و ملت کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں اس ناپاک شیطانی عمل کے ذکر سے اپنے سارے نثر و نظم کے لٹریچر کو پاک کردینا چاہیئے۔"

ہر چیز ظاہر و باطن رکھتی ہے ہم لوگ ظاہر سے تو مسلوک اور بے خود۔ مگر ایک غریب جو مئے وحدت سے چور و مخمور ہو وہ گنہگار! سچ ہے تعلیم بھی اب ظاہر کی رہ گئی ہے ہر قدم پر ہم اور ہمارے نوجوان لغزش کر رہے ہیں۔ مگر ایک شرابی جو بظاہر صرف ہماری نظر میں ایک گناہ کا مرتکب نظر آتا ہے اور ساتھ ہی احساسِ گناہ بھی رکھتا ہے بلکہ اپنی عادات و اطوار سے اس کا اظہار بھی کرتا ہے اُسے روسیاہ و خطاکار بتلایا جاتا ہے اور سب سے بڑے گناہ کا مجرم۔

اسلام "جام وحدت" پر مبنی اور "ساقی کوثر" کی نظر پر منحصر ہے۔ ع

درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش

مولوی سلطان حیدر جوش صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ

میرزا صاحب! اس تحریر سے جبیں بجبیں نہ ہوجئے۔ "نیک خصلت" اپنی طینت سے مجبور ہے اور آپ اپنی عادت سے معذور! لکھنے والے بہت کچھ لکھ چکے ہیں مگر ہٹ دھرمی کے 'مولابخش' کا بول بالا رہتا ہے۔ مناسب ہو کہ آپ اس شعر کی تشریح بھی کردیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

بہتر ہے کہ اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈالکر ایک ڈکار لے لیجئے!

الجواب

مشہور ہے کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ مئی اور جون کے مہینوں میں جبکہ راقم السطور کی طرح اللہ کے نیک بندے کشمیر۔ شملہ۔ مسوری۔ اور نینی تال بھیجے جارہے ہیں۔ ہمارے (برعکس نہند نام زنگی کافور) "نیک خصلت" بزرگ کا تائیدِ شراب نوشی کی پاداش میں علیگڑھ سے جھانسی جیسے بند ملکعنڈی جہنم میں تبادلہ ہوا ہے۔ بہ نفرت خفی بقول حضرت مضطر خیرآبادی ؎

جہنم کا ڈر ہے یہ زندانِ جھانسی
عجب پُرخطر ہے یہ ایوانِ جھانسی

بُطلانِ حق پر مزید اصرار ہوا تو برسات شروع ہونے پر
چڑیا پونچی اور جاڑے میں لہٰذا آج شریف روانہ فرما دئے
جائیں گے۔

رہی جوش صاحب کی ہوائی' تو اللہ کا احسان ہے
کہ آپ بروقت بچ گئے اور اب آپ کے اوقاتِ عزیز ع
بمقتضائے 'بچوں پیر شود.......'
مطالعہ قرآن وتفسیر میں بسر ہوتے ہیں۔ رہا خط تو وہ عہد
سرخوشی کا شاہکار ہے۔

حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی صاحب آپ کی دُوری اب بہت ستاتی ہے۔ مگر
مجبوری ہے۔ اہل گورکھپور کا اصرار حد سے بڑھ چکا ہے۔
اخبار کا کام ہے۔ امتحاناً کام شروع کروں گا۔ جی لگ گیا تو
رہ جاؤں گا۔ گورکھپور وطن سے قریب ہے اور اخبار والے
چھپوانے توڑنے کا ذریعہ۔ قلم میں زنگ لگ گیا ہے اور طبیعت
جمود میں۔ اب شاید کوئی مفید کام ہو سکے۔ انشاءاللہ تعالیٰ
صحافت کو فن کی صورت میں نئے انداز میں پیش کرنا چاہتا ہوں
شاید پرانا تجربہ کام دے جائے۔

مشیر احمد علوی المخاطب ناظر کاکوروی بی اے (علیگ) عمر دراز
کے بعد آپ سے آج ملاقات کی نوبت آئی۔ خدا کا شکر ہے کہ
آپ نے سوتے سوتے آنکھیں کھولیں۔ مصنف نے یہ صورت نکالی
مارچ ۱۹۴۶ء کے عدد سے دل خوش ہو گیا۔ ڈاکٹر راجہ غلام سرور
صاحب کا مقالہ (کتب خانہ آج شریف گیلانی) بہت عجیب
اور پُر از معلومات ہے۔ آپ ان کو میری طرف سے مبارکباد
دیدیجئے۔ مسٹر ظہیر الدین علوی کا مضمون (اُردو شاعری
میں خمریات) بھی اچھا ہے۔ مولانا ابراہیم فاروقی صاحب
نے بھی اپنے مقالہ (ہم لقب حکمرانانِ اسلام) میں کافی
محنت کی ہے۔ مضامین کی کہاں تک تعریف کی جائے ہر مضمون
محنت سے لکھا گیا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ بار بار پڑھا جائے
خدا آپ کی بلند توقعات کو پورا کرنے کے جمیع سامان مہیا
کرے۔ آمین۔ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ آپ کی علمی برادری
میں شرکت کروں۔ اس سال کسی نہ کسی حیثیت سے اس آرزو
کو ضرور پورا کر دوں گا۔

سید لطیف حسین ادیب بریلوی رسالہ 'مصنف' اپنی نوعیت کے لحاظ سے
یکتا ہے۔ اہل قلم حضرات نے خوب خوب جدّت طرازیاں کی
ہیں۔ معلومات کے دریا بہائے ہیں۔ اس پر صاف اور سلیس
عبارت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ خصوصاً مولوی
ظہیر الدین علوی صاحب کا مضمون مصنف کا ایک درخشاں
ستارہ ہے۔ اس پُر آشوب زمانہ میں 'مصنف' کی کامیابی
پر جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

ان چند باتوں کے علاوہ جو اوپر عرض کی گئیں۔ میں مصنف
کا ایک اور اہم وجہ سے بھی مرہونِ منت ہوں۔ ابھی تک
میرا دماغ رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف مولانا حالیؔ اور
مولانا شبلیؔ کی علمی۔ اخلاقی اور ادبی مضامین صف آرا تھے۔
دوسری طرف جناب شوکت تھانوی اور مولانا نیاز فتحپوری
کے افسانے۔ آستین چڑھائے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ لیکن
مصنف نے قطعی فیصلہ کر دیا۔ اور ان دو انیسویں صدی کی عبا
پوش بزرگوں کی فتح ہو گئی! اس فیصلہ سے پہلے میں بالکل
اپاہج سا ہو گیا تھا۔ قلم اٹھاتا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ
علمی موضوع پر کاوش ذہنی کروں یا افسانہ پر طبع آزمائی کروں
مگر آج افسانوں کے بے بنیاد اور جھوٹے جذبات سے پُر ہونے
کا قطعی ثبوت مل گیا۔ چنانچہ تائب ہوتا ہوں اور اپنا پہلا
ناچیز مضمون "مسلمان اور سائنس" پیش کرتا ہوں۔

سید محسن علی ترمذی صاحب ایل ایل ایم آر ایس پی سی ایس سب جج گڑھ شنکر ہوشیارپور مجھے سال بھر سے آپ کی کتاب
"حیاتِ حافظ رحمت خاں" کی تلاش ہے۔ لاہور کے
کتب فروش مہیا نہ کر سکے[1] براہِ کرم ایک جلد بذریعہ وی۔
پی بھجوا دیجئے۔

غلام قادر روہیلہ کے بارے میں آپ کا سلسلۂ مضامین
'ڈان' میں پڑھا اور نواب دوندے خاں پر مضمون 'مصنف'
میں دیکھا تھا۔ خود میرا بیٹا اُنھیں جراحتوں سے مجروح ہے۔
خیر یہ قصہ طولانی ہے۔ مجھ کو آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا بریلی میں

---

[1] حیاتِ حافظ رحمت خاں دسمبر ۱۹۳۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر
شائع ہوئی تھی۔ پہلا ایڈیشن عرصہ سے ختم ہے۔ بعد نظرثانی دوسرا ایڈیشن با
دیگر مصروفیات چھپوانے کی فرصت نہ ملی۔ پھر جنگ نے اس
کام کو ناممکن بنا دیا۔ اب انشاءاللہ جنگ کا خاتمہ ہے۔ کتاب مذکور
جلد دوبارہ شائع ہوگی۔

پنجابی سیّدوں کا کوئی گھرانا موجود ہے؟ میرے ایک بزرگ بارھویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں وہاں گئے تھے اور پھر نہیں آئے۔ سنا کرتے ہیں اُن سے ایک شاخ وہاں چلتی ہے۔ محمد علی اُن کا اسم شریف تھا۔ اور ۱۱۶۹ھ تک وہ روہتک جو سرکار سہرند سے اُن دنوں متعلق تھا مقیم تھے۔ غالباً روہیلوں کی کوشش یا کشش اُنھیں اُدھر لے گئی۔

نواب دوندے خاں کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ "مزار شریف نصف بیع ہو چکا ہے" موجودہ قانون کی نگاہ میں ایسا بیع کالعدم ہے بشرطیکہ کوئی پیروی کرے۔

قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی

پرسوں مصنف باھرہ نواز ہوا۔ مگر بیوگی کے لباس میں۔ خط اور رسالہ میں آپ کے پورے خط و خال پیش نظر ہو جاتے ہیں اور میں دیر تک محو تماشا رہتا ہوں۔ ۳ مارچ کی نیاز نامہ کی پذیرائی کا شکریہ ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

متواتر علالتوں کے دَور سے گزر رہا ہوں۔ آشوب چشم۔ اس کے بعد درد گردہ۔ پھر اسہال اور ...... ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ لیکن اس سے پیشتر ایک مرتبہ علیگڑھ آکر ملاقات کرنے کی تمنا ہے۔ مقالۂ دلی کا حسن طلب بین قوسین خوب رہا۔ آدمی میں کم سے کم اتنی لطافت تو ہو۔ اظہر میاں سے کہئے کہ قفل خموشی توڑیں۔ امتحانات کی مصروفیتیں ختم ہوگئی ہوں تو کچھ قلم کے جوہر دکھائیں۔

ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر بنام قاضی صاحب موصوف

کانفرنس کے ہیڈ اسسٹنٹ سید الطاف علی صاحب کو ادبی خدمات لینے میں کمال حاصل ہے۔ مجھ سے ایک خط آپ کے نام لکھوانا چاہتے تھے۔ قلب اور قلم دونوں کو گرم کرنے کے لئے آپ کا کارڈ مجھ کو دکھلایا جو آپ نے اُن کو لکھا تھا۔ یقین فرمائیے کہ نقوش تحریر نے پرانے نقوش نیازمندی کو اُبھار دیا۔ کیا کیا یاد آگیا۔ کیا کیا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اسی ہیجانِ شوق میں مومن کا شعر پڑھا۔

بے چارے مومن کی بے کسی پر رحم آیا۔
معاً دل نے کہا:۔
"کیا نصیبا ہے"!!

اے خوشا طالع کہ ہوں اختر شناس
آسماں بھی ہے 'کرم ایجاد' کیا؟

مومن اپنا شعر کہہ کر محو تاسف رہے ہوں گے۔ میں پیام دل سنکر محو فخر و مسرت ہو گیا۔ ایک ادیب ادیب سے ربط قدیم و شناسائی دلنواز بلکہ دل افروز نہیں نور بخش ہے۔ پھر کیونکر فخر و مسرت اُس کی تجدید سے حاصل نہ ہوتی۔ یہی معراج 'اختر شناسی' ہے۔

آپ علیگڑھ آنے کی تمنا میں ہیں۔ علیگڑھ خود حاضر ہوکر جوناگڑھ میں سلام کا مشتاق ہے۔ ملفوف خط سے مدعا ظاہر ہوگا۔

قاضی اختر صاحب کا جواب الجواب

عطوفت نامہ نے سرفراز فرمایا یعنی :- ع

کلاہ گوشۂ اختر بآفتاب رسید

جس طرح اور جن محبت بھرے الفاظ میں آنمحترم نے یاد فرمایا ہے وہ میرے لئے باعثِ صد فخر و مسرت ہے اس خوش بختی پر جس قدر بھی نازاں ہوں کم ہے! ؎

یوں تو میرا انجم بخت اوج پہ مدّت سے تھا
آج ہوا ہے مگر نقطۂ وسط السما

شکریہ آنمحترم کی اختر شناسی اور دلنوازی کا، نہیں اس ذرہ نوازی، بندہ پروری کا۔

خوشا طالع! مومن کے شعر کے تصرف پر خود مومن کو حسرت ہوتی۔ مرد مومن کی یہی معراج ہے! آرزوئے لقا تو نیاز آگیں دل میں مدتوں سے جاگزیں ہے، کہیں سے یہ 'حسرت' نکلے! کاش علی گڑھ اور جوناگڑھ کی یکجائی شوق دیدار کو پورا کر سکے۔ اور دیدارِ 'حبیب' سے آنکھیں روشن ہوں۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

معلوم ہوا ہے کہ کتب خانۂ حبیب گنج میں سلوترنائی سنسکرت کتاب کا ترجمہ از عبد اللہ بن صفی بعہد احمد شاہ بہمنی موجود ہے۔ اس ترجمہ کا تھوڑا سا حال ضروری اپنے ایک مقالہ 'سنسکرت اور مسلمان' کے لئے درکار ہے۔ اگر خازنِ کتب کو حکم فرمایئے تو عین نوازش اور معارف پروری ہوگی۔

سلام علی نجد و من حلّ فی النجد !!!

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

آپ کی یاد دل میں کبھی کبھی آمد و رفت باقی رکھے ہوئے ہے لیکن اسوقت آپ کو اخبار 'منشور' کی ایک مطبوعہ رپورٹ پڑھ کر لکھ رہا ہوں۔

میرا اشارہ اسلامک ریسرچ اور اُس کی اکاڈمی کی طرف ہے جو علیگڑھ میں قائم ہونے والی ہے۔ صرف ہنگامہ ہے یا واقعی کچھ کام کرنے کا ارادہ ہے۔ فرصت ملے تو اس سے مجھے مطلع فرمائیے۔

گزشتہ سال میری ایک کتاب "نظام تعلیم و تربیت" کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ خیال یہ تھا کہ آپ کی نظر سے گزرے گی اور مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تک یہ کتاب نہیں پہنچی اس کا افسوس ہے کہ ناشر نے کتاب کو ۲ حصوں میں تقسیم کر کے نتائج کو ضعیف کر دیا۔ تعطیل موسم گرما میں آجکل میں اپنے دیہاتی مستقر بہار میں ہوں۔

خان بہادر ابو عبداللہ محمد ذکاء اللہ صاحب ایم، اے
ریٹائرڈ کلکٹر و سابق نائب دیوان (دتیا)

نواب غلام قادر خاں صاحب کے متعلق جو مقالہ آپ نے لکھا تھا اُس کو میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ مقالہ بہت اچھا اور مفید ہے۔ اگر کچھ ضرورت ہے تو صرف اس قدر کہ ان ماخذوں کا حوالہ بھی آجاتا، جہاں سے آپ نے سب مضامین لئے ہیں۔ تاکہ نواب غلام قادر خاں کے متعلق جو غلط بیانیاں ابتک ہوتی رہی ہیں اُن کی تردید محض آپ کے بیان پر منحصر نہ رہے۔ (مصنف کے اگلے شمارہ میں مقالہ مذکور کا اردو ترجمہ شائع ہوگا اور اُس میں ماخذوں کی پوری بحث تمہید میں درج کر دی جائے گی۔ مُدیر)

مجلس کے جلسے

اِس سہ ماہی میں

۵۵ پچپنویں مجلس

زیر صدارت عالی جناب ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہٗ:۔

۹ راپریل ۴۵ء کو ساڑھے پانچ بجے شام کانفرنس لائبریری سلطان جہاں منزل علیگڑھ میں مولوی محمد مقتدی خانصاحب شروانی کی دعوتِ عصرانہ پر منعقد ہوئی اور اُس میں پروفیسر محمد عزیر صاحب ایم۔اے نے اپنا مقالہ "دار المصنفین اعظم گڑھ" پڑھا۔ اس جلسہ میں تقریر صدارت بھی اپنی افادیت اور تاثیر کے اعتبار سے لاجواب ہوئی۔

۵۶ چھپنویں مجلس

جناب حکیم مولوی عبداللہ خاں نصر صاحب لکچرر طبیہ کالج کی دعوتِ عصرانہ پر ۲۲ راپریل ۴۵ء کو ۶ بجے شام زیر صدارت پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب ایم۔ اے۔ چیرمین شعبۂ اردو و فارسی آگرہ کالج، منعقد ہوئی۔ اور اُس میں مولوی سراج الحق قریشی صاحب بی۔اے۔ نے راقم السطور کے انگریزی مقالہ "غلام قادر روہیلہ" کا اپنا اُردو ترجمہ مع ایک فاضلانہ تمہید اور سید شوکت علی سبزواری صاحب ایم۔ اے۔ نے اپنا مقالہ "غالب کا نظریۂ اخلاق" پڑھا۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بیرونی مہمانوں میں سید مسعود الحسن نقوی صاحب ایم۔ اے پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی۔ اور مرزا امیر الدین برلاس صاحب ڈپٹی کلکٹر خلفِ صاحب "عجیب التواریخ" نے بھی شرکت کی۔

۵۷ ستاونویں مجلس

۱۲ رمئی ۴۵ء کو چھ بجے شام ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب چیرمین شعبۂ نباتات مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر موصوف کے اپنے دولت خانہ میں منعقد ہوئی۔

جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب بی۔اے (آکسن) بار ایٹ لا چیرمین ہسٹری ڈپارٹمنٹ اور حکیم عبداللہ خاں نصر صاحب نے علی الترتیب فرائض صدارت انجام دئے۔

اس مجلس میں مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب نے اپنا پرکیف اور فلسفیانہ مقالہ "پریم رس" پڑھا۔

"مجلسیں پیہم" کبرے ہے کیجہ باز خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگ یک بتخانہ ہم

سید الطاف علی بریلوی

(مُدیر)

تسخیرِ امراض

یا

فنِ طِب کی تاریخ

اور

اُس کا تدریجی اِرتقاء

(از جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب)

طبیب یا ڈاکٹر نہ ہونے پر میرے لئے موزوں نہ تھا کہ میں اس شریف اعلیٰ اور عالمانہ فن کے متعلق کچھ لکھنے کی جرأت کرتا، بالخصوص جبکہ علی گڑھ میں قابل ترین اطباء اور ڈاکٹروں کا اجتماع ہے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ مجلس مصنّفین کے قیام کے تین ۳ سال کے زمانہ میں برخلاف یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جات کے طبّیہ کالج کے علماء نے اب تک اپنے کسی مقالہ سے اس مجلس کو عزّت نہیں بخشی، میں نے اُن سے استفادہ کی یہ صورت نکالی ہے کہ اپنے ناقص خیالات اُن کی موجودگی میں پیش کردوں تاکہ اُن کی تردید اور تصحیح پر وہ مجبور ہو کر اِس سلسلہ میں اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں۔ بہرحال میری یہ جرأت چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اس لئے قابل معافی ہے۔

میں نے اس مقالہ میں طبّی ترقی کے اعتبار سے پانچ عہد قایم کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) عہدِ قدیم (۲) عہدِ فلسفۂ یونان (۳) عہدِ وسطیٰ

(۴) عہدِ جدید (۵) عہدِ حاضرہ

اب میں اِن میں سے ہر ایک کے متعلق اپنے خیالات پیش کرتا ہوں:۔

---

(۱) عہدِ قدیم

علاج کے ابتدائی طریقے

عہدِ قدیم سے میری مُراد ابتدائی زمانہ سے لے کر گذشتہ قبل مسیح تک ہے وہ زمانہ انسان کے بچپن کا تھا۔ جب بچہ گر کر چوٹ لگ جانے سے روتا ہے تو اس کے سامنے جھنجھنا بجانے، زنجیر کھٹ کھٹانے اور اُچھلنے، کودنے سے اُس کا خیال تکلیف کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ابتدائی زمانہ کا انسان جب کسی معمولی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اسی قسم کے طریقوں سے اُس کا خیال تکلیف کی طرف سے ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ البتہ جب اندرونی اعضاء کے ماؤف ہونے سے وہ درد یا بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ اُس کے کسی فعل سے کوئی دیبی اُس سے ناراض ہو گئی ہے۔ یا کوئی بھوت اُس کے جسم میں داخل ہو گیا ہے۔ یا کسی دشمن نے اُس پر سحر کیا ہے۔ اس قسم کی شکایتوں کا علاج اُس کے سامنے ڈھول اور جھانجھ بجانے اور مختلف قسم کی حرکتیں کرنے سے کیا جاتا ہے۔ علاج کے پُرانے طریقوں اور قدیم مراسم کی تلاش کے لئے بالعموم دُنیا کی ابتدائی قوموں کے حالات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو بعض دُور افتادہ مقامات میں مہذب دُنیا سے دُور پڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کے حبشی، سیلون کے ویدھ، ہندوستان کے منڈنے، گونڈ و بھیل، سماترا کے بٹک، افریقہ کے کافر، ملایا کے سانگ وغیرہ لیکن یہ سب قومیں ہومیوسیپنس (Homeo Sapeans) کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس کو روئے زمین پر پھیلے ہوئے دس پندرہ ہزار سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کرومیگنن نسل (Cromagnon) کا دَور دورہ تھا جو عرصہ ہوا فنا ہو چکی۔ اُن لوگوں کی ہڈیوں کے ڈھانچوں سے جو غاروں میں سے ملے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا قد چھ فیٹ کے قریب تھا۔ چہرہ زیادہ چوڑا تھا۔ اُن کی عورت کا بھیجہ دان موجودہ نسل کے مَردوں کے بھیجہ دان سے بڑا تھا۔ وہ لوگ اعلیٰ درجہ کے نقاش اور مصور تھے اُن کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر آج کل کے لوگ حیرت کرتے ہیں۔ اُنھیں کی بنائی ہوئی ایک ڈاکٹر کی تصویر بنسٹھ ہزار رقم کی ہے جس کو اب ۲۲ ہزار سال ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ریچھ کی کھال اوڑھے اور سر پر بارہ سنگھے کے سینگ لگائے ہوئے ہیں اور چہرہ پر لمبی ڈاڑھی ہے۔

ایسی عجیب و غریب شکل دیکھ کر اُس زمانہ کے مریضوں کا بھوت یا مرض ضرور بھاگ جاتا ہوگا اور اُس زمانہ میں کیا موجودہ زمانہ میں بھی اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جو ایسی چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ درحقیقت انسان کے امراض میں سے اسّی فی صدی ایسے ہیں جو جسم میں فضلہ جمع ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں جس کو انسان کی طبیعت از خود بذریعہ بخار اور پسینہ اور قے اور دست کے خارج کر دیتی ہے اور مریض بغیر کسی علاج کے اچھا ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے امراض پر ابتدائی زمانہ کا انسان سحر یا عمل کے ذریعہ سے غالب آجاتا تھا۔ اور اپنے زعم میں انھیں مسخر کر لیتا تھا۔ اسی نظریہ کے پیشِ نظر اس مقالہ کا عنوان "تسخیر امراض" تجویز کیا گیا ہے۔

تبرکات بطور دوا کے

مندرجہ بالا طرقِ علاج کی ایک شکل یہ تھی کہ بزرگوں کے بدن کی ہڈیاں اور دوسرے تبرکات بیماری کے وقت جسم پر پھیرے جاتے تھے۔ بعض جانوروں کی ہڈیاں گلے میں ڈالی جاتی تھیں۔ سونا اور قیمتی جواہرات کا جسم سے متصل رہنا دفعِ امراض کے لئے نفع بخش سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دور آیا کہ اِن چیزوں کو پانی میں گھس کر مریض کو پلایا جاتا تھا۔ تاکہ جسم کے اندر پہونچ کر زیادہ مؤثر ہو۔ تب اُن چیزوں کے اثرات بجائے ایک کے دو طرح کے ہو گئے۔ ایک بہ اعتبار سحر کے جس کا اثر مریض کے خیال پر پڑتا ہے۔ دوسرے معدہ میں پہونچ کر خون میں شامل ہونے سے اُن کی حیثیت دوا کی سی ہو گئی جو بعض صورتوں میں مفید اور بعض میں مضر ثابت ہوتی تھیں۔ درحقیقت اِنھیں اثرات کے مطالعہ سے علم طب کی ابتدا ہوئی۔ اور سحر و عمل کا حصہ زیادہ تر شعبۂ روحانیات کی طرف منتقل ہونے لگا۔

بزرگوں کے رکھے ہوئے تبرکات کے استعمال کے سلسلہ ہی میں زندہ بزرگوں اور اعزہ کے جسم سے نکلے ہوئے فضلات کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ زمانہ قدیم میں دُکھتی آنکھ میں فوراً بیوی کا پیشاب ٹپکانا مفید سمجھا جاتا تھا۔ اور اب بھی بعض بزرگ اپنے لب سے مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور بعض مُرید شدّتِ عقیدت میں اپنے مرشدوں کا لعابِ دہن نگل جاتے ہیں۔

سمّیات کا استعمال

تبرکات کے بعد انسان نے عرصہ دراز تک سمّیات کا تجربہ کیا ہے۔ کیونکہ اُن کا اثر فوراً محسوس ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ سانپ کے کاٹنے سے انسان فوراً مر جاتا ہے۔ ابتدائی زمانہ کے لوگ اپنے تیروں پر سانپ، بچھو اور بردی کے

زہر لگا کر اُنھیں دشمنوں پر پھینکتے تھے تاکہ دشمن ان کے زخم سے مر جائے۔ سانپ کا زہر لڑائی میں پکڑے ہوئے قیدیوں اور غلاموں کو کھلا کر اُس کا تجربہ کیا جاتا تھا۔ (Cleopatra) کلیوپیٹرا جو پہلی صدی قبل مسیح میں مصر کی مشہور ملکہ تھی اور متعدد طبی کتابوں کی مصنفہ تھی اُس نے ہر کے زہر کے تجربے کئے تھے۔ سمیات پر تجربے اس لئے کئے جاتے تھے کہ اُن کا تریاق معلوم کیا جائے۔ چنانچہ قدیم یونانی طبیب مسمّیٰ متھریاٹیس (Mithriates) نے جملہ اقسام کے زہر جمع کر کے ہر ایک تریاق کا نسخہ تیار کیا جو اُس حکیم کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس میں ۳۷ سے لے کر ۶۳ تک دوائیں ہوتی تھیں جن میں سے کالے سانپ کا گوشت بھی تھا۔ وہ نہ صرف تریاق بلکہ اکسیر سمجھ کر ہر مرض میں دیا جاتا تھا۔ مگر صدیوں کے تجربہ کے بعد ثابت ہوا کہ وہ بالکل بیکار تھا اس لئے ترک کر دیا گیا۔

سمیات کے سلسلہ ہی میں تمام دیگر اشیاء پر تجربے کئے جاتے تھے۔ چنانچہ کسی زمانہ میں مخنث آدمی کی چربی بہت سے امراض میں مفید سمجھی جاتی تھی۔ زیادہ چلنے والے شخص کے پرانے جوتے کا تلہ گھس کر پیچش کے مریض کو پلایا جاتا تھا۔ دانت کے درد کے مریض کو خود اُس کا پیشاب پلایا جاتا تھا۔ اِنھیں تجربوں سے انسان رفتہ رفتہ صحیح دوائیں معلوم کرتا چلا گیا۔ چنانچہ مصر قدیم میں آنکھ کے روہوں کے لئے توتیا کا استعمال ہوتا تھا اور وہ اب تک اس مرض کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے۔ اُس زمانہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر دوا میں طلسمی اثر سمجھ کر اُسے ہر مرض میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہ خیال کم و بیش اب تک چلا آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ صدی کے انگریز فلسفی مسٹر کارلائیل کی نسبت تحریر ہے کہ اُس کا دوست مسٹر ٹیلر (Henry Taylor) بیمار ہوا تو وہ اپنے ساتھ ایک دوا لے گیا جو اُس کی بیوی کی بیماری میں مفید ثابت ہوئی تھی اور بچی ہوئی رکھی تھی اور بلا لحاظ اس کے کہ اُس کے دوست کا مرض کیا تھا کارلائیل Carlyle نے وہ دوا اُسے کھلا دی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلسمی اثرات کے متعلق جو عقیدہ ہزاروں سال قبل تھا وہ کس قدر تسلسل اور یکسانیت کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ اسی عقیدہ کی بنا پر ہزاروں سال تک انسان اکسیر کی تلاش میں رہا جو ہر مرض میں یکساں مفید ثابت ہو سکے۔ غالباً اکسیر کی جگہ زمانہ حال میں پیٹنٹ (Patent) ادویہ نے لیلی ہے جو بے شمار امراض میں مفید سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ اصولاً ہر مرض کے خاص حالات کے مطابق نسخہ کا تجویز ہونا ضروری ہے۔

قدیم عمل جراحی

زمانہ قدیم میں عمل ادر دوا کے علاوہ زخموں کے علاج اور بعض صورتوں میں عمل جراحی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مصر کے شہر منفس (Memphis) میں پتھروں پر جو تصاویر ۲۵۰۰ قبل مسیح کی ہیں اُن میں جراح کسی کی ختنہ اور کسی کو خصی کر رہا ہے۔ کسی کے پھوڑے کو چیر رہا ہے۔ مگر اُس وقت کے عمل جراحی صرف جلد تک محدود تھی۔ زمانہ قدیم میں ایک علاج بہت دلچسپ تھا۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص چھرے سے زخمی ہو جاتا تو وہ چھرا بڑے اہتمام سے فراہم کیا جاتا اور اُس پر مرہم لگا کر اُسے علیحدہ رکھدیا جاتا اور زخم کو صاف کر کے صرف اُس پر کپڑے کی پٹی باندھ دی جاتی اور سمجھا جاتا کہ اس طریقہ سے زخم اچھا ہو جائیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی صحتوں کے اعتبار سے زخم صاف کر کے اُس پر پٹی باندھ دینا بالعموم کافی ثابت ہوتا ہوگا۔ دراصل زخموں کا علاج ہی اُن لوگوں سے شروع ہوا ہے جو لڑائی میں زخمی ہوتے تھے۔ ابتدا میں زخموں کے معالج صرف وہی ہو سکتے تھے جو پہلے زخمی ہو چکے ہوں اور اس کام کا تجربہ رکھتے ہوں۔

قدیم دایہ گری

اِسی سلسلہ میں دایہ گری کی خدمات کی نسبت بھی کچھ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اُس زمانہ میں بیابانی زندگی اور سادہ غذا ہونے کی وجہ سے نظام عصبی اس قدر عمدہ حالت میں رہتا تھا کہ عورت کو اس بارہ میں زیادہ امداد کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بالخصوص چونکہ اپنے جرگوں سے باہر شادی نہ ہوتی تھی اور سب کے قد تقریباً یکساں ہوتے تھے اس لئے پیدائش کے وقت بچہ کے قدوں میں بھی یکسانیت ہوتی تھی۔ ضرورت کے وقت عورت تنہائی میں جا کر فارغ ہو جاتی تھی اور اپنی انا ول نال اپنے دانت سے کاٹ کر علیحدہ کر دیتی تھی۔ تاہم اُس زمانہ کی تکلیف جو کبھی کبھی پیش آ جاتی تھی یہ تھی کہ ماں کے پیٹ کے اندر بچہ پلٹ جاتا تھا۔ اس کی نسبت قدیم حالات میں تحریر ہے کہ مصر میں ۳۰۰۰ ق م میں اور ہندوستان میں ۱۵۰۰ ق م میں مندروں کا پوجاری ہاتھ کے استعمال سے بچہ کو سیدھا کر کے نکال لیتا تھا اور اگر بچہ اندر مر جاتا تو دست تے اور عمل جراحی کے ذریعہ سے اُسے نکال دیتا تھا جس سے زچہ کی جان بچ جاتی تھی۔

---

(۲) عہدِ فلاسفہ یونان

حکیم اسقولیفس

عہد قدیم کے بعد یونان کے عہد فلاسفہ کا دور آتا ہے۔ جو پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی پر ختم ہوا۔ اس دور میں حکیم اسقولیفس (ESCULAPIUS) کا نام بڑی عظمت کے ساتھ لیا جاتا تھا مگر اس کے زمانہ حیات یا وطن کا صحیح پتہ نہ تھا۔ صرف اس قدر معلوم تھا کہ وہ اپالو (APOLLO) دیوتا کا بیٹا تھا۔ جو دیوتاؤں کا طبیب سمجھا جاتا تھا۔ وہ حضرت ادریس علیہ السلام کا اُمتی اور پیرو بتایا جاتا ہے۔ اس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ اتنا بڑا طبیب تھا کہ اس نے ایک مُردہ کو زندہ کر دیا تھا اس لئے ZEUS دیوتا نے اسے بجلی گرا کر مار ڈالا تھا۔ اُس کے نام کا بہت بڑا مندر اور بہت سے چھوٹے مندر یونان میں تھے جو پوجا کے علاوہ مریضوں کے اسپتال اور صحت گاہوں کا کام دیتے تھے۔ یہ مندر پہاڑیوں اور بلند مقامات پر بنائے جاتے تھے اور مریضوں کا علاج سورج کی روشنی، تازہ ہوا، صاف پانی، ورزش اور غذا سے کیا جاتا تھا۔ ضرورت کے وقت پوجاری طبیب دواؤں اور عمل جراحی کا استعمال کرتے تھے۔ مگر اُن کے علاجات کی بنیاد مذہب اور طلسم داوہام پرستی پر قایم تھی۔

اس حکیم کے دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام HYGEIA تھا وہ صحت کی دیوی قرار دی گئی اور اُسی کے نام پر HYGINE کا لفظ ہے جو حفظانِ صحت کا مُرادف ہے۔

بقراط

حکیم اسقولیفس کے بعد یونان میں بقراط کا نام آتا ہے وہ ۴۶۰ ق م میں جزیرہ کاس میں پیدا ہوا۔ اُس کے طریق علاج کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تجربہ اور مشاہدہ میں بہت وقت صرف کرتا تھا۔ دواؤں کے زیادہ استعمال کا قائل نہ تھا اور مثل اپنے پیش رو اسقولیفس کے دھوپ، ہوا اور غذا سے علاج کرتا تھا۔ اُس نے فنِ طب کو اس قدر زیادہ ترقی دی کہ مندروں کے قدامت پرست پوجاری جو صحت کے مندروں میں کام کرتے تھے اُس کے ساتھ نہ چل سکے۔ دراصل بقراط اور پوجاریوں کا اختلاف کوئی مذہبی اختلاف نہ تھا بلکہ قدیم اور جدید طرقِ علاج کا اختلاف تھا اور اسی بنا پر دونوں طبقوں میں علیٰحدگی ہوئی۔ طبیبوں نے اپنے تجربہ میں جھاڑ پھونک، جنتر منتر کے علاجوں کو بے اثر پایا اس لئے انھیں ترک کر دیا۔ پوجاریوں نے اپنے قدیم سائنس کو عین مذہب قرار دے کر جدید تجربات کو

بے دینی سے منسوب کیا اور دونوں گروہوں میں روز بروز دُوری اور دُوری سے منافرت اور مخالفت پیدا ہوتی گئی۔

بقراط سے قبل حاملہ عورتوں کے ساتھ بڑی بے رحمی برتی جاتی تھی۔ وضع حمل کے وقت اُسے بستر سے اونچا اُٹھا کر گرا دیا جاتا تھا۔ پیٹ بُری طرح دبایا اور آٹے کی طرح گوندھا جاتا تھا۔ اُس نے اِن طریقوں کو بند کر کے دایہ گری کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا۔ بقراط کی ایک بڑی یادگار وہ قسم ہے جو وہ اپنے شاگردوں کو دیتا تھا۔ اور جو اب ڈھائی ہزار سال بعد تک مسلسل جاری ہے۔ اور اُسی کے نام سے موسوم ہے۔ سند پاتے وقت ڈاکٹر عہد کرتا ہے کہ وہ کسی شخص کو مہلک دوا نہ دے گا، کسی عورت کا پیٹ نہ گرائے گا، اُسے اغوا نہ کرے گا، ہر مریض کا علاج صداقت اور خلوص نیت سے کرے گا، اپنے پیشہ کے سلسلہ میں جو کچھ سُنے گا اُسے راز میں رکھے گا۔ بقراط کا قول تھا کہ:۔

"میری فضیلت کا ماحصل یہ ہے کہ میں اپنے جہل سے مطلع ہوا"

بقراط نے ۳۷۷ ق م میں تراسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

طب یونانی رُومہ میں

یونان کے طبی عُروج کے زمانہ میں اُن کے ہمسایہ شہر رومہ کے باشندے سراسر اوہام میں مبتلا تھے۔ اُن کے ہاں ہر مرض کا ایک دیوتا تھا حتیٰ کہ خارش اور کھجلی کا بھی دیوتا تھا، جسے رضامند کئے بغیر اُس مرض کا ازالہ نہ ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اطباء یونان کا اثر رومہ میں بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۴۶ ق م میں شہر CORINTH کا پتھر تباہ ہوا اور اس سے طب یونانی پوری طرح رومہ میں پہونچ گئی۔ اور وہاں اُس نے اِس قدر روشن خیالی پیدا کر دی کہ خود رُومہ کے طبیب نامی سورنیس (SORANUS) نے فن دایہ گری کو بہت ترقی دی۔ اور جھاڑ پھونک کی جگہ اُس نے طب کی عملی تعلیم جاری کی۔ اُس کا قول یہ تھا کہ "کسی دایہ کو ارواح پر عقیدہ نہ ہونا چاہیئے۔"

جالینوس

طبی دُنیا میں حکیم جالینوس کا نام غالباً سب سے زیادہ عظمت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ۱۳۱ء میں ایشیائے کوچک کے شہر PERGAMUS در ماس میں پیدا ہوا اور طب کی تعلیم زیادہ تر اسکندریہ میں حاصل کی جو اُس زمانہ میں بڑا علمی مرکز تھا۔ ترقی کر کے وہ مارکس آریلس (MARCUS AURELUS) شہنشاہ رومہ کا طبیب ہو گیا۔ بقراط اُس کا پیش رو بڑی تحقیقات اور تجربات کے بعد جزئیات سے کلیات تک

پہونچتا تھا اور دواؤں کا استعمال کم کرتا تھا۔ برخلاف اس کے حکیم جالینوس اول کلیات قائم کرکے پھر اُس کے جزئیات کی تفصیلات کی طرف توجہ کرتا تھا اور دواؤں کا استعمال زیادہ کرتا تھا۔ اپنے اسی اصول کے مطابق اُس نے انسان کے جسم میں چار اخلاط یا مزاج تجویز کئے یعنی صفروی، سوداوی، بلغمی اور دموی۔ انھیں چار اخلاط کے امراض کی دواؤں کو باعتبار خواص کے اُس نے گرم اور سرد، خشک اور تر میں تقسیم کیا اور طب کا ایک قانون بنادیا جس پر نہ صرف صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے عمل ہو رہا ہے۔

جالینوس نے فنِ جراحی کو بھی ترقی دی اور چونکہ مردہ انسان کے جسم کو چیرنا سخت جرم تھا اور اُس کی سزا موت تھی اس لئے اس حکیم نے بندر، کتے اور بیل وغیرہ پر تجربے کرکے علم تشریح مرتب کیا جو اگرچہ صحیح بنیاد پر قایم نہ ہو سکا تاہم نہ ہونے سے اُس کا ہونا غنیمت تھا۔ اُس کی تصانیف میں چار سو مجلدات بتائے جاتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا انتقال ۲۰۰ء میں اُنہتر ۶۹ سال کی عمر میں ہوا۔

---

(۳) عہدِ وسطیٰ

علم طب کا زوال

اب وہ وقت آیا جبکہ یورپ میں ذہنی زوال شروع ہوا اور اُس سے چونکہ علم طب بھی کسوف میں آگیا اس لئے اُس زمانہ کے انقلاب کے متعلق مختصر طور پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

عین اُس زمانہ میں جبکہ رومۃ الکبریٰ کی حکومت عروج پر تھی، خالص مذہب عیسوی کی تحریک فلسطین سے اُٹھی اور بڑھکر یورپ تک پہونچی۔ وہ غرباء کی تحریک تھی جو توحید، پاکدامنی اور نفع عامہ کی بہبودی پر مبنی تھی اس لئے اول عوام اور رفتہ رفتہ خواص کے دلوں میں جاگزیں ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اُس کی ٹکر حکومت سے ہوئی جو بُت پرستوں کی حکومت تھی۔ اس کشاکش میں شہنشاہ DIOCLETIAN کو تخت چھوڑنا پڑا اور شہنشاہ قسطنطین نے جو بظاہر عیسائیوں کا نمایندہ تھا ۳۰۶ء میں اسکی جگہ لی۔ مگر بت پرستوں کی قوت بھی کم نہ تھی، اس لئے قسطنطین نے اُن کی خوشنودی کے لئے یہ گوارا کیا کہ مذہبِ عیسوی میں مصر کے دیوتاؤں کی تثلیث اور یورپ کے

دیوتاؤں کی پوجا بھی شامل کرلی جائے۔ قیام حکومت کے لئے عقائد کی اس رواداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اوہام پرستی اور تنگ خیالی کا دَور دَورہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ ۱۴۲۹ء میں خود یونان کے دارالحکومت شہر ایتھنز (ATHENS) میں جسٹینین (JUSTINAN) نے فلسفہ کی تعلیم ممنوع کردی اور تمام مدرسے بند کردیئے۔ مصر میں علم ریاضی کی ماہرہ ہائی پیٹیا HYPATIA پر جبکہ وہ اپنی درس گاہ سے واپس آرہی تھی عیسائی راہبوں کے ایک گروہ نے حملہ کرکے اُسے مار ڈالا۔ اُس کا برہنہ جسم کھینچ کر گرجا میں لائے اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے اُسے جلا دیا۔ یہ محض اُس فاضلہ کا جسم نہ تھا جو جلایا گیا، بلکہ اُس کے ساتھ یونانیوں کا فلسفہ اور اُس کے علوم بھی جل کر خاکستر ہوگئے۔ علم طب کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اور بجائے باقاعدہ علاج کے دیوتاؤں اور دیبیوں کی پوجا اور جھاڑ پھونک کے طریقے جاری ہوگئے۔ اس سے حکماء اور اطباء معطل ہوگئے اور امراض کا علاج اُنھیں پادریوں کے ہاتھوں میں پہونچ گیا جو قدیم بت پرستی اور اوہام پرستی کی تبلیغ مذہب عیسوی کے نام سے گرجاؤں کے منبروں پر کھڑے ہوکر کرتے تھے۔

پادریوں کا زور اِن پادریوں کے علاج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مریض کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اور مختلف قسم کے عمل پڑھ کر جو علاج کرتے تھے یا خرق عادات کے ذریعہ دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہونچاتے تھے، اُنھیں تو وہ کرامات سے تعبیر کرتے تھے اور اگر کسی دُنیا دار شخص سے عوام کے نزدیک کوئی خرق عادت صادر ہوتا تو اُسے جادوگر قرار دیکر اُس پر مقدمہ چلاتے اور اُسے سزا کرادیتے تھے۔ چنانچہ اُس تاریکی کے عہد میں جادوگروں کو سزا دینے کے لئے خاص عدالتیں قایم تھیں جو مجرموں کو جرمانہ قید اور موت کی سزائیں دیتی تھیں۔ ایک پرلطف واقعہ یہ ہوا کہ کسی شخص نے اتفاق سے ایک مرغ کے پاس مرغی کا انڈا دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا اُس مرغ کی رپورٹ ہوئی۔ مقدمہ قایم ہوا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور مرغ کو سزائے موت دی گئی اور اُسے جادوگر قرار دیکر پھانسی پر چڑھایا گیا۔

اُس تاریک زمانہ میں عورتوں کی بُری گت ہوئی۔ پادریوں نے زچگی کی تکالیف کو گناہوں کا نتیجہ قرار دے کر عورت کی امداد کو غیر ضروری قرار دیا۔ البتہ بچہ کی پیدایش میں اگر دیر ہوتی تو پچکاری کے ذریعہ سے ماں کے پیٹ کے اندر بپتسمہ کا پانی پہونچایا جاتا تھا تاکہ اگر بچہ مرے تو عیسائی ہونے کی وجہ سے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے خواہ اس عمل سے بچہ اور زچہ دونوں کیوں نہ ہلاک ہوجائیں۔

عربوں کے ہاتھوں علم طب کا احیاء

جبکہ بُت پرستی نے غلبہ سے عیسوی توحید کا آفتاب مغربی ممالک میں غروب ہو چکا تھا تو وہ عرب میں آنحضرت صلعم کی پیدائش سے اسلامی توحید کی شکل میں مشرق کی جانب سے طلوع ہوا۔ اور روحانی زندگی پیدا کرنے کے ساتھ انسان کی ذہنی بیداری کا موجب ہوا۔ یونان کے علماء کا فلسفہ اور طب جو دفن ہو چکی تھی اُسے مسلمانوں نے باہر نکالا اور ان کی کتابوں کے ترجمے کر کے اُن علوم کو زندہ کیا۔ خلیفہ منصور نے آٹھویں صدی عیسوی میں ایک بڑا طبی کالج بغداد میں قایم کیا۔ عربوں نے اپنے علوم کی بنیاد بجائے قیاس کے تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی۔ گندھک کا تیزاب، شورہ کا تیزاب اور الکحال تیار کرنا خاص مسلمانوں کی ایجادیں ہیں۔ اُنھوں نے پہلی مخزن الادویہ مرتب کی۔ مسلمانوں میں بوعلی سینا اور رازی (RHAZES) بڑے پایہ کے طبیب ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے اِن علوم کو نہ صرف اپنے وطن میں ترقی دی بلکہ یورپ کو بھی اپنے فیوض سے محروم نہ رکھا۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں ملک اٹلی کے مقام سیلرنو (SALERNO) میں ایک طبی کالج قایم کیا جو یورپ بھر میں پہلا تھا۔ عیسائی ممالک میں خلل دماغ کے مریضوں کے ساتھ خراب برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اُنھیں نہ صرف زنجیروں میں باندھ کر رکھا جاتا تھا، بلکہ بعض اوقات زدوکوب کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے مسلمان ایسے مریضوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔ اُنھیں دل بہلانے کے قصے سُنائے جاتے تھے۔ اُن کے لئے پاگل خانے بنائے گئے تھے۔ اُس کے صدیوں بعد لندن میں ۱۵۴۷ء میں پہلا پاگل خانہ بنایا گیا۔

فنِ جراحی کو بھی مسلمانوں نے بہت ترقی دی۔ اس سلسلہ میں ابوالقاسم کا نام تاریخ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی تصنیف اُس کے وطن کی نسبت سے "زہراوی" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں تھا۔ حال میں مولوی ابرار حسین فاروقی صاحب نے ایک قابلانہ مضمون مسلمانوں کے طبی کارناموں کے متعلق لکھا ہے۔ یقین ہے کہ وہ یا جناب حکیم صاحبان اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان فرمائیں گے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں نے یونانی طب کو اس قدر زیادہ ترقی دی کہ وہ اصلی معنوں میں "اسلامی طب" ہو گئی۔

(۴) عہدِ جدید

مُردہ لاشوں پر عملِ جراحی

بالآخر صدیوں کی مذہبی غلامی اور ذہنی انحطاط کے بعد یورپ پادریوں کے چنگل سے نکلا اور پندرھویں صدی سے وہ دَور شروع ہوا جسے عہدِ جدید یا نشاۃِ ثانیہ کہتے ہیں۔ سب سے اوّل رُوما کے پوپ سے مارٹن لوتھر نے جو جرمنی کا ایک پادری تھا، بغاوت کی۔ اُس کی تحریک نے لوگوں کے خیالات میں ایک حرکت پیدا کر دی جس سے علم طب کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اُس وقت تک طبی ترقی اس لئے رُکی ہوئی تھی کہ مُردوں پر عمل جراحی نہ ہو سکتا تھا اور اس لئے جسم کے اندرونی اعضا اور اُن کے افعال سے محض لاعلمی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جراحی کا کام حجاموں کے ہاتھوں میں تھا جو زخموں کے علاج کے ساتھ حجامت بھی بناتے تھے اور اس لئے ذلیل تھے۔ اُن کی زندگی بھی ہر وقت خطرہ میں رہتی تھی۔ مثلاً برگنڈی کی ملکہ کو طاعون ہو گیا اور اُس کی گلٹی میں شگاف دیا گیا مگر وہ نہ بچ سکی۔ اس پر شاہ GUTRAM اُس کے شوہر نے ۵۸۰ء میں دو جراحوں کو ملکہ کی قبر پر تلوار سے قتل کرا دیا۔

۱۳۳۷ء میں بوہیمیا کا بادشاہ اندھا ہو گیا تھا۔ چونکہ جراح اُس کے علاج میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اُسے دریائے ODER میں پھینک دیا گیا۔

۱۴۶۴ء میں شاہ ہنگری نے اعلان کیا کہ جو شخص اُس کے زخم کو اچھا کر دے گا اُسے انعام ملے گا ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ علاج سے انکار کرنے پر بھی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

بالآخر فنِ جراحی کی ترقی کی بنیاد اُس وقت پڑی جبکہ مردہ جسم کو چیرنا گوارا کیا گیا۔ اُس کی ابتدا یوں ہوئی کہ نہ معلوم کس طرح پادریوں نے ایک مجرم پر جسے قتل کا حکم دیا جا چکا تھا عمل جراحی کرنے کی اجازت دے دی۔ اُس پر اوّل کچھ دُعائیں پڑھی گئیں، تب اُسے پھانسی دی گئی اور اُس کی لاش یونیورسٹی والوں کو سپرد کی گئی۔ عمل جراحی کے وقت عمائدین شہر جمع تھے جن کے سامنے پادری صاحب کا اجازت نامہ پڑھا گیا اور اس پر یونیورسٹی کی مُہر لگا دی گئی۔ سر کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ اُس کے اندر رُوح رہتی ہے اس لئے اوّل اُسے کاٹ کر علحدہ رکھ دیا گیا، تب خطبہ پڑھا گیا اور سب نے مل کر گایا۔ ڈاکٹر نے خود مُردہ کے

جسم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ نوکر کو ہدایت کی کہ وہ جسم کو کاٹتا جائے۔ ڈاکٹر کے ایک ہاتھ میں جالینوس کی کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ جس سے وہ کتاب میں دیکھ کر اعضاء کے نام بتاتا جاتا تھا۔ اُس کے بعد بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ محفلِ رقص و سرود منعقد ہوئی اور تھیٹر کا تماشا ہوا۔

مگر پادری صاحبان کے اِن فتووں اور اُن پر باضابطہ عملدرآمد ہو جانے پر بھی عوام کے دلوں سے مُردہ لاش کی عظمت نہیں گئی اور کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ وہ مردہ لاشوں پر عمل جراحی کر سکتا۔ البتہ بلجیم کے رہنے والے ویسے لیس ANDRENS-VESALEUS نامی نے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر ایک پھانسی پر لٹکی ہوئی لاش کو رات کے وقت چرا لیا اور اسی طرح اور لاشیں حاصل کر کے ۱۵۴۳ء میں علم تشریح پر ایک کتاب شایع کی۔ اُس کتاب میں اُس نے اُس پُرانے خیال کو غلط ثابت کیا تھا کہ عورت کے مقابلہ میں مرد میں ایک پسلی کم ہوتی ہے۔ اُس نے جالینوس کی غلطیاں دکھائیں جو جانوروں کی تشریح پر مبنی تھیں جس کی وجہ سے اُس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اور اُس کی کتابیں ضبط کر کے جلا دی گئیں۔ وہ خود بھی کتابوں کے ڈھیر کے ساتھ کچھ جل کر بھاگا' اور غصّہ میں آکر اُس نے خود اپنے قلمی نسخوں کو آگ لگا دی۔ فنِ جراحی کو چھوڑ کر شہنشاہ چارلس پنجم کا درباری بنا اور پھر شاہی طبیب ہو گیا۔ مگر اب اسپتال والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ لاشوں کی قیمت ادا کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے مُردہ چور پیدا ہو گئے اور روپیہ کے لالچ میں اِن چوروں نے اکیلا پا کر زندہ لوگوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس پر حکومت نے مجبور ہو کر لاوارث مُردوں کی لاشوں کو اسپتالوں میں دیا جانا جائز قرار دیا۔

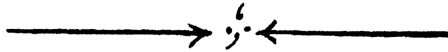
زخموں کے علاج میں اصلاح

ویسے لیس مذکور کا ایک ہمعصر AMBROISE PARE پارے فرانس کا باشندہ تھا۔ وہ ۱۵۲۹ء میں پیرس میں ایک دیہاتی حجام کا اپرنٹس ہوا۔ اور ترقی کر کے بڑا سرجن ہو گیا۔ اُس کے زمانہ تک گولی کے زخم کا علاج زخم پر کھولتا ہوا تیل ڈال کر کیا جاتا تھا۔ جس سے مریض کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اتفاق سے ایک روز اُس ڈاکٹر کا تیل ختم ہو گیا تو اُس نے انڈے کی زردی، روغن گلاب اور تارپین کا تیل ملا کر ایک مرہم بنایا اور اُسے زخم پر لگا دیا۔ مگر رات بھر ڈرتا رہا کہ نہ معلوم کیا نتیجہ ہوگا۔ صبح معلوم ہوا کہ مرہم والے مریض خوب آرام سے سوئے اور اچھے رہے۔

تب سے اُس نے گرم تیل کا استعمال بند کر دیا۔

ڈاکٹر پارنے نے دایہ گری کے فن کو اس طرح ترقی دی کہ رحم میں بچہ پلٹ جانے کی صورت میں اُس نے ہمت کر کے ڈھائی ہزار سال قبل کا طریقہ اختیار کیا، یعنی یہ کہ ہاتھ سے بچہ کو سیدھا کر کے اُسے زندہ نکال لیتا۔ اِس سے قبل بچہ کو کاٹ کر نکالا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ایسے عمدہ عمدہ طریقے جاری تھے جو ہزار دں سال بعد مفید سمجھ کر پھر اختیار کئے جاتے ہیں۔

تحقیق ادویہ اِس عہد میں دواؤں کی بہت تحقیق کی گئی۔ ہر نئی چیز جو مشکل سے ملتی یا دوسرے ملکوں سے اپنے ملک میں اوّل آتی اُسے بیماری میں کھلا کر اسکا تجربہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں سر والٹر ریلے انگلستان میں آلو لائے تو وہ نامردی دُور کرنے کے لئے کھایا جاتا تھا۔ نیز اُس سے حبّ کا عمل بھی کیا جاتا تھا۔ اُسی عہد میں ہندوستان کے تمام مسالے یعنی ایلوا، افیون، سیاہ مرچ وغیرہ بڑی بڑی قیمتوں میں یورپ جا کر بکتے تھے۔



(۵) عہدِ حاضرہ

کثرتِ ادویہ کا استعمال چارلس دوم پر سولھویں صدی عیسوی میں عہدِ جدید یا نشاۃِ ثانیہ ختم ہوا۔ اور سترھویں صدی سے وہ دَور شروع ہوا جسے عہدِ حاضرہ کہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ حاضرہ کے شروع میں فنِ طب کی حالت کیا تھی۔ اُس وقت تک جالینوس کا طریقِ علاج جاری تھا جس میں دواؤں کا استعمال بہت کثرت سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کا علاج جس طریقہ پر کیا گیا وہ سُننے کے قابل ہے۔

پچپیس سال کی عمر میں چارلس حجامت بنواتے وقت بیہوش ہوگیا تو اوّل اُس کے داہنے ہاتھ سے آدھ سیر خون نکالا گیا۔ اس کے بعد گلاسوں کے ذریعہ سے کندھے پر سے پاؤ بھر خون اور نکالا گیا۔ اِس قدر عمل جراحی کے بعد دواؤں کی بھرمار شروع ہوئی۔ قے اور دست

دوائیں مسلسل دی گئیں اور پھر جلاب دیا گیا۔ اِس کے بعد اُسے حسب ذیل ادویہ کا انیما دیا گیا۔ سرمہ، مقدس کڑوی دوائیں، نمک، میلو کے پتے، بنفشہ، چقندر، گل بابونہ، سوئے کے بیج، السی، دارچینی، الائچی، زعفران، قرمز اور ایلوا۔ دو گھنٹہ بعد ان دواؤں کا دوبارہ انیما اور ایک جلاب دیا گیا۔ پھر بادشاہ کا سر مونڈھ کر اُس پر پلاسٹر لگایا گیا۔ ایک صفوف سے چھینکیں دی گئیں۔ اور تقویت دماغ کے لئے گل گاؤ زباں کا صفوف دیا گیا۔ پھر مسہل ادویہ کا تھوڑی تھوڑی دیر بعد اعادہ کیا گیا اور درمیان میں آش جو، ملٹھی اور بادام کا شیرہ پلایا گیا۔ اسی طرح سفید شراب، افسنتین اور سونف، گوکھرو کے پتے اور پودینہ، کالا دانے اور انجلیکا کے ساتھ دئے گئے۔ بیرونی علاج کے لئے برگنڈی پچ اور کبوتر کی بیٹ تلووں پر لگائی گئی۔ اِن سب علاجوں کے ساتھ خون نکالنے اور دست آور دوائیں دینے کا سلسلہ جاری رہا اور کھانے کی دواؤں میں تخم خربزہ، منّا، لیموں کے پھولوں کا عرق، سوسن، شقائق نعماں، لیونڈر اور حل شدہ موتی دئے جاتے تھے۔ پھر جنتایانا کی جڑ، جائفل، کونین اور لونگ دئے گئے۔ جب بادشاہ کی حالت خراب ہوتی گئی تو تشنج کے لئے انسانی کھوپڑی کے جوہر کے ۴۰ قطرے پلائے گئے۔ مگر افسوس کہ کسی دوا نے کوئی فائدہ نہ کیا بلکہ حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بالآخر اطباء نے مایوس ہو کر ریلے (RALEIGH) کا مشہور تریاق جانکنی کی حالت میں زبردستی بادشاہ کے گلے میں اُتارا۔ جو موتی، ایک مفرح شربت اور رائمونیا سے مرکب تھا۔

اسپتالوں میں غرباء کی حالت

یہ تو بادشاہ کے علاج کی کیفیت تھی جو اطباء کی کثرت توجہ اور کثرت ادویہ اور اخراج خون سے کمزور ہو کر جلد مر گیا۔ اب اُس زمانہ کے غرباء کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے جو پیرس کے بڑے اسپتال میں ہوتی تھی۔ سولھویں صدی میں اِس کے قیام کو ایک ہزار سال ہو چکے تھے۔ اس وقت اُس میں ۱۲۰۰ مریضوں کے بستر تھے جن میں سے ایک ثلث تو بیشک ایک ایک مریض کے لئے تھے۔ باقیماندہ کی یہ گت ہوتی تھی کہ پانچ فیٹ کی چوڑائی میں چھ مریض تک لٹائے جاتے تھے۔ اس حساب سے فی مریض صرف دس انچ چوڑی جگہ دیجاتی تھی۔ ایک بڑے کمرہ میں جس میں نہ روشنی تھی اور نہ روشندان، ... مریض پھونس کے ڈھیروں پر سامان کی طرح ایک دوسرے پر پڑے رہتے تھے جس میں مریضوں کے سروں پر دوسرے مریضوں کے پاؤں لگتے تھے۔

مریضوں میں بچے، اور بوڑھے، مرد و عورت، متعدی امراض اور بیت محرقہ کے مریض، زچہ اور حاملہ عورتیں، سل اور دق کے مریض بلا امتیاز یکجا پڑے رہتے تھے یہاں تک کہ مردہ لاشیں بھی ۲۴ گھنٹہ تک انھیں میں پڑی رہتی تھیں۔ اور کوئی اٹھانے والا نہ ہوتا تھا اور ہوتا کہاں جبکہ ۴۹۵ مریضوں پر صرف ایک جراح تھا اور وہ بھی رات کو اپنے گھر رہتا تھا۔ اسی سے مریضوں کی دوا اور علاج کا قیاس کر لیا جائے۔ البتہ وارڈوں کے دروازے چوبیس ۲۴ گھنٹہ کھلے رہتے تھے تاکہ شہر سے خیراتی کھانا آجائے تو فاقہ کشی کی کچھ تو تلافی ہو سکے۔ در اصل اُس دور میں اسپتال قبرستان کے پیش خیمہ تھے یہاں سے کوئی سخت جان مریض ہی زندہ بچ کر نکل سکتا تھا۔ یہ حالات یورپ میں سترھویں صدی تک جاری رہے۔

جدید علم تشریح کے فوائد

ان حالات میں اور نیز طبی معلومات میں غیر معمولی اضافہ اُس وقت ہوا جبکہ جدید علم تشریح نے طبی ترقی کا نہ صرف دروازہ بلکہ پھاٹک کھول دیا۔ اُسوقت انسانی جسم کو چیرنے سے بہت سی بلکہ بیشمار نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ

۱۔ جالینوس کا نظریہ یہ تھا کہ خون قلب کی داہنی جانب سے درمیانی پردہ کے مسامات میں سے گزر کر قلب کی بائیں جانب براہ راست چلا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر ہاروے (HARVEY) نے ۱۶۲۴ء میں بذریعہ مشاہدہ کے معلوم کیا کہ خون پھیپڑوں میں سے ہو کر قلب کو جاتا ہے۔ اور وہاں سے جسم کے کونے کونے میں پہونچ کر انسانی زندگی قائم رکھتا ہے۔ تب سے ڈاکٹر اس کوشش میں رہے کہ مختلف طریقوں سے مریضوں اور کمزوروں کے جسم میں تندرست آدمی کا خون پہونچائیں۔ مگر چونکہ خون جسم سے باہر نکل کر چند منٹ میں جم جاتا ہے اس لئے اس تجربہ میں بہت سی جانیں ضائع ہوگئیں۔ بالآخر ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر آگوٹے Dr. Luis Agote of Agentina نے یہ دیکھ کر کہ Sodium citrate انڈے کی سفیدی کو جم جانے سے روکتا ہے اُس کا تجربہ انسان کے تازہ خون پر کیا۔ اور اس ایجاد میں رفتہ رفتہ اس قدر ترقی ہوئی کہ ۱۹۳۰ء سے خون کا ذخیرہ ۳۵ دن تک اس حالت میں رکھا جا سکتا ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ کسی شخص کے جسم میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ جنگ کے زمانہ میں تازہ خون کے ذخیرے ہر وقت تیار رہتے ہیں جو Blood - Banks سے موسوم ہیں اور مرتے ہوئے انسانوں میں پہونچ کر انھیں جدید زندگی بخشتے ہیں۔

اسی جنگ میں حادثات سے تازہ مرے ہوئے سپاہیوں کو زندہ کرنے کی کوششیں

کی گئیں اور اس تجربہ میں مسلسل کامیابی ہو رہی ہے۔ یہ ابتدائی انسان کے اس خواب کی صحیح تعبیر معلوم ہوتی ہے جس میں کہ وہ مردوں کو زندہ کیا کرتا تھا۔

۲۔ خون بند کرنے کی کوشش زمانہ قدیم میں اس طرح کی جاتی تھی کہ رگوں کو باندھ دیا جاتا تھا مگر اس سے زخم سڑ جاتا تھا۔ اس لئے زخم کو لوہے سے داغ دینے یا گرم تیل ڈالنے سے خون بند کیا جاتا تھا۔ عرب طبیبوں نے بھی اس کو جاری رکھا۔ مگر اب جبکہ زخم کی سڑن یعنی Infection روکنے کے طریقے معلوم ہو گئے ہیں۔ کٹی ہوئی رگوں کو باندھ کر خون بند کرنے کا طریقہ کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

۳۔ عمل جراحی کرنے کے لئے پہلے زمانہ میں شراب پلائی جاتی تھی۔ مگر وہ کم موثر تھی۔ اور عمل دیر تک جاری نہ رکھا جاسکتا تھا، اس لئے مریض کو رسّوں سے باندھ دیتے تھے تاکہ وہ جنبش نہ کر سکے۔ اس بارہ میں سب سے پہلا تجربہ (MORTON) مارٹن دنداں ساز ساکن باسٹن نے ستمبر ۱۸۴۶ء میں بذریعہ (ETHER) ایتھر کے کیا۔ اس سے اگلے سال ڈاکٹر سیمسن (SIMSON) نے کلوروفارم کا استعمال کیا جو نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اب صرف ماؤف مقام کو دواؤں کے انجکشن دیکر سُن کر دیا جاتا ہے، جس کا اثر دماغ پر بھی نہیں پڑتا۔ اور بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ گھنٹوں تک آپریشن جاری رہ سکتا ہے۔

۴۔ زخم کی سڑن روکنے کے لئے ڈاکٹر لسٹر (JOSEPSH LISTER) نے سب سے پہلا تجربہ مارچ ۱۸۶۵ء میں کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ زخم کو صرف بیرونی ہوا سے بچا کر صاف پٹی باندھ دی جائے تو وہ از خود اچھا ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانہ میں شروع ہی میں زخم کے سڑ جانے کا اندیشہ رہتا تھا اور پیپ پڑ جانے کو صحت کی علامت سمجھ کر اس کا علاج کیا جاتا تھا۔ مگر لسٹر نے پیپ پڑنے کا قصہ بھی ختم کر دیا۔ اور ادویہ کے ذریعہ سے جراثیم کو روک کر جلد سے جلد زخم کے صحت یاب ہونے کی صورت نکال لی۔ اس نے عمل جراحی کے خطرہ کو نہایت کم کر دیا۔ جوزف لسٹر کی اس قدر عزت ہوئی کہ وہ ۱۸۹۶ء میں PEER یعنی لارڈ بنا دیا گیا۔

مختصر یہ کہ عمل جراحی اور اُسی کے ساتھ اسپتالوں کی حالت مسلسل بہتر ہوتی گئی چنانچہ زمانۂ حال کے اسپتالوں کا مقابلہ اگر عہدِ جدید کے اسپتالوں سے کیا جائے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے تو بلا تشبیہ جنّت اور دوزخ کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ زمانہ کی

تدریجی ترقی دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ عجب نہیں کہ آیندہ زمانہ میں چل کر عہد حاضرہ کے بہترین اسپتال دوزخ کا نمونہ قرار دیئے جائیں۔ اور علاج کے ایسے آرام دہ طریقے نکل آئیں جن سے موجودہ زمانہ کے تکلیف دہ انجکشنوں کی بھرمار سے نجات ملے جو مرتے ہوئے انسان کو چھلنی بنا دیتے ہیں۔

تشخیص مرض زمانہ حال میں سرجری کے ساتھ فنِ تشخیص میں بھی ترقی ہوئی ہے۔ جالینوس کے زمانہ میں تشخیص مرض کا انحصار تمام تر نبض کی حرکات دیکھنے پر تھا۔ نیز قارورہ اور اجابت کا رنگ دیکھا جاتا تھا۔ عہدِ حاضرہ میں STETHOSCOPE اور تھرما میٹر کا اضافہ ہوا۔ قارورہ، اور اجابت، تھوک اور خون کی جانچ بذریعہ تجزیہ کے کیجاتی ہے۔ ایکس رے سے اندرون جسم کے فوٹو اور جراثیم کا مشاہدہ خوردبین سے کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نباضی کے فن نے بہت ترقی کی تھی مگر اس کے لئے نہایت ذہانت اور کثیر تجربہ ضروری تھا۔ اب ہر معمولی سمجھ والے شخص کے لئے اتنے بہت سے آلات موجود ہو گئے ہیں کہ وہ جسم کے متعلق ایک حد تک یقینی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

اجتماعی امراض انفرادی امراض کے بعد اجتماعی امراض کی نسبت کچھ عرض کرنا مناسب ہوگا۔ اس سے مراد وہ امراض ہیں جو متعدی ہیں اور بعض وقت بڑھکر وبائی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

زمانہ ہائے قدیم سے طاعون اور ملیریا اور چیچک سے ہزاروں۔ لاکھوں آدمی مرجاتے تھے۔ انھیں روکنے کے لئے دو طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ جہاں وبائی مرض نمودار ہوتا وہاں سے آمد و رفت بند کیجاتی۔ دوسرے غلاظتوں کو دور کیا جاتا اور آبادیوں کو صاف اور ستھرا رکھنے کی کوشش کیجاتی۔

اِن وبائی امراض میں سب سے زیادہ ہلاکت چیچک سے ہوتی تھی جو تقریباً ہر سال شدت کے ساتھ پھیلتی تھی اور جو مریض اس سے جانبر ہوتے انھیں مستقل طور پر بدصورت بنا دیتی تھی۔ چنانچہ مصر کی ممیوں پر چیچک کے نشانات اب تک دیکھے جاتے ہیں۔ یہ مرض زیادہ تر گرم ممالک میں تباہی لاتا تھا مگر دسویں صدی میں وہ یورپ میں بھی پہونچ گیا اور وہاں اس قدر زیادہ پھیلا کر ۱۶۹۴ء میں ملکہ میری کو بھی ہلاک کر دیا۔ اٹھارھویں صدی میں وہاں چھ کروڑ آدمی چیچک سے ضائع ہو گئے۔ چیچک کے ٹیکے کی ایجاد سب سے اوّل قسطنطنیہ میں ہوئی۔

وہاں کے شاہی دربار میں انگریزی سفیر کی بیوی Lady Mary Montagu

لیڈی میری مانٹے گو تھی اُس نے ۱۷۱۸ء میں چیچک کے ٹیکہ کی بابت اپنے گھر کو لکھ کر بھیجا۔ اسوقت چیچک کا ٹیکہ خود چیچک کے مواد سے تیار کیا جاتا تھا۔ جب لیڈی مذکور اپنے وطن لندن میں آئی تو اُس نے ازراہ ہمدردی لوگوں کو ٹیکہ لگانا شروع کیا۔ مگر پادریوں نے اُس کی اس قدر سخت مخالفت کی کہ وہ انگلستان آکر پچتائی۔ اُس ٹیکہ میں چھوت لگنے کا بہت خطرہ رہتا تھا۔ اسکی دفعدا انگلستان کے ایک گھوسی مسمی جینر Edward Jenner of Gloucestershire نے اس طرح کی کہ اپنی گایوں کے تھنوں سے دوا تیار کر کے اُس کا ٹیکہ ۱۷۹۸ء میں جاری کیا۔ اُسی کی وجہ سے اب چیچک کی وباؤں سے بہت کچھ حفاظت ہو گئی ہے۔ اس سے قبل ہر مرض کا علاج صرف اُس وقت شروع کیا جاتا تھا جبکہ وہ نمودار ہو جاتا تھا۔ چیچک کا ٹیکہ حفظ ماتقدم کا بہترین پہلا تجربہ تھا اور اُس کے بعد اب دیگر امراض سے حفاظت کے لئے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔

مگر متعدی اور وبائی امراض کا مستقل علاج گزشتہ صدی کے آخر میں PASTEUR کے ہاتھوں سے ایجاد ہوا جو کوئی ڈاکٹر نہ تھا بلکہ محض علم کیمیا کا ماہر تھا۔ اُس نے جراثیم کی تحقیق کی۔ اور مختلف اشیاء سے اُن جراثیم کی پرورش کرنے، بڑھانے اور ہلاک کرنے کے تجربے کئے۔ اُس کی تحقیقات کا پہلا نتیجہ کتے کے کاٹے کا علاج تھا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اُس کے بعد اب کوئی متعدی مرض مشکل سے ایسا بچا ہوگا جس کے جراثیم بذریعہ خوردبین کے جدا جدا نہ پہچانے جاتے ہوں اور انھیں پرورش کرنے اور ہلاک کرنے کی دوائیں معلوم نہ ہو گئی ہوں۔ اب تو ٹائیفائڈ اور ہیضہ اور ملیریا کے جراثیم طبی لیبوریٹریوں میں شیشہ کی نلکیوں میں جدا جدا رکھے رہتے ہیں۔ وہ مرض کی حالت میں اور نیز بطور حفظ ماتقدم بذریعہ انجکشن کے خون میں پہونچائے جاتے ہیں جس سے جسم میں مرض کا مقابلہ کرنے اور اُسے دفع کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُن کے نتائج تقریباً یقینی ہیں۔ ڈاکٹر محمد فیاض خاں صاحب نے ایک بار بیان کیا کہ وہ صیغہ حفظان صحت لکھنؤ کے معمل میں کام کر رہے تھے تو ہیضہ کے جراثیم نلکی میں سے اُنھوں نے حسب قاعدہ اُسے منھ میں لیکر سانس سے کھینچے تاکہ اُنھیں دوسری نلکی میں پہونچائیں۔ اتفاق سے ہیضہ کے جراثیم کھنچ کر اُن کے حلق میں پہونچ گئے جس سے اُنھیں پریشانی ہوئی۔ مگر تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ وہ کھانا کھا کر آئے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے معدہ میں GASTRIC JUICE موجود ہوگا اور اُس سے ہیضہ کے جراثیم فوراً مرجائیں گے اور آنتوں تک نہ پہونچ سکیں گے۔ جہاں پہنچکر

وہ ہیضہ پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس اطمینان پر اُنھوں نے کسی دوا کا استعمال نہ کیا اور وہ محفوظ و مامون رہے۔

مختلف امراض کے جراثیم کو نلکیوں میں رکھا ہوا دیکھ کر بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان نے امراض کو مسخر کر لیا ہے جس کا خواب اُس نے ابتدائی زمانہ میں دیکھا تھا اور وہ سحر آور عمل یا اپنے تصور و خیال کی قدرت سے اُنھیں مسخر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دنیا کے مختلف ممالک کے نقشوں سے جو شایع ہوتے رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس نسبت سے خاص خاص امراض کی بیخ کنی کی کوشش کیجاتی ہے اُسی نسبت سے کامیابی ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سوویٹ روس میں ہیضہ، طاعون اور ملیریا، ٹائیفائڈ کی جہاں کہیں سے خبر آتی ہے ڈاکٹروں کا ایک دستہ ہوائی جہاز سے پہونچ کر وہاں اُن کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اسی طرح انگلستان کی اموات میں کمی ہونے کے چند اعداد قابل ملاحظہ ہیں:۔

	سنہ ۱۸۶۸ء میں	سنہ ۱۹۴۳ء میں
عام اموات فی ہزار	۲۰٫۶	۱۲٫۱
شیر خوار بچوں کی اموات	۱۵۵	۴۹

ہیضہ سے اموات ۶ سال میں سنہ ۱۸۴۸ء سے سنہ ۱۸۵۴ء تک ۱۰ لاکھ (اب ندارد)
ٹائیفائڈ سے سنہ ۱۸۷۱-۷۵ء تک ۴ سال میں ۳۷۱ فی ۱۰ لاکھ سنہ ۱۹۴۲ء میں صرف ۳
چیچک سے ۳۹۲ " سے صفر تک
سُرخ بخار سے سنہ ۱۸۶۱-۷۰ء میں ۲۶۱۷ " سنہ ۱۹۳۱-۳۵ء میں صرف ۵۷

ہندوستان میں اب تک چیچک سے موتوں کی تعداد ضرور گھٹی ہے۔ مگر دیگر امراض سے مجموعی تعداد اموات اب بھی بہت زیادہ ہے۔ مثلاً سنہ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کی مجموعی اموات انگلستان کی کل موتوں سے ڈہائی گونہ، اور بچوں کی شرح اموات دوگنی تھیں۔

حفظ ماتقدم سب سے آخر میں میں حفظ ماتقدم کے طریقوں کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کی موجودہ زمانہ میں بہت اہمیت ہوگئی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اسقولیفیعس کے زمانہ سے لیکر جالینوس کے زمانہ تک حکماء کی توجہ کھلی ہوا اور صحت بخش مقامات کی طرف زیادہ تھی۔ اور سحر و عمل کے ذریعہ سے خیالات پر اثر ڈال کر زیادہ تر علاج کیا جاتا تھا۔ جالینوس کے زمانہ سے دواؤں کی طرف توجہ زیادہ ہوئی۔ پھر سولھویں صدی میں علم تشریح کی

ترقی سے جسم کی چیر پھاڑ نے دواؤں کی طرف سے کسی قدر توجہ ہٹالی۔ کثرتِ ادویہ کا ردِ عمل ہومیوپیتھی کی شکل میں نمودار ہوا، جس کا نظریہ یہ ہے کہ جس نسبت سے دوا کی مقدار گھٹائی جاتی ہے اُسی نسبت سے اُس کی قوت اور اثر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کثرتِ ادویہ کے ردِ عمل نے ایک اور شکل اختیار کی اور دواؤں کو بالکل چھوڑ کر قدیم سحر اور عملیات کو مسمریزم و ہپناٹزم (Mesmerisms & Hypnotisim) کی شکل میں پیش کیا، اسی کے ساتھ پہاڑوں پر اور کھلی ہوا میں مریضوں کو رکھنے کا طریقہ جاری کیا گیا جو ڈھائی ہزار سال قبل حکیم بقراط کے زمانہ میں جاری تھا۔

مگر اِن تمام جدید طریقوں میں سب سے زیادہ کامیاب وہ معلومات ہیں جو غذاؤں میں (VITAIMINES) ویٹامینوں کے متعلق حاصل ہوئی ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ صحت کے لئے ایک وقت میں صرف ایک غذا مفید سمجھی جاتی تھی، مگر اب کہا جاتا ہے کہ عمدہ صحت کے لئے ضروری ہے کہ غذاؤں کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ان میں مختلف ویٹامینوں کا توازن رہے۔ اور جسم میں جس ویٹامین کی کمی ہو اُسے غذا کی شکل میں پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ مختلف غذاؤں کے ذریعہ سے جسم کے اندر ہر روز تین ہزار کیلوریز (CALORIES) پہونچائی جائیں جن سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ وہ سات گیلن یعنی ۳۵ سیر برف کے درجہ کے پانی کو بھاپ بنا دے۔ چنانچہ اِس وقت خوشحال ممالک میں نہ صرف یہ کہ وبائی اور متعدی امراض کے جراثیم کو وسیع پیمانہ پر ہلاک کیا جاتا ہے بلکہ اُسی کے ساتھ غذاؤں میں توازن کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ اُن ممالک میں اوسط عمر مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ امریکہ میں سنہ ۱۹۰۰ء سے اِس وقت تک یعنی ۵۰ سال میں اوسط عمر بقدر سترہ سال کے بڑھ گیا ہے اور اب وہاں ۶۵ سال اور اس سے زیادہ کی عمر والے لوگ نوّے لاکھ کے قریب موجود ہیں۔

غذاؤں کا اثر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بالکل نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ شمالی ہند میں جہاں گیہوں اور دودھ دہی خوب کھایا جاتا ہے وہاں کے لوگوں کے جسم کا اوسط وزن جنوبی ہند کے لوگوں کے وزن سے دوگنا ہے۔ اور مختلف قسم کے امراض میں نہایت کمی ہے۔ مگر فی الجملہ ہندوستان کے لوگوں کا اوسط عمر انگلستان سے نصف کے قریب ہے یعنی ۶۰ فی ہزار کے مقابلہ میں صرف ۲۳ ہے۔ ہندوستان میں اوسط عمر بڑھنے کی صورت بجز اس کے نہیں ہوسکتی کہ یہاں بھی انفرادی اور اجتماعی امراض دور کرنے کے وہی طریقے اختیار

کئے جائیں جو یورپ اور امریکہ میں اختیار کئے گئے۔ اجتماعی طریقے یہ ہیں کہ مچھروں اور پسوؤں اور مرض پھیلانے والے کیڑوں کو ہلاک کرنے کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کر کے حفظانِ صحت کے طریقے جاری کئے جائیں۔ اور مرض سے بچنے کے انفرادی طریقے یہ ہیں کہ عوام الناس تک کو کافی مقدار میں غذا کے ضروری اجزاء اور وٹیامن دستیاب ہوں۔ مگر یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ عوام میں اتنی مالی استطاعت نہ ہو کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بلند کر سکیں۔ کن طریقوں سے ملک میں حفظانِ صحت کے طریقے وسیع پیمانہ پر جاری کئے جا سکتے ہیں اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جا سکتا ہے اور ان ذرایع سے امراض کا قلع قمع یا اُن کی تسخیر کیجا سکتی ہے یہ امور ایک حد تک سیاسی ہونے کی وجہ سے اس مجلس کے حدود سے باہر ہیں۔ اگر میں اس میں مبادرت کروں تو اندیشہ ہے کہ میں "بسوز د پرم" کا مصداق نہ بن جاؤں اس لئے یہاں اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

سب سے آخر میں عرض ہے کہ میں نے جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ بطور ایک حاطب اللیل کے ہے۔ نہیں بلکہ میری حالت اُس شخص کے مانند ہے جسے راستہ میں ایک نعل پڑا مل گیا تھا اور وہ کہتا پھرتا تھا کہ اب صرف ۳ نعل اور ایک گھوڑے کی کسر باقی ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ مجھے اس قدر احساس ضرور ہے کہ مجھ میں یہ کمی پورا کرنے کی اہلیت اور قابلیت نہیں ہے، اس لئے اُن اصحاب کی خدمت میں جو اس کے اہل ہیں عرض ہے کہ اپنے مقالوں کے ذریعہ سے "مجلس مصنفین" کے لئے ۳ نعل اور ایک گھوڑا فراہم کریں تاکہ طبی معلومات کا ایک مکمل گھوڑا تیار ہو جائے۔

طفیل احمد

علی گڑھ میڈیکل کالج

کے

قیام میں عملی حصہ لیکر جدید طبی تحقیقات اور معلومات میں اضافہ کیجئے!

(مصنف)

ازبکستان کی علمی سرگرمیاں

(از جناب ل۔ احمد صاحب اکبر آبادی)



خیوا بخارا وغیرہ کا علاقہ پہلے روسی ترکستان کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ ایران و افغانستان کے شمال میں بحر قزوین سے لے کر وادی فرغانہ تک پھیلا ہوا ہے۔ روسی ترکستان کی سب سے بڑی ریاست بخارا کی تھی، جو زار شاہی کی محکوم اور ایک ہندوستانی رجواڑے سے بدتر تھی۔ اس پورے علاقے کی آبادی مسلمان ہے، لیکن غریب رعایا مسلمان خاں، مسلمان ملا، مسلمان بے یعنی زمیندار، مسلمان امیر، روسی نوآبادکار اور سفید زار کی مستقل خوں آشامی کا شکار تھی۔

روسی ترکستان کی مسلمان آبادی قومیت کے اعتبار سے مختلف النسل یعنی ازبک، تاجک، ترکمان، باشکر اور کرغیز وغیرہ پر مشتمل تھی۔ حالت اتنی ردی ہو چکی تھی کہ ایک کلمے کے پڑھنے والے ایک دوسرے سے انتہائی نفرت کرتے اور حقیر سمجھتے تھے۔ یہ پورا علاقہ اب چھ نسلی جمہوریتوں میں بٹ گیا ہے۔ سوویٹ انقلاب نے جب قوموں کی آزادی کا اعلان کیا تو ایک مذہبی قوم میں سے چھ نسلی قومیں نکل پڑیں اور سب نے اپنی کلچری علٰحدگی اور خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ لینن نے اس مطالبے کو تسلیم کیا اور علٰحدگی ہو گئی۔ حالت بہتر ہونے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ باہمی بغض عناد بھی رفع ہو کر مخلصانہ تعلق اور سچا بھائی چارہ قائم ہو گیا۔ اب یہ تمام جمہوریتیں خود مختاری کے طفیل تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔

غرض مسلمان امیر کی عملداری میں عیسائی زار غریب مسلمانوں کی محنت و مشقت کا پھل جھپٹ لے جاتا تھا، روسی نوآبادکار جونک بنا ہوا تھا، امیر کے عمال و تحصیلدار گدھ کی طرح چمٹے رہتے تھے، ان سے جو کچھ بچ جاتا اس پر زمیندار اور خوانین کا دانت رہتا، اور ملاان سب پر مستزاد تھا۔

امیر کے ٹیکسوں کی وہ بھرمار تھی کہ شاید ٹیکس کا کوئی معقول حیلہ نہ رہ گیا تھا، اس لئے کہ

ایک ٹیکس مہمانداری بھی تھا۔ پھر امیر کے عقیل وار تنخواہ کے اکولی نہیں بلکہ کمیشن وار ہوتے تھے، جتنا زیادہ وصول کریں اتنی ہی زیادہ کمیشن پائیں۔ صورت حال جب یہ ہو تو کیا اُمید رہ جاتی ہے کہ مسلمان امیر کی مسلمان رعایا سکھ کی روٹی کھا سکتی اور کوئی کلچری ترقی کر سکتی!

ریاست بخارا کا پورا مالیہ پونے دو کروڑ روبل سالانہ تھا۔ اس میں سے رعایا کی فلاح و بہبود پر مشکل سے پانچ فی صدی خرچ کیا جاتا تھا۔ امیر نصراللہ خاں نے اپنی چھبے سال کی حکومت میں ایک مدرسہ، ایک پُل اور ایک مسجد بنوائی اور ہمیشہ اس پر فخر کیا۔

بخارا کی تعلیمی حالت ۲ دو فی صدی سے کم تھی اور اس ۲ دو فی صدی تعلیم پر عمال، امیر، خوانین اور ملّا قابض تھے۔ عام مسلمان سو فی صدی جاہل رہتے تھے۔ اُزبک قوم کی یہی بدقسمتی شاید اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہماری زبان میں اُجبک کا لفظ انگھڑ، گنوار اور مطلق جاہل کے لئے بولا جانے لگا۔

سوویٹ روس کی حیرت انگیز ترقیاں روس پر نازی حملے کے باعث دنیا پر ظاہر ہوئیں۔ لیکن وسط ایشیا کی قوموں کی ترقی اس سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اس لئے کہ روس خاص کے لوگ تمدن و تہذیب کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ وسط ایشیا کی قوموں نے ابتداء سے ابتداء کی، اور صدیوں کے مذہبی تعصبات سے جنگ کی، اور اس قسم کی جنگ شاید اور ہر قسم کی جنگ سے زیادہ سخت و دشوار ہوتی ہے۔

الغرض جب ازبکستان کے افق پر انقلاب کا سورج جگمگایا، جب اس مفید سرزمین پر آزادی کا پرچم لہرایا تو بارہ ۱۲ پندرہ سال کی قلیل مدت میں ملک کی کایا پلٹ ہو کر ۲ دو فی صدی تعلیم نوّے ۹۰ فی صدی ہو گئی۔ اور آج یہ تمام قومیں تیز رفتاری کے ساتھ علمی، سائنسی، کلچری اور تمدنی ترقی کر رہی ہیں۔

میں اس موقع پر ازبکستان کے بعض علمی اداروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ہم مذہب اور ہمسایہ قوموں کے حالات کا اندازہ کریں اور ہو سکے تو سبق لیں کہ قومی طور پر دنیا کا ہر مشکل ترین کام بھی آسان ہو جاتا ہے، کوئی جماعت جب عزم اور تہیہ کر لیتی ہے تو "انہونی" باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

رسالہ ہندوستانی میں میرا ایک مضمون "وسط ایشیا کی قوموں کا سوویٹ ادب" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جس کے اندر ایک اُزبک شاعر غفور غلام کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

غفور کے متعلق مجھے ایک واقع کا علم بعد میں ہوا اور اس موقع پر وہ واقعہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس لئے کہ نفس مضمون سے اس واقع کا گہرا تعلق ہے:۔

> تاشقند ازبکستانی جمہوریت کا پایۂ تخت ہے۔ نئی دہلی کی طرح نیا تاشقند بھی آباد ہوگیا ہے جو چھوٹا موٹا شہر نہیں ہے۔ لیکن پرانے تاشقند کی آبادی بھی دس لاکھ کی ہے۔ غفور پرانے تاشقند میں رہتا ہے۔ ایک بار کسی دوسری جگہ کے ایک شاعر سے نئے تاشقند میں غفور کی ملاقات ہوئی اور غفور نے اس کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اس نے غفور کے مکان کا پتہ پوچھا تو غفور نے کہا کہ "پرانے تاشقند میں پہونچ کر کسی سے پوچھ لینا وہ تمہیں میرے گھر پہونچا دے گا۔"

اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دس لاکھ کی آبادی والے شہر کا کم از کم ہر بالغ شخص غفور ہی کو نہیں جانتا، اس کا مکان بھی جانتا ہے اور پوچھنے والے کو اس کے مکان تک پہنچا دینے پر مکلف بھی ہے! یہ واقعہ غفور کی غیر معمولی قبولیت اور شہرت کی حدیں بتانے کے ساتھ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ تاشقندی عوام کا کلچری معیار اور اُن کی وسعت کیا ہے، وہ "ازبک" جو "پرانے" تاشقند میں رہتے ہیں اپنے شعرا اور شاعر سے کتنے قریب ہیں، اس کی اہمیت اندازہ و قیاس میں نہیں آتی۔ اس واقعہ کو ازبک قوم یا وسط ایشیا کی قوموں تک محدود کر دینا ایک غلطی ہوگی پوری سوویٹ یونین کو اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور اشتراکی نظام کے معنی و مفہوم سمجھ میں آسکتے ہیں! اس لئے کہ تاجکستان کا شاعر لاہوتی جب سوویٹ لوگوں کے تقاضے پر سوویٹ یونین کے دورے پر نکلتا ہے تو دیہات اور پنچایتی کاشت کے علاقوں میں جاتا ہے اور جس روز لاہوتی اُن کا مہمان ہوتا ہے تو وہ دن ان لوگوں کی چھٹی کا نہیں تہوار کا دن ہوتا ہے۔

سوویٹ یونین کے ادارۂ شرقیات کی ایک شاخ تاشقند میں بھی ہے، جہاں مختلف موضوع پر تحقیق و تفتیش ہوتی رہتی ہے۔ رفقائے ادارہ کی ایک جماعت بارھویں صدی عیسوی کے عالی مرتبت شاعر آذربیجان، نظامی گنجوی کے متعلق عرصے سے تحقیق کر رہی تھی۔ اس جماعت کا ہدایت کار ایک روسی مستشرق پروفیسر یوجین برٹیل (EUGENE BERTEL) ہے۔ نظامی کے کلام کی صحت کرنے میں کمال دقت نظر سے کام لیا گیا۔ اور جہاں سے ممکن ہو سکا کلام نظامی کے مختلف زمانوں کے لکھے ہوئے نسخے فراہم کرکے مقابلے کئے گئے اور کتابت کی غلطیاں دور کی گئیں۔ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے

لکھے ہوئے نسخے ہیں، اِن کے فوٹو حاصل کئے گئے اور بالآخر خمسۂ نظامی کا ایک مستند نسخہ مرتب ہوگیا۔ سکندرنامہ علیحدہ شائع کیا جاچکا ہے۔ اب باقی چاروں مثنویاں ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ زیرِاشاعت ہیں۔ پورے خمسے کا روسی ترجمہ پہلے ہی شائع ہوچکا ہے۔

اس مقدمے میں جدید تحقیقات کے نتیجے بیان ہوئے ہیں۔ اب سے پہلے دُنیا کے سامنے مطالعہ نظامی کے اکثر پہلو ان دقیقہ سنجی کے ساتھ پیش نہ ہوئے تھے۔ بہت سا نیا مسالا اور مواد بھی دستیاب ہوا ہے جس کے وجود کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ نظامی کی سیرت وضاعت پر اس نئی معلومات کی روشنی میں گہری نظر ڈالی گئی اور مبسوط بحثوں کے بعد اہم نتیجے مرتب کئے گئے ہیں۔ بالکل نئی بات یہ ہے کہ نظامی کے عہد اور اس عہد کی زندگی کو جانچا گیا اور اس کے تعلق سے نظامی کے ضاعت کی قدر قرار دی گئی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی زمانے کے شعر وضاعت کی سچی قدر اس عہد کی زندگی کو سامنے رکھے بغیر قرار نہیں پا سکتی۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نظامی کی زندگی سخت افلاس وعسرت میں بسر ہوئی، اگرچہ درباری سرپرستی اور عیش وآرام کی زندگی ایک ادنےٰ اشارے پر حاصل ہوسکتی تھی۔ اور اس کی وجہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، نظامی اپنی ضاعتی آزادی کی اہمیت سے واقف تھا، اس لئے اس نے فارغ البالی کو اپنے عقیدے پر قربان کردیا اور تنگدستی کی زندگی اختیار کی۔

پچھلے تبصرہ نگاروں نے نظامی کو بھی اور بیسیوں شاعروں کی طرح "گل وبلبل" کا شاعر سمجھ لیا تھا، لیکن جدید تحقیقات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنے عہد کی زندگی کا گہرا احساس تھا اور واقعاتِ عالم پر حکیمانہ نظر ڈالتا تھا یعنی عصری زندگی کے ساتھ نظامی کا تعلق ترقی پسندانہ تھا۔

نظامی کا سال وفات ۱۲۰۳ء بھی اگلے مورخوں نے غلط قرار دیا تھا، ۱۲۱۱ء تک نظامی کا حیات ہونا ثابت ہے۔

نظامی کے فلسفۂ حیات اور اُس کے افکار وخیالات نے قفقاز، ایران، وسط ایشیا اور ہندوستان کو جس حد تک متاثر کیا پہلے مورخوں نے اس کا بھی صحیح اندازہ نہیں کیا۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ نظامی کے کردار تر کماں قوم کی کہانیوں میں آج بھی زندہ ہیں۔

اُزبکستانی ادارے کی اس جدید تحقیق کا فیصلہ ہے کہ نظامی کے شعر وضاعت کی تکمیل سکندر نامے میں ہوئی ہے اور نظامی کے فلسفۂ حیات کی پوری آئینہ داری سکندر نامہ ہی کرتا ہے۔ سکندرنامہ

نظامی کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ اس لئے اس کے عقائد و افکار سکندر نامے ہی میں پوری طرح جلوہ گر ہو سکتے تھے۔

تاشقند کے ادارۂ تحقیقات لسانی PHILOLOGICAL RESAERCH INSTITUTE ، اور وسط ایشیا کی مرکزی اسٹیٹ یونیورسٹی کی متفقہ سرپرستی میں پچھلے سال ملا علی شیر نوائی کے شعر و ادب بحث و نظر کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں سوویٹ یونین کے سائنسدان مستشرقوں نے حصہ لیا۔ کانفرنس کی صدارت پروفیسر V. ZHIRMUNSKY نے کی جو سوویٹ اکاڈمی آف سائنسز کا معزز ممبر اور ایک بلند پایہ مستشرق ہے۔ ملا علی شیر نوائی خراسان کی تیموری سلطنت کا وزیر تھا اور ایک مدبر سلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و درویش، نقاش و موسیقی نواز اور ادیب و شاعر اور جامی کا ہم عصر تھا۔ ملا علی شیر نوائی علم و فن کا اتنا بڑا سرپرست تھا جس کی ہنر پروری کو شہنشاہ بابر نے عدیم المثال کہا ہے۔ بہزاد سا نقاش اور حسن عودی سا موسیقار اس کے وابستگان میں سے تھے۔ نظامی کے اتباع میں ملا علی شیر نے ایک خمسہ مرتب کیا اور ترکی و فارسی میں ۶ مثنویاں اور ۴ منظوم ڈرامے لکھے۔ نوائی کا پورا کلام روسی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو گیا ہے اور اُزبکستان کے فلمی ادارے نے نوائی کی زندگی کا فلم بھی بنا لیا ہے۔

صدر کانفرنس نے اپنے خطبے میں ملا علی شیر کی عظمت اور بلند مرتبتی پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ یہ جنگ سوویٹ یونین کے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ لیکن جنگ کی اہم ذمہ داریوں اور انہماک کے باوجود نوائی پر ریسرچ کا کام ایک دن کے لئے ملتوی نہیں ہوا۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہم ملا علی شیر کے علم و فضل کا کیا درجہ سمجھتے ہیں۔

پروفیسر VSEFOLODZUMM نے علی شیر کی تصویر پر ایک مقالہ پڑھا اور بتایا کہ دنیا میں نوائی کی ایک ہی مستند تصویر ہے جو مملکتِ ایران کی ملکیت ہے۔ یہ تصویر بخارا کے مشہور نقاش محمود مذہب کی قلم کاری کا نتیجہ ہے اور اس کے مستند ہونے پر ذرہ بھر شک نہیں کیا جا سکتا۔

اُزبک نوعمر سائنس داں محمد یونسوف نے اپنے مقالے میں اس اثر کو ظاہر کیا جو ملا علی شیر کے شعر و ادب نے اپنے زمانے اور بعد کے زمانے پر چھوڑا۔

تاشقند کے جامعہ علوم یا ACADEMY of SEWCES نے مشرقی مخطوطات کا ایک کتب خانہ قائم کیا ہے جس میں ستّر ہزار قلمی نسخے اس وقت موجود ہیں۔ مشرقی مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ دُنیا میں شاید دوسرا نہ ہو۔ بڑی حیرتناک بات یہ ہے کہ یہ عظیم الشان ذخیرہ سوویٹ عہد ہی کے اندر فراہم ہوا ہے۔ اُزبک جمہوریت وجود میں آتے ہی حکومت کی طرف سے قلمی نسخوں کی فراہمی شروع ہو گئی تھی اور جب یہ اکاڈمی قائم ہوئی تو وہ نسخے اس کو منتقل کر دیے گئے۔

اس کتب خانے میں ۱۹۰۰ء تک کے لکھے ہوئے نسخے ہیں، جن میں زیادہ تعداد فارسی، اس سے کم عربی اور اس سے کم ترکی زبان کے نسخوں کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سب سے بڑی تعداد تاریخ کی کتابوں کی ہے جو وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اکثر نسخے مُصوّر و مُطلّا ہیں۔ تاریخ سے کم جس موضوع پر کتابیں ہیں وہ اسلامی شرق کا فلسفہ ہے۔ باقی کتابیں طب، ریاضی اور علم کیمیا وغیرہ پر ہیں۔ طب کی کتابوں میں بعض ایسے نسخے ہیں جن میں تشریح الابدان کے متعلق رنگین ڈایاگرام دئے ہوئے ہیں۔

اس کتب خانے میں ایسے نادر نسخے بہت ہیں جن کا کہیں ذکر یا حوالہ بھی نہیں آیا ہے۔ اور ایسے مسوّدے بھی کافی تعداد میں ہیں جو خطاطی اور رضاعت کے اعتبار سے بے مثال اور نہایت پُرانے ہیں۔ نادر ترین نسخوں میں اُزبک لیڈر شعبان خاں کی خود نوشت سوانح حیات ہے جس کا کچھ حصہ شعبان خاں کے معتمد یا سکریٹری کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک نسخہ اُزبے خاں کی یادداشت ہے۔ ازبے خاں اصفہان کا رہنے والا اور شعبان خاں کا دوست تھا۔ اس یادداشت کی ایک جلد استنبول کے کتب خانے میں اور ہے۔

ان ستّر ہزار قلمی نسخوں کے علاوہ کوئی پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جو وسط ایشیا، ایران یا ہندوستان میں چھپی تھیں، مگر ان میں سے اکثر کتابوں کا علم ان ملکوں کو نہیں ہے جہاں وہ چھپی تھیں۔

یہ ادارہ ساری سوویٹ یونین میں مشہور ہے اور نہایت ذی وقعت مانا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے دُنیا کے معروف ترین کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ سوویٹ یونین کے مختلف حصّوں سے بہت سے استفسار آتے رہتے ہیں، جن کا تشفی بخش جواب دینا ادارے کا فرض ہے۔ طبیب ڈاکٹر سوال کرتے رہتے ہیں کہ فلاں مرض میں عرب اطبا کا طریق علاج کیا تھا، یا فلاں مرض میں کیا دوائیں تجویز کرتے تھے۔ تھیٹروں اور فلموں کے ہدایت کار معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں عہد میں

فلاں حصۂ ملک کا لباس کیا تھا۔ معاشرت کیا تھی وغیرہ۔ صناع و نقاش بوچھتے رہتے ہیں کہ مصور نسخوں میں کس کس عہد کی اور کس صناع کی دست کاری ہے اور کون کون سے رنگ استعمال ہوتے ہیں وغیرہ۔

تاریخی اور کلچری مطالعہ و تحقیق کے لئے تاشقند میں ایک اور ادارہ قائم ہے۔ یہ ادارہ ہسٹوریکل مونیومنٹ تحفظ آثار قدیمہ کی اُزبکستانی کمیٹی کہلاتا ہے جس وقت یہ کمیٹی قائم ہوئی تو اُزبکستان کی جمہوریت نے یک وقت بیس لاکھ روبل عطا کئے۔ اس کمیٹی کا صدر واحد جہانگیروف ہے، اور یہ کمیٹی اس جنگ کے شروع ہونے سے قبل اپنا کام شروع کر چکی تھی جو برابر جاری ہے۔

سمرقند میں امیر تیمور کا مقبرہ گورِ امیر کے نام سے مشہور ہے۔ تین سال سے یہ کمیٹی گورِ امیر کی تحقیق کر رہی ہے۔ شروع میں اس تحقیق کے تمام ذرائع مفقود تھے۔ لیکن حسنِ اتفاق سے ایک اسپینی سفیر کا روزنامچہ دستیاب ہو گیا جو ۱۴۰۴ء میں امیر تیمور کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ اس سفیر نے اپنے روزنامچے میں ایک بہت بڑے مدرسے کی عمارت اور اس کے مقابل ایک عالیشان درویش خانہ یا خانقاہ کی عمارت کا ذکر کیا ہے۔ کھدائی سے ان دونوں عمارتوں کے آثار نکلے اور پتا چلا کہ گورِ امیر بعد کی چیز ہے۔ پہلے وہاں مدرسہ و خانقاہ تھی جو ایک چار دیواری سے محصور تھی۔ اور دونوں عمارتوں کے بیچ میں ایک نہایت خوشنما باغ تھا۔ یہ عمارتیں اور باغ شہزادے محمد سلطان یعنی امیر تیمور کے پوتے نے بنوایا تھا۔ باغ کا نقشہ و تعمیر ایک اصفہانی انجنیر نے بنایا تھا جس کا نام محمد بن محمود تھا۔

شہزادہ ایک جنگی معرکے میں مقتول ہوا اور اس کی لاش سمرقند لائی گئی اور خانقاہ میں دفن کر دی گئی۔ لیکن چونکہ امیر تیمور کو شہزادے سے بہت محبت تھی اور اس محبت کا تقاضا تھا کہ شہزادے کی قبر بہت عالیشان بنائی جائے۔ چنانچہ حکم تیموری کے مطابق وسط باغ میں شہزادے کا مقبرہ تیار ہوا جو پھر شاہی گورستان بن گیا اور بالآخر امیر تیمور بھی وہیں دفن ہوا اور اس شاہی قبرستان کا نام گورِ امیر پڑ گیا۔

خانقاہ کی عمارت تو مسمار ہو چکی تھی مگر ایک نیلی چینی کا گنبد باقی تھا۔ اس کمیٹی نے اس گنبد کی مرمت کرائی اور چار دیواری بھی اصل کے مطابق بنوائی ہے۔ چار دیواری میں اندر کے رُخ پچی کاری کا حاشیہ تھا۔ یہ حاشیہ بنوانے کے لئے سارے علاقے سے بوڑھے بچہ کار جمع کر کے اصل کے مطابق کام کرایا گیا۔ تعمیر کی تفصیلات اسپینی سفیر کے روزنامچہ سے حاصل کی گئی تھیں۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ گور امیر کی کھدائی میں چار مجسمے برآمد ہوئے جن میں ایک امیر تیمور کا ہے، دو اس کے بیٹوں کے، اور ایک اس کے پوتے الغ بیگ کا ہے۔ اس تمام تحقیقات سے اگرچہ پندرھویں صدی کی اس عظیم الشان شہنشاہی کے متعلق سوویٹ سائنس کو بہت تاریخی باتوں کا علم حاصل ہوا ہے، لیکن اس سلسلے میں اہم کارنامہ یہ ہے کہ سوویٹ سائنسداں گراسی نوف نے جو علم الانسان کا ماہر ہونے کے ساتھ مانا ہوا فلم ساز بھی ہے۔ ان مجسموں پر گوشت پوست چڑھا کر چہرے بنا دئے ہیں جو تاریخی قیافوں کے بالکل مطابق ہیں۔ گراسی نوف کا یہ کارنامہ اسی قبیل کا کام ہے جیسا قدیم یونانی شاعرہ سیفو کے لفظوں اور جملوں کو لے کر سیفو کے رنگ میں نظمیں تیار کر دینا۔

ازبکستان میں ایک اور تاریخی و کلچری تحقیقات ہو رہی ہے جس کی اہمیت کا پورا اندازہ آیندہ چل کر ہو سکے گا۔ اس ادارے کا نام INSTITUTE of THE HISTORY of MATERIAL CULTURE ہے۔ اس ادارے نے ایک بہت بڑی کمیشن بھیج کر دریائے سیر کے کنارے بہت قدیم زمانے کے کلچری آثار برآمد کرائے ہیں۔ ایک شہر برآمد ہوا ہے، جس کی تاریخ تقریباً دو سو سال قبل مسیح شمار کی جاتی ہے۔ ایک عالیشان محل کے بعض حصے نہایت اچھی حالت میں نکلے ہیں جس کے اندر بڑے بڑے ایوان ہیں اور چھتیں محرابی ہیں چھتوں میں سونے کے ٹکڑے پڑے ہیں اور ان میں موتی جڑے ہیں۔ محل کی دوسری منزل کا برآمدہ فن تعمیر کا ایک خاص نمونہ سمجھا گیا ہے۔ ایک آوا یا بھٹا بھی دریافت ہوا ہے جس میں سے کمہار کے کام یعنی مٹی کے برتن اور ان پر روغن سازی کے بعض اعلیٰ نمونے ملے ہیں۔ ہڈی کی ایک چھری دستیاب ہوئی ہے جس پر باریک کندہ کاری کی گئی ہے۔

ان ہمسایہ ملکوں کی یہ علمی سرگرمیاں ہندوستان کے علمی اور کلچری اداروں کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہمارے اداروں کو چاہئے کہ وسط ایشیا سے اپنے تاریخی تعلق کو پھر سے زندہ کریں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم دس پانچ ماہرین کی ایک جماعت ان اسلامی ملکوں کی سیاحت کے لئے بھیجیں جو اپنے اپنے موضوع کے لحاظ اس تمام علاقے کا مطالعہ کریں اور پھر ایک ایک مقالے کی صورت میں اپنے تاثرات کو مرتب کریں اور تمام مقالے ایک مجلد میں شائع کئے جائیں +

ل۔ احمد

زاہدہ خاتون نزہت

(از صاحبزادہ ممتاز علی خاں بی۔ اے (علیگ) نبیرۂ نواب صدر یار جنگ بہادر)

زاہدہ خاتون نزہت مرحومہ نواب ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کی منجھلی صاحبزادی تھیں۔ وہ دسمبر ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ابھی منزلِ شعور میں قدم نہ رکھا تھا کہ آغوشِ مادر سے محروم ہو گئیں۔ لیکن اس کمی کا ازالہ قدرت نے شفیق خالہ کی صورت میں کر دیا۔ انھوں نے مرحومہ کو مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا اور کبھی بیکسی کا روح فرسا احساس نہ پیدا ہونے دیا۔ لیکن اُس وقت یہ بات اِن کے وہم و گمان میں بھی نہ گزری ہوگی کہ بوستانِ شیروانیان کی یہ نوخیز کلی ایک دن ایک خوشنما اور دل آویز پھول بننے کا شرف حاصل کریگی اور اپنی نکہتِ جاں فزا سے اہلِ ذوق کے مشامِ جان کو معطر کر جائے گی۔ اس کا شمار ہندوستان کی چوٹی کی شاعرات میں ہوگا۔ اور علم جیسی بے بہا و عدیم النظیر شے کی حامل ہوگی۔

نواب صاحب مرحوم نے باوجودیکہ اس زمانہ میں عورتوں کو اور خاص کر ہمارے خاندان کی مستورات کو اعلیٰ تعلیم دلوانا معیوب اور گمراہ کن تصور کیا جاتا تھا، اپنی لڑکیوں کو پڑھانے کیواسطے سید احمد صاحب نیری اور آغا سنجر کی بہن کو مقرر کیا۔ اور یہ اسی تعلیم اور مذکورہ ہر دو ہستیوں کی صحبت کا فیض تھا کہ اس جوہر نے جو خالقِ ارض و سما نے مرحومہ کو عطا کیا تھا جلا پائی اور اس کی تابندگی سے دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ اگر خاندان کی دوسری عورتوں کی طرح اِنھیں بھی تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا تو دلدادگانِ شاعری ایک اچھی شاعرہ کے افکارِ عالیہ سے محروم رہتے، اور خزانۂ اُردو میں ایک گرانقدر گوہر (یعنی تصانیفِ نزہت مرحومہ) کی کمی رہ جاتی۔

بہر صورت حیف کہ ایسی مقتدر ہستی اپنی زندگی میں اور انتقال کے بعد ۲۱ بیس سال تک گمنام رہی۔ غیر تو غیر خود اپنوں نے مرحومہ کی قدر نہ کی اور دنیا اس گرامی ذات سے کما حقہٗ روشناس نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۱ء میں یعنی مرحومہ کی وفات کے پورے ۲۱ بیس سال بعد دار الاشاعت پنجاب نے "فردوسِ تخیل" (نزہت کے کلام کے مجموعہ کا نام) چھاپی، جسے مرحومہ اپنی زندگی ہی میں مرتب کر گئی تھیں۔ اگرچہ

اس سے بہت قبل مرحومہ کی نظمیں ملک کے اکثر رسائل میں ز۔ خ۔ ش کے نام سے شائع ہوکر داد سخن لے چکی تھیں، لیکن ان کی حیثیت اجزائے پریشاں سے زائد نہ تھی۔ اگر کتاب مذکور اُفق اشاعت پر نمودار نہ ہوتی تو زمانہ کا ظالم ہاتھ اس منتشر شیرازہ کو ہمیشہ کے واسطے فنا کر دیتا۔ اور یہ بے بہا موتی جو اب ایک رشتہ میں منسلک ہوکر ایک عمدہ ہار کی صورت اختیار کر چکے ہیں، ضائع ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کارپردازانِ دارالاشاعت نے "فردوسِ تخیل" چھاپ کر ہمارے خاندان اور اُردو شاعری پر انتہائی احسان کیا ہے کہ اس سے سُبکدوشی کسی طور پر ممکن نہیں۔

آخرکار آسمانِ شاعری کا یہ نیرِ تاباں کچھ مدت تک اپنی ضیا باری سے دُنیائے ادب کو منور کرکے بہ عالمِ دوشیزگی فروری ۱۹۲۲ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے روپوش ہوگیا۔ لیکن ؏

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

مرحومہ اگرچہ بظاہر پردہ کر چکی ہیں۔ لیکن معنوی اعتبار سے زندہ ہیں۔ اور جب تک گردشِ لیل و نہار قائم ہے انشاء اللہ تعالیٰ خراجِ تحسین و آفریں وصول کرتی رہیں گی۔ کیونکہ خیالات کی وہ مے خالص جو اُنھوں نے جامِ شاعری میں بھر کر پلائی تھی اتنی نفیس اور خوش ذائقہ تھی کہ کام و دہن اس کی لذت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کے کلام کا اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس قلیل عمر میں وہ وہ کچھ کہہ گئیں جو لوگ ایک طویل مدت میں بھی نہیں کہہ پاتے، اور شاعری میں وہ مرتبہ پایا جو بہت کم اشخاص کو حاصل ہے۔

مرحومہ باوجود بے حد حریت پسند اور روشن خیال ہونے اور اعلیٰ ترقی پذیر رجحانات رکھنے کے مشرقی تہذیب و تمدن کی انتہائی دلدادہ تھیں اور اُنھیں مذہب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اگر آپ ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی محبت اُن کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی اور مسلمانوں کی بے راہ روی اور مذہب سے بیگانگی اُنھیں ہمیشہ بے چین رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی صلاحیتوں اور وقت کو پامال شدہ مضامین کے بیان کرنے اور دُور ازکار خیالات کے موزوں کرنے میں ضائع نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے اپنی تمام کوششیں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں صرف کر دیں۔

"آئینۂ حرم" اور "فردوسِ تخیل" کی اکثر نظمیں اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہ معمولی واقعات سے اس درجہ متاثر ہوتی تھیں کہ کئی کئی دن تک ان پر محویت کا عالم طاری رہتا اور وہ خواب و خور سے تقریباً بے نیاز ہو جاتیں۔ ایک دفعہ کانپور کی ایک مسجد پر پولس والوں نے

گولی چلائی۔ مسجد کے ایک حصّہ اور نمازیوں کی اکثریت نے جامِ شہادت نوش کیا۔ بہت سے مسلمانوں کو اِس کی خبر تک نہ ہوئی۔ جنھیں اس رُوح فرسا واقعہ کا علم ہوا ان میں سے اکثر و بیشتر نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بہت کم ایسے تھے جن کے دل اس صدمہ سے بیتاب ہوئے۔ اُن میں سے ایک مرحومہ بھی تھیں۔ اِس جاں گسل واقعہ کی اطلاع سنے ان کا دل لرز اٹھا اور اُنھوں نے "مسجد کانپور کی باتیں" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس سے زیادہ ایک پردہ نشین خاتون اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ بہتیروں کو تو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

لیکن اس ناصحانہ افتادِ طبع کے باوجود اُنھوں نے شاعری کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور اگر گاہے اشعار ثقلِ الفاظ کی وجہ سے گراں بار نہ ہو جایا کرتے تو ان کے کلام کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہو جاتا۔ بایں ہمہ تسلسل و روانی، عذوبت و دل آویزی، درد و تاثیر اور رفعتِ خیال جو جانِ شاعری ہے ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور یہی خوبیاں ہیں جو ایک شاعر کو وقیع بنا دیتی ہیں اور لوگ اس کے کلام میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ مرحومہ کا کلام اگر آپ بار بار بھی پڑھیں تب بھی طبیعت سیر نہ ہوگی۔ بلکہ ہر مرتبہ نیا مزہ آئیگا اور خیال گزرے گا کہ آپ کلام کا پہلی مرتبہ مطالعہ کر رہے ہیں۔

اگر اُن کی زندگی وفا کرتی تو وہ اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا مسندِ شہرت پر رونق افروز نظر آتیں۔ اور ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا۔ اب ان کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ جو کچھ مُوَہبت مرحومہ کے متعلق عرض کیا گیا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔

اُن کی ایک نظم ہے "ہمارے بعد" اِس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ اُن کے دُنیا سے جانے کے بعد کیا صورتِ حال ہوگی۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات کی اس عمدگی سے وضاحت کی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ جو کچھ تحریر کیا ہے وہ عینی مشاہدہ کا رہینِ منت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یادِ ایام کہ ہم پیکرِ بے جاں ہوں گے	تارکِ خانہ و مہجورِ عزیزاں ہوں گے
کام آئے گی نہ کچھ آپ کی دانشمندی	لقمۂ کرم لحد حضرتِ انساں ہوں گے
رُخِ زیبائے حقیقت سے نقاب اُٹھے گا	جتنے اسرار ہیں پردے میں نمایاں ہوں گے
واہ کیا کیفیت آمیز زمانہ ہوگا	جبکہ ہم بے خبر شورشِ دوراں ہوں گے
غمِ پامالیِ حسرت سے نہ دل خوں ہوگا	نہ یہ اُمیدیں رہیں گی نہ یہ ارماں ہوں گے

اپنے مرنے کا عزیزوں کو بہت غم ہوگا | بعض سکتے میں رہیں گے کوئی نالاں ہوں گے
ہو ہی جائے گی مگر غم سے طبیعت خوگر | نہ ہم موجبِ آزارِ محباں ہوں گے
پھر یہی عیش و طرب ہوں گے یہی یار و رفیق | یہی دنیا یہی اس کے سروساماں ہوں گے
شاخ پر بیٹھ کے مرغانِ خوش الحانِ چمن | صورتِ نزہتِ مرحومہ غزل خواں ہوں گے

گائیں گے ہو کے ہم آواز ہمارے اشعار
اور ہم ساکنِ اقلیمِ خموشاں ہوں گے

ناظرین کو ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مرحومہ کس پایہ کی شاعرہ تھیں۔

اِن کی ایک اور نظم ہے۔ جس کا عنوان ''اے باپ'' ہے۔ اِس میں عہد رفتہ کا ماتم کیا گیا ہے اور اپنے والدِ ذی حشم کی محبت و شفقت کا تذکرہ کیا ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شب کو جب ہوتا ہے حاصل فکرِ دنیا سے فراغ | یادِ عہدِ رفتہ سے معمور ہوتا ہے دماغ
اس تماشا گاہ میں کُل واقعاتِ رنج و فرح | گھومنے لگتے ہیں چلتی پھرتی تصویروں کی طرح
دیکھ کر چھن جانے والے گوہرِ نایاب کو | دیکھ کر چھپ جانے والے رُوئے عالم تاب کو
مشتعل ہوتا ہے دل پہلو میں انگارے کی طرح | مرتعش ہوتا ہے رُخ پر اشک سیارے کی طرح
کھینچتی ہوں سینۂ سوزاں سے آہِ پُر شرر | پوچھتی ہوں جانبِ گردوں اُٹھا کر چشمِ تر
سچ بتا اے ماہتاب، اے عابدِ شب زندہ دار | تو نے دیکھا ہے کبھی مجھ سا حزیں مجھ سا فگار
لیلیِ شب کھا کے آنکھوں کی سیاہی کی قسم | کہہ رہی ہے تجھ سے روشن بخت میں دنیا میں کم
ہاں مری مونس ہے وہ جاں گراں قدر و عزیز | گنجِ ہفت اقلیم جس کے آگے بے قدر و ناچیز
ہے اسے ہر وقت میرے رنج و راحت کا خیال | کیوں مجھے غمگیں کرے پھر اپنی حالت کا خیال

اِسی نظم میں اُنھوں نے ایک جگہ اپنے بچپن کے تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ اسلوبِ بیان لائق توجہ ہے:

آہ میں ہرگز نہ بھولوں گی وہ ایامِ طرب | جب مجھے حاصل تھا بچہ کا محبت زا لقب
جب مجھے آتے تھے دُنیا کے یہی دو چار کام | کھیلنا۔ کھانا۔ پہننا۔ شادماں رہنا مدام
تھا یہ حالِ علم گر سیدھی لکیر ایک دیکھ لی | ہو کے خوش آہا الف آہا الف چلا اُٹھی
جب سرور و عیش افزودں تھا خرد کم عقل کم | جب پہیلی تھیں معما تھیں لغاتِ فکر و غم
لب تک آیا تھا نہ جامِ تشنگی افزائے علم | طبع تھی نا واقفِ تکلیفِ استسقائے علم

آہ میرا عہدِ طفلی تو بہ عہدِ سلطنت
کس قدر رشک آفریں تھا کس قدر پُر تمکنت

ایک اور نظم جس کا عنوان "جنگل" ہے کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ پاکیزگی زبان اور ندرت۔ تشبیہات قابل داد ہے:

واہ کیا جاں بخش ہے جنگل کا منظر وقتِ شام
کھل گیا دل اے ہوا کے سرد جھونکو! مرحبا

چھوڑ کام۔ اے بیوفا دولت کے شائق! چھوڑ کام
جلد آ۔ اے شاہدِ قدرت کے عاشق! جلد آ

الوداع۔ اے شہر کے ہنگامۂ گفت و شنید
ہے تخیل تجھ سے ثنا کی جیسے پالے سے گلاب

اے بیاباں! اے مجسّم شعر! تیری پاک دید
دل کشا ہے جیسے بعد ابرو باراں آفتاب

جھیل کے نغمے سکوتِ وشت سے کرتے ہیں چھیڑ
جیسے شب سے حمد و نعت عابدِ شب زندہ وار

ہے بپئے نظارہ ساحل پر کھڑا پیپل کا پیڑ
جس کا سایہ آگے بڑھ کر جھیل سے ہے ہمکنار

یہ شفق ہے یا ملک لائے ہیں جنت سے شراب
یا ردائے حور ہے شفاف و سرخ و لطف خیز

شام کی بازی میں ہے اک آتشیں گیند آفتاب
آتشیں گیند آب کے آئینہ میں ہے عکس ریز

اُردو کے علاوہ نزہت مرحومہ کو فارسی شاعری میں بھی دخل تھا۔ اگرچہ ان کا فارسی کا کلام ہم تک بہت کم پہونچا ہے۔ لیکن جو کچھ سامنے ہے وہی اپنے خالق کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ناظرین کی طبائع عالیہ کی ضیافت کے لئے اُن کا تھوڑا سا فارسی کا کلام نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد وہ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

"فردوسِ تخیل" میں ایک قصیدہ ہے جو "ذکرِ حبیب" کے نام سے موسوم ہے اور قاآنی کے رنگ میں کہا گیا ہے۔ اس میں اگرچہ الفاظ ہی الفاظ ہیں لیکن اس خوبی سے انھیں موزوں کیا گیا ہے کہ اس میں ترنمی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور بے ساختہ داد نکل جاتی ہے:

بہ چرخ و ارض و برّ و بحر غیر ذکر اللہ ہُو!
ہمہ ملعوں، ہمہ مفتوں، ہمہ افسوں، ہمہ جادو

لسانِ عاجز، دہانِ قاصر، زبانِ الکن، بیان کوتہ
ز وصفِ رب ز مدحِ شہ ز حمدِ ایں ز نعتِ اُو

شدت شاہا ز فضل و لطف و احسانِ عطائے رب
جہاں تابع زماں خادم زمیں جا کر فلک ہندو

منور جاں، مطہر جسم، عنبر زلف، شکر لب
مسیحا دم، سلیماں جاہ، یوسف چہرہ، موسیٰ خُو

نگہ جاں بخش و جاں افزا و جاں آسا و جاں پرور
ادا دل بر، عطا دل دہ، حیا دل کش، وفا دل جو

شہا! ما ئیم کج رفتار و خوار و زار و بد سیرت
توئی ہادی، توئی شافع، توئی راحم، توئی خوش خُو

ایک اور نظم جس کا عنوان "البلاغ المبین" ہے کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ نظم مذکور میں اُمتِ مرحوم کو مخاطب کیا گیا ہے اور اِسے منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہونے کی تلقین کی گئی ہے

اے قوم! چند فارغ و بیکار بہمت — غافل ز کیدِ دشمنِ عیار بہمت
تا چند خصم زرہ احباب یا بمت — تا چند خاک و رگِ اغیار بہمت
کج میروی، بہ منزلِ مقصود کے رسی — باغی ز طوعِ قافلہ سالار بہمت
اے کاش باز مصلحت اندیش خواہمت — اے کاش باز عاقل و ہشیار بہمت
اے در لبِ تو آبِ بقا! از چہ تشنۂ — اے عیسیٰ زمن! ز چہ بیمار بہمت
آئینۂ دولت بہ صفا عکس طور بود — حیف است گر در آئینۂ زنگار بہمت
اے نزہت! اے کہ مخزن راز است سینۂ — خواہم ز لب ہمیشہ گہر بار بہمت

جنسے نہ داشت شعر تو۔ الا دلم ربود
شاعر نامی۔ فسوں گر و سحار بہمت

ایک اور غزل ہے۔ جس کا عنوان "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما" ہے یہ حافظ کے ایک مشہور شعر پر تضمین ہے:۔

آہ کز گردوں گزشت آوازۂ تحقیر ما — در ملائک شد سحر محرومیٔ تقدیر ما
چرخ را صد رخنہ در جاں میکند یک تیر آہ — بسلے در خوں نہ غلطانید آہ از تیر ما
ہمچنیں باشیم در قعرِ مذلت سر نگوں — یا کند جولاں بہ گردوں مرکبِ توقیر ما
تارکِ آئینِ شرعِ پاک شد صنفِ رجال — آنکہ ہستِ از حکم رب فرماندۂ ما میر ما

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
"چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما"

نظم کے ساتھ ساتھ نزہت مرحومہ کو نثر پر بھی اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ حالانکہ ایک اچھا شاعر عام طور سے ایک اچھا نثار نہیں ہوتا۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ "استانی" میں (جو خواجہ حسن نظامی کی اہلیۂ محترمہ کے زیر ادارت دہلی سے نکلتا تھا) علی گڑھ کی ایک سخن گو خاتون کے نام سے شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے جب اوّل بار اِن کا مطالعہ کیا تو بہت متعجب ہوا، کیونکہ ان کی نظم کی طرح ان کی نثر بھی خوبی و عمدگی کا نمونہ نظر آئی۔ ناظرین کو اس سے روشناس کرانے کی غرض سے "استانی" میں شائع شدہ مضامین کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں،

لیکن قبل اس کے کہ مذکورہ بالا مضامین کے اقتباسات گوش گزار کروں مناسب خیال کرتا ہوں کہ کتاب "آئینۂ حرم" کا انتساب پیش کروں۔ کیونکہ یہ بہ ظاہر نثر کا ایک ٹکڑا ہے لیکن معنوی اعتبار سے ایک لبسیط مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی بہت ہی ہشیار جوہری نے نہایت بیش قیمت موتیوں کو چابکدستی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے:۔

"یہ آنسوؤں کی لڑی، یہ درد کی تڑپ، یہ سوزش کی آہ، ہاں ایک فریادی کا بستر حام، ایک ناشاد کی نوحہ گری، ایک زخمی کی چیخ، یعنی کتاب آئینۂ حرم، اسلام کے اُس سچے شیدائی، تعلیم نسواں کے اس زبردست حامی کے نامِ نامی سے منسوب و معنون کی جاتی ہے۔ جس کا فیضانِ تربیت اس مجموعۂ پریشاں خیالی کی تسوید و تشید کا معنوی سبب ہے اور جس کی قومی محبت وراثتی اثر و نسلی خصوصیت کے طور پر خاکسار مصنفہ کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ کے عام اصول کی مطابقت میں دریا کے سامنے قطرہ، خورشید کے حضور ذرہ، گلشن کے پاس پھول "گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ" کا نعرہ کلمہ پڑھتے ہوئے اپنی سعی بے حقیقت کو ہدیتاً پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ میرے جان سے زیادہ پیارے والد ماجد دام ظلہ العالی اِس نذرِ محقر کو خوشی کے ساتھ شرفِ قبولیت مرحمت فرمائیں گے۔

ہمتم بدرقۂ راہ کن اے طائرِ قدس
کہ دراز است رہِ منزل و من نوسفرم"

ایک مضمون اُنھوں نے رسالہ استانی کے تعارف میں لکھا تھا۔ اس کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے:۔

"رات کے دل افروز سکوت و ظلمت میں ایک بزمِ سرور منعقد کر کے لیمپ کی تیز روشنی کے سامنے ان استانی صاحبہ کو بٹھاؤ اور کچھ گنگنانے کی فرمائش کرو۔ خاموشی کے ساتھ ایسے شیریں نغمے فضائے ادب میں بلند ہوں گے کہ تم بھی مسحورانہ طور پر بے ساختہ ان کی ہم آواز ہو کر مترنم ہو جاؤ گی۔

ہاں ذرا یہ بھی یاد رہے غصہ تھوڑا بہت ان میں بھی ہے۔ ذاتی حملوں کے جواب میں تو یہ گونگے کا گڑ کھا لیں گی مگر اپنے غیر محدود حلقۂ درس میں کسی کی بے راہ روی گوارا کرنے والی

آسامی نہیں۔ ایسی کھری کھری سنائیں گی کہ جن پر چوٹ ہو گی اُنھیں بغلیں جھانکنے کے سوا کچھ بن نہ پڑے گی۔"

ان کا ایک اور مضمون ہے جس کی سُرخی "سیاسی استانی" ہے۔ جس میں سیاست کو مسلمان خواتین کے واسطے ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ موجودہ ادبار کی وجہ ہماری خواتین کی سیاست سے علیحدگی ہے۔ مضمون کی ابتدا یوں کرتی ہیں:۔

"آج ہم ایک چونکا دینے والی بات کہنا چاہتے ہیں۔ آج ہم خفتگانِ غفلت کو اچھل پڑنے کی دعوت دینے والے ہیں۔ آج ہمارا قصد ہے کہ گوشہ نشینانِ حرم کو سیاسی میدان میں مدعو کریں۔"

آگے چل کر اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر ہے:۔

"اب ذرا خوش نصیبی کے اُن ایام کا تصور ذہن میں تازہ کیجئے جب کرۂ ارض مسلم سواروں کی جولانیوں سے تھرا رہا تھا۔ جب فضائے آسمان اللہ اکبر کے رعشہ زا نعروں سے گونج رہی تھی۔ جب مخالفوں کے دل اسلام کی عظمت و جلال سے سینوں میں پنکھے کی طرح ہل رہے تھے۔ اُس زمانہ میں۔ آہ اُس نشاط آگیں زمانہ میں پیکر اسلام کا نصف حصّہ آج کی طرح خوف از کار رفتہ نہ تھا

عضوِ مفلوج کی مانند نہ بے کار تھے ہم
قصرِ اسلام کی تعمیر میں معمار تھے ہم

مسلمان خواتین کے بے شمار مذہبی، سیاسی، اور علمی کارناموں سے تاریخ عالم لبریز ہے۔ اور اِن کے دُہرانے کے لئے ایک ضخیم تصنیف درکار ہے۔ میں یہاں ضرورتاً صرف اُن خواتین کے نام یاد دلانا چاہتی ہوں جنھوں نے نہ صرف علم و حکمت کی بزموں میں بلکہ عزت و دولت کی فیصلہ کن رزموں میں اپنے فرقہ کے اعلیٰ سپاہیانہ اوصاف کا ثبوت دیا۔ مسلمان خاتون نے رضیہ سلطانؒ، چاند بی بی، نور جہاں، ترکان خاتون وغیرہم کی شکل میں تاج پوش ہو کر یا بے تاج پہنے سلطنت رانی کی اور حضرت عائشہؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، خولہؓ، ام ابانؓ، ام حرامؓ، ام حکیمؓ، ام عمارہ وغیرہم کے پیکر خاکی میں شہسواری اور تیغ آزمائی کے جوہر دکھائے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق ہیں۔ اگرچہ مرحومہ کا نثر کا ذخیرہ نظم کے مجموعہ سے کم ہے۔ اور خصوصیات کے لحاظ سے بھی اس کا ہم پلہ نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود کافی و وافر ہے اور بڑی حد تک پُرلطف و دل کش کہلانے کا مستحق ہے۔ اگر آپ اِن کے مضامین کو پڑھیں تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو کچھ نزہت مرحومہ کے بارے میں

عرض کیا گیا ہے اس میں مبالغہ یا حسنِ ظن کا شائبہ تک نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔

نزہت مرحومہ کی زندگی اگرچہ تنوع سے خالی تھی اور اس قسم کے واقعات پیش نہ آئے جن کا تذکرہ یہاں ضروری خیال کیا جاتا اور جو ان کی بڑائی پر دلالت کرتے۔ لیکن ان کی ذہانت و ذکاوت، لیاقت و قابلیت انھیں عام سطح سے بلند کئے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں، جنھوں نے مجھے انھیں مضمون ہٰذا کے ذریعہ ادبی حلقہ سے متعارف کرانے پر آمادہ کیا۔ مختصر عمر میں اور چہار دیواری کے اندر رہ کر اس قدر استعداد کا بہم پہونچانا اور بیرونی دُنیا سے باخبر رہنا لائق صد ستائش ہے۔ مولانا سیّد احمد صاحب کے صاحبزادہ نے (جو ان کے ہم سبق رہ چکے ہیں) مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کے والد بزرگوار مرحومہ کی فہم و فراست کے بہت مدّاح تھے۔ موصوف جیسے عالم کی جس ذات کے متعلق اچھی رائے ہو اس کی لیاقت میں پھر کسے کلام ہو سکتا ہے۔

ادب کی تیسری صنف یعنی مراسلات میں بھی ان کا پایہ عام لوگوں سے بلند تھا۔ اگرچہ ان کے خطوط قابلِ ذکر خوبیوں کے حامل نہ ہوتے تھے اور نہ ہی ان میں کوئی ندرت ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مروجہ روش سے جداگانہ اور دلچسپ ہوتے تھے اور ان کے دوستوں کے لئے مایہ انبساط و بہجت۔

مختصر یہ کہ نزہت مرحومہ کی ذات خوبیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ تھی۔ پاکیزہ جذبات و اعلیٰ خیالات اور لیاقت و قابلیت کے امتزاج نے ان کے کلام کو رفعت و تاثیر عطا کر دی۔ ان کی نظم اور نثر دونوں وجد آگیں ہیں۔ مطالعہ کے اعادہ سے شان کیفیت بجائے زائل ہونے کے اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور ہر مرتبہ دل و دماغ ایک نیا حظ محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مادرِ ہند نے ان جیسی شاعرات بہت کم پیدا کی ہیں۔ اس دَور میں ان کی نظیر ملنی اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحومہ کو غریق رحمت کرے۔ ان کی جانفشانیوں کو بار آور کرے۔ یعنی لوگ ان کی خاطر خواہ قدر و منزلت کریں۔ ان کا نام رہتی دنیا تک آسمانِ شہرت پر تاباں رہے۔ اور اس بلبلِ خوش نوا کے گیت سدا سامعہ نوازی کرتے رہیں۔ ان کی زندگی اور خیالات دوسری خواتین اور خاص کر ہمارے خاندان کی مستورات کے واسطے مشعلِ ہدایت بنیں اور انھیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق ہو۔

اپنے اس مضمون کو مرحومہ کے دو بندوں پر قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

یہ بند اُس نظم کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو اُنھوں نے اپنے محبوب بھائی کی موت پر کہی تھی اور جو اَب خود ان پر بھی صادق آتے ہیں: ؎

کیا بتاؤں کہ پسِ مرگ وہ کیسی تھیں | کوئی اُن سا نظر آئے تو کہوں ایسی تھیں
بس مرے جی ہی کو معلوم ہے وہ کیسی تھیں | جیسے اس دہر میں جی سکتے نہیں ویسی تھیں

میں تو میں ان کے لئے روتے ہیں بیگانہ وغیر
اس مسلہ کا ہیں ماتم کدہ میخانہ و دیر

ایک موتی تھا گرا ہاتھ سے اور پھر نہ ملا | ایک مٹی کا کھلونا تھا گرا ٹوٹ گیا
رہ گئی دیکھتی کی دیکھتی چشمِ بینا | کیا ہوا کیا نہ ہوا کچھ نہ سمجھ میں آیا

نہ ہوئے عہدہ برآ بختِ نگونسار سے ہم
رہ گئے سر کو پٹکتے در و دیوار سے ہم

ممتاز علی خاں

ذوقِ عمل

(از حضرت علامہ سلیم پانی پتی مرحوم)

ان کے دل پر، دل کو جو بے چین کر سکتے نہیں
انقلابِ دہر کے صدمے گزر سکتے نہیں
جن کی شخصی زندگی ہے عین قومی زندگی
اُن کو جینے کا سلیقہ ہے وہ مر سکتے نہیں
پستیٔ فطرت سے جو رہتے ہیں اکثر خود غرض
نقش اُن کے امتیاز دل کے اُبھر سکتے نہیں
جن کا دل پاکیزہ ہے، جن کا چلن ہے آبدار
وہ عزیزوں کی نگاہوں سے اُتر سکتے نہیں
جو امانت میں رہے سچے، دیانت میں کھرے
ہاتھ اُن کے چھوٹے ہو کر بھی اُتر سکتے نہیں
اجتماعِ قوم سے جن کو رہی اُلفت سدا
ہوش اُن کے وقت کلفت بھی بکھر سکتے نہیں

جن کے چہروں پر کدورت دل کی ہو چھائی ہوئی
رنگ غازوں سے کبھی اُن کے نکھر سکتے نہیں
جو خفا تہذیب سے ہوں، جن کی عادت ہو جفا
سامنے اہلِ وفا کے وہ ٹھہر سکتے نہیں
گھر کی بگڑی تربیت نے گر بگاڑا ہو تمھیں
مدرسوں میں جا کے تم ہرگز سنور سکتے نہیں
زندگی ہو جن کی آوارہ، پریشاں ہو نظر
منزلِ مقصد پہ وہ زنہار اُتر سکتے نہیں
جن کے باطن میں نہ اُتری ہو حقیقت کی شعاع
اہلِ باطن سے وہ آنکھیں چار کر سکتے نہیں
یہ بھی کیا تعلیم ہے، مذہب سے رہنا بے نیاز
سرکشی ایسی کہ گویا سجدہ کر سکتے نہیں
ہو بھنور در پیش جن کو ترکِ مذہب کا سلیم
کشتیٔ تہذیب میں وہ پار اُتر سکتے نہیں

دارالمصنفین اعظم گڑھ

(از مولوی محمد عزیر صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی)

مسلمانانِ ہند کی مختلف انجمنوں میں دارالمصنفین ہی وہ تنہا انجمن ہے جس نے مال و دولت اور دنیاوی اعزاز سے بے پروا ہوکر قوم کی دماغی نشوونما اور علمی خدمت کو اپنا مقصود بنایا ہے۔ اس کا نصب العین اسلام، تمدن اسلام، تاریخ اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کی زبان و ادب کی خدمت ہے۔

جدید تعلیم کی ترقی سے ہمارے قدیم علوم و فنون نظرانداز ہوتے جارہے ہیں اور قوم میں اُن کی طرف سے بیگانگی بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہم اسلامی تمدن اور اپنے اسلاف کے علمی کارناموں سے بھی ناآشنا ہوتے جارہے ہیں، اور یوں اپنے ماضی سے ہمارا تعلق منقطع ہورہا ہے۔ کوئی قوم اپنے ماضی سے بےتعلق ہوکر ترقی نہیں کرسکتی۔ اگر کریگی تو پھر وہ ایک نئی قوم بن جائے گی جس سے اُس کی اصلی خصوصیات زائل ہوچکی ہوں گی۔ اس صورت میں قوم میں ایک ایسی جماعت کی موجودگی نہایت ضروری ہے جو اپنے مذہبی علوم اور بزرگوں کے علمی ترکہ کی حفاظت کرتی رہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس جماعت کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے علوم و فنون کو زمانہ جدید کے مذاق کے مطابق نئے اسلوب سے مرتب کرکے پیش کرے تاکہ وہ بھی توجہ کی نظر سے دیکھے جائیں اور اُن کی قدر و قیمت کا بھی صحیح اندازہ کیا جاسکے۔ مسلمانوں نے تاریخ، جغرافیہ، طب، کیمیا، طبیعیات، فلسفہ اور ریاضیات وغیرہ میں جو گراں قدر تحقیقات کی ہیں اُن سے آج کی علمی دنیا بہت کم واقف ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسی جماعت موجود نہ تھی جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں سے دنیا کو باخبر کرتی۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا اُسے مغرب کے اہل علم نے انجام دیا اور مستشرقین کی جماعت نے مسلمانوں کے علوم و فنون کی حفاظت اور اشاعت کو اپنی تحقیق و تفتیش کا مقصود قرار دیا۔ ہم ان علماء کے نہایت درجہ ممنون ہیں کہ ان کی کاوش سے ہمارے بزرگوں کا اندوختہ

تلف ہونے سے محفوظ ہو گیا۔ لیکن شکریہ کے ساتھ یہ شکایت بھی ہے کہ انہی مستشرقین میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جس نے تحقیق و ریسرچ کے نام سے اسلام، پیغمبر اسلام، اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن پر کلیسائی تعصب کے ساتھ حملے شروع کر دیے۔ یورپ کے اس "تحقیقی" لٹریچر نے جو زہر پھیلایا ہے اُس سے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دماغ شدت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے مغربی "تحقیق" کے اِن نتائج کو محسوس کیا اور پھر اپنی ساری کوشش اس زہر کا تریاق فراہم کرنے میں صرف کی۔

عہد عباسیہ میں جب غیر اسلامی علوم مسلمانوں میں اشاعت پانے لگے تو اسلامی لٹریچر میں بھی نمایاں تبدیلیاں کی گئیں۔ چنانچہ جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے:۔

"ایک گروہ نے علوم و فنون کے ترجمہ سے عربی زبان کو مالا مال کیا۔ ایک دوسرے گروہ نے اسلامی علوم و آداب کی سادہ دیواروں پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں۔ عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی۔ اصول فقہ میں منطقی استدلال پیدا ہوئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہوئی۔ فرائض میں علم حساب کے دقیق مسائل شامل ہوئے، علوم یونان و ہند میں جہاں غلطیاں دیکھیں اُن کی اصلاح کی اور جہاں خامیاں نظر آئیں اُنھیں پورا کیا۔"

جس طرح عہد عباسیہ میں علوم و آداب میں انقلاب کی ضرورت محسوس کی گئی تھی اُسی طرح موجودہ زمانہ میں قدیم علوم و فنون کو جدید اسلوب پر مرتب کرنے کا خیال مولانا شبلی کو پیدا ہوا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ آل عباس تاج و تخت کے مالک تھے۔ اُنھوں نے بغداد میں بیت الحکمتہ قائم کر کے مختلف علوم و فنون کے اہل کمال کو جمع کر لیا۔ شبلی کا سرمایہ خلوص نیت، اسلامی غیرت، اور قومی حمیت کے سوا صرف چند مخلص احباب اور تلامذہ تھے۔ انہی کے سامنے اُنھوں نے تصنیف و تالیف کا ایک خاکہ پیش کیا جس کے خاص عنوانات حسب ذیل تھے:۔

۱۔ فلسفہ جدید کو ملکی زبان میں منتقل کرنا اور اُس کے مسائل پر جدید علم کلام کے رنگ میں روشنی ڈالنا۔ ۲۔ مختلف علوم اسلامیہ مثلاً تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت اور تحقیقات مذاہب پر زمانہ حال کے علمی انداز میں کتابیں تالیف کرنا۔ ۳۔ مخصوص علوم دینیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تصوف اور کلام کو نئے رنگ میں پیش کرنا۔ ۴۔ علوم اسلامیہ کی تدریجی ترقیوں پر تبصرہ اور تنقید کرنا۔ ۵۔ عربی فارسی اور اردو ادبیات کی تاریخ مرتب کرنا۔ ۶۔ اسلامی تہذیب و تمدن پر نئے انداز سے نظر ڈالنا اور

تہذیب اسلامی اور تمدن جدید کے تعلقات کی تشریح کرنا۔

اس خاکہ کو عملی شکل دینے کے لئے سب سے پہلی ضرورت ایک علمی مجلس کی تھی جس کے ارکان دوسرے مشاغل سے یکسو ہو کر اپنی خدمات اس مقصد کے لئے وقف کر دیں۔ مولانا شبلی نے جس وقت اس تخیل کو پیش کیا اُس وقت ہندوستان کے مختلف حصّوں میں قومی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور تعلیمی انجمنیں قائم تھیں جو اپنے اپنے دائرہ میں مفید خدمات انجام دے رہی تھیں۔ مگر مصنّفین کے لئے کوئی مرکزی ادارہ موجود نہ تھا۔ جن اہلِ علم کو تصنیف و تالیف کا ذوق تھا وہ انفرادی طور پر کتابیں لکھتے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر کوئی خاص لائحہ عمل نہ تھا۔ اس لئے اُن کی تالیفات سے اُن مقاصد کی توقع بھی نہیں کیجا سکتی تھی جن کو مولانا شبلی نے اپنے خاکہ میں سامنے رکھا تھا۔ علاوہ بریں مصنّفین کے لئے ایک بہت بڑی مشکل کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا مسئلہ تھا۔ یہ مشکل قدما کے سامنے نہ تھی۔ اُن اہلِ فضل کے علاوہ جو بغداد کے بیت الحکمۃ سے وابستہ تھے۔ سیکڑوں مصنّفین ایسے بھی تھے جو سلاطین اور اُمرا کی فرمائش پر کتابیں لکھتے تھے اور یہ کتابیں اُنہی سلاطین اور اُمرا کے نام معنون کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور اُن کے درباری اُمرا کی علم نوازی سے بڑی بڑی کتابیں وجود میں آگئیں۔ سلاطین مغلیہ کی روایات کی زندہ مثال ہمارے زمانہ میں حضور نظام کی شاہانہ فیاضیاں ہیں۔ دولتِ آصفیہ نے علوم و فنون کی سرپرستی میں جس دریا دلی کا ثبوت دیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ لیکن مولانا شبلی کے پیشِ نظر جو علمی ادارہ تھا اُس کی بنیاد وہ شاہانہ عطیوں پر نہیں بلکہ ایثار و خدمت پر رکھنا چاہتے تھے۔

ملک میں اہلِ قلم کی ایک مخصوص حیثیت ہوتی ہے۔ ایک بلند پایہ مصنّف بمنزلہ معلم کے ہوتا ہے۔ وہ اپنا علمی سرمایہ قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بہترین متاع قوم میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اُس کی کتاب اُس کی برسوں کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کا حاصل ہوتی ہے۔ قوم کے خیالات کی اصلاح جس پر اُس کی ترقی کا بہت کچھ مدار ہے زیادہ تر اُس کے اہلِ قلم کی کوششوں پر موقوف ہے۔ وہی اُس کے لئے تعلیمی نصاب مرتب کر سکتے ہیں۔ وہی اُس کے تاریخی کارناموں سے اُسے باخبر کر سکتے ہیں۔ وہی اُس کے مذہبی لٹریچر کی اشاعت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ آج کل مغربی علوم و فنون کی تعلیم کے لئے مغربی زبانوں کی تحصیل پر جس قدر توجہ صرف کی جا رہی ہے اُس سے یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ اسلامی علوم کو قدیم اسلامی زبانوں میں حاصل کرنے کی اہلیت

ہندوستان کے مسلمانوں سے روز بروز رخصت ہوتی جائے گی اور عربی، فارسی پڑھنے والے بہت کم رہ جائیں گے۔ ایسی صورت میں ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے علمی سرمایہ کو جو تیرہ سو برس سے جمع ہوتا آیا ہے قومی زبان میں منتقل کر کے قوم کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ بالخصوص اس حالت میں جبکہ تعلیم کے لئے ملکی زبان کا مسئلہ نہایت اہم ہوگیا ہے اور ماہرین تعلیم کے نزدیک علوم وفنون کی تحصیل کے لئے مادری زبان کا ذریعہ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے کام کے لئے اہلِ علم کی ایک ایسی مستقل جماعت کی ضرورت ہے جو اس مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکی ہو اور ہمہ تن اس خدمت میں مصروف رہ سکے۔ دارالمصنفین کی تشکیل اسی ضرورت کے احساس کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں صرف قدیم علوم وفنون کافی نہیں ہو سکتے۔ آج ہمارے لئے علوم جدیدہ کا حاصل کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے ان علوم کو قومی زبان میں منتقل کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لی ہے، مگر اس کے پیش نظر زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جو جامعہ کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں۔ علوم وفنون کے اُس حیرت انگیز ذخیرہ سے جو مغرب نے چند صدیوں میں جمع کر لیا ہے ابھی ہماری ملکی زبانوں میں عشر عشیر بھی نہیں آسکا ہے۔ خود اسلام کے متعلق بھی یوروپین زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے ہماری قوم کے بہت کم افراد واقف ہیں۔ ان وجوہ سے ایک ایسی خالص علمی مجلس کی تاسیس کی ضرورت تھی جو مستند مصنفین پر مشتمل ہو، اور تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے تربیت گاہ کا کام دے۔ پھر ان مصنفین کے مطالعہ اور تصنیفی ضروریات کے لئے ایک وسیع کتب خانہ بھی ناگزیر تھا، اور طباعت واشاعت کے دشوار گزار مراحل طے کرنے کے لئے ایک پریس اور تجارتی مکتبہ کی بھی ضرورت تھی۔

یہی وہ تخیلات تھے جو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم کے ذہن میں آئے اور انھوں نے ایک علمی مجلس دارالمصنفین کے نام سے قائم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن شروع میں دارالعلوم ندوہ اور سیرت نبویؐ کی تالیف کی مصروفیت کی وجہ سے اس خیال کو عمل میں لانے کا موقع نہ ملا۔ مگر ۱۹۱۳ء میں جب وہ ندوہ کی خدمات سے سبکدوش ہوئے تو اس کے چند مہینوں کے بعد الہلال (کلکتہ) کے ذریعہ انھوں نے اس تجویز کو ایک مرتب شکل میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تازہ تالیف حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں :-

"ابتداء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ چند طلبہ خود مولانا کے ساتھ

رہیں اور ان کو خاص خاص فنون میں تیار کرایا جائے۔ چنانچہ وہ مجھی کو جون ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "آزاد سے مشورہ ہوا۔ رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے۔ اس لئے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں اور اُن کو کسی فن میں تیار کروں، اور صحیح مذاق اُن میں پیدا کرایا جائے۔ ان کے مصارف کا تکفل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا۔ اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو، اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو۔ نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہیئے۔ اس میں کچھ ماہوار تم بھی دو۔"[۵۱]

مولانا شبلی مرحوم نے دارالمصنفین کے لئے جو تعلیمی خاکہ مرتب کیا تھا اُسے سید صاحب نے بجنسہٖ نقل کر دیا ہے۔

۱۔ مدت تعلیم دو سال۔

۲۔ اس کی دو شاخیں ہوں گی۔ تکمیل[۱] و تصنیف[۲]۔

۳۔ ہر طالب علم جو صرف و نحو کافی جانتا ہو اس درجہ میں داخل ہو سکے گا۔

۴۔ اس درجہ میں داخل ہونے کے لئے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔

درجہ تکمیل۔ اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے۔ ادب اور علوم ثلثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن مجید مع تفسیر، حدیث، علم کلام مع فلسفہ۔

درجہ تصنیف۔ (۱) اس میں وہ شخص شامل ہو سکے گا جس کو انشاپردازی کا فی الجملہ مذاق ہو اور عربی صرف و نحو کافی طور سے جانتا ہو، اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص عمدہ انشاپرداز ہو لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اُس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے۔

(۳) طریقہ تعلیم فن تصنیف۔

۱۔ پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوان دئے جائیں گے اور مضامین لکھوائے جائیں گے۔

۲۔ پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے۔

۳۔ ہر مضمون کے متعلق اس کے ماخذ بتائے جائیں گے اور تمام ماخذ مہیا کر دئے جائیں گے کہ مطالعہ کر سکے۔

۴۔ پھر (یوں ہی یہ عبارت ناتمام رہ گئی ہے)"[۵۲]

---

[۵۱] حیات شبلی ص ۶۹۲

[۵۲] حیات شبلی ص ۶۹۶

ابتداءً مولانا شبلی مرحوم کی خواہش یہ تھی کہ دارالمصنفین ندوہ ہی میں قائم کریں، مگر ارکان ندوہ کے ساتھ جو تلخ تجربات انھیں پیش آئے اُن کی وجہ سے وہ اس ارادہ کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے اور اپنے وطن اعظم گڑھ کی پُرسکون فضا کو اس علمی ادارہ کے لئے موزوں خیال کیا۔ چنانچہ اپنا ایک وسیع باغ اور دو کچے بنگلے دارالمصنفین کے لئے وقف کر دئے اور اپنی اور اپنے بعض اعزہ کی کتابیں کتب خانہ دارالمصنفین میں منتقل کر دیں۔ چونکہ ابھی تک کسی مالی آمدنی کا انتظام نہ تھا اس لئے درجہ تکمیل کے وظائف کے لئے تیس ۳۰ روپئے ماہوار مولانا نے خود منظور کئے اور اسی قدر مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم نے (جو مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے) مقرر فرمائے۔ ان ابتدائی کارروائیوں سے فارغ ہو کر مولانا نے اپنے بعض مخصوص شاگردوں کو خطوط بھیجے کہ اعظم گڑھ آنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن اسی درمیان میں ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو خود اُن کا سفر آخرت پیش آگیا اور دارالمصنفین کی تکمیل کی حسرت ساتھ لے گئے۔

مولانا کے انتقال کے وقت دارالمصنفین کا تخیل صرف اس حد تک عمل میں آسکا تھا کہ اس کے لئے ایک باغ، دو کچے بنگلے اور چند سو کتابیں وقف کر دی گئی تھیں۔ وفات کے تیسرے روز مولانا حمیدالدین مرحوم کی دعوت پر ایک عارضی مجلس اخوان الصفا کے نام سے قائم کی گئی جس کے صدر مولانا حمیدالدین صاحب، ناظم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مہتمم مولانا مسعود علی صاحب ندوی مقرر ہوئے۔ اس مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلا کام سیرت نبویؐ کی تکمیل ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم اور مولانا سید سلیمان صاحب سرکار عالیہ بھوپال فردوس مکاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سرکار عالیہ نے سیرت نبویؐ کا ماہوار وظیفہ بدستور جاری رکھنے کا حکم صادر فرمایا۔ ۲۴ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اعظم گڑھ میں اعیان شہر کی ایک مجلس منعقد کی گئی جس میں مولانا شبلی مرحوم کے احباب خاص مرزا محمد سلیم مرحوم اور مرزا محمد نعیم مرحوم کا باغ بھی جو مولانا کے موقوفہ باغ سے ملحق تھا دارالمصنفین پر وقف کیا گیا۔ لیکن ابھی تک دارالمصنفین کے لئے کسی سرمایہ کا انتظام نہ تھا۔ چنانچہ بھوپال سے واپس آنے کے بعد مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم نے حیدرآباد تشریف لیجا کر اس بات کی کوشش فرمائی کہ مولانا شبلی مرحوم کے وظیفہ کی رقم جو تین سو ۳۰۰ روپئے ماہوار تھی دارالمصنفین کو منتقل کر دی جائے۔ اور نواب عماد الملک مرحوم اور سر اکبر حیدری مرحوم کی سفارش سے حضور نظام نے اسے منظور فرما لیا۔

۴ر جون ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں دارالمصنفین کی باضابطہ رجسٹری بھی ہو گئی۔ اس کے بعد ایک

مجلس انتظامیہ بنائی گئی جس کے ارکان ملک کے ممتاز اہلِ قلم تھے۔ اس مجلس کی صدارت نواب عماد الملک مرحوم نے قبول فرمائی جن کے قیمتی مشوروں اور گراں قدر عطیات سے دار المصنفین کو بڑی مدد ملی۔ نائب صدر کا عہدہ جسٹس سید کرامت حسین مرحوم نے قبول فرمایا۔ علوم جدیدہ کی ترتیب و تالیف سے متعلق موصوف کے مفید مشورے دار المصنفین کی رہنمائی کا باعث ہوئے۔ مجلس انتظامیہ کے ارکان میں سے چند ممبر منتخب کر کے ایک مجلس عاملہ قائم کی گئی جس کی صدارت مولانا حمید الدین صاحب کو تفویض ہوئی۔ اس کے ناظم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مہتمم مولانا مسعود علی صاحب ندوی مقرر ہوئے۔ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی وفات پر مجلس عاملہ کے صدر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی منتخب ہوئے، جو بفضلہٖ اس وقت تک دار المصنفین کی مسندِ صدارت کی زینت ہیں۔

دار المصنفین کی تاسیس کے دو سال بعد اس کے مختلف شعبے علٰحدہ علٰحدہ قائم ہو گئے یعنی (۱) صیغہ سیرت نبویؐ۔ (۲) صیغہ دار التالیف۔ (۳) صیغہ دار الطباعت۔ (۴) صیغہ دار الاشاعت۔ (۵) صیغہ رسالہ معارف (۶) صیغہ دار الکتب۔ (۷) صیغہ تعمیرات۔ یہ صیغے رفتہ رفتہ ترقی کر کے جس حد تک پہونچ چکے ہیں اُس کا اندازہ تصریحاتِ ذیل سے ہوگا:۔

۱۔ صیغہ سیرت نبویؐ۔ اس صیغہ کی تمامتر ذمہ داری مولانا سید سلیمان ندوی، ناظم دار المصنفین کے سر عائد ہوئی۔ مولانا شبلی مرحوم نے سیرت کی صرف پہلی جلد مکمل کی تھی اور دوسری کا صرف ایک حصہ لکھا تھا۔ سید صاحب نے دوسری جلد کی تکمیل کی اور اس کے بعد تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلدیں بھی لکھیں۔ سیرت النبیؐ کی یہ جلدیں دار المصنفین کا ایک عدیم المثال کارنامہ ہیں۔ آنحضرت صلعم کے سوانح حیات تو پہلی دو جلدوں میں آ گئے ہیں۔ باقی جلدیں معجزہ کی حقیقت اور اُس کے امکانِ وقوع، خصائص نبوت، منصب نبوت، عبادات اور اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ یہ جلدیں گویا اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہیں جن میں پیغمبرِ اسلام اور اسلام کے متعلق تمام ضروری معلومات نہایت تحقیق کے ساتھ فراہم کر دی گئی ہیں۔

۲۔ صیغہ دار التالیف۔ یہ صیغہ سیرت نبویؐ کے علاوہ دیگر اہم تالیفات کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس میں کچھ مصنفین اور رفقاء ایسے ہیں جو مستقل طور پر دار المصنفین سے وابستہ ہیں۔ اِن کے سوا باہر کے بعض مصنفین اور مترجمین بھی اس کے حلقہ میں شامل ہیں جو اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے یہاں بھیجتے ہیں۔ دار المصنفین کے ابتدائی دَور میں اس صیغہ میں صرف دو مصنف تھے، مولانا

سید سلیمان صاحب ندوی جو دکن کالج پونہ کی پروفیسری چھوڑ کر اپنے استاد مولانا شبلی مرحوم کی خواہش کے مطابق یہاں چلے آئے تھے، اور مولانا عبد السلام ندوی، مولانائے مرحوم کے دوسرے شاگرد جو اسی غرض سے الہلال (کلکتہ) کے صیغہ ادارت سے الگ ہوگئے تھے۔ بعد میں مندرجۂ ذیل رفقاء تصنیف و تالیف کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دار المصنفین میں داخل ہوئے:۔

مولانا عبد الباری صاحب ندوی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔ مولوی سعید صاحب انصاری۔ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی۔ مولوی ابوالحسنات صاحب ندوی۔ سید نجیب اشرف صاحب ندوی، پروفیسر اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی)۔ مولوی ابو الجلال صاحب ندوی، سابق پرنسپل جمالیہ عربک کالج مدراس۔ اور یہ راقم۔

مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے دورانِ رفاقت ہی میں وفات پائی۔ حاجی معین الدین صاحب مرحوم دار المصنفین سے علیحدہ ہونے کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل ہوگئے تھے مگر افسوس کہ تھوڑے دنوں کے بعد اُن کا بھی انتقال ہوگیا۔ باقی رُفقاء نے اپنی مدتِ رفاقت ختم کرکے دوسرے علمی مشاغل اختیار کرلئے۔ اِس وقت جو حضرات دار المصنفین میں قیام رکھتے ہوئے صیغہ تالیف کے مستقل ارکان کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ مولانا عبد السلام صاحب ندوی۔ مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی۔ مولوی ریاست علی صاحب ندوی۔ مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم۔ اے۔

اِس وقت تک دار المصنفین کے مصنفین اور مخصوص رُفقاء، نیز رفقائے اعزازی نے جو کتابیں تالیف و ترجمہ کی ہیں اُن کی تعداد چھیاسٹھ ۶۶ ہے، جن میں سے ہر ایک کی اوسط ضخامت ساڑھے تین سو صفحات ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کتابیں ذیل کے عنوانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں:۔

(۱) **سِیَر** ۔ سیرت نبویؐ کی چھ جلدوں کے علاوہ دار المصنفین کا ایک نہایت شاندار کارنامہ صحابہ کرامؓ کے حالاتِ زندگی ہیں جو یہاں کے مختلف رفقاء نے دس جلدوں میں مرتب کئے ہیں۔ صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مکمل تالیف ابتک اُردو زبان میں موجود نہ تھی، بلکہ اہل نظر کا خیال ہے کہ عربی میں بھی کوئی کتاب اس جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔

(۲) **سیر الصحابہؓ** کے اس سلسلہ کے علاوہ بعض بزرگانِ دین کے حالات میں بھی چند مستند کتابیں شائع کی گئیں، مثلاً حیاتِ امام مالکؒ۔ سیرتِ عائشہؓ اور سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

اس ذیل میں رقعاتِ عالمگیر کی ترتیب بھی قابلِ ذکر ہے جن کی پہلی جلد ایک مفصل مقدمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

(۳) **تاریخ علوم و فنون**۔ دارالمصنفین کے پیشِ نظر اسلامی علوم و فنون کی تاریخ بھی شروع سے رہی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ارض القرآن حصہ اوّل و دوم، تاریخ فقہ اسلامی، اور طبقات الامم شائع ہو چکی ہیں۔

(۴) **تاریخ ممالک**۔ تاریخ سسلی کی دو جلدوں کے علاوہ ایک مستقل سلسلہ تاریخ اسلام کا شروع کر دیا گیا تھا جس میں تاریخ اسلام کے دو پہلے حصے اور دولتِ عثمانیہ کی دو جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلہ کی باقی جلدیں زیرِ ترتیب ہیں۔

(۵) **فلسفۂ تاریخ** میں ایک کتاب کا ترجمہ **انقلاب الامم** کے نام سے اور دوسری کتاب "تاریخ اخلاقِ اسلام" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

(۶) **فقہ** میں اب تک دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ "القضاء فی الاسلام" اور "اسلامی قانون فوجداری"۔

(۷) **جدید علم کلام** میں "الجہاد فی الاسلام" کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین ہی سے شائع ہوا تھا۔

(۸) **فلسفۂ جدید** میں چند اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ برکلے، مکالمات برکلے، نٹشے، مقالہ روسو، ابن رشد، مبادی علم انسانی، روح الاجتماع اور نفسیاتِ ترغیب۔

(۹) **ادبیات** کے سلسلہ میں شعر الہند حصہ اول و دوم اور گلِ رعنا دارالمصنفین کی مشہور کتابیں ہیں۔ اسی سلسلہ میں مولانا شبلی مرحوم کے مقالات بھی آتے ہیں جو آٹھ حصوں میں شائع کئے گئے ہیں اور مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی، فلسفیانہ اور سیاسی مضامین پر مشتمل ہیں۔

(۱۰) **لغت**۔ ایک مستند عربی اردو لغت کی ضرورت بھی ملک میں عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ دارالمصنفین نے اس ضرورت کو بھی پورا کیا۔ اور **لغاتِ جدیدہ** کے نام سے ایک اوسط درجہ کا جامع لغت شائع ہو گیا ہے۔

ان مستقل تالیفات کے علاوہ رفقائے دارالمصنفین نے مختلف عنوانوں پر علمی رسالے بھی لکھے ہیں۔

شعبہ دارالتالیف کی ایک اہم علمی خدمت یہ بھی ہے کہ اطرافِ ملک سے اسلامی علوم و تاریخ و عقائد و مسائلِ دینیہ کے متعلق کثرت سے استفسارات آتے رہتے ہیں۔ ان کے جوابات نہایت تحقیق کے ساتھ لکھ کر بھیجے جاتے ہیں۔

اُردو زبان کی مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ دارالمصنفین نے عربی زبان کی بھی بعض مستند کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر یہ ہیں:۔

ابو مسلم اصفہانی کے تفسیری اجزاء۔ نظام القرآن کے مختلف اجزاء۔ مولانا سید عبدالحیٔ مرحوم کی ایک مبسوط تاریخ ہند۔ مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری کا عربی دیوان۔ ابوالعلامعری کے سوانح حیات اور اُس کے کلام اور بعض مختلف فیہ اجزائے سوانح پر تنقید۔

۳۔ صیغہ دارالطباعت۔ دارالمصنفین کی تمام اُردو کتابیں اسی کے مطبع معارف میں طبع ہوتی ہیں اور کتابت وطباعت کی خوبیوں کے لحاظ سے ملک میں خاص امتیاز رکھتی ہیں۔

۴۔ صیغہ دارالاشاعت۔ اس صیغہ میں زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم اور مصنفین ٭ رفقائے دارالمصنفین کی کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اُردو اور مکتبۂ جامعہ ملیہ کی کتابیں بھی اس میں شامل ہیں۔ علاوہ بریں ملک کے دیگر مشاہیر کی کتابیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ صیغہ اُردو زبان کا ایک مستند علمی ذخیرہ بن گیا ہے۔ یہاں سے صرف سنجیدہ کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

۵۔ صیغہ رسالہ معارف۔ معارف مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ ہے جس کا پہلا نمبر قیام دارالمصنفین کے ڈیڑھ، دو سال بعد جولائی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ شروع میں اس کی ضخامت ساٹھ صفحے تھی اور مضامین زیادہ تر رفقائے دارالمصنفین کے ہوتے تھے، مگر دو ہی سال کے بعد اس کے صفحات کی تعداد اسّی کر دی گئی اور اس کے قلمی معاونین کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ یہ رسالہ اپنے سنجیدہ اور محققانہ مضامین کے لحاظ سے علمی رسالوں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہے اور نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

۶۔ صیغہ دارالکتب۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنا ذاتی کتب خانہ ندوہ کو دیدیا تھا۔ لیکن ندوہ سے علیحدہ ہونے کے بعد اُنھوں نے جو کتابیں سیرت نبوی ؐ کی ترتیب کے سلسلہ میں جمع کی تھیں وہ اور اُن کے بعض اعزّہ کی کتابیں جن کا مجموعی سرمایہ پانچ چھ الماریوں سے زیادہ نہ تھا دارالمصنفین کو ملیں۔ مگر یہ ذخیرہ دارالمصنفین کی ضروریات کے لئے ناکافی تھا۔ اس لئے شروع ہی سے کتابوں کی فراہمی کا خاص خیال رکھا گیا اور ہر سال اُن کی خریداری کے لئے ایک معقول رقم مقرر کر دی گئی۔ اس سلسلہ میں ملک کے بعض اہل علم رؤسا نے بھی مدد فرمائی۔ خصوصاً شیخ محمد اکرام صاحب مرحوم رئیس محمد آباد ضلع اعظم گڑھ نے اپنا پورا کتب خانہ دارالمصنفین کی نذر کر دیا، جس میں قیمتی نسخے بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

وفد خلافت کے سلسلہ میں جب ناظم دار المصنفین مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے یورپ کا سفر کیا تو واپسی میں اپنے ساتھ یورپ کی مطبوعہ مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لیتے آئے تھے۔ علاوہ بریں انھوں نے وہاں کے مشہور کتب فروشوں سے مستقل تعلقات قایم کر لئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے یورپ میں مشرقی علوم کی جو بہترین کتابیں طبع ہوتی ہیں ان کا ایک نسخہ بقیمت یا بطور ہدیہ دار المصنفین میں ضرور آتا ہے۔ اس وقت ۴۳ الماریاں مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں اور ہر سال ایک ہزار روپیہ کی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ مصر و شام کے اشاعت خانوں سے بھی تعلقات قایم کر لئے گئے ہیں اور جو کتابیں اسلامی علوم سے متعلق وہاں شائع ہوتی ہیں وہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں التزام کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ یہاں کی بعض کتابیں شاہی کتب خانوں کی زینت بھی رہ چکی ہیں۔ انگریزی کی کتابیں کم ہیں مستند انگریزی علمی وادبی رسائل کا ذخیرہ تو کافی ہے۔ فلسفہ اور سیرت سے متعلق کتابیں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ مگر اور مضامین کی کتابیں دار المصنفین کی ضروریات کے لحاظ سے بہت کم ہیں۔

۷۔ **صیغۂ تعمیرات**۔ شروع میں مولانا شبلی مرحوم نے دار المصنفین کے لئے اپنے دو بنگلے وقف کئے تھے، مگر یہ خام اور بوسیدہ ہونے کے علاوہ ابتدائی ضروریات کے لئے بھی ناکافی تھے۔ اس لئے چند ہی دنوں کے بعد رفقاء اور مصنفین کے لئے پانچ چھ پختہ کمرے بنوائے گئے۔ اس کے بعد دفتر اور مکتبہ کے لئے تین پختہ وسیع کمرے تعمیر ہوئے۔ اور پریس کے لئے ایک عمارت الگ بنائی گئی۔ ابتک کتب خانہ اور تصنیف و تالیف کے لئے کوئی مستقل عمارت موجود نہ ہونے سے رفقاء اور مصنفین اپنے اپنے کمروں میں کام کرتے تھے اور کتب خانہ مولانا کے ایک بنگلہ میں تھا۔ غالباً ۱۹۲۷ء میں اس بنگلہ کو منہدم کر کے ایک شاندار عمارت بارہ پندرہ ہزار کی لاگت سے تعمیر کی گئی۔ اب اسی میں کتب خانہ بھی ہے اور یہیں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا ہے۔ احاطہ دار المصنفین میں نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کے عطیہ سے ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں ناظم اور مہتمم دار المصنفین کے لئے دو مکانات بنائے گئے۔ صیغۂ اشاعت کی ترقی کی وجہ سے کتابوں کے ذخیرہ کے لئے جو کمرے بنوائے گئے تھے وہ ناکافی ثابت ہوئے، اس لئے دفتر کے کمرے بھی کتابوں کے رکھنے کے لئے دیدئے گئے، اور دو سال ہوئے دفتر کے لئے ایک خوبصورت عمارت الگ تعمیر ہو گئی ہے۔

دارالمصنفین کی خصوصیات و خدمات

دارالمصنفین کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان میں وہ اپنی نوع کا واحد اسلامی ادارہ ہے۔ یہ اس ملک کے مسلمانوں کا تنہا مرکز ہے جو فارغ التحصیل طلبہ کی ایک محدود جماعت کو علمی تحقیق و تفتیش اور تصنیف و تالیف کے لئے تیار کرتا ہے، اور اُن کی وسعتِ معلومات اور دماغی تربیت کا سامان بہم پہونچاتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں بھی ریسرچ و تحقیق کے لئے طلبہ کو تربیت دی جاتی ہے، لیکن دارالمصنفین اور یونیورسٹیوں کے نصب العین میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ یہاں کا مرکزی نقطہ "اسلامیت" ہے۔ یہاں کی ہر تحقیق و مطالعہ کا مقصود اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت ہے۔

دارالمصنفین کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادبی، تاریخی، مذہبی اور فلسفیانہ ہر قسم کی تصنیفات کا مرکز ہے اور ہر قسم کے علمی مذاق کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کا صیغۂ اشاعت صرف بلند پایہ اور مستند تصانیف شائع کرتا ہے اور اس کی کتابیں علمی دنیا میں معیاری حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح اس کا کتب خانہ تصنیفی ضروریات کے لئے ایسی تمام قدیم و جدید مستند کتابوں کا ذخیرہ رکھتا ہے جو اسلامی علوم سے متعلق عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں، یا وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔

تعلیم کے لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کے دو طبقے ہیں۔ ایک وہ جس نے قدیم تعلیم حاصل کی ہے اور صرف مشرقی زبانوں سے واقف ہے۔ اس طبقہ کے لئے جدید علوم اور جدید خیالات کو اُردو زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت تھی۔ دوسرا طبقہ جدید تعلیم یافتہ جماعت کا ہے جو اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دارالمصنفین نے اپنی تالیفات و تراجم میں دونوں گروہوں کی ضروریات کا لحاظ رکھا ہے۔ اس کی کتابیں ادبی، تاریخی، مذہبی اور فلسفیانہ ہر قسم کے لٹریچر پر مشتمل ہیں۔

دارالمصنفین کی کتابیں اُردو میں ہونے کے باوجود اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان میں سے بعض کے ترجمے ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں کئے گئے۔ چنانچہ بنگالی، گجراتی اور ملیباری زبانوں میں اس کی بعض کتابوں اور رسالوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ اس کی متعدد کتابوں کے ترجمے فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں کئے گئے۔ شعرالعجم کے علاوہ

چند اور کتابوں کے ترجمے بھی فارسی زبان میں ہو چکے ہیں۔ بعض رسائل عربی میں ترجمہ ہوئے ہیں، **الفاروقؓ، سیرت عائشہؓ** اور **خلفائے راشدینؓ** کے علاوہ **سیرت النبیؐ** کی پہلی ۲ جلدوں کے ترجمے ترکی میں ہو چکے ہیں۔

دارالمصنفین کی ایک بہت بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ اس کے قیام کے بعد اسلام اور داعیٔ اسلام کے متعلق جب کبھی نارواِ مضامین نکلے یہاں کے مصنفین نے ہمیشہ اُن کا جواب دیا جس کے ثبوت سے **معارف** کی جلدیں بھری ہوئی ہیں۔ اِس نے مستشرقین کی "تحقیق" کی حقیقت واضح کی، اُن کے استدلال کی خامیاں دکھائیں، اور جن بنیادوں پر وہ بالعموم اپنے نظریوں کو قایم کرتے ہیں، اُن کی کمزوری آشکارا کر دی، اور اس طرح بہت سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اُن کے دام تزویر میں گرفتار ہونے سے بچالیا

محمد عزیر

تمہیں سے اے مجاہدو! جہاں کا ثبات ہے

(نتیجۂ فکر مولانا عبدالمجید سالک مدظلہٗ مدیر روزنامہ انقلاب لاہور)

تمہیں سے اے مجاہدو! جہاں کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعل وفا فروغ شش جہات ہے
تمہاری ضَو سے پُرضیا جبین کائنات ہے
کواکبِ بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں
کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی ممات میں
تمہارا اقتیاز ہے دوام میں ثبات میں
جدا ہو کائنات سے تو محو اُس کی ذات میں
بقا ہے جس کی ذات کو وہ اک خدا کی ذات ہے

مجاہدوں کے بازوئے فلک فگن عجیب ہیں
بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
یہ جسم ہائے خوں چکاں و بے کفن عجیب ہیں
مجاہد و شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں
حیات بھی حیات ہے، تو موت بھی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تو نگری!
بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری!
چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخل تاک کی!
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی!
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جن کی قوم لے تمہیں وہ شہسوار ہو
تمہیں وہ سرفروش ہو تمہیں وہ جاں سپار ہو
تمہیں دفاع و احترامِ دیں کے ذمہ دار ہو
جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ استوار ہو
تمہاری تیغ ضامنِ نظامِ کائنات ہے

مسلمان اور سائنس

(از سید لطیف حسین ادیب بریلوی)

ساتویں صدی عیسوی عرب کا وحشت ندار دور ہے جس میں غیر شائستہ تہذیب و تمدن کا خاکہ اُڑایا گیا۔ قبائلِ عرب کا جلایا ہوا چراغ جس کو زمانہ کی گندی فضا نے کافی فاسفورس بہم پہونچائی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُل ہوگیا۔ معصیت کی کالی گھٹائیں جو بلادِ عرب اور اس کے گرد و نواح پر بُری طرح مستولی تھیں وہ زائل ہوگئیں، اور مطلع صاف ہوگیا۔ ان تاریک بادلوں کے پیچھے سے ایک آفتاب ہویدا ہوا جس کے نور سے عرب کے مے نوش اور بت پرست قبائل کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، یہ نور رفتہ رفتہ پھیلتا ہی گیا، حتیٰ کہ عرب کی کالی فضا یک لخت منور ہوگئی۔

عرب میں جب اسلام کی اشاعت بخوبی ہوگئی تو مسلمانوں نے ممالک غیر میں پیش قدمی شروع کی۔ ابھی تک عراق و عجم 'انسانیت' کے نام سے نا آشنا تھے۔ تثلیث پرستی گویا ان کی گھٹی میں تھی۔ عیش پرستی معراج پر تھی، قیصر و کسریٰ کی جلیل القدر حکومتیں پوری آب و تاب سے سرزمین ایران پر مُسلط تھیں۔ لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ دولت اور ایک چھوڑ اُن کے تین، تین خداؤں میں سے کسی ایک نے بھی مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روکا۔ مٹھی بھر مسلمان تمام مشرقی ممالک پر قابض ہوگئے اور توحید کا پرچم لہرانے لگا۔ زیادہ زمانہ گزرنے نہ پایا تھا کہ اسلام کے سپاہی تمام شمالی افریقہ پر قابض ہوگئے، اِس بڑھتے ہوئے سیلاب کو آخرکار اٹلانٹک کی موجوں نے روکا۔ لیکن کسی کو کیا خبر تھی کہ اسلامی حکومت کی حد افریقہ ہی تک محدود نہ رہے گی، بلکہ یورپ کے وحشی اور غیر مہذب سفید باشندوں کو تعلیم و تربیت کے لئے ان بدیسی مسلمانوں کو سرزمینِ یورپ میں بھی قدم رکھنا پڑے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مسلمانوں نے اندلس (اسپین) پر قدم جما لئے، اندلس کی خوشگوار آب و ہوا اور سرسبز و شاداب کھیتوں نے مسلمانوں کے دلوں کو موہ لیا۔ رنگین فضا اور غذا کی بہتات نے یورپ کے بقیہ ممالک کی تسخیر میں مزاحمت کی۔ اس طرح یورپ ایک زبردست اور فوری عطیہ سے

محروم رہ گیا۔ اس وقت ہندوستان و فارس، عراق و عجم سے لے کر شام و مصر اور افریقہ و اندلس تک اسلامی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ اندلس کے زرخیز علاقہ نے مسلمانوں کی ہر دلی تمنا کو پورا کیا۔ اس طرح فتوحاتِ عظیم کے دَور کے بعد مسلمانوں کو صحیح معنوں میں چین نصیب ہوا۔ ان کو اندلس کے علاوہ دوسرے سرسبز و شاداب ملک درکار نہ تھے۔ اندلس میں ان کے آرام و چین کے لئے ہر قسم کی چیزوں کی فراوانی تھی۔ غرض اس دَور میں مسلمانوں کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ان کے پاس مُلک تھے، دولت تھی، جاہ و ثروت تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا اللہ ان کے عمدہ افعال سے خوش تھا۔ جب مسلمان لڑائی جھگڑوں کے بکھیڑوں سے فراغت پا گئے تو اُنھوں نے ملک کی خوشحالی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اُنھوں نے دُنیا کے ہر ہر شعبہ میں کارہائے نمایاں کئے۔ علم و ادب، سائنس و طب، موسیقی اور زراعت غرض سائنس کے ہر شعبہ کو کمال تک پہونچا کے چھوڑا۔ میرا یہاں مطلب صرف سائنس سے ہے اس لئے میں اصل مضمون پر آتا ہوں۔

آئیے سب سے پہلے کیمسٹری پر غور کریں۔ کیمسٹری کا موجد ابوموسیٰ جابر بن حیان کوفی تھا۔ اس شخص نے ہزاروں ادویات کے خواص کو پرکھا۔ اور اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہی وہ شخص تھا جس نے یونان کی کیمیاوی سائنس کو پسِ پشت ڈال دیا۔ ڈیلامبر علم ہیئت کی تاریخ میں رقمطراز ہے "علم کیمیا میں یونانیوں کے یہاں ایک بھی مجرّب اصول نہیں دکھائی دیتا۔ لیکن اہلِ عرب کی کیمیاوی تحقیقات کا ذخیرہ دیکھو تو دو سَو مجرّب قاعدے دکھائی دیں گے، اس لئے اصل میں کیمیا اہلِ عرب کی ایجاد ہے" اوپر بیان کئے ہوئے قول سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانانِ عرب نے کیمسٹری میں کہاں تک ترقی کی تھی۔ دیکھئے مسٹر اسکاٹ کیا فرماتے ہیں۔ "[۵] زمانہ حال کی کیمیا اور دوا سازی کے بھی مسلمان موجد ہیں ان ہی کی بدولت دنیا کو الکحل، تیزاب، نوشادر، پوٹاس، ہائیکلورائڈ آف مرکری BICLORIDE OF MERCURY چاندی کا پانی اور فاسفورس کا علم ہوا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہائیڈروجن کے وجود اور اس کے خواص سے بے خبر نہ تھے معدنیات کے محلول کرنے، سیّال بنانے OXIDATION اور گیسوں کے پیدا کرنے کی ترکیبوں اور نسخوں کو سب سے پہلے جابر کوفی نے جس کو یورپ والے جبیر کہتے ہیں بیان کیا ہے"۔

اس طرح اس ازلی سائنسداں نے طلوع اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان تمام چیزوں کی

---

[۵] ماخوذ از موازنہ صلیب و ہلال، حکمت شاہجہاں پوری۔

داغ بیل ڈال دی، جن پر آج یورپ نازاں ہے اس نے نہ صرف اپنے تجربات EXPERIMENTS سے دُنیائے عرب کو مسحور کیا بلکہ یونان کے قدیم سائنسدانوں کی عملیات کی تشریحات کیں۔ اس کے عہد کے عربی الفاظ مثلاً الکحل ALKOHOL، الکیمیا ALCHEMY، الاکسیر ELEXIR، شربت SYRUP، اسفنج SPONGE، کافور CAMPHOR، شنجرف CINNABAR، جرم GERM، اس بات کے شاہد ہیں کہ اُن کی نشو و نما عربی ہاتھوں سے ہوئی ہے اور پھر انگریزی لغت نے ان کو تھوڑی سی تبدیلی سے اپنے دامن میں لے لیا ہے، یہ زمانہ کتنا پُر آشوب ہے؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ سائنس عروج پر ہے کیونکہ ؎

جان ہی لینے میں انساں نے ترقی کی ہے
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

اِس دَور کی سائنس اور سائنس کی ترقی کا راز کمتر مفاد اور زیادہ تر نقصان پر منحصر ہے۔ توپ، بندوق، بم، گیس ان تمام چیزوں کا استعمال ہر فرد و بشر کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے، ہمارے کان ان تمام مہلکات سے آگاہ ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ اس بندوق اور بارود کے اصل موجد کون تھے۔ ان کی ایجاد کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے، گو بہت سے محققین کی رائے ہے کہ بارود کے موجد اہلِ چین ہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ ڈاکٹر لیبان کہتا ہے "عربوں کی منجملہ دوسری ایجادات کے ایک بہت بڑی ایجاد بارود ہے" اِس کے بعد کہتا ہے "توپ کا استعمال عربوں میں بکثرت ہو گیا تھا، انہوں نے اس کو زیادہ تر ۱۳۴۰ء میں الجبر (ہنگری) کی حفاظت میں جبکہ الفانسو یازدہم نے حملہ کیا تھا استعمال کیا تھا"[1] توپ، بندوق، بارود کا اصل موجد میر فتح اللہ شیرازی تھا اور جیسا کہ مندرجہ بالا قول سے ظاہر ہے مسلمانوں نے اس ایجاد سے اکثر و بیشتر لڑائیوں میں کام لیا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد جب بابر نے ابراہیم لودی اور رانا سانگا کے مقابلہ میں فوج کشی کی تو پہلی مرتبہ ہندوستان میں توپ، بندوق اور بارود سے کام لیا اور اس لئے کامیابی ہوئی۔

اسکول اور کالج کے طلباء اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کیمرا کتنی ضروری چیز ہے۔ لیکن روپیہ میں ایک آنہ بھی کسی نے اس کی ایجاد کو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کیا ہوگا۔ اب بھی ہم اہیں نے کہتے سُنا ہے "یورپ نے کتنی زبردست کی کو پورا کیا" ایسے لوگ اصل حقیقت سے ناآشنا ہیں۔

---

[1] تمدن عرب۔ صفحہ ۴۳۸۔

بدقسمتی سے جیسا کہ مسٹر جوزیف ہل[51] کا خیال ہے "ابن الہیثم متوفی ۱۰۳۹ء نے کیمرے کو ایجاد کیا ہے"۔ یہ دوسری بات ہے کہ شریعت سے مجبور ہو کر اُس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنایا ہو لیکن یہ تو قطعاً واضح ہے کہ کتابی صورت میں اُس نے اپنے خیالات کو ضرور چھوڑا۔

کوئی ROGER BACON سے پوچھے کہ تم نے تعلیم و تربیت کہاں سے حاصل کی اگر باپ دادا سے، تو باپ دادا نے کہاں حاصل کی۔ یہ جو ثقل اضافی DENCITY کے اصول کو تم نے اپنا لیا ہے آخر کہاں سے آیا، سچ پوچھئے تو یہ خازنی مروی ۱۱۲۰ء کی ایجاد ہے اور اُسی کی فکر کا نتیجہ ہے۔

تھرماس دورِ حاضرہ کی ایجاد مانی جاتی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ نویں صدی کے آخری نصف دور میں اس پر محمد احمد و حسن ولد موسیٰ بن شاکر نے بحث کی۔ اس نے اپنے ان تفکرات کو ایک کتابی صورت میں چھوڑا، جس کو "کتاب الحیل" کہتے ہیں۔ اس کتاب کی سنہ طباعت ۸۶۰ء ہے اور شاید میکانک پر سب سے پہلی طبعزاد کتاب ہے۔

اسی طرح گھڑی کے موجد اعلیٰ مسلمان ہیں۔ اُس زمانہ میں پانی گھڑی۔ دھوپ گھڑی، اور ریت گھڑی کے پائے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ مسلمانوں کی ایجاد یہ گھڑیاں نہ تھیں جیسی ہم اس دور میں پاتے ہیں۔ البتہ حساب وہی تھا یا یوں کہئے کہ عنوان ایک ہی تھا جس پر دو مضامین لکھے گئے۔ ان ہی میں سے ایک مضمون کی منجھی ہوئی صورت موجودہ گھڑی ہے۔ لیکن بڑی پُرلطف بات یہ ہے کہ جو کچھ آٹھویں اور نویں صدی کے مسلمان گھڑی اور گھنٹے ایجاد کر گئے اس کا پاسنگ بھی اس خوبی اور وضاحت کے ساتھ ایجاد نہ ہو سکا۔ مثال کے طور پر مستنصریہ کی گھڑی لے لیجئے، اِس میں آسمان کی مناسبت سے ڈائل نیلا بنایا گیا تھا اور اس میں ایک آفتاب اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ برابر حرکت کرتا رہتا تھا جس سے صحیح وقت معلوم کیا جاتا تھا۔ یا دمشق کی مسجد[52] کی گھڑی لے لیجئے اس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مسجد کی ایک دیوار میں نصب تھی۔ جس میں بارہ دروازے دن کے بارہ گھنٹوں کی مناسبت سے بنے ہوئے تھے۔ اوّل اور آخر کے دو دروازوں میں دو باز پیتل کے تھے۔ ان کو پیتل کی تھالیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ جب گھنٹہ ختم ہوتا تھا تو یہ باز اپنی چونچ سے پیتل کی گولیاں گرا دیتے تھے۔ گولیاں جب

---

[51] Joseph Hill, Arab civilization translated by K. Baaz.

[52] بحوالہ سفرنامہ ابن جبیر۔ مولانا شبلی مرحوم۔

پیتل کی تھالی میں گرتی تھیں تو آواز پیدا ہوتی تھی۔ گولیوں کے گرنے کے بعد فوراً ہی ان بارہ دروازوں میں سے ایک دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ہر گھنٹے کے گزرنے پر یہی دور جاری رہتا تھا۔ یا خلیفہ ہارون الرشید کی اُس گھڑی کو لے لیجئے جو اُس نے شارلمین شاہ فرانس کو روانہ کی تھی۔ اس گھڑی میں بارہ سوار تھے جو گھنٹہ ختم ہونے پر وقت بتلاتے تھے۔

یہ وہ شاندار مثالیں ہیں جن کا جواب دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں پیش کر سکتی ہے۔ گو ان کے ڈھانچے اب بھی بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ بڑے سے بڑا سائنٹسٹ ان میں دوبارہ جان ڈال سکے۔ بجز اس کے کہ عملیات (Experiments) سے ان کی خستہ حالی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی یہ زبردست ترقی طلوع اسلام سے بہت دن بعد ہوئی ہے بلکہ اُن کی بنیاد آٹھویں صدی میں ہی پڑ گئی تھی۔ گھڑی کی ایجاد کا سہرا ابن یونس کے سر تھا۔ اس کی موت کا زمانہ زبردست کارناموں کے بعد ۶۷۶۵ ہے۔ ابن الساعتی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مشہور گھڑی ساز تھا۔ یہ دو وہ زبردست ہستیاں ہیں، جنھوں نے ایام جہالت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دنیائے سائنس میں کھلبلی مچادی۔ مسلمان ہی ان سے مسحور نہیں ہیں بلکہ خاص طور سے یورپ غیر معتقد ہوتے ہوئے بھی ان مسلمانوں کے کارناموں کا معتقد ہے۔

ہندوستان اور روم سے تجارت عہد قدیم میں برابر ہوتی رہی ہے لیکن تجار کی راہیں خشکی کی تھیں، اس لئے پانچویں صدی عیسوی میں جہازوں کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ البتہ جب مسلمانوں نے اندلس میں ترقی کی راہیں کھول دیں تو جہاز کی ایجاد کی طرف بھی خیال آرائیاں شروع ہوگئیں۔ جہاز کی ایجاد کا سہرا ابو القاسم اندلسی کے سر باندھا جاتا ہے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موجد نے اس میں سفر بھی کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوربین اور قطب نما کا ذکر بھی آتا ہے، اس کی ایجاد ابن الہیثم متوفی ۱۰۳۹ء کے سر ہے۔

موسیقی اور موسیقی کے آلات کا ماہر حکیم ابو نصر فارابی ہے۔ اس نے ہزاروں قسم کے گانے ایجاد کئے اور ہزاروں قسم کے باجوں کی بنیاد ڈالی اس کا ایک بہت مشہور باجہ آلۂ قانون ہے، جو نفسیاتی پہلو پر بنایا گیا تھا۔ اس کو پہلی ترکیب سے سیف الدولہ کی مجلس میں بجایا گیا تو سب ہنسنے لگے۔ جب دوسری ترکیب سے بجایا تو سب رونے لگے اور جب تیسری ترکیب سے بجایا تو سب سونے لگے۔ اس قسم کے باجوں کا اس دور میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

رشید الدین ابن رقیعہ ایک ایسے پیالہ کا موجد ہے جس کے عجیب و غریب ہونے کا یہ حیرت انگیز

واقعہ ہے کہ اُس پیالہ کے بیچ میں ایک چڑیا بٹھائی گئی تھی۔ جب پیالہ میں پانی ڈالا جاتا تھا تو چڑیا پھڑپھڑاتی تھی، حتیٰ کہ مشرب کو زبردستی پانی پینا پڑتا تھا تب کہیں جا کر چڑیا کو چین آتا تھا۔

کاغذ کی اصل ایجاد چین سے منسوب کی جاتی ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے کاغذ اہلِ چین نے بنایا۔ لیکن چین کی ترقی کے زمانہ میں دُنیا کی دوسری اقوام ترقی یافتہ نہ تھیں، اس لئے کاغذ دوسرے ملکوں میں نہ پھیل سکا۔ خصوصاً یورپ جس میں اُس وقت تک وہاں کے سفید باشندے جھونپڑوں اور بھٹوں میں پیال کے نرم بستروں پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں کی ترقی کا زمانہ آیا تو کاغذ کی ایجاد سُرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں نے چین سے کاغذ کی ایجاد کو کیسے حاصل کیا؟ کرسٹی[۵۱] صاحب کے خیال کے مطابق فتح سمرقند ۷۰۴ء کے موقع پر مسلمانوں نے چین سے اِس ایجاد کو حاصل کیا۔ رفتہ رفتہ کاغذ کی صورت منجھتی گئی اور اس کی نفاست میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی منجھی ہوئی صورت کا دوسرا نام "دمشقی کاغذ" ہے۔ اس کو یوسف بن عمرو دمشقی نے ایجاد کیا۔ اُس زمانہ کے قلمی نسخوں کو (جن کی بوسیدگی ان کی رگ رگ سے ہویدا ہے) دیکھنے سے اس عہد کے کاغذ کی نوعیت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

کپڑا بُننے کے فن میں مسلمانوں کو وہ کمال حاصل تھا کہ اُس عہد میں اُن کی ہمسری کوئی دوسری قوم نہیں کر سکتی تھی۔ اس فن یا سائنس میں مسلمانانِ اُندلس سب سے آگے ہیں۔ اُندلس کی خوشگوار آب و ہوا کی موزونیت اور اُس پر مسلمانوں کے جوش و خروش نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ریشمیں کپڑے۔ دیبا۔ قالینیں۔ دریاں۔ اونی کپڑے۔ غرض کہ سب کچھ بنایا اور ہر ایک میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ یہی نہیں بلکہ رنگائی کے فن میں بھی اِنھیں مسلمانانِ اندلس کو وہ کمال حاصل تھا جو شاید اس دَور میں بھی نہ حاصل ہوا ہو۔ اس کے علاوہ کپڑوں پر چھپائی کا کام بھی بہت عمدہ ہوتا تھا، گو مشینیں تو نہ تھیں مگر ٹھپے ضرور تھے جن سے ہاتھوں کے ذریعہ وہی کام لیا جاتا تھا جو اِس دَور میں مشینیں کرتی ہیں۔ اُن چھپی ہوئی چیزوں یا بالالفاظ دیگر تصویروں میں ترچھی ترچھی عورتیں نہ تھیں، کلنڈر نہ تھے، محبت بھرے الفاظ نہ تھے، بلکہ قرآنِ کریم کی آیتیں تھیں، بیل بوٹے تھے، جن میں ایک کاریگر اشاعتِ اسلام کا خیال کر کے ہمہ تن کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اِس فن کا مرکز اندلس تھا۔ یہاں سے ہی ممالکِ غیر کو کپڑا بھیجا جاتا تھا۔ مسٹر اسکاٹ[۵۲] رقمطراز ہیں "زمانۂ حال کا

---

۵۱ میراث اسلام ، M. A. H. Christie

۵۲ اخبار اندلس صفحہ ۲۴۴ بحوالہ موازنہ صلیب و ہلال نکہت شاہجہان پوری۔

سائنس باوجود اس قدر ترقی کے ایسے مضبوط نازک اور خوبصورت کپڑے نہیں بنا سکتا، جیسا کہ مسلمانانِ اندلس کے کرگھے نکال چکے ہیں، ان کے رنگ صناعی و رنگریزی کی انتہائی قابلیت ظاہر کرتے ہیں"۔

اُس عہد کی اب بھی بہت سی چیزیں بطور یادگار جگہ جگہ میوزیم ہاؤسس USEOH HO ۔ SES: میں موجود ہیں۔ نورمبرگ (جرمنی) میں اب بھی ایک چادر موجود ہے جس کو شاہانِ صقلیہ نے استعمال کیا تھا۔ اس پر ۱۱۲۳ء کا کتبہ درج ہے۔ اس کے دیکھنے سے مسلمانوں کے رنگائی کے فن کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی کڑھائی بھی قابلِ تعریف ہے۔ آخیر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان جیسا خوبصورت اور باریک کپڑا آج تک نہ بن سکا۔ جیسا کہ ابن خلکان[۵] کا خیال ہے کہ اسپین کے زربفتی کپڑے مکڑی کے جالے سے زیادہ نازک اور ملائم اور بیش بہا ہوتے ہیں۔

آب پاشی کے طریقے بھی کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ مصر و اندلس میں اب بھی بارش کی قلت ہے اور دورِ حاضرہ میں بذریعہ آب پاشی کھیتی باڑی کی جاتی ہے، وہی مشکل عہدِ اسلامیہ میں بھی درپیش تھی۔ اُنھوں نے بھی آب پاشی کے نت نئے طریقے ایجاد کئے۔ چنانچہ بیسیوں قسم کے ایسے پرزوں اور مشینوں کا پتہ چلتا ہے جو آب پاشی کے وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔

عہدِ عباسیہ میں بغداد میں ۹۵۵ حمام کا ہونا پایا جاتا ہے۔ وہ بھی محض پبلک کے آرام و آسایش کے لئے ایسی صورت میں صابن کا پایا جانا غیر قیاسی نہیں۔ بقول مسٹر اسکاٹ کے "یہ (صابن) صرف اہلِ عرب کی ایجاد ہے۔

غرض یہ کہ مسلمانوں نے سائنس کے ہر ہر شعبہ میں جابکدستی دکھائی اور صحیح صحیح نتائج دنیا کے سامنے پیش کئے جن سے اس وقت بھی فائدے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ گو ان کے ایجاد کرنے والوں کو زمانہ کی کروٹوں نے بھلا دیا ہے۔ لیکن لاکھ دنیا تغیر و تبدل ہو پھر بھی سلف کے کارنامے کسی طرح بھلائے نہیں جا سکتے۔ دریا کی روانی میں تنکے کو لازم ہے کہ وہ بھی دھارے کے ساتھ ساتھ بہتا جائے، لیکن اگر اس کا ماضی شاندار ہے تو بہت ممکن ہے کہ دھارا مع تنکے کے پیچھے کی طرف لوٹ پڑے کیونکہ تنکے کی قسمت کا فیصلہ اسی پر منحصر ہے۔

لطیف حسین

---

[۵] بحوالہ موازنہ صلیب و ہلال نکہت شاہجہاں پوری۔

جنرل بخت خاں روہیلہ

از سیدہ انیس فاطمہ (بیگم الطاف علی بریلوی)

خدا جانے وہ کونسی مبارک ساعتیں تھیں، جن میں بابر کے مقدس ہاتھوں نے ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا کہ بادِ حوادث کے تھپیڑوں نے سینکڑوں بار اِس کو مٹانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مٹی اور مٹی تو اس طرح کہ ہندوستان جنت نشان سے مسلمانوں کا قومی وجود ہی ختم ہو گیا۔ اُن کی تہذیب، اُن کا تمدن، اُن کا علم، اُن کی دولت، غرضکہ تخت کے ساتھ ہر چیز جو باعثِ افتخار تھی، رخصت ہو گئی۔ آخر زمانہ میں قلعۂ معلّٰی کی حکومت لاکھ مجبور و زوال پذیر سہی، پھر بھی ماضی کی شان دار روایات اُس سے وابستہ تھیں! اور وہ عوام کی والہانہ عقیدت کا مرکز تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی دست درازیاں دامن سے گزر کر گریبان تک پہونچ چکی تھیں کہ ۱۸۵۶ء کے الحاق اودھ نے مسلمانوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ اگر چندے یہی حالت رہی تو

اب کے جنوں میں فاصلہ باقی نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

پہلے کافی ہیجان ہوا اور بالآخر ۱۸۵۷ء کا زبردست ہنگامہ رونما ہو گیا۔ عوام اور خواص دونوں نے مل کر ملک و ملت کی آزادی کے لئے تلوار اُٹھائی۔ خواص میں جنرل بخت خاں۔ فیروز شاہ [51] نانا راؤ [52]۔ نواب تجمل حسین خاں [53]۔ جنرل محمود خاں۔ اور عظیم اللہ خاں تھے۔

---

[51] ایک تیموری شہزادہ تھا۔ میدانِ رزم میں اس کی تلوار نے دشمن کی صفوں میں ہلچل ڈال دی تھی جب خان بہادر خاں کو بریلی میں شکست ہوئی تو فیروز شاہ نے بھی میدانِ جنگ کو خیرباد کہا۔ اکثر لوگوں کا بیان ہے کہ اُنھوں نے اُن کو گیرو الباس میں حجاز میں دیکھا اور پہچانا۔

[52] نانا راؤ پیشوا نے عدیم المثال بہادری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اس کی بہادری اور اعلیٰ علمی قابلیت کا اعتراف اکثر انگریزوں کو بھی تھا۔ فرانسیسی مصنف گارساں لکھتا ہے کہ سنا ہے کہ یہ خونخوار انسان انگریزی تحریر و تقریر میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اس شخص نے

(باقی صفحہ ۶۹ حاشیہ دیکھو)

اور علماء کے سرگروہ مولوی احمد اللہ۔ مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیر آبادی وغیرہ قرار پائے۔

غدر کو اب کافی زمانہ گزر گیا، پھر بھی اصل واقعات پر بہت کچھ تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اِس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے کافی واقعات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی لیکن دانستہ یا نادانستہ طور پر اُن کی تحریروں میں افسانوی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ تاہم جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اُس جوشِ عقیدت کے تحت ہے، جو ایک مسلمان محبِ وطن کو قلعۂ معلّٰی کی حکومت سے ہو سکتا ہے۔ خواجہ صاحب قلعہ کی تباہی پر خود بھی جی کھول کر روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں۔

مُغلیہ حکومت تھی تو شخصی حکومت لیکن خدا معلوم اُس میں کیا خصوصیت تھی کہ ہر شخص نے قلعہ کی بربادی پر خون کے آنسو بہائے۔ چنانچہ نصف صدی گزر جانے پر بھی جب مسٹر اینڈریوز نے مولوی ذکاء اللہ کی لائف لکھنے کے سلسلہ میں غدر کے حالات دلّی کے بوڑھوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کرنے شروع کئے تو صاحب موصوف نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:-

"جس بوڑھے شخص سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان اکثر کے آنسو نکل آتے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا واقعہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اپنی ہی بپتا سُنا رہا ہے۔"[۵۱]

بنگالی اہلِ قلم نے اس موضوع پر خوب لکھا اور بہت لکھا۔ لیکن وہ انگریزی یا بنگلہ زبان تک محدود رہا اور اُردو کی تہی دستی جوں کی توں قایم رہی۔ جو قلمی لٹریچر اُس زمانہ کے لوگوں نے اپنے اخلاف کے لئے چھوڑا تھا، وہ یا تو دیمک کی نذر ہو گیا۔ اور یا پرائیویٹ لائبریریوں میں شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۸: شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ صفحہ ۲۲۹ آٹھواں خطبۂ نگارستان۔

۵۳ نواب صاحب غدر کی ناکامی کے بعد ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے اُن کو وہاں سخت عسرت اور شکستہ حالت میں دیکھا۔ یہ جس شان و آن بان سے رہتے تھے اُس کے متعلق غالب نے لکھا تھا کہ:-

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے	بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا	کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

(مصنف بابت جنوری ۱۹۳۵ء)

۵۱ مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی۔

جس کو ہاتھ لگانے کی جرات کرنا ناممکن ہے

مسلمانوں میں دو حضرات نے تاریخی حیثیت سے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، ایک سرسیّد اور دوسرے مولوی ذکاءاللہ۔ لیکن ان ہر دو حضرات نے قلم کی جگہ نشتر سے کام لیا۔ ذکاءاللہ نے تو حد ہی کر دی۔ قوم کی جاں گداز تباہی پر خوب دل کھول کر ہنسے، شہیدانِ وطن کی ذلت و تحقیر کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ نتیجہ میں خان بہادری اور شمس العلمائی پر خاتمہ بخیر ہوا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سرسیّد نے بیشک جو کچھ لکھا وہ خلوص نیت اور ہمدردیٔ قومی کی بناء پر تھا۔ اُن کی نیک نیتی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ اس الزام کو مسلمانوں کے سر سے اتارنے کا محض یہ طریقہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان واقعات کو صفحاتِ تاریخ سے مٹا دیا جائے۔ غدر میں مسلمانوں کو جس تباہی سے دو چار ہونا پڑا وہ اُس کے خود شاہد تھے۔ جس وقت نواب ضابطہ خاں کے پوتے جنرل محمود خاں نے بجنور میں بغاوت کا علم بلند کیا تو یہ اُس زمانہ میں بجنور میں منصفی کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس کے بعد دلّی آئے لیکن اس خوفناک ٹریجڈی کے پسِ منظر میں اُنھوں نے **اسبابِ بغاوت** جیسی کتاب مرتب کی۔ یہ اُنھیں کا دل گُردہ تھا۔ کتاب مذکور میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"سرکشی ہندوستان کے جواب مضمون میں جو میں نے اصلی اسباب بغاوت ہندوستان کے بیان کئے تھے اگرچہ دل چاہتا ہے کہ اب ان کو صفحۂ روزگار سے مٹا دوں بلکہ اپنے دل سے بھی بھلا دوں، کیونکہ جو اشتہار جناب ملکۂ معظمہ نے جاری کیا ہے۔ درحقیقت بغاوت کے ہر ایک اصلی سبب کا پورا علاج ہے۔ حتیٰ یہ ہے کہ اشتہار دیکھ کر بغاوت کے سبب لکھنے والوں کے ہاتھ سے قلم گر پڑے، کسی کو ضرورت نہیں رہی کہ اُن کی تشخیص کریں۔" [۵]

اس کے بعد تحریک کو محض معمولی اور چند شوریدہ سروں کے دماغوں کی اختراع کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:۔

"اودھ کی ضبطی کو بھی ہم سبب اس سرکشی کا نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یہ یقین کر لیا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد اقرار کے کیا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبِ ملک رئیسوں میں کوئی باغی نہیں ہوا۔ اس کے جواب میں یہ مت کہو کہ جھجر کا نواب اور بلب گڑھ کا راجہ فلاں فلاں باغی ہو گیا۔"

---

[۵] اسبابِ بغاوتِ ہند۔

اعترافِ حقیقت کے باوجود بھی یہ اصرارِ پردہ داری کس قدر دلچسپ ہے۔ دراصل کمپنی کی فوجوں کے ہاتھوں وہ بے پناہ مظالم جو عوام اور بے گناہوں پر توڑے گئے۔ جو لرزہ براندام چنگیزی داستانیں دلی میں دُہرائی گئیں۔ اُن کا اقتضاء بھی یہی تھا لیکن جادو ہمیشہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ خود انگریزوں ہی میں بعض نیک دل حضرات نے اپنے ہم قوموں کے ان مظالم کے خلاف سخت احتجاج بلند کیا جو انھوں نے مظلوم عوام پر بلا کسی خطا اور قصور کے توڑے تھے۔ جو تماشائی تھا وہ خود ہی تماشہ بن گیا۔ مسٹر رسل لکھتے ہیں :۔

"لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع ہی کو تاخت و تاراج کر دیا جائے۔ محض اس جُرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا۔ انگریزوں نے راستہ میں سیکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بے دریغ قتل و غارت اور برباد کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران کر دیا۔ ہزاروں شہری پھانسی پر لٹکائے گئے۔ حالانکہ ان کو بغاوت سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ بے گناہ شہریوں کو درانحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے۔ گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو حالانکہ ان کے جسم رعشے سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھدیا گیا۔ دہلی میں قتلِ عام کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہشمند تھے۔"[۵۱]

پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے بھی مردوں۔ عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا نہ صرف پھانسی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ جنرل آؤٹرم کی رائے ہیں "یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا"۔ میجر رینالڈ کو جنرل نیل کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی کہ :۔

"قصبۂ فتحپور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہِ تیغ کر دیا جائے۔"[۵۲]

ابتک بعض خاندانوں میں اس زمانہ کے مظالم کی داستانیں سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔ جن سے ان شدائد کا احساس ہو کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ نے اپنی پھوپھی کی زبانی سُنا تھا کہ :۔

---

۵۱ تصویر کا دُوسرا رُخ ۔ ۵۲ تصویر کا دُوسرا رُخ بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۱۹۸

"تلنگے مجمع میں گھس کر سینہ کھول کر سونگھتے تھے۔ اُس زمانہ میں مسلمان اور بالخصوص سیدوں کے سینوں میں سے ایک خاص قسم کی خوشبو نکلا کرتی تھی اور یہ مسلمان ہونیکی سب سے بڑی دلیل سمجھ کر سنگینوں کو اُن کے سینوں میں پیوست کر دیا جاتا تھا۔"

حکمراں جماعت کے ایک انصاف پسند طبقہ کا خیال تھا کہ یہ بغاوت کمپنی کے اُس نازیبا طرزِ عمل کا نتیجہ تھی جو اِس کے گماشتوں نے عوام اور شاہی خاندان کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ ان لئے جن وجوہ کی بناء پر بغاوت رونما ہوئی اُن کی چھان بین کر کے آپس کی غلط فہمیاں دُور کیجائیں اور آیندہ را احتیاط کے اصول پر کاربند ہوا جائے۔

چنانچہ جب ساورکر کی کتاب ضبط کی گئی تو مسٹر ٹامسن نے سخت احتجاج کرتے ہوئے تحریر کیا کہ۔

"میرے نزدیک یہ نہایت ہی نامناسب ہے کہ گورنمنٹ نے ساورکر کی تاریخ کو بحقِ سرکار ضبط شدہ قرار دیدیا ہے۔ لیکن اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ اس لڑائی کے بعض حالات پر پردہ پڑا رہے تو ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کو بھی اپنی تاریخ میں جگہ دیں۔"[1]

لیکن طبقۂ سول سروس کی رائے اس کے برعکس معتدل پالیسی کے خلاف تھی۔ وہ اس ہلکے پردہ کے بجائے اس قدر گہرا اور بھاری پردہ ڈالنا چاہتے تھے کہ دُنیا اس کو سرے سے بھول ہی جائے۔ چنانچہ ایڈورڈ ٹامسن رقمطراز ہے کہ:۔

"انگلستان اور ہندوستان کے مفاد کا اقتضاء یہ ہے کہ اس بغاوت کی تلخ یاد کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا جائے۔ ہمیں اس زہریلے کنوئیں کو پاٹ دینا چاہئے اور خوش قسمتی سے اس وقت ایک کثیر تعداد ایسے ہندوستانیوں اور انگریزوں کی ہے۔ جو نہایت دیانتداری سے یہ یقین رکھتی ہے کہ کسی طرح غدر کے رنجیدہ واقعات کی یاد کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات اور انسانوں کے قلوب سے محو کر دیا جائے۔ ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم کچھ سال اور انتظار کی پالیسی پر عمل کریں۔ یہاں تک کہ وہ انسان ہی رحلت کر جائیں جن کے دماغوں میں غدر کی تلخ یاد کا ذخیرہ موجود ہے۔"[2]

[1] تصویر کا دوسرا رُخ
[2] تصویر کا دوسرا رُخ

ہنگامۂ ۵۷ء کے واقعات نسیاً منسیاً کئے جانے کا سب سے زیادہ اثر جنرل بخت خاں روہیلہ کی شخصیت پر پڑا۔ باعتبار تدبر و سیاست و بہادری و اولوالعزمی ان کی قائدانہ اہلیت کا اعتراف دوست دشمن سب کو ہے لیکن اُن کے تفصیلی حالات اُن کا حسب و نسب۔ اُن کا انجام

اور آخر میں چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ تحریک کے اس سب سے بڑے ہیرو کا روپوش ہو جانا ابھی تک تاریخ کا ایک ناقابل حل معمہ ہے۔

حسب و نسب ۱۸۵۷ء کے متعلق جس قدر بھی لٹریچر نظر سے گزرا یا روایت بزرگوں سے سُنا اس سے جنرل بخت خاں کے حسب و نسب کے متعلق ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ مثل مولوی ذکاءاللہ جن کا قلم جنرل صاحب کی تحقیر و تخریب کے لئے ہر وقت آمادۂ رم رہتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش ناکام کی ہے کہ اُنکا تعلق کسی گمنام اور پست خاندان سے تھا۔

لیکن بخت خاں نے ۱۸۵۷ء میں جو کارہائے نمایاں کئے تحریک کو جس قابلیت کے ساتھ تمام ہندوستان میں پھیلایا۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا تعلق ضرور کسی اعلیٰ نسل و خاندان سے ہوگا۔

اس سلسلہ میں ایک سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پر پوتی چندا بیگم کی ہے، جو خدا کے فضل سے ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ اِن سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے ان کی قرابت قریبہ تھی اور وہ خاندان روہیلہ سے تھے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ والی روہیلکھنڈ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اِس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چلا گیا۔ چنانچہ بخت خاں کے والد مع اہل خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے۔

نواب عبداللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے، شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابانِ اودھ سے قرابت داری ہو گئی۔[۵۱]

خود بخت خاں نے بھی ایک مرتبہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے کہا تھا کہ:۔

> "میں موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں۔ اور خاندانِ اودھ سے ہوں۔ اگر آپ کو میرے بیان پر شک ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں! بادشاہ نے فرمایا تصدیق کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کی شرافت و نجابت پر پورا یقین ہے۔"[۵۲]

یہ امر کچھ بعید از قیاس نہیں کہ جو قوم حافظ الملک، نواب نجیب الدولہ اور غلام قادر جیسے سرفروش اور

---

۵۱ حیاتِ علامہ فضل حق خیر آبادی مصنفہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔ ۵۲ غدر کی صبح و شام۔

اللہ وردی خاں جیسے مُدبّر پیدا کر سکتی ہے کیا وہ ہندوستان کی آخری جنگ آزادی میں بخت خاں جیسے جانبازوں کو جنم نہیں دے سکتی۔

تعلیم و تربیت اور ملازمت زمانۂ قدیم کے نوابی خاندان کے لوگ کافی پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ فنون حرب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بخت خاں کا بھی استثنیٰ نہ تھا۔ سلطان پور کی جاگیر نواب اودھ کی جانب سے ملی تھی اوّل تو خاندان کی ضروریات کے لئے ناکافی تھی۔ دوسرے اُن کی اولوالعزم اور بے چین طبیعت اِس پُرسکون زندگی کی متحمل نہ ہوئی۔ بنا بر اں انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کی اور بہت جلد ترقی کر کے ممتاز عہدہ پر فائز ہو گئے۔ مسٹر سیبل کے تحت جنگ افغانستان میں ایسے بہادرانہ کارنامے دکھلائے کہ توپ خانہ باٹری کے سب سے بڑے افسر ہو گئے۔ ان کے ماتحت تمام ہندوستانی توپچی رہتے تھے۔ یہ باٹری اپنی کارگزاریوں کے لئے بہت مشہور تھی۔ اعزاز کے طور پر اُن کی توپوں پر پھولوں کا محراب نما تاج بھی رکھا گیا تھا۔ بخت خاں جلال آباد میں بھی اس باٹری کے ساتھ کام کر چکے تھے۔[۵۱]

افغانستان سے واپس آنے کے بعد نیمچ کی چھاؤنی پر بھیجدیئے گئے۔ اور صوبے داری کا عہدہ عطا کیا گیا۔ اس طرح بخت خاں توپ خانہ کے بڑے افسر تھے اور انگریزی لشکر گاہ میں بہت سے لوگ اُن کو جانتے تھے۔ وہ ایک فربہ اندام شخص تھے اور انگریز اُن کو بہت ہوشیار اور بڑا دانشمند سمجھتے تھے۔[۵۲]

جنرل بخت خاں کی قیادت مولوی عظیم اللہ خاں کانپور چھاؤنی میں مشن اسکول میں ملازم تھے اپنی لیاقت سے انگریزی۔ فرانسیسی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں نانا صاحب اور انگریزوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ نانا صاحب کو انگریزی پڑھانے کے لئے انگریزوں کی طرف سے عظیم اللہ خاں مقرر ہوئے۔ اِس شخص کو قدرت نے عجیب دل و دماغ عطا کیا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا معاملہ تو غدر بود ہو گیا۔ اُستاد اور شاگرد کی دُور بین نگاہوں نے انگریزوں سے جنگ کی اسکیم مرتب کرنا شروع کر دی، طے شدہ پروگرام کے مطابق بیرونی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے "عظیم اللہ خاں اور بالا صاحب گوکھلے" یورپ روانہ ہوئے۔ عظیم اللہ خاں روس ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، دونوں نے یورپ کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر تاریخ بغاوت اور نقشہ جنگ تجویز کیا۔[۵۳]

---

۵۱ یادداشت نوشتہ جی۔ ایچ۔ ایم۔ ریکنس۔ سی بی۔ ۵۲ عروج عہد انگلشیہ۔ ۵۳ علماء کا شاندار ماضی صفحہ ۴۰۔

چنانچہ سب سے پہلا شخص جس نے بغاوت کا آغاز کیا وہ منگل پانڈے تھا۔ جس کو ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو پھانسی کی سزا دی گئی۔[۵۱]

تحریک کا آغاز منگل سنگھ کی قربانی سے ہوا۔ چپاتیوں کی تقسیم نے بغاوت کو ہر جگہ بیک وقت شروع کرنے میں نمایاں کام کیا کوئی گاؤں۔ قصبہ۔ یا شہر باقی نہیں تھا جہاں یہ چپاتیاں نہ پہونچی ہوں۔ تمام انگریز اہل قلم کی یہ متفقہ رائے ہے کہ بغاوت کو پھیلانے اور ترقی دینے میں چپاتیوں نے بڑا کام کیا۔ مصنف تاریخ بغاوت ہند تحریر کرتا ہے:۔

"ظاہر ہے کہ کوئی امر بہتر اس سے ہو اسطے شامل کرنے تمام مسلمانوں کے ایک خاص امر میں حسب دلخواہ عمل میں لانے کے نہیں معلوم ہوتا۔"[۵۲]

اسی مصنف نے اپنے لیکچر میں بیان کیا تھا کہ:۔

"مولانا احمد اللہ صاحب خود روٹی کے ٹکڑے اور کنول کے پھول تقسیم کرتے تھے۔"[۵۳]

روہیلکھنڈ میں نوابی شورش کی آگ بھڑکتے ہی بخت خاں نے جو بعد کو جنرل کے لقب سے مشہور ہوئے، اپنے اجداد کے وطن بریلی کا رُخ کیا۔ بریلی جا کر خان بہادر خاں کو جو حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے اور خاندان میں بہت زیادہ با اثر اور بہادر تھے تخت امارت پر بٹھالا۔ روہیلکھنڈ میں روہیلہ قوم اپنے غیر معمولی شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے ابھی تک تفوق خاص کی مالک تھی۔ دولت اور حکومت تو ختم ہو چکی تھی لیکن ترکۂ آبائی میں شجاعت و بسالت کا تھوڑا سا اندوختہ باقی رہ گیا تھا جو اس وقت بروے کار آیا۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیلکھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی۔"[۵۴]

بریلی جو عرصہ تک حافظ رحمت خاں کا دار السلطنت رہا تھا جنرل بخت خاں کی جد وجہد کا مرکز قرار پایا۔ ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں کہ:۔

"بریلی میں ہر طرف کے مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثل تانا راؤ۔ فیروز شاہ۔ وغیرہ جمع ہیں۔ رامپور کے تخمیناً دس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں۔ اور مردان رامپور کا یہ حال ہے۔ کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا ہے۔ اور اس پر گوٹا لگا ہوا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہوا ہے۔ اور چار چار طپنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں۔ دوہری

---

[۵۱] تاریخ بغاوت ہند۔ [۵۲-۵۳] علماء کا شاندار ماضی۔ [۵۴] عروج عہد انگلشیہ۔

تلوار میں ذاب رکھی ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور شہر میں گھوڑے کو دائے پھرتے ہیں۔
پچاس ۔۔۔۔۔۔ ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔" ۵۱

جب تک جنرل صاحب کا بریلی میں قیام رہا وہ نواب خان بہادر خاں کے دست راست رہے۔ چنانچہ جو امن و امان اس نواب گردی میں عوام کو میسر تھا اُس میں بخت خاں کا بھی حصّہ ہے۔ میں نے اپنے خاندان کی ایک بزرگ خاتون کی زبانی سُنا جن کی کہ والدہ نے اپنے چشم دید حالات اُنھیں بتائے تھے کہ اُس دوران میں کثرت سے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات ہوئیں اور اُن میں کسی قسم کی بے اطمینانی یا انتشار نہیں پایا جاتا تھا۔ ہر چیز کی ارزانی اور بہتات تھی، گرانی کا کہیں ذکر نہ تھا۔

روہیلکھنڈ کے علاوہ تمام ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف سخت ہیجان برپا تھا۔

بادشاہ کے حضور میں روانگی اور دہلی کا انتظام

بعکس دہلی میں بادشاہ جن کے اقتدار رفتہ کو واپس لانے کے لئے یہ سب ہنگامہ برپا تھا چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ بادشاہ کمزور و معذور زندگی کی اس منزل پر پہونچ گئے تھے جبکہ انسان کا جوش و خروش مبدّل بہ انحطاط ہوتا ہے؛ شاہ عالم کے زمانہ سے کمپنی کے زیر سیادت شاہانِ مغلیہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اُس سے اُنھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ برائے نام حکومت ان کی ذات پر ختم ہو جائے گی۔ قلعۂ معلّٰے کی حیثیت درگاہ کی سی تھی اور بادشاہ اس کے مجاور۔ شاعرانہ اور صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے۔ درود وظائف پیری مُریدی سے فرصت پاتے۔ تو شاعری کی محفلیں گرم ہوتیں۔ تھوڑی سی فارغ البالی کمپنی کی ذراسی نگاہِ کرم مطمئن زندگی کے لئے کافی سرمایۂ تسکین تھا۔ ان کے شاہانہ مشاغل کی تفسیر اشعار ذیل سے ہوتی ہے ؎

صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہے — شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہے

رہے شاہ زادے اُن میں مرزا مغل ذرا جوش اور جذبہ کے آدمی تھے۔ لیکن زینت محل نے سازشوں کا جو جال بچھایا تھا۔ اور جواں بخت کو تخت دلوانے کے لئے جو ریشہ دوانیاں جاری کی تھیں، سب کی توجہ اُن کی طرف منعطف تھی۔ چنانچہ مرزا مغل بھی اُن سے دامن نہ بچا سکے اور اُن میں

---

۵۱ داستانِ غدر از ظہیر دہلوی۔

ایسے محو ہوئے کہ دشمن دروازہ پر کھڑا تھا لیکن یہاں کسی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ تھی دہلی کی وہ ناگفتہ بہ صورت حال، جس کو بخت خاں نے محسوس کیا اور بریلی چھوڑ کر دہلی روانہ ہو گئے۔ نانا راؤ کا بھائی ہمراہ تھا۔ بدایوں سے ہوتے ہوئے فرخ آباد آئے۔ جہاں جہاں سے گزرے راجہ اور جاگیرداروں کو معاونت پر آمادہ کرتے جاتے تھے۔ ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں:-

> "جنرل بخت خاں ۱۴ ہزار کا کیپو، چند توپ اور تین رجمنٹیں سواروں کی لے کر اور کئی لاکھ زر ۲ر جولائی کو دہلی میں داخل ہوا۔ سر پر انگوچھا لپٹا ہوا جال کرچ گلے میں پڑی ہوئی، پیچھے حال کھلا کہ بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ بظاہر تو اس کا لباس گھس کھدوں کا سا تھا، میں تو سمجھا جیسے اور پوربئے سپاہی ہیں یہ بھی کوئی سپاہی ہوگا۔"[۵۱]

علاوہ کثیر التعداد فوج کے ایک سو کے قریب علما بھی اُن کے ہمراہ تھے جنھیں اس زمانہ میں مجاہدین کہا جاتا تھا۔ بادشاہ نے جب بخت خاں کی آمد کی خبر سُنی تو اپنے خسر نواب احمد علی خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں[۵۲]۔ صمد یار خاں۔ ابراہیم خاں اور غلام علی خاں کو اُن کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ بخت خاں بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے۔

بادشاہ کی طرف سے بڑے وسیع پیمانہ پر ان کی پوری فوج کو دعوت دی گئی۔ اور چار ہزار زر بطور انعام کے فوج کو جیب خاص سے عنایت کیا۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

> "سپاہ میں سب سے زیادہ اچھی حالت بریلی بریگیڈ کی تھی۔ کہ جس نے چھ ماہ کی تنخواہ پیشگی دیدی تھی اور اس کے سالار کے پاس چار لاکھ روپیہ بھی تھا۔"[۵۳]

بادشاہ نے فرزند کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ ایک بیش قیمت ڈھال اور تلوار بھی عنایت کی۔ اور تمام شہر میں منادی کرائی گئی کہ پلٹنوں کے افسروں کو ہدایت سُننے کے لئے جنرل کے پاس جانا چاہئے۔ اُنھوں نے اپنا فوجی دفتر علیحدہ قایم کیا۔ میر منشی خیرات علی مقرر ہوئے۔ ان کے ڈسپلن کی بدولت ان کی فوج میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

انگریزوں سے جنگ } ۹ر جولائی کو بخت خاں نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ انگریزی فوج پر حملہ کیا اور تیس ہزاری میدان ان سے چھین لیا۔ گھوڑے۔ ہتھیار

---

۵۱ داستان غدر ۵۲ احترالدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ، ان کی شہادت پر بادشاہ کو رنگون بھیجا گیا۔ (مضامین فرحت اللہ بیگ) ۵۳ عروج عہد انگلشیہ۔

اور بہت سا سامان میدانِ جنگ سے ہاتھ آیا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں :۔

"۲۹ جولائی کے دربار میں جنرل بخت خاں بادشاہ کا قائم مقام ہو کر آیا۔ بادشاہ نے ساری سپاہ اور شہر پر نیم بادشاہ بنا دیا۔ جنرل نے بھی کمانڈر انچیف کی نقل اتاری۔ آج میگزین دیکھتا ہے۔ اُس میں بالترتیب سامان رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ لال ڈگی اور جامع مسجد کے درمیان ہزاروں فوج کی پریڈ لی۔ نمک اور شکر پر جو محصول تھا وہ معاف کر دیا۔ تاکہ غربا کو تکلیف نہ ہو۔ نیز یہ بھی کہا کہ جو شہزادہ شہر کو لوٹے گا میں اُس کی ناک کٹوا دوں گا۔" [۱]

آگے چل کر مولوی صاحب پھر لکھتے ہیں :۔

"جب تک بخت خاں دلی میں نہیں آیا تھا جہاد کے فتوے کا چرچا بہت کم تھا۔ مگر جب بخت خاں دلی آیا تو اس نے یہ فتوے لکھا یا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کو فتح ہو گئی۔ تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر دیں گے۔ جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے ان کے دستخط کرائے۔ اس فتوئے جہاد کے علاوہ ایک حلف نامہ بھی تقسیم کرایا اور اس پر ہر سپاہی سے جن کی تعداد ۷۰/۸۰ ہزار کے لگ بھگ تھی عہد لیا۔ مرزا مغل نے یہ حلف نامہ فوجوں کو پڑھکر سنایا۔ جس پر انھوں نے اقرار کیا کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے! جنرل بخت خاں خلوت جلوت میں جب چاہتے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتے کوئی پابندی عاید نہ تھی۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ عید قرباں کے روز حسب ذیل شعر لکھکر ان کو بھیجا ؎

لشکرِ اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو
گورکھا، گوجر سے لیکر تا نصارےٰ قتل ہو [۲]

پیدل فوج کی دو پلٹنیں اور پانچ سو رسالہ کے سپاہی چھ توپوں اور سامان اسلحہ کے ساتھ بخت خاں کے حکم سے باغپت روانہ ہوئے تاکہ انگریزوں کو پل تعمیر کرنے سے روکیں، اس کے علاوہ فوج کی کثیر تعداد مع سامان حرب کے علی پور روانہ ہوئی، سہ پہر کو یہ افواہ اُڑی کہ باغیوں کو بہت بڑی فتح ہوئی۔ اس کی وجہ سے عوام میں بڑا جوش و خروش پھیل گیا۔ دہلی سے اجمیری دروازہ تک فوجوں کی پریڈ لی گئی۔ جنرل نے سپاہیوں کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ بات چیت کی اور بادشاہ کا خاص پیغام پہونچایا کہ جو شخص میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں کرے گا

---

[۱] عروجِ عہد انگلشیہ۔ [۲] رسالہ بغاوت ہند صفحہ ۱۲۶ بابت ۱۸۵۹ء ماہ دسمبر۔

اُسے پانچ بیگہ زمین دی جائے گی۔ اور اعزازی عہدہ بھی دیا جائے گا۔"

جنگی کونسل کے روبرو بخت خاں نے بیان کیا کہ وہ کشمیری دروازہ کے بالمقابل مورچہ بنا رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بغاوت ہوئی اس کی سرپرستی اور رہنمائی بادشاہ کی طرف سے اُن کے سپرد تھی۔ وہ لوگ اُن سے براہ راست ہدایتیں منگواتے اور اُس کے مطابق عمل درآمد ہوتا تھا۔ جنرل صاحب کے ایک خط سے جو اُنھوں نے جنرل سدھاری سنگھ اور غوث محمد خاں کو روانہ کیا ہے۔ اِن کے اُس مقصدِ عظیم کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کو لے کر وہ اُٹھے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"محمد بخت خاں گورنر بہادر اور دہلی کے دارالخلافہ میں جو فوج ہے۔ اس کے سپاہی اور افسران آداب بجا لاتے ہیں۔ اور تم کو مبارک باد دیتے ہیں۔ جو بہادرانہ کارنامے تمہارے متعلق سے ہیں ہم سب کو اُن پر فخر ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اور تمہارے بادشاہ شب و روز ان مٹھی بھر عیسائیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو بہت تھوڑے عرصہ میں دہلی کا ملک ان سے پاک ہو جائے گا۔"

جواب سدھاری سنگھ:۔

"خدا کے فضل سے دہلی کی جو سلطنت وجود میں آئی ہے۔ عالم طفولیت میں ہے۔ خدا نے آپ کو اس بچہ کی پرورش کے لئے بھیجا ہے۔ آپ کے تحت پانچ دستے ہیں اور آپ کا خطاب جنرل بہادر ہے۔ اور آپ کے ہاتھ میں ہر قسم کی قوت ہے۔"[۵۱]

جنرل اور اُن کی فوج کی بہادری

توپچیوں نے جنرل کی سرکردگی میں بہادری کے وہ جوہر دکھلائے کہ دشمن کی صفوں میں ہل چل ڈال دی تھی۔ ظہیر دہلوی ایک اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"چاندنی رات ہے اور میں ایک دوست کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا ہوں کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمربندی ہو گئی۔ اور میگزین سے بڑی بڑی چھتیس پنی منڈیاں دس دس بارہ بارہ جوڑی بیل لے چلے اور میگزین کی کراچیاں جداگانہ تھیں۔ کوئی پانچ گھڑی رات گئے یہ سب فوج باہر ہو گئی۔ بڑی بڑی توپیں پہاڑوں پر چڑھا کر مورچے باندھ لئے۔ دریا درمیان ہر دو لشکر کے بیچ ایک میل کا فاصلہ

---

۵۱ محاصرہ کے دوران میں جنرل بخت کا خط سدھاری سنگھ کے نام غدر کا ریکارڈ (از گوری شنکر)۔

ہوگا۔ بڑی توپوں نے بڑا کام کیا اور فوج انگریزی کا بہت نقصان ہوا۔ زرد کوٹھی کے متصل پوربیوں نے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا۔ اور بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں۔ اُن توپوں سے انگریزی فوج کو بہت نقصان پہونچتا تھا۔ اس مورچہ کی حفاظت کے لئے ہر وقت دو پلٹنیں اور گولا انداز موجود رہا کرتے تھے۔"[۵۱]

"انگریزی فوج نے ایک رات شب خون مارا' رات بھر ہنگامہ گیرو بکش گرم رہا۔ دونوں طرف سے توپ چلتی رہی۔ لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے۔ خدا جانے طرفین سے تین سَو توپیں چل رہی تھیں یا چار سَو اس کا علم خدا کو ہے۔"

"گھوڑ چڑھی کے توپ خانہ نے یہ کام کیا کہ محلدار خاں کے برابر تریولیہ ہے اس میں توپیں لگادیں۔ اور دو پلٹنیں باغیچہ میں چھپ کر کھڑی ہوگئیں۔ تریولیہ کے تینوں دروں میں توپیں لگی ہوئی تھیں۔ اور دونوں طرف سے باغیوں نے راستہ رکھا تھا۔ لیکن انگریزی توپ خانہ نے ایسے گولے برسائے کہ تینوں توپیں بے کار ہو کر شہر روانہ ہوگئیں۔ فوج انگریزی اس سے بے خبر کہ پلٹنیں گھات میں بیٹھی ہیں۔ دو رویہ سلسلہ میں بندھی تعاقب میں بڑھی چلی آئیں۔ باغیوں نے جب دیکھا کہ وہ بیچ میں آگئیں۔ یکبارگی باغات کی دیوار کے پیچھے سے کھڑے ہو کر دونوں طرف سے باڑھ جھونک دی۔ اُس وقت فوج کا یہ حال ہوا جیسے کبوتروں میں چھرّا مار دیا ہوا۔ بہت آدمی ضائع ہوئے اور مورچہ چھوڑ کر اُلٹے پاؤں چھاؤنی کہنہ کی طرف روانہ ہوئے۔"[۵۲]

"جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی۔ اور ان کو معلوم ہوگیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے۔ فوج باغی نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا۔ اور کوئی تدبیر یا دقیقہ ان کے وہاں سے نکالدینے میں اور غارت کرنے میں باقی نہیں چھوڑا۔ دشمنوں نے اپنی مورچہ بندی ایک بہت اچھے موقع پر باغات اور مکانات کی آڑ میں کی تھی۔ توپیں بہت عقلمندی کے ساتھ سرکیں اور زیادہ رغبت سے آگ برسائی کہ ایک لمحہ کیلئے بھی توقف نہ تھا۔"[۵۳]

ولیم فوربس رقمطراز ہے کہ:۔

"محاصرہ کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملے کئے اور یہ باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی دشمن سے مقابلہ نہ کر رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد ۲۶ تھی۔ ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظم اور باقاعدہ اقدام اور حملہ تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار حملے دُور اُفتادہ

---

۵۱ داستانِ غدر از ظہیر دہلوی۔ ۵۲ داستانِ غدر . . . ۵۳ رسالہ تاریخ بغاوت ہند۔ بابت اگست۔

چوکیوں اور ہراول پر ہوئے۔ یہ ہمارے آدمیوں کے بہت کم قریب آتے تھے۔ اور یہ بھی اُسوقت جب ان پر اچانک حملہ کر دیا جاتا تھا۔ گو روزانہ جنگ آزما ہوتے تھے۔ ان کی اس مستقل جرأت بہادری سے کوئی چیز بازی نہیں لے جاسکتی تھی۔"[۵۱]

چارلس بال صاحب رقمطراز ہیں کہ:۔

"شہر کے جس حصّہ پر ہم نے سب سے پہلے حملہ کیا اس پر شراب کا کافی تعداد میں موجود ہونا باغیوں کی انتہائی چالاکی کا ثبوت ہے۔"[۵۲]

مُجاہد علماءِ اسلام سے اتحادِ عمل

۱۸۵۷ء کی تحریک سے بھلا علماء کی جماعت کیسے علٰحدہ رہتی ۱۸۳۱ء میں ان کو سرحدی جنگ میں جو ہزیمت ہوئی گورنمنٹ نے جو قیامتِ صغریٰ ان پر نازل کی تھی اُس کا بدلہ لینے کا اس سے بہتر موقعہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ اس زمانہ میں وہابیوں کو مجاہدین کہا جاتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب رقمطراز ہیں کہ:۔

"بخت خاں خود بھی وہابی تھے اور محمد رفیع رسالدار۔ مولوی امام خاں۔ مولوی عبدالغفور خاں مولوی سرفراز علی بھی وہابی تھے۔ بخت خاں نے سرفراز علی کو پیشوائے مجاہدین مقرر کیا تھا۔ اور وہی ان کی سرپرستی کرتے تھے۔"[۵۳]

علماء کی جماعت پر جنرل صاحب کو اس قدر اعتماد تھا کہ تخلیہ کے اُن مخصوص مشوروں میں جن میں سوائے اُن کے اور بادشاہ کے کوئی نہ ہوتا تھا یہ لوگ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ جنرل بخت خاں کے ہمراہ ایک سو علماء دہلی آئے تھے۔ دورانِ ہنگامہ میں ایک جماعت وہابی علماء کی ٹونک سے بھی آئی تھی۔ اِس کے علاوہ جے پور۔ بھوپال۔ ہانسی حصار اور آگرہ سے بھی کافی تعداد میں علماء آئے اور جنرل کے ساتھ کام کیا۔[۵۴]

لیکن علماء کی جماعت میں مولوی لیاقت علی خاص لیاقت اور شخصیت کے مالک تھے۔ جن کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر بخت خاں نے انکو الہ آباد کا گورنر بنا دیا تھا۔ انھوں نے ایک رسالہ "جہادِ حریت" بھی لکھکر شائع کیا۔ اس میں تحریر کیا تھا کہ:۔

"جہاد میں سب سے بڑا سامان یہ ہے کہ بندے توکل بخدا کریں اور امداد جانب خالقِ کون ومکاں سے ہو۔ مسلمانانِ ہندوستان کہ بوجہ بے استطاعتی زرعدم موجودگی گولہ بارود توپ ولشکر تھے مجبور دنا توان

---

[۵۱] غدرِ عظیم کا تذکرہ۔ (از ولیم ونیس)۔ [۵۲] "ہندوستان کے غدر کی تاریخ"۔ (چارلس بال)۔
[۵۳] بہادر شاہ کا مقدمہ۔ (از خواجہ حسن نظامی) [۵۴] بہادر شاہ کا مقدمہ صفحہ ۲۲۶

ہو رہے تھے سو اس خالق اعداء اللہ نے دین احمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا باطنی طور پر قوی و توانا کیا ہے۔ ویسا ہی ظاہری سامان تسکین خاطر ہم ضعفاء و مساکین ان نابکار فجار کی بداطوار سے بلا سبب و کوشش ہم لوگوں کو دلوایا۔" ۵۱

ہنٹر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"جب ۱۸۵۷ء میں غدر شروع ہوا تو مولوی جعفر تھانیسری اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا اور اب وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ جن کے پاس باغیانہ ازمحفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی میں جب باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تو جعفر جبر تھانیسر واپس آ گیا۔" ۵۲

تاریخ بغاوت ہند میں تحریر ہے کہ:۔

"اس کے علاوہ ملک میں اور طرح بھی سازشیں کی گئیں۔ انقلابی لوگ فقیرانہ لباس پہن کر شہروں میں نکل جاتے تھے۔ تاکہ انتظام سرکار میں خلل ڈالیں۔ اور ہندوستانی سپاہیوں کو باغی بنائیں۔" ۵۳

علماء کی جماعت میں مولوی احمد اللہ شاہ صاحب بھی تھے۔ ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ:۔

"جب آگرہ میں وعظ فرماتے تھے۔ تو دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ فیض آباد کی چھاؤنی پر در بست قابض ہو گئے۔ بیگم حضرت محل نے انہیں لکھنؤ بلا کر فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ جہاں وہ دس ماہ تک انگریزوں سے برسرپیکار رہے۔ جب انگریزوں کا لکھنؤ پر قبضہ ہو گیا تو راجہ پوایاں نے اپنے مکان میں بلا کر جبکہ وہ اس سے باتیں کر رہے تھے شہید کرا دیا۔ ان کی قبر موضع گنج متصل شاہجہاں پور میں ہے۔" ۵۴

راجہ جگن ناتھ کو ۵۰ ہزار روپیہ انعام میں ملا۔ مولوی صاحب کی نسبت مالیسن لکھتا ہے کہ:۔

"مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ کوئی شخص فخر کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے کالن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دوبار میدان میں شکست دی۔ مولوی احمد اللہ شاہ سچا محب وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہیں کیا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں

---

۵۱ علماء کا شاندار ماضی۔ علماء کی جماعت کے ساتھ مولوی لیاقت علی کو بھی کالے پانی بھیجا گیا۔ "حکایاتِ عجیب" میں علماء ہند کے علاوہ انکا نام بھی درج ہے صفحہ

۵۲ ماخوذ از "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مولوی صاحب وہابیہ تحریک کے مجاہدین میں سے تھے ۱۸۶۵ء میں ستھانہ کیمپ سے تعلق رکھنے کی بنا پر کالے پانی کی سزا ہوئی، ۲۰ سال وہاں گزارے۔

۵۳ "تاریخ بغاوت ہند"۔

۵۴ مولانا سید طفیل احمد صاحب نے قبر پر کتبہ لگوا دیا ہے اور اب سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ مضمون "دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ" از مفتی انتظام اللہ صاحب (مصنف) بابتہ دسمبر ۱۹۴۳ء۔

ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی۔ جنھوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو مولوی احمد شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہئے۔" مولوی صاحب کے قتل کے بعد انگریزوں کو مکمل فتح ہوئی۔ اور ۲۱ جنوری ۱۸۵۸ء کو نواب ممّو خاں نائب حضرت محل۔ ۵۰ نفر قیدیان بغاوت کالے پانی بھیجے گئے اور وہیں فوت ہوئے"۔ ۵۲

انھیں مجاہدین میں ایک مجاہد جھنڈا شاہ تھے۔ جن کو مولانا جعفر تھانیسری نے کالے پانی میں دیکھا اور اُن کے متعلق تحریر کیا :۔

"جھنڈا شاہ ایک سر بھنگی فقیر سالہا سال سے مونٹ ہیریٹ میں دھونی لگائے بیٹھا تھا اور ۲۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ضلع بریلی سے بجرم ترغیب وہی بغاوت ۱۴ برس کا سزایاب ہو کر پورٹ بلیر آیا اور جس کو حسب وارنٹ ضلع بریلی کے ۲۱ دسمبر کو رہا ہوجانا چاہئے تھا۔ مگر ابتک رہا نہیں ہوا۔ اِس کے بظاہر بے وجہ قید رکھنے میں جو حکمت ہے ہم عوام اس کو نہیں جانتے۔ ۵۱

۱۷۹۶ء میں جو جزیرہ اپنی ہولناک اور جانکاہ آب و ہوا کی وجہ سے آباد ہو کر اُجڑ چکا تھا علماء ہند کی بدولت پھر آباد ہوا۔ مولوی جعفر صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"ان جزائر کی ہوا سمِ قاتل ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے جا کر دیکھا کہ اس غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسوں راجے۔ مہاراجے اور نواب۔ زمیندار۔ مولوی۔ مفتی۔ قاضی۔ ڈپٹی کلکٹر۔ منصف صدرامین۔ رسالدار اور صوبیدار۔ جمعدار۔ وغیرہ قید ہیں۔ جو کہ چوہڑے۔ چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ محنت مشقت کرتے ہیں۔" ۵۳

اس کے علاوہ ایک اور انتہائی شرمناک سزا نوشتۂ تقدیر کی تھی۔ محمد جعفر لکھتے ہیں کہ :۔

"ہم جب پہنچے ہزاروں مرد۔ عورت قیدیوں کو دیکھا کہ ماتھا کھود کر پیشانی پر ان کا نام اور جُرم اور لفظ دائم الحبس لکھا ہوا ہے کہ وہ مثل نوشتۂ تقدیر کے تمام عمر نہیں مٹتا۔ مگر بہ تائید الٰہی سنئے کہ ہمارے جانے سے کچھ عرصہ پہلے وہ حکم منسوخ ہو چکا تھا۔ اس سبب سے اس دائم الحبسی سے بھی ہم محفوظ رہے۔" ۵۴

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی قیدی بھی اس نوشتۂ تقدیر سے نہیں بچتے تھے۔

---

۵۱ "حکایاتِ عجیب" جعفر تھانیسری صفحہ ۸۲۔ ۵۲ "حکایاتِ عجیب" صفحہ ۴۴۔

۵۳ "کالا پانی" صفحہ ۵۶۔ ۵۰۔ ۵۴ "کالا پانی" صفحہ ۴۹۔

بہادری کی عجیب و غریب مثالیں

ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں کہ:-

"میں جوہری بازار کے پھاٹک پر آیا تو دیکھا کہ زخمی بکثرت آ رہے ہیں۔ دو سوار میری برابر سے نکلے، میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں میں گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے ہیں۔ اور پشت پر بڑے بڑے بھباتے کھلے ہوئے تھے اور کلیجے کے ٹکڑے خون کے لچھے پر جمے پڑے تھے۔ داہنے ہاتھ میں تیغے۔ بائیں ہاتھ میں گھوڑے کی باگیں۔ کسی طرح کا کرب اور بدحواسی ان کے بشرے سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ ایک زخمی کو دیکھا کہ اس کا ہاتھ کہنی سے اُڑ گیا تھا اور کٹے ہوئے بازو سے خون گرتا جاتا تھا اور اپنے پاؤں سے چلا آتا تھا۔"[۵۱]

مجینڈی نے بہادری کی ایسی ہی مثالوں سے متاثر ہو کر تحریر کیا تھا کہ:-

"ان لوگوں پر انسان نہیں بلکہ کوئی مافوق البشر ہونے کا گمان ہوتا ہے"

ولیم فوربس لکھتا ہے کہ:-

"میجر ریڈ کی ہدایت پر بغیر کسی دشواری کے باغیوں کو باغوں سے انگریزی سپاہ نے نکال دیا۔ لیکن سراؤں۔ مکانوں میں باغیوں سے لڑائی ہوئی۔ مکانوں کی چھتوں پر جو زینے جاتے تھے اُن پر چڑھتے ہوئے باغیوں کو انگریزی سپاہ نے سنگینوں سے ہلاک کیا۔"[۵۲]

چارلس بال رقمطراز ہے کہ:-

"دشمن نے ہر سڑک پر ایک ایک فٹ زمین کے لئے لڑائی لڑی تھی۔ اور بڑے استقلال کے ساتھ یکے بادیگرے ہر مقام پر قبضہ کیا تھا۔"[۵۳]

بادشاہ لاکھ بوڑھے اور کمزور تھے۔ پھر بھی تیموری خون کبھی کبھی گرما ہی جاتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے شرفا، دہلی کے لڑکوں۔ کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی ایک فوج بنائی تھی۔ انکے لباس میں چند جدتیں بھی کی تھیں، سبز کوٹ۔ سیاہ چمڑے کے جوتے۔ سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے بڑے آن بان سے قدم ملا کر چلتے تھے، تھے تو کم مگر غدر میں باؤنٹے کے نیچے سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے۔ تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں۔ خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی فوج تھی اس لئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔[۵۴]

---

۵۱ داستانِ غدر۔ ۵۲ غدرِ عظیم کا تذکرہ (ولیم فوربس)۔

۵۳ ہندوستان کے غدر کی تاریخ (چارلس بال) ۵۴ مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔

اسبابِ ناکامی

مذکورہ بالا قربانیوں کا جو افسوسناک انجام ہوا۔ اس کا ایک بڑا سبب اُس میگزین کی تباہی تھا جس کی بربادی نے کامیابی کو ناکامیابی سے اور فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ :-

"اسی زمانہ میں یہ ستم ہوا کہ شہزادی بیگم کی حویلی میں جو میگزین تھا اور جس میں سات سَو من باردو تیار ہوتی تھی اور خرچ میں آجاتی تھی۔ ایک دن سہ پہر کا وقت ہے۔ دن کے تین بجے ہیں۔ کہ ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ میں اپنے دو منزلہ پر چڑھا۔ دیکھتا کیا ہوں گرد و غبار اور دھواں آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ میگزین اُڑ گیا۔ بارود کی عدم فراہمی کی وجہ سے تمام آلات توپ بیکار تھے۔ دشمن دروازہ پر کھڑا تھا باہر سے امداد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بادشاہ پہلے سے ہی سوختہ جگر۔ اور سوختہ سامان ہو رہے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے کچھ ایسا افسوں کیا کہ قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرہ میں گوشہ گیر ہونے میں عافیت سمجھی۔"

میلسن لکھتا ہے کہ :-

"باغی فوج کے سپہ سالار بخت خاں نے اسی شب شہر کو خالی کر دیا اور اپنے ہمراہ ان لڑنے والوں کو بھی لے گیا۔ جن پر اس کو اعتماد تھا۔ بخت خاں نے ہر ممکن الفاظ میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ چلیں انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن ملک کے دروازے اِن کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ بادشاہ کی موجودگی سے اب بھی اس کے نام پر جنگ کو جاری رکھنا ممکن ہے۔ اور کامیابی کے امکانات ہیں۔"[ا]

اگر بہادر شاہ کی فطرت میں اپنے اجداد بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ اور عالمگیر کی سی ثابت قدمی ہوتی یا قوتِ ارادی کا شائبہ ہوتا تو بخت خاں کی درخواست بیکار نہ جاتی۔ شہزادوں نے بھی بادشاہ کا اتباع کیا۔

جنرل بخت خاں کی رُوپوشی

میگزین ختم ہو چکا تھا۔ بادشاہ قلعہ چھوڑ چکے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ جنرل صاحب مع اپنی فوج کے کہیں روپوش ہو گئے۔ سالہا سال تک اِن کی تلاش و جستجو جاری رہی۔ لیکن اِس بہادر غیور ملت کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ اکثر کا خیال ہے کہ وہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہاں فیروز شاہ

ا "تاریخ غدر" (از میلسن)

اور تجمل حسین خاں وغیرہ کو تو لوگوں نے دیکھا اور بخت خاں کو کسی نے نہ دیکھا نہ پہچانا۔ ایک خیال یہ بھی ہے اور ایک حد تک صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرحد آزاد کی طرف چلے گئے۔ اور قبائل میں انگریزوں کے خلاف کام کرتے رہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

بادشاہ کو تخت حکومت پر برقرار رکھ کر خود تحریک کی قیادت کرنا شخصی دورِ حکومت میں ان کی زبردست سیاسی غلطی تھی جو ان کی ناکامیابی کا باعث ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:۔

"بخت خاں بچارے پر دو حریفوں کا بوجھ پڑا۔ ایک طرف انگریز تھے۔ دوسری طرف مرزا مغل اسی کشمکش میں فوجیں قابو سے باہر ہو گئیں۔ انتظام کی مشین بے کار ہو گئی۔ انگریزوں نے دہلی فتح کر لی اور انقلاب کی اسکیم دھواں ہو کر اڑ گئی۔"

تحریکِ بغاوت

نیک دل انگریزوں کی نگاہ میں!!

مندرجۂ بالا واقعات سے ہمارے بزرگوں کی قربانیوں اور جانکاہیوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ جو کیا تو کون مقصد اعلیٰ سامنے رکھ کر کیا۔ بعض انصاف پسند انگریزوں نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تحریر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ مسٹر لیکی نے تحریر کیا تھا کہ:۔

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے۔ تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی۔"[۵۱]

ڈاکٹر ہنٹر نے تحریر کیا کہ:۔

"انھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد سے نہیں لیا۔"[۵۲]

مسٹر ڈزرائیلی وزیر اعظم انگلستان نے ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کی تقریر میں بیان کیا:۔

"مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ محض قومی تکلیف کی بنا پر یہ بغاوت نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ درپردہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے۔"[۵۳]

---

۵۱ "روشن مستقبل"۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب۔

۵۲ "ہمارے ہندوستانی مسلمان"۔

۵۳ "تصویر کا دوسرا رخ"۔

مجینڈی لکھتا ہے :-

"جن کو ہم نے گرفتار کیا تھا ان میں سے بہت سے تو اسی وقت ختم ہو گئے۔ لیکن آخر وقت تک اُن کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایان شان علامات تھیں" ۔ ۵ے

وہ مقصد عظیم جس کے لئے جنرل بخت خاں اور دوسرے لوگوں نے جان کی بازی لگائی ہندوستان کی کامل آزادی اور احیائے سلطنت اسلامیہ تھا۔ لیکن جب کوئی قوم ایک مرتبہ اپنی حماقتوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر با سانی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ تاہم ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کو بالکلیہ ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ظالم کمپنی کی حکومت کا بہر صورت خاتمہ ہو گیا۔ اُس کی جگہ ایک قسم کی جمہوری حکومت نے لے لی۔ جس میں ہم ہندوستانی نسبتاً زیادہ آزادی کی سانس لے رہے ہیں۔ اور کم از کم ملک کے اندرونی انتظام میں برابر کے شریک ہیں +

انیس فاطمہ

۵ے "علماء ہند کا شاندار ماضی" (مصنفہ مولوی محمد میاں صاحب صفحہ ۴۰۵)۔

معاونین مصنف

۲۶ مارچ ۱۹۴۵ء لغایتہ ۲۵ مئی ۱۹۴۵ء

۱- ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر علیگڑھ ...... ۵۰ ر

۲- مولوی مختار احمد خاں صاحب بی اے (علیگ) رئیس بریلی ...... ۶ ر

۳- خان بہادر خلیفہ اسد اللہ صاحب کلکتہ ...... ۵ ر

۴- بیگم صاحبہ محمد نسیم صاحب بی اے، ڈبائی ...... للعہ ر

۵- یونین لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ...... ۵۰ ر

۶- مولوی حسن عبداللہ صاحب ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ...... ۶ ر

۷- آنریبل خواجہ غلام السیدین صاحب وزیر تعلیمات رامپور ...... ۵ ر

۸- خان بہادر شیخ وحید الدین صاحب سی آئی اِی رئیس اعظم میرٹھ ...... للعہ ر

۹- خان بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب ڈپٹی کمشنر لکھیم پور ...... للعہ

۱۰- مولوی محمد ابراہیم علیخانصاحب رئیس قائم گنج .... للعہ

۱۱- مولانا امتیاز علی خانصاحب عرشی رام پور .... للعہ

۱۲- ڈاکٹر زبید احمد صاحب الہ آباد یونیورسٹی للعہ

۱۳- خان بہادر سید آل علی نقوی صاحب ایم اے بدایوں - للعہ

۱۴- سید نصیر الدین حیدر صاحب ایم - اے لکھنؤ - للعہ

۱۵- پروفیسر نجیب اشرف صاحب اسمٰعیل زندھیری کالج بمبئی للعہ

۱۶- انجمن عربی صوبہ متحدہ - الہ آباد .... للعہ

۱۷- مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلور .... للعہ

۱۸- سید نائب حسن صاحب کاظمی علی گڑھ ...... للعہ

۱۹- ہیڈماسٹر صاحب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علیگڑھ للعہ

۲۰- خان بہادر پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ .... للعہ

۲۱- ہیڈماسٹر حامدہائی اسکول رام پور ... للعہ

۲۲- " " مرتضی " " ..... للعہ

۲۳- پرنسپل رضا انٹر کالج " ..... للعہ

۲۴- " مدرسہ عالیہ " ..... للعہ

۲۵- ہیڈ مسٹرس صاحبہ اسلامیہ گرلز ہائی اسکول بریلی . للعہ

۲۶- خواجہ محمد نسیم صاحب لاہور .... للعہ

۲۷- سید مسعود الحسن صاحب پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج بریلی (ذاتی) .... للعہ

۲۸- پرنسپل صاحب اسلامیہ انٹر کالج بریلی .... للعہ

۲۹- میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد .. للعہ

۳۰- حکیم بشیر الدین صاحب وکیل لوائے مادھوپور .. للعہ

۳۱- پروپرائٹر صاحب عالم شوز مرچنٹ دارجلنگ ...... للعہ

۳۲- مولوی شجاعت علیخانصاحب سپرنٹنڈنٹ اکسائز الموڑہ ..... للعہ

۳۳- مہتمم صاحب انجمن ترقی اردو بانکی پور پٹنہ ... للعہ

۳۴- بیگم صاحبہ آبا د احمد خانصاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس اٹیہ - للعہ

۳۵- ڈاکٹر عبد العزیز خانصاحب سویلین ہسپتال - الہ آباد - للعہ

۳۶- بابو فضل دین صاحب بنگلور ...... للعہ

۳۷- بابو امام الدین صاحب نوساروی سورت .. للعہ

۳۸- مولوی حاجی ابو الحسن صاحب غازی پور .... للعہ

۳۹- بابو محمد صدیق صاحب میسور .... للعہ

۴۰- ڈاکٹر محمد راحت اللہ خانصاحب مہتمم کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن .. للعہ

۴۱- مولوی عبد المجید صاحب بنگلور ...... للعہ

۴۲- بیگم اعزاز رسول صاحبہ ایم ایل سی - لکھنؤ ... للعہ

۴۳- بیگم خدیجہ علام احمد صاحبہ کوٹھی گلفشان بستی پٹھاناں پٹیالہ - للعہ

میزان ۱۹۰ للعہ

تصانیف سید الطاف علی بریلوی

حیات حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اُردو زبان میں پہلی مکمل و مبسوط با تصویر سوانحعمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور ولولہ انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۵ روپئے (زیر طبع بار دوم)

مسلمانوں کی تعلیمی جد و جہد — (بزبان انگریزی) اس کتاب میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے اسوقت تک کی مسلمانانِ ہند کی بالخصوص اور مسلمانانِ یو۔پی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جد و جہد تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت عہ/ روپیہ (زیر طبع بار دوم)

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی ذاتی سادہ 'پبلک لائف' کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مُرتب کیا ہے۔ قیمت چھ آنے۔

معرکۂ انتخاب جداگانہ و مخلوط — جداگانہ یا مخلوط کونسا طریقۂ انتخاب مسلمانوں کے مفید ہے اس سوال کا جواب عام فہم زبان میں دیا گیا ہے۔ قیمت دو آنے۔

رُباعیات عرش فاروقی — بریلی (روہیلکھنڈ) کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے دردانگیز حالاتِ زندگی اور بطور نمونۂ کلام اُن کی کیف آور رُباعیات کا مجموعہ۔ قیمت چھ آنے۔

صوبۂ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رکاوٹیں درپیش ہیں۔ اُن پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حلِ مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔

نواب دوندے خاں — (بزبان انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامرا نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار عزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر بہرام جنگ کے مجاہدانہ واقعات اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت چار آنے۔

غلام قادر روہیلہ (سلطنتِ مغلیہ کا آخری محافظ) — بزبان اردو و انگریزی۔ (زیر [illegible])

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ یو۔پی

مصنف نمبر ۱۰

مجلس مصنفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

مارچ سنہ ۴۵ء

مدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

قیمت سالانہ چار روپے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باہتمام [illegible] صاحب جواہر خاں

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں [illegible] طبع ہوا

مُصنّف

جلد ۳	بابت ماہ مارچ ۱۹۴۵ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

× × × × × × × × × × × × × × × × ×

ذکرِ ماضی
اور
فکرِ فردا

زیں تنگنائے خلوتم خاطر بہ صحرا میکشد
کز بوستاں بادِ سحر خوش میدہد پیغام را

جنگ ایک طرف دُنیا اور اُس میں رہنے بسنے والوں کے لئے تباہی و بربادی کا باعث ہے تو دوسری طرف اُس کی ترقی کا بھی پیش خیمہ ہے۔ انسانی جوہر مشکلات میں پڑنے سے کھلتے ہیں۔ اور خفتہ صلاحیتیں کشمکش ہی سے بیدار ہوتی ہیں۔

ساڑھے پانچ سال کی مہیب اور عالمگیر جنگ نے ہماری طبائع کے ایسے ایسے پرانے زنگ دُور کئے اور ہمارے دماغوں میں ایسی ایسی نمو جودت اور جولانی پیدا کی جو جنگ کے بغیر پچیس سال میں بھی نہ ہوتی۔ صنعتی۔ تجارتی۔ زراعتی۔ معاشی اور سیاسی نظریوں میں جو نکھار پیدا ہوئے اُن سے قطع نظر کر کے تعلیمی اور علمی میدانوں میں بھی اِس وقت زبردست جدّ و جہد جاری ہے۔ ایک خاص جوش و ولولہ اور عزم و استقامت کی برقی رَو دوڑی ہوئی نظر آرہی ہے۔

راقم السطور کی طرح جو لوگ محدود آمدنی اور زیادتی مصارف کا شدت سے شکار ہیں وہ بھی اپنے ناکارہ وجود میں سرورِ فاقہ مستی محسوس کرتے ہیں اور ایک شاندار مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ہر شخص خواہ کسی مرتبہ اور مکتبِ خیال کا ہو بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ علما اور مفکرین جن کو بالطبع علیل بے عمل اور تنہائی پسند کہا جاتا ہے ان میں بھی اجتماعی جدّ و جہد کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

---

۵ اگست ۱۹۴۲ء کو ہماری مجلس مصنفین قائم ہوئی اُس کے بعد سے اب شاید ہی کوئی دن خالی

جاتا ہوگا جو اخباروں میں کسی نہ کسی ادارۂ تصنیف و تالیف، انجمن علمی یا انسٹی ٹیوٹ اور اکیڈیمی کے قیام کی اطلاع نہ آتی ہو۔

اخبارات و رسائل کا معیار بھی بلند سے بلند تر ہو رہا ہے اور اگر کاغذ کی کمیابی و گرانی نہ ہوتی تو ہمارے ملک کے جرائد کی تعداد اشاعت بھی انگلستان اور امریکہ کے لگ بھگ پہونچ جاتی۔ اسی طرح ہر قسم کی کتابیں نہایت بہتات کے ساتھ بازار میں آرہی ہیں اور ہمارے اہل ملک جو کبھی اچھی سے اچھی کتاب کو کم سے کم داموں میں نہ خریدتے تھے اب بے دریغ دو گنی اور چوگنی قیمت پر کتابیں لے رہے ہیں۔ نمائشوں اور بازاروں میں جس قدر بھیڑ مٹھائی کی دوکانوں پر ہوا کرتی تھی اُس سے اب کچھ زیادہ مجمع کتاب والوں کی دوکانوں پر ہوتا ہے۔ کتابوں کا لکھنا۔ چھاپنا اور بیچنا اور اخبارات و رسائل کی ایڈیٹری جو ہندوستان میں نحوست بھرے پیشے تھے، اب خوشحالی و مرفہ الحالی کے روزگار ہو گئے ہیں۔ جنگ کے خاتمہ کا انتظار ہے، اس کے ختم ہوتے ہی آپ دیکھیں گے کہ لوگ کس قدر کثرت سے ان پیشوں کو اختیار کرتے ہیں۔ اور اُن کے ذریعہ کس سُرعت کے ساتھ ملک میں سیاسی بیداری اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ضرورت ہے کہ جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں عنقریب ختم ہونے والی جنگ سے پیدا ہونے والے حالات کی تیاری ہو رہی ہے اور آیندہ تعمیر ہونے والی عماراتِ قومی کی سائنٹفک اصولوں پر داغ بیل ڈالی جا رہی ہے صحافت۔ علمی تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ترقی کے جو امکانات ہیں اُن کا بھی ابھی سے جائزہ لیا جائے اور کسی بدنیتی کو دخل دئے بغیر کامل انداز کے ساتھ اُن تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لایا جائے جن سے کہ ہمارا ملک بھی ذہنی اور علمی اعتبار سے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے۔

صحیفہ نگاروں۔ اور مصنفین کی بے کسی۔ اور مفلوک الحالی دور ہو۔ اور ہر ایک لکھنے والے کو اس کی استعداد و قابلیت کے مطابق دُنیوی ترقی کا موقع نصیب ہو۔ اس ملک کے تمام علمی خزانے جو دوسرے ممالک اور خود ہندوستان میں صدیوں سے دفن پڑے ہیں اُن کو روشنی میں لایا جائے اور ان سب کوششوں کے نتیجہ میں ہمارے زندہ اور مرحوم صاحبانِ علم و فن کی جو بھی حیثیت متعین ہوتی ہو اُسے بلا امتیاز آزادی و غلامی اور رنگ و نسل تسلیم کر لیا جائے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس کا صدر دفتر ہندوستان کے سب سے بڑے علمی و ثقافتی

علی گڑھ میں قائم ہے اپنے ساٹھ سالہ دورِ حیات میں ہمیشہ ملک کی بروقت صحیح رہنمائی کرتی رہی ہے اسی لئے اب وہ سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم بر روئے کار لاکر سب سے پہلے میدانِ عمل میں آئی ہے۔ کانفرنس کی ایک کمیٹی کا جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر ۲۱ رجنوری ۴۵ء کو آفتاب لائبریری میں منعقد ہوا۔ طے کیا گیا کہ اسکیم کے عملی پروگرام کو تیار کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی ماہرین فن کی بنا دی جائے۔ چنانچہ یہ کام اس وقت اس منزل پر ہے کہ سب کمیٹی مذکور کا جلسہ ۱۰ اور ۱۱ مارچ ۴۵ء کو آنریبل ڈاکٹر سر محمد عزیز الحق صاحب کے دولت خانہ پر بمقام دہلی منعقد ہوا۔

خان بہادر پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی۔ خان بہادر میاں افضل حسین صاحب۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی۔ اور ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی نے بحیثیت ممبر اور راقم السطور نے بطور پیشکار شرکت کی۔ اس مختصر کمیٹی میں یہ طے ہوا کہ اس کی رپورٹ انسٹی ٹیوٹ کی بڑی کمیٹی اور کانفرنس ورکنگ کمیٹی میں منظور ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ جون ۴۵ء سے اسکیم کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔

مُرتبہ اسکیم کی رُو سے ایک آل انڈیا ریسرچ بورڈ ہوگا۔ جس کے چھ ذیلی بورڈ ہوں گے ان بورڈوں کے ماتحت علی گڑھ۔ لاہور۔ اجمیر۔ حیدر آباد۔ بمبئی اور کلکتہ میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ قلمی و مطبوعہ کتابوں کے میوزیم اور چھاپے خانے وغیرہ قائم کئے جائیں گے۔ اور پورے ملک میں تصنیفی کام کی موثر تنظیم کی جائے گی۔

خدا سے دعا ہے کہ آخر جون ۴۵ء میں جب 'مصنف' کا اگلا شمارہ نذرِ ناظرین ہو تو ہم یہ خوشخبری سُنا سکیں کہ اسکیم منظورہ و مذکورہ کے تحت ابتدائے کار کے طور پر کم از کم علی گڑھ کا انسٹی ٹیوٹ قائم ہو گیا۔

چہ بتربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم
مرا کہ چشم بہ ساقی و گوش بر چنگ است

"بزمِ مُصنّف!"

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانہ رام پور

مصنف کا پچھلا شمارہ میں نے دیکھا۔ گرمی قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ کا مضمون (غالب نے اردو خطوط نویسی کب سے شروع کی) بالاختصار پہلے ہی دیکھ چکا تھا اور میری ہی فرمائش پر انھوں نے اُسے "مصنف" میں بھیجا تھا۔ وہ اِس وقت اپنے مذاق کے یکتا عالِم اردو ہیں۔ ایسی دقتِ نظر سے کام کرنے والے ہندوستان میں انگلیوں پر گنتے کے برابر ہیں۔

فضل العلماء خان بہادر عبدالحق صاحب پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس

مجلس مصنفین علی گڑھ کی مساعی واقعی قابل قدر ہیں اور اس کی رسالہ "مصنف" کی اشاعت سے ایک بڑی اہم خدمت پوری ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ مصنفین کا ایک مرکزی ادارہ ہو تاکہ مصنفین اور اُن کی تصانیف کے متعلق ضروری معلومات مہیا کی جا سکیں اور ایک ہی عنوان اور مضمون پر ایک سے زیادہ "مصنف" بیک وقت کام نہ کیا کریں۔ اس مجلس کی یہ خدمت نہایت ہی مفید اور کارآمد ثابت ہو گی۔

مولوی محمد امین صاحب زبیری حال مقیم حیدرآباد دکن

آج "مصنف" ملا۔ شکریہ۔ "بیت المصنف" کا افتتاح! خدا مصنفین کو مبارک کرے۔ اور آپ کی اُمیدیں پوری ہوں۔ میں بھی کچھ کتابیں پیش کروں گا۔ درحقیقت یہ عزم و حوصلہ ایثار وانہماک قابل مثال ہے۔ کام کرنے والے یوں ہی کام کیا کرتے ہیں۔

پروفیسر حمید الدین خاں صاحب ایم۔اے گورنمنٹ کالج جھانسی

یاد آوری اور مرسلہ "مصنف" کا بہت بہت شکریہ۔ نہایت ہی بلند معیار اور دیدہ زیب پرچہ ہے۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر آر۔ ای۔ مارٹیمر وہیلر ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثارِ قدیمہ ہند

اسلامی علم کتبات پر خصوصی توجہ کرنے کے لئے آپ کا میں بہت شکرگزار ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہے۔ اور میں نے اس سلسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا سے موثر کارروائی کی ہے۔

میرے محکمہ کے لئے ایک مسلم ماہر علم کتبات کے تقرر کی منظوری حاصل ہوگئی ہے اور اس کے لئے کسی مناسب شخص کا عنقریب انتخاب عمل میں آئے گا۔ مسلم ماہر علم کتبات گورنمنٹ ماہر کتبات کی جگہ کا بھی مناسب وقت پر مستحق ہوگا۔ اس معاملہ میں آپنے جو دلچسپی اور ہمت افزائی کا ثبوت دیا ہے اُس کے لئے دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مولوی صلاح الدین صاحب ایڈیٹر ادبی دُنیا لاہور: آپ کی کتاب "مسلمان کی دُنیا" بہت دلچسپ تصنیف ہے۔ انشاءاللہ ختم کرنے کے بعد کچھ عرض کر سکونگا۔ 'مصنف' مل رہا ہے۔ ماشاءاللہ خوب چل رہا ہے۔ میں اور 'ادبی دُنیا' کے ناظرین برابر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی: معاف فرمائیے۔ یا باین شورا شوری یا باین بے نمکی۔ اقامت الصلوٰۃ اور تلاوتِ مصحف کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے خدا استقامت بخشے پردہ کے حامی آپ نہ ہوں گے تو کون ہوگا۔ حکم تو عام ہے۔ مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف "اہل بیت" کے لئے یہ حکم تھا۔ اس لحاظ سے حجاب اور قرار فی البیت کے مؤکد الیہ تو آپ لوگ ہیں۔ "حال و قال" کا یہ تناقض بھی خوب ہے۔ ع

منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

میں بھی حافظ کی طرح نہ کہدوں ؎

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس | کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

ہاں تو یہ کہئے جناب پچھلے کرم نامے میں آپنے جو گل کھلائے تھے وہ تمام تر شطحیات تھے۔ فرمائیے انا الحق کہتے میں کیا دیر ہے۔

کانفرنس کے سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کمیٹی کے جلسے کا جو نقشہ آپنے کھینچا ہے وہ بہت خوب ہے۔ لیکن میرے خیال میں تو سید القوم شروانی (مستغنا الیہ المسلمین بطول بقائہ) کی قیادت اور آمریت کافی تھی نہ کہ اس کے لئے کسی کمیٹی یا سب کمیٹی اور گراں بار اخراجات کی ضرورت۔ یہ افرنجی طریقے ہیں وقت اور روپیہ ضائع کرنے کے لئے۔ واللہ یھدی القوم المسلمین۔

مصنف پہونچا کتابت میں ترقی ہوئی تو کاغذ کا رونا پڑ گیا خدا اس جنگ کو غارت کرے۔ مصنف کا گلدستہ مشاقِ باغباں کی صنعت گری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر ادب نواز کو اسے دل میں جگہ دینی چاہئے میں تو کہتا ہوں ؎

تو زغنچہ کم نہ دمیدہ | درِ دل کشا بچمن درا

دکنی کے گجراتی ہونے کا دستاویزی ثبوت مل گیا۔ دکنی" دکاترہ" نے جو عمارت تعمیر کی ہے وہ عنقریب ڈھادی جائے گی تشہیر کا غلط پروپاگنڈا اکثر اوقات واقعات کی صورت کو بدل دیتا ہے اس کی بین مثال ہے۔ ایک مفصل مقالہ تیار ہو رہا ہے (جو معنف میں شائع ہو گا۔)

مجلس کے جلسے

اکیاونویں مجلس ۵۱ مجلس مصنفین کا اکیاونواں جلسہ جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب وائس پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی دعوت پر ۹ رجنوری ۵۸ء کو ۵ بجے شام آفتاب لائبریری کانفرنس کمپاؤنڈ میں زیر صدارت ڈاکٹر سید عبدالحلیم صاحب ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لکچرر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا۔ بیرونی مہمانوں میں جناب قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر روزنامہ پیام حیدرآباد و مؤلف "آثارِ جمال الدین افغانی" کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس مجلس میں مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے نے اپنا مقالہ "سلطان بہلول لودھی" پڑھا۔

باونویں مجلس ۵۲ زیر صدارت مولوی امیر الدین قدوائی صاحب بی۔اے، ایل، ایل، بی (علیگ) ایڈوکیٹ بارہ بنکی ۲۰ رجنوری ۵۸ء کو ۴½ بجے شام مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ایڈیٹر "کانفرنس گزٹ" کی دعوت پر کانفرنس لائبریری میں منعقد ہوئی اور اس میں جناب پروفیسر عبدالستار خیری صاحب نے اپنا مقالہ "اسلامی مخیلہ" پڑھا۔

ترپنویں مجلس ۵۳ ۵ رفروری ۵۸ء کو ۵½ بجے شام مولوی سراج الحق قریشی صاحب کی دعوت پر آفتاب لائبریری میں زیر صدارت جناب ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر پنشنر جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن منعقد ہوئی اس مجلس میں ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی چیرمین باٹنی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی نے اپنا مقالہ "نباتاتی تنفس" پڑھا۔ بیرون علی گڑھ سے مولوی محمود احمد عباسی صاحب امروہہ۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب چیرمین شعبۂ اردو و فارسی آگرہ یونیورسٹی۔ اور مولوی محمد بہلول خاں صاحب داناجے پور شریک ہوئے۔

چونویں مجلس ۵۴ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی کی دعوت پر موصوف کے دولتخانہ فارسین روڈ میں ۲۲ مارچ ۵۸ء کو ۶ بجے شام زیر صدارت ڈاکٹر عنایت اللہ شاہ صاحب ایم۔ بی، بی، ایس ریٹائرڈ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی منعقد ہوئی۔ اور اس میں جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب نے

اپنا مقالہ "تسخیر امراض" پڑھا۔ ارکان مجلس کے علاوہ مہمانوں میں خان بہادر محفوظ علی خانصاحب۔ مولوی حبیب اصغر صاحب قدوائی ڈپٹی کلکٹر۔ اور مولوی ضمیر حیدر صاحب ڈپٹی کلکٹر بھی شریک مجلس ہوئے۔

عطیہ دربارِ حیدر آباد اواخر دسمبر ۴۴ء میں مثل سال گزشتہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے دربار دُربار کا گرانقدر عطیہ پانچسو روپیہ۔ ہز اکسلنسی نواب سر احمد سعید خاں سر صدر اعظم بہادر کی منظوری اور عالی جناب نواب معین نواز جنگ کی معارف پروری کی بدولت موصول ہوگیا۔ جس کے لئے ادارہ "مصنف" بدل سپاس گزار ہے۔

مُعاونینِ مُصنّف

۱۹ر دسمبر ۴۴ء لغایتہ ۲۵ر مارچ ۴۵ء

۱۔ ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر حیدر آباد ۔۔۔ ۲۵ صہ

۲۔ پروفیسر آغا سرور شی صاحب اورنگ آباد دکن ۔۔۔ للعہ

۳۔ سید عبد الرحمن صاحب بی۔ اے (علیگ) ۔۔۔ للعہ

۴۔ مولوی عبد المجید صاحب تاج محلی آگرہ ۔۔۔ للعہ

۵۔ پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج شاہ جہاں پور ۔۔۔ للعہ

۶۔ ملک احسن اللہ خانصاحب رئیس شاہ جہاں پور ۔۔۔ للعہ

۷۔ مولوی اسد اللہ خانصاحب رئیس بگراسی ضلع بلند شہر ۔۔۔ للعہ

۸۔ لائبریرین صاحب امپیریل لائبریری کلکتہ ۔۔۔ للعہ

۹۔ پروفیسر حافظ محمد عثمان صاحب اسلامیہ کالج پشاور ۔۔۔ للعہ

۱۰۔ مولوی محامد اللہ صاحب انصاری بی۔ اے (علیگ) کراچی ۔۔۔ للعہ

۱۱۔ ایم اے باری صاحب بمبئی ۔۔۔ للعہ

۱۲۔ تصدق کریم صاحب قدوائی بی اے (علیگ) دہلی ۔۔۔ للعہ

۱۳۔ مولوی رشاعلی خانصاحب ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج اٹاوہ ۔۔۔ للعہ

۱۴۔ ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر علی گڑھ ۔۔۔ ۱۶ عہ

۱۵۔ بیگم ظفر مہدی صاحبہ اورنگ آباد دکن ۔۔۔ للعہ

۱۶۔ پرنسپل صاحب گورنمنٹ کالج جھنگ (پنجاب) ۔۔۔ للعہ

۱۷۔ مولوی نعیم احمد خاں صاحب آگرہ ۔۔۔ للعہ

۱۸۔ بینڈٹ بشیر الدین صاحب ایم۔ اے شاہ جہاں پور ۔۔۔ للعہ

۱۹۔ مولوی امیر الدین صاحب قدوائی (علیگ) ایڈوکیٹ بارہ بنکی ۔۔۔ للعہ

۲۰۔ پروفیسر عبد الحمید خانصاحب ایم اے سکندرہ آباد دکن ۔۔۔ سے

۲۱۔ مصطفیٰ ابن ابراہیم صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔۔۔ للعہ

۲۲۔ خان بہادر شاہ عالم خانصاحب ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ سرحد پشاور ۔۔۔ للعہ

۲۳۔ صاحبزادہ ممتاز علی خانصاحب بی اے (علیگ) سہاور ضلع ایٹہ ۔۔۔ للعہ

۲۴۔ مولانا عبد الرؤف صاحب دہلی ۔۔۔ للعہ

۲۵۔ مولوی خصلت حسن صاحب صابری بی اے ڈپٹی انسپکٹر مدارس علیگڑھ ۔۔۔ للعہ

میزان ۔۔۔ ۱۳۳ ماہ صہ

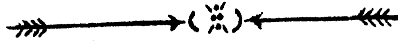
سید الطاف علی بریلوی

مدیر رسالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو شاعری میں خمریات

از جناب مولوی ظہیر الدین علوی صاحب ایم، اے، ایل، ایل، بی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



شعر و شاعری کی بزم رنگیں حسن و عشق اور بادہ و ساغر کی ہمیشہ منت کش رہی ہے۔ ہر مہذب قوم کے ادب میں شراب کا ذکر نہایت ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے۔ یونانی شاعری میں گو شراب پر کوئی مکمل نظم نہیں ملتی لیکن وہاں ایک دیوتا کا وجود ملتا ہے جس کو (Bacchus) کہتے تھے۔ سقراط کے زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ سال میں ایک دن ایک میلا لگا کرتا تھا جس میں نا و نوش کی محفلیں گرم ہوتی تھیں اور خدائے میخانہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ ہومر کی شاعری میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شراب کی تندی و تیزی سے خوب واقف تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے تمام ہیرو شرابی ہیں۔ وہ ایک جگہ شراب کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "مردہ روحوں کے لئے شراب میں نئی زندگی ہے" روم میں ورجل کے زمانے میں افسردگی ہٹانے کے خاص طریقے رائج تھے۔ مصر کی ممیوں کے تابوت میں اکثر شراب نکلی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل مصر کو شراب مرغوب تھی۔ انگریزی ادب میں بن جانسن اور شکسپیئر کے یہاں ایک خاص قسم کی شراب کا ذکر ہے جو نہایت ذوق کے ساتھ استعمال ہوتی تھی

انیسویں صدی میں رومانوی شعراء کے کلام میں شراب کا ذکر نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو

بہت کم لیکن اس کی کیفیت اُن پر مسلط ہے۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کی شاعری آلام روزگار سے بریت چاہتی ہے The Poetry of 19th. Century is The poitry of escape. جس کے لئے شراب سے بہتر اور کیا شئے ہوسکتی ہے۔ سنسکرت میں بھی شراب کے متعلق بہت کچھ مواد موجود ہے۔ کالیداس نے جو سنسکرت کا ایک مشہور شاعر تھا شراب کی دعوت دی ہے اور اپنے کلام میں پینے پلانے کا ذکر اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ اہل عرب شراب کے معاملہ میں بڑے فراخدل تھے۔ اسلام کی آمد سے قبل عرب کا ہر گھر ایک میخانہ بنا ہوا تھا اور شراب اِس کثرت سے رائج تھی کہ نہ پینے والے کو بیوقوف کہا جاتا تھا۔ اسلام نے شراب کو مذہباً ممنوع قرار دیا، چنانچہ مذہبی رو میں بہہ کر بعض نے جام و صراحی توڑ ڈالے لیکن کچھ نیت کے کمزور ثابت ہوئے اور چھپ چھپ کر پیتے رہے۔ ابونواس جسے علامہ شبلی نے جاندادۂ شراب کا لقب دیا ہے، شراب کے بلبلوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"سونے کی زمین پر موتی کے خذف پڑے ہیں"

ایران کی سرزمین شاعری کے لئے نہایت زرخیز اور شراب کے معاملہ میں کسی سے کم نہیں ہے بلکہ زیادہ چھان بین کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شراب کے مضامین جسقدر فارسی شاعری میں ہیں مشکل ہی سے کسی دوسری زبان کی شاعری میں ملیں گے۔

میرا عنوان چوں کہ "اردو شاعری میں خمریات" ہے اور اُردو شاعری نے از سرتاپا فارسی شاعری کا تتبع کیا ہے اِس لئے نفسِ مضمون پر آنے سے پہلے فارسی شاعری کی خمریات پر ذرا تفصیلی نگاہ ڈالنا پڑے گی۔

خمریات کے مضامین فارسی شاعری کی ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں۔ رودکی کہتا ہے:۔

رودکی چند برگرفت ونواخت | بادہ انداز کو سرود انداخت
آن عقیقین مے کہ ہر کہ بدید | از عقیقے گداختہ بشناخت
ہر دو یک گوہر اند لیک بالطبع | ایں بفسرد و آن دگر بگداخت
نا بسودہ دو دست رنگین کرد | نا چشیدہ بہ تارک اندر تاخت

اور کبھی جوش میں چلّا اٹھتا ہے:۔

بیار۔ ہاں۔ بدہ آفتاب۔ کس بخوری | زلب فروشود و از دہان آرزو دو

عنصری شراب کی تعریف میں کہتا ہے :-

دل آرائے ۔ دل آرامے ۔ غم افزائے ۔ غم انجامے

نکو روئے ۔ نکو روئے ۔ بہ حُسن اندر جہاں سرور

منوچہری کا ایک مکمل قصیدہ شراب کی تعریف میں موجود ہے ۔ اور انگور کے پھلنے سے شراب پینے تک کا حال ایک حکایت میں بیان کیا ہے ۔ انگور کی بیل کو ایک عورت تصور کیا ہے ، انگوروں کو اس کی بیٹیاں مانا ۔ انگور والا جنھیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے ، اتفاق سے ان بیٹیوں کو چھوڑ کر اُسے کچھ عرصہ کے لئے مسافرت کرنی پڑی ، واپس آنے پر کیا دیکھا کہ اُن کے سرخ چہرے سیاہ ہو گئے ہیں اور وہ حاملہ ہو گئی ہیں ۔ اس کو سخت صدمہ ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں ، لڑکیوں نے عذر کیا لیکن اس نے ایک نہ مانی اور سب کے سر تن سے جدا کر دیئے ۔

فارسی شاعری کے ہر دور میں مستی اور جوش کے نمونے ملتے ہیں لیکن جو نشہ حافظ اور خیام پر چھایا ہوا ہے وہ کسی پر نہیں ۔ یہ لوگ واقعی غرق جام شراب تھے ۔

اِس مختصر خاکے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعری اور شراب میں کوئی گہرا تعلق ضرور ہے ۔

لہٰذا یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہو جاتا ہے کہ شراب میں وہ کیا شے ہے جو شاعر کو اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ ایک عامی کے لئے شراب سرخ رنگ کا پانی ہے لیکن کسی رند سے پوچھئے تو وہ اِس چھوٹے سے پیمانے میں عجائبات عالم دیکھتا ہے ۔ اس میں وہ بوسہ ہائے اولیں کا مزہ اور شہد کی شیرینی محسوس کرتا ہے ۔ اس کی زندگی اپنے اصلی رنگ میں اس کے سامنے آجاتی ہے ، بقول مولانا شبلیؔ وہ مزے میں آکر پکارتا ہے کہ مجھکو ننگ و نام کی پرواہ نہیں ۔ ساقی پیالے پر پیالہ دیئے جا اور کسی سے نہ ڈر ۔ زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں مطرب سے کہو کہ یہ نغمہ گائے کہ تمام عالم پر میری حکومت ہے ، کل خاک میں جانا ہے ، آج کیوں نہ مست ہو کر تمام عالم میں غلغلہ ڈال دوں ۔ تم مجھے حقیر سمجھتے ہو ، شراب خانے میں آؤ تو میں تمہیں اپنی توقیر دکھاؤں ، میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے وہ جمشید کو بھی نصیب نہ ہو گا "

شراب کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ جذبات کو تیز اور شدید تر کر دیتی ہے ۔ شاعر قدرت کی طرف سے ایک حساس دل لیکر آتا ہے اور ذرا ذرا سی باتوں سے متاثر ہوتا ہے ، جذبات کی تیزی اور زود حسی مل کر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور اسی عالم میں شعر نازل ہوتا ہے ، شراب زندگی کے باریک پردوں کو چھیڑ دیتی ہے اور پھر وہ نغمے نکلنے میں جو شاعر

اور سامعین دونوں کو وجد میں لاتے ہیں۔ جذبات وخیالات میں برقی رَو دوڑانے کے لئے شراب سے زیادہ اور کوئی نسخہ کارگر نہیں۔ دنیا میں بعض انسان ایسے ہیں جو "غم روزگار" کو بھی "غم جاناں" بنا لیتے ہیں، لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کا دل کسی طرح نہیں بہلتا۔ جب اُن کی سعیٔ التفات بھی رائگاں جاتی ہے تو شراب ہی اُن کی مدد کو آتی ہے اور اسی سے وہ غم دنیا سے چھٹکارا پاتے ہیں۔

شاعری میں عموماً جس شراب کا ذکر کیا جاتا ہے اُس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شراب انگوری جو خیام کی رباعیوں میں جھلکتی ہے، اور دوسری شراب معرفت جو حافظ اور عطار کے کلام کے بلوریں جام میں نظر آتی ہے۔ شراب انگوری کے متعلق تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں دریافت ہوئی۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت نوح کو معلوم تھی، ایرانی علما کہتے ہیں کہ خسرو و جمشید کی طبعزاد ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ جس بزرگ نے بھی یہ ایجاد کی ہو شاعروں کو فکر فردا سے بچنے کے لئے نہایت مستند نسخہ ہے۔ شراب معرفت کی تاریخ متعین کرنے میں کوئی دقت نہیں۔ یہ شراب صوفیانہ شاعری میں پائی جاتی ہے، جس وقت کہ مذہب کی بندشیں سخت تھیں، زاہدوں اور قاضیوں کا ستارہ عروج پر تھا۔ صوفی خدا کی حمد و ثنا میں مصروف رہتے تھے۔ جن کا زیادہ وقت محبوب (خدا) سے قریب تر پہونچنے کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ صوفیوں نے شراب کو ایک خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان کی شراب انگوری نہ تھی بلکہ اس سے کوثر والی شراب مراد تھی یا محبوب کے دیدار کی گرمی اور مستی مقصود تھی۔ لیکن زاہدوں اور قاضیوں کی سطحی نگاہیں اس گہرائی تک نہ پہونچ سکیں اور وہ صوفیوں پر شبہ کرنے لگے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں ساقی۔ میکدہ۔ جام و سبو۔ صراحی۔ نقل۔ گزک۔ نشہ۔ خمار۔ صبوحی وغیرہ سب سے عرفان کے بڑے بڑے واردات اور مدارج مراد ہیں اور ان اصطلاحات کے ذریعہ سے تصوف کے اہم مسائل اور دقیق اسرار بیان کئے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی شعرالہند میں لکھتے ہیں:- "تصوف کا یہ اعجاز تھا کہ وہ الفاظ جو رندی اور عیاشی کے لئے خاص تھے، حقائق و اسرار کے ترجمان بن گئے، ساقی کا لفظ ہر زبان میں اُس بد ہیئت شخص کے لئے وضع کیا گیا ہے جس کی بدولت سیکڑوں آدمی لباس عقل سے عاری ہو جاتے ہیں اور سوسائٹی کے ذلیل ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن تصوف میں یہ شخص مرشد کامل اور عارف اسرار سمجھا جاتا ہے مے فروش سے بدتر کون شخص ہو سکتا ہے لیکن تصوف کی زبان میں پیر مغاں سے بڑھ کر کوئی

مقدس ذات نہیں۔" حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

جب مولویوں نے دیکھا کہ ایسے ایسے بزرگ اشخاص اِس آبِ ممنوعہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں تو اُن کی مذہبی رگ بھڑک اٹھی اور صوفیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حکومت نے بھی مولویوں کو ساتھ دیا اور چپّہ چپّہ پر پہرہ دار بٹھا دیئے اور شغل شراب کو حرام قرار دیدیا گیا۔ شاعر چوں کہ فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور کسی قید و بند سے نہیں ڈرتا بلکہ اِس قسم کی قیود اُس کی آگ کو اور بھی مشتعل کر دیتی ہیں۔ ان ظاہر پرستوں کی ضد میں شراب کا راگ اور بھی زوروں کے ساتھ الاپنے لگا، اور مولویوں اور واعظوں کی ایسی قلعی کھولی کہ اُنھیں اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل ہوگئی۔ حافظ اِس گروہ کے قائد ہیں۔ اُن کے یہاں شراب معرفت اپنے شباب پر ہے، مولانا شبلی اُن کے متعلق لکھتے ہیں :-

"خواجہ پر رندی اور مستی کا جذبہ غالب تھا۔ اُن کے کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔" ثبوت میں چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

ساقی بہ نورِ بادہ برافروز جامِ ما ؎ مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما
ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم ؎ اے بے خبر ز لذتِ شُربِ دوامِ ما

ساقیا برخیز و دردہ جام را ؎ خاک بر سر کن غمِ ایّام را

سرِّ خدا کہ عارفِ سالک بکس نہ گفت ؎ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

دوسری تحریک جو فارسی شاعری میں ملتی ہے وہ خالص رندانہ ہے۔ اُس میں شراب سے یہی انگوری شراب، ساقی سے گوشت و پوست کا وہی نازک بدن جس کا ایک جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ہے۔ صراحی، ساغر، پیمانہ، خم سے مادی اشیاء مراد ہوتی ہیں۔ اِس قافلہ کا میر کارواں خیّام ہے۔ گو مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو اس سے اختلاف ہے، کیوں کہ اُن کا خیال ہے کہ یہ خیّام کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس کی شراب کو دوست و دشمن یہی بھٹی والی شراب

سمجھتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ تمام رباعیاں جن کا مضمون بجز انگوری شراب کے اور کسی شراب پر منطبق نہیں ہو سکتا، خیّام کی نہیں بلکہ الحاقی ہیں۔ چوں کہ یہ مسئلہ نفس مضمون سے بالکل جدا ہے اس لئے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ بہرحال خیّام کی چند رباعیاں پیش کرتا ہوں، جن سے ناظرین خود اندازہ لگائیں گے۔

من بے مئے ناب زیستن نتوانم — بے جام کشیدہ بارتن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید — یک جام دگر بگیر و من نتوانم

مے خوردن من از برائے طرب است — نے بہر فساد و ترک دین و ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے — مے خوردن و مست بودنم این سبب است

در نائے ترا بہ قلقلِ مے چہ خوش است — آواز سماع و نالۂ نے چہ خوش است
در بربتِ دلفریب و در سر مئے ناب — فارغ زغمِ زمانہ ہے ہے چہ خوش است

ساقی مئے کہنہ یار دیرین من است — بے دختر زر عشق نہ آئین من است
گویند کہ بادہ خوار را دینے نیست — من بادہ خورم کہ بادہ خود دین من است

خیّام کی عالمگیر مقبولیت کی وجہ بھی اس کی رباعیات ہیں جن میں شراب کا عنصر غالب ہو۔ مگر وہ شراب میں آپے سے باہر ہو جانیکی تعلیم نہیں دیتا، کہتا ہے:۔

چوں بادہ خوری زعقل بیگانہ مشو — مدہوش مباش و جہل را خانہ مشو
خواہی کہ مے لعل حلالت باشد — آزار کسے مجوے و دیوانہ مشو،

زاہد و واعظ کی لعنتوں کا جواب وہ ایک شعر میں یوں دیتا ہے۔

تو فخر ہمی کنی کہ خود مے نخوری — صد کار ہمی کنی کہ مے غلام است اورا

اور نشے کی تیزی میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں۔

مائیم خریدار مے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو

شراب کا ذکر بغیر اس کے لوازمات کے ادھورا رہ جاتا ہے، اگر شراب پلانے والا کوئی حسین ہو

یا پیمانہ ایسا ہو جس میں اس کا رنگ چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر دے اور محبوب پہلو میں ہو تو شراب کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ میخانہ۔ ساقی۔ صراحی۔ جام۔ خُم۔ کدو وغیرہ شراب کے جزو لاینفک ہیں، شراب کی محفلیں سنجیدہ اور خشک لوگوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ فرامین شاہی کے ذریعہ سے فاقہ مستوں کی گیر و دار ہونے لگی اور اس کام کے لئے محتسب مقرر ہوئے، زاہدوں اور واعظوں نے شراب کے عیوب بیان کرنے پر کمر باندھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء اور ان کے درمیان ایک کشمکش اور محاذ قائم ہو گیا۔ شعراء نے زاہدوں کی ظاہری پرہیزگاری اور باطنی سیاہ کاری کو خوب خوب بیان کیا۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

غلام ہمت دردے کشانِ یک رنگم — نہ زاں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہ اند

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے — دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را،

انھیں بزرگوں کے لئے خیام کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:۔

قومے زگزاف در غرور افتادند — قومے ز پئے حور و قصور افتادند

معلوم شود چو پردہ ہا بردارند — کز کوئے تو دور دور افتادند

واعظ یا شیخ کی ظاہری تقریر ایک صاحب نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچی ہے:۔

”مقدس صورت نورانی چہرہ، سیدھی وضع، سادی پوشاک، دلدہی کر کے سمجھانا، ملائم و نرم الفاظ سے خطاب کرنا، آیتوں کی تفسیر، جنت کی ترغیب، حوروں کی تمنّا، شراب طہور کا شوق دلانا، عسل مصفّٰی کے بیان پر چٹخارے بھرنا اور آتش دوزخ کے شعلوں کے ذکر سے کانپ اٹھنا۔“

شعراء نے اُن کی ہجو صرف الفاظ ہی تک محدود نہیں رکھی بلکہ اکثر شعراء نے زاہد و واعظ کو میخانہ کے دروازہ پر پکڑا بھی ہے۔ جہاں وہ چھپ چھپ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیچارے کا ایمان پرکھنے کے لئے اس کے حجرے میں بوتل رکھدی ہے۔ مگر چونکہ اُن کی پشت پناہی منجانب حکومت ہوا کرتی تھی اس لئے باہمت شاعر ہی کھلّم کھلا ہجو گوئی کی ہمت کرتے تھے۔ سب سے پہلے خیام نے جرأت کی اُس کے بعد سعدی نے دبی زبان سے کام لیا اور جس دلیری اور آزادی سے حافظ نے اس قرض کو ادا کیا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے“

اُردو جیسا کہ مولانا آزاد کا خیال ہے فارسی کے پیروں پر اُٹھی۔ اس میں آہستہ آہستہ فارسی زبان کی اصطلاحیں آگئیں۔ مثلاً گل و بلبل۔ لیلیٰ مجنوں۔ دشنہ و خنجر۔ بادہ و ساغر۔ جام و میخانہ۔ ساقی و پیرمغاں۔ زاہد و تسبیح۔ جبّہ و عمامہ۔ وغیرہ، اور یہ اصطلاحیں رفتہ رفتہ اُردو کی روزمرّہ بن گئیں اور جو بطور مہمان کے اُردو میں داخل ہوئیں تھیں اب خود میزبان بن گئیں۔ خمریات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس صنف کو ہمارے شعراء نے حتی المقدور فروغ دیا۔ شراب اور اُس کی تعریف۔ ساقی۔ میخانہ۔ رند۔ واعظ۔ مستی و مدہوشی کے مضامین قریب قریب ہر دور کی شاعری میں ملتے ہیں۔

اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ شمالی ہند میں وہاں سے کئی سو سال بعد شعر و شاعری کی بزم رنگیں منعقد ہوئی۔ سلطان قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ ایک رنگیلا بادشاہ تھا۔ طبیعت بھی شاعرانہ تھی۔ اُس کے دربار میں عیش و عشرت کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ساقی و مطرب کی خاطر و مدارات بھی ہوتی تھی۔ اُس کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

اب مست اچھے دایم ہمیں مست اچھے کا ہنگام ہے ساقی صراحی نقل ہور پیالے سے ہمنا کام ہے
عاشق اوّل تے ہیں ہمیں سرمست ازل تے ہیں ہمیں نا آج کل تے ہیں ہمیں، زاہد کو تئیں یہ نام ہے
روز یہ کہ عید آنے میں ٹک شیر خرما کھانے میں صوفی چلے میخانے میں تسبیح ہات اب جام ہے
ساقی پیالہ مج پلا پیالا پیتے ہوتا ولا، اُس پیوں کوں تو لیکر چلا جس پیوتے مج آرام ہے

اِسی بادشاہ کے دربار میں ایک شاعر ملا وجہی گزرا ہے جو اپنی نثر کی کتاب "سب رس" کی بنا پر زیادہ مشہور ہوا۔ اس کتاب میں اُس نے شراب کی تعریف کی ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ یا دیگر امراء کے لئے شراب ضروری ہے، اِس نثری کارنامہ کے علاوہ ایک مثنوی "قطب مشتری" بھی لکھی جس میں قلی قطب شاہ کی داستانِ عشق کا بیان ہے۔ اِسی مثنوی میں وجہی نے محفلِ نشاط اور شغلِ شراب و کباب کا ذکر نہایت خوبی سے کیا ہے۔ دکنی شاعری میں بہت سے شعرا ایسے ہیں جنھوں نے خمریات کو اپنے کلام کا جزو بنایا ہے لیکن چوں کہ ہمارے کان اُس پرانی زبان سے آشنا نہیں اس لئے انھیں دو شعرا پر اکتفا کرتا ہوں۔

ولی

ولی کی شاعری سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کا اثر زیادہ تھا لیکن ولی نے اُسے فارسی کے نقش قدم پر چلایا۔ اُنکا کلام

اسقدر مقبول ہوا کہ امرا کی محفلوں جلسوں اور کوچہ و بازاریں اُن کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے
ولی ایک آزاد منش، سیر و سیاحت کے شوقین اور رنگین مزاج شاعر تھے۔ الغرض کلیات میں
خمریات کے کافی اشعار موجود ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بزم عشرت میں جام لب سوں پیا — سے پلاتا نہیں ہزار افسوس
ساقی و مطرب آج ہیں ہم رنگ — نشہ و بیخودی دوبالا ہے
شراب شوق سوں سرشار ہیں ہم — کبھو بیخود کبھو ہوشیار ہیں ہم

لیکن ولی شراب سے اتنا متاثر نہیں ہیں جتنا کسی کی آنکھ میں شراب کی مستی دیکھ کر۔
چند شعر ملاحظہ ہوں :-

یک جام میں دو جگ کو کرے مست و بیخبر — انکھیاں کا تیری عکس پڑے گر شراب میں
یک نگہ سوں کیا ہے مست مجھے — اُس کی انکھیاں میں کیا خماری ہے
نشہ بخش عاشقاں وہ ساقی گلفام ہے — جسکی انکھیاں کا تصور بے خودی کا جام ہے
جو کیفیت سیہ مستی کی تجھ انکھیاں میں ہے ظالم — نہیں وہ رنگ مستی کا شراب پرتگالی میں
بے منت شراب ہوں سرشار انبساط — تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہوا

قلقل مینا سے کیا مراد لی ہے :-

ہُوا ہے قلقل مینا سوں مجھکو یہ ظاہر — کہ مے پرست کے سینے میں ہے شمار خدا

زاہدوں کی تضحیک اور محتسب پر فقرے ولی کے کلام میں موجود ہیں، مثال :-

آسماں اُوپر نہ پوچھو چادر ابر سفید — جانماز زاہد عزلت نشیں برباد ہے
آلودہ کیوں نہ ہوئے دامان پاک زاہد — جب دست نازنیں میں جام شراب ہوئے
ترے ابرو کی پہونچے گر خبر مسجد میں زاہد کو — تماشہ دیکھنے آوے ترا محراب سے اٹھ کر
کہو زاہد سے جاوے اُس گلی میں — اگر مشتاق فردوس بریں ہے

قلی قطب شاہ سے لیکر ولی کے زمانہ تک خمریات میں ایک خاص بات جو ملتی ہے وہ یہ کہ
شعرا شراب کی گرمی سے اتنے متاثر نظر نہیں آتے جتنا آنکھ کے خمار اور شراب کے
نشہ کی یکرنگی سے۔

میر شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا ولی کے کلام سے ہوئی اور اسی لئے اُن کو
شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اولاً شعرا ایہام کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے

مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد چند ہستیاں خضرِ راہ بن کر آئیں۔ انہیں سے سب سے پہلا نام میر تقی میر کا ہے۔ اُن کی قادر الکلامی اور استادی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ گو اُن کی شاعری یاس و حرماں سے لبریز ہے پھر بھی اُن کے یہاں خمریات کے مضامین اکثر و بیشتر ملتے ہیں :۔

میرا اِن نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

ساقی کے انتظار میں ساری رات بے خبری سے کاٹ دیتے ہیں :۔

ساقی کے جو آنے کی خبر تھی گذری ہمیں ساری بے خبر رات

ایک جگہ شراب کی تاثیر یُوں بیان کی ہے :۔

نہ اتنی دارو پی ظالم کہ اس خمار میں ہوں مزاج گرم ہے پھر اور یہ ہوا ہے گرم

میخانہ کا نقشہ یُوں کھینچتے ہیں :۔

نئے طرزوں سے میخانے میں رنگِ مے جھلکتا تھا گلابی روتی تھی واں جام ہنس ہنس کر چھلکتا تھا

اور اپنی مستی کا زور یُوں دکھاتے ہیں :۔

پھوٹا کئے پیالے لُنڈھتا پھرا قرابا، مستی میں میری تھا یاں اِک شور اور شرابا

محبوب کی آنکھ سے شراب کا تعلق یُوں ظاہر کرتے ہیں :۔

رات اُس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں صبح سوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

بکھری ہیں منھ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے کیونکہ چھپے میخوارئ شب جب رات کو ایسے ماتے ہو

ابر و بہار میں توبہ کس انداز سے توڑتے ہیں :۔

سبزۂ و لالہ و گُل اَبر و ہوا ہے مے دے ساقیٔ ہم توبہ کے کرنے سے پشیمان ہوئے

آخر میں رہنِ میکدہ ہونے کی تعلیم دیتے ہیں، کیونکہ تمام چیزوں سے چھٹکارا مل جائے گا :۔

چلو میکدے میں بسر کریں کہ رہی ہے کچھ برکت وہیں
لب نان واں کا کباب ہے، دمِ آب واں کا شراب ہے

بہار کی آمد کو بھی اسی رنگ میں دکھاتے ہیں :۔

بہار آئی ہے غنچے گُل کے نکلے ہیں گلابی سے نہال سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

یاسیات میں بھی خمریات موجود ہے :۔

دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے

میر کی خمریات کا سب سے دلچسپ حصّہ وہ ہے جہاں انھوں نے شیخ کی برائی، واعظ اور زاہد پر طنز

اور محتسب پر فقرے چست کئے ہیں :-

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانہ میں — جُبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

تھے بڑے مغبچو کے تیور لیک — شیخ میخانہ سے بھلا کھسکا

مفت آبروئے زاہد علامہ لے گیا — اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

میر کے دیوان میں پوری پوری غزلیں شراب کی دعوت، شیشے کی سرگزشت اور حالت نشہ کی کیفیت کے بیان میں ملتی ہیں۔ اُن کی بہت مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

شیخ جی آؤ مصلّیٰ گروئے جام کرو — جنس تقوی کے تئیں صرف مئے جام کرو

بعض اشعار نہایت عمدہ ہیں جن میں خمریات کا مضمون انوکھے پیرایہ سے باندھا ہے، مثال :-

شراب عشق میسّر ہوئی جسے اک شب — پھر اس کو روز قیامت تلک خمار رہا

واں تو وہ اپنے گھر سے پی کر شراب نکلا — یاں شرم کے عرق میں ڈوب آفتاب نکلا

خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا — پیر مغاں سے رات کرامات ہوگئی

مصطبۂ بیخودی ہے یہ جہاں — جلد خبردار ہوا چاہئے

سودا

میر کے بعد سوداؔ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے کلام میں بھی شراب کی اکثر کیفیتوں کا ذکر ہے۔ وہ بھی آنکھوں کی مستی سے بے قابو ہو جاتے ہیں، اُن کا وہ "عیش جہاں" کا نقشہ جو "صحبتِ مستاں" کو مدنظر رکھ کر کھینچا ہے، دیدہ زیب ہے۔ وہ دنیا میں شراب و شاعری کے علاوہ اور کسی شئے سے سروکار رکھنا نہیں چاہتے، کہتے ہیں :-

صحبت شعر۔ بکف جام۔ صراحی در دست — اس سوا سوداؔ کو کچھ کام نہیں دنیا میں

یہ خیال عام ہے کہ سوداؔ کے یہاں صرف "واہ" ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اُنکی شاعری میں کہیں کہیں دل ہلا دینے والی آہ کے نمونے ملتے ہیں، اس کی وجہ اُن کا ماحول تھا احمد شاہ ابدالی کے جہاد اور مرہٹوں کی غارتگری کا خود انھوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ وہ ساقی جو اپنی دریا دلی کے لئے مشہور تھے، اس دار وگیر میں ایسے مٹے کہ نانِ شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ میخانہ تباہ ہوا۔ شراب لٹی اور عجیب افراتفری پڑ گئی۔ ایسی فضا میں اگر وہ ایسے اشعار نہ کہتے تو تعجب تھا۔ سوداؔ کا فطری میلان رجائیت کی طرف تھا اور اسی وجہ سے ان کے اشعار میں رنگینی پیدا ہوگئی۔ سوداؔ درباری شاعر تھے، انھوں نے عیش و نشاط کی محفلوں کا حظ اٹھایا تھا اِس لئے اُن کے یہاں بھی خمریات موجود ہے؛ اُن کا ایک مشہور شعر ہے ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلا میں

یہ بھی بغیر دوست کے پینا گوارہ نہیں کرتے تو :-

پیتا ہوں یاد دوست میں ہر صبح و شام جام سبے یاد دوست مجھکو ہے پینا حرام جام

ساقی سے طلب میں عجلت :-

ساقی ہے اک تبسم گل فرصت بہار ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر بھی دے

ان کے یہاں بھی شراب کی تیزی سے، زیادہ نشۂ چشم محبوب پُراثر اور مخمور کن ہے،

کہتے ہیں :-

کیا کروں نگاہ کے واعظ ہاتھ سے حوروں کے جام ہُوں میں ساغر کش کسی کی نرگسِ مخمور کا

واعظ اور ناصح پر انھوں نے بھی کافی فقرے چُست کئے ہیں :-

عمامہ کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ ،، سجدہ سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا

تقویٰ کا اس کے موسم گل نے کیا یہ رنگ زاہد کو خانقاہ سے میخانہ لے گیا

سودا کے یہاں پوری پوری غزلیں ایسی ملتی ہیں جن میں شراب کی جزئیات کی تعریف ہے،

ایک شعر میں شراب پینے کی ایسی تفصیل لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پکے شرابی تھے کہتے ہیں:-

سودا تھا وقتِ نزع بھی کلّے کا منتظر جنبش لبوں کی دیکھی تو کرتا تھا جام جام

درد سودا کے بعد درد کے یہاں خمریات کا عنصر نمایاں ہے۔ تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ یہ بزرگ منش تھے اور انھیں تصوف ورثہ میں ملا تھا جس سے انہیں عشق تھا، اس لئے ان کے کلام میں شراب معرفت جھلک رہی ہے اور حافظ کا رنگ نمایاں ہے۔ کلام میں پائے بوسیٔ خم اور دست بوسیٔ سبو جیسی تراکیب ملتی ہیں، مثال :-

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

کہاں کا ساقی اور مینا کدھر کا جام و میخانہ مثالِ زندگی بھرلے اب اپنا آپ پیمانہ

ہے تنگ ظرفوں کو بے جا مے کشی جام مے کب ہو سکے جام حباب

ساقی ہے کدھر کو کشتیٔ مے اب کے کیونکر میں پار رہیں ہم

ساقی اس وقت کو غنیمت جان پھر نہیں ہوں نہ تو نہ یہ گلشن

بسانِ دانۂ انگور سے پرستوں نے لیا ہے فیض مرے دل کے آبگینے سے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بھی چل سکے ساغر چلا

ان سب اشعار میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اس بات کو مندرجۂ ذیل شعر میں اور صاف کر دیا ہے ؎

جائیے کس واسطے اے دردؔ میخانے کے بیچ — اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

محتسب پر ان کے یہاں بھی اچھی چوٹیں کی گئی ہیں لیکن مندرجہ ذیل شعر سب پر بھاری ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

میر و دردؔ کے بعد آتشؔ و ناسخؔ کے یہاں بھی خمریات کے اشعار ملتے ہیں، لیکن اُن میں رسمی انداز زیادہ اور ذوق مستی کم ہے۔ یہ لوگ نہ تو اتنے بزرگ تھے کہ تصوف سے لگاتے اور نہ اتنے چھچھورے کہ رندِ شاہد باز کہلاتے۔ ان کے یہاں شراب کے الفاظ بزرگوں کی تقلید میں باندھے گئے ہیں۔ خمریات کے اشعار زندگی کے ایک محبوب مشغلے کے بجائے ایک علامت ایک اشارہ یا ایک موضوع یا عنوان کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، اور شعراء اس عنوان پر صرف اس وجہ سے بھی طبع آزمائی کرتے تھے کہ اُن کے کمالِ فن کا پورا اثر پڑے۔ رعایت لفظی ان لوگوں کے غزل کی جان تھی۔ جذبات پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا جتنا الفاظ کی خوبصورتی پر، شراب چوں کہ جذبات پر ایک خاص اثر کرتی ہے اِس لئے اُن کے یہاں نشہ و خمار کی اشعار سطحی معلوم ہوتے ہیں یا بھرتی کے، نمونے ملاحظہ ہوں :-

(ناسخؔ) زاہد وہ بادہ کش ہوں کہ مانگوں اگر دعا — اٹھیں ابھی شراب سے بادل بھرے ہوئے

حشر تک جی میں ہے بیہوش رہوں اے ساقی — کاش سے بھر دے مرے عمر کے پیمانے میں

آبِ حیواں پیوں بجائے شراب — ایسی اے خضر مجھکو پیاس نہیں

آیا مہ صیام علی الرغم محتسب — روزہ شراب سے سرِ بازار توڑیئے

صباحِ عید ہوئی ساقیا شراب چلے — نہ بیشتر کہیں ساغر سے آفتاب چلے

ہر طرف مصروف زاہد ہیں نماز صبح میں — گردنِ مینا کو بھی لازم ہے اب خم کیجئے

مغتنم وصل میں ہے دورِ شراب آخر شب — ساقیا مرغِ سحر کے ہوں کباب آخر شب

(آتشؔ) ان کے یہاں تھوڑی تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے :-

کام ہے شیشے سے ہم کو اور ساغر سے غرض — مست رہتے ہیں شراب رفع پیر و رسے غرض

آدمی کے واسطے کچھ اور ہووے یا نہ ہو — ساقی و مے، سبزۂ و آبِ رواں درکار ہے

شیشے رہیں شراب کے آٹھوں پہر کھلے — ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابرِ تر کھلے

سبوئے غنچہ ہے لبریز جام گل معمور ٹپک رہی ہے شراب ابر نو بہاری سے
ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو، مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا
ساقی ہے مے ہے یار ہے بزم نشاط ہے چھیڑے نہ اب جو ساز تو مطرب کو چھیڑیئے

غالب خمریات میں جو درجہ عربی میں ابونواس کا اور فارسی میں حافظ و خیام کا ہے۔ اُردو میں وہی درجہ غالب کا ہے۔ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی شراب پیتے تھے یا نہیں لیکن غالبؔ پیتے تھے اور ڈنکے کی چوٹ پیتے تھے۔ وہ قرض کی بھی پیتے تھے اور جام۔ پیمانہ یا پیالہ نہ ہونے پر اوک سے بھی پینے میں انھیں عار نہ تھا۔ اُن کو بہشت و دوزخ سے کچھ سروکار نہ تھا، وہ اس نو بہار ناز کی آرزو کرتے تھے جس کا چہرہ فروغ مے سے گلستاں ہو۔ اُن کے یہاں نہ تصوف کی چاشنی ہے نہ ساغر کے پردے میں آلام روزگار کی نوحہ خوانی۔ اُن کے کلام میں شراب پرتگالی ہے اور وہ اُس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ یہ شراب کی تیزی ہی تھی جس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا:۔

"آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے"

مرتے دم تک اُن سے شراب نہیں چھٹی۔ حالت غیر ہے اُٹھنے بیٹھنے کی سکت نہیں۔ سارا دم کھنچ کر آنکھوں میں آگیا ہے، لیکن واہ ری ذوقِ میکشی اُس وقت بھی ارشاد ہوتا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالبؔ کے کلام میں سے خمریات کے مضامین نکالنا آسان نہیں اور اُن پر رائے زنی کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ اُن کی شراب کہیں کہیں خالی شراب نہیں رہتی بلکہ خاص معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اُن کی خمریات میں جہاں اور خوبیاں ہیں وہاں اُن کا ذوقِ میکشی بھی شریک ہے، ذوقِ میکشی کی وجہ کی طرف ان کے کلام میں خود ہی جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ غالبؔ کی زندگی کے اوّل سات سال نہایت رنگ رلیوں میں گزرے، دن عید اور رات شب برات منائی، لیکن بعد میں انھیں اکثر شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے انھیں زندگی اجیرن ہو گئی، لہٰذا خود کو بھلا دینے کی اِس سے بہتر ترکیب نظر نہ آئی، جیسے وہ خود بتاتے ہیں:۔

مے ہے پھر کیوں نہ مے پیئے جاؤں غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اب اُن کے وہ اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں اُن کا خاص رنگ جھلکتا ہے :-

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ وساغر نہیں ہوں میں

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے !

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہے دورِ قدح وجہ پریشانیٔ صہبا
یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

سرپائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی،
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مجھ تک کب اسکی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مختلف اشعار کے علاوہ غالبؔ کے فارسی اور اُردو دونوں کلاموں میں شراب کے بیان میں پوری پوری غزلیں ملتی ہیں، واعظ پر طعن و تشنیع بھی موجود ہے :-

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

داغ

شراب کے معاملے میں داغؔ بھی غالبؔ کے ہم مشرب ہیں، وہ بھی خوب پیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انھیں قرض کی نہیں پینی پڑتی اور نہ محتسب کا کھٹکا ہے۔ ساقی بھی اُن سے نفرت نہیں کرتا، وہ انھیں جام پیش کرتا ہے اور کبھی زبردستی پلا دیتا ہے ؎

انکارِ مے کشی نے مجھے کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اس نے خمِ مے پلا دیا

انھیں کبھی اوک سے پینی نہیں پڑی، وہ ساقی کی خوشامد نہیں کرتے بلکہ اُس کو بھی چھیڑتے ہیں،

داغ کی خاص شوخی جو اُن کے کلام کا حصہ ہے رندانہ مضامین میں اور بھی چمک جاتا ہے۔ اُن کی شاعری کا وہ خاص جوہر جس کی بنا پر حکیست نے ان کی شاعری کو عیاشانہ بتایا۔ خمریات میں اور بھی نمایاں ہے۔ داغ کی زبان کوثر کی دُھلی ہے۔ اُن کے محاورے اور بھی خوبی اور چمک پیدا کر دیتے ہیں، سرمستی اور سرشاری کا عالم ملاحظہ ہو:۔

مجھ سے میکش کو کہاں صبر کہاں کی توبہ — لے لیا دوڑ کے جب سامنے ساغر آیا
میخانہ ہے اور داغ ہے اور نشۂ مے ہے — سوتا ہے رکھے خشتِ خم بادہ سرہانے
ساقیا مجھ سے بادہ کش کو سرور — ایک ہی جام سے تو آئے گا
توبہ کے بعد بھی خالی نہیں دیکھا جاتا — دُور رہتا ہے بھرا شیشہ و ساغر اپنا
مے تو حلال ہے جو پیئے ڈھب سے بادہ نوش — میں توبہ کر کے اور پشیمان ہو گیا
اپنے حصے کی بچا لیتے ہیں پینے والے — نہ بھرا ساقیٔ کم ظرف نے ساغر پورا
آیا ہے جھوم جھوم کے ابر بہار آج — توبہ کو خشتِ خم سے کروں سنگسار آج
وہ چشم مست پھر اُس پر وہ پنجۂ مژگاں — کہ جیسے ہاتھ کسی نازنیں کا ساغر پر
کوئی جنت کا خواہاں ہے کوئی کوثر کا خواہاں ہے — اُڑا کرتی ہے بے پر کی ہمیشہ بادہ خواروں میں
یہ بجا ہے منع ہو گا رمضاں میں آب و دانہ — یہ غضب کہ تیس دن تک نہ ملے شراب ہرگز
روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے — مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے
ایک چلو میں بہت داغ بہک اُٹھے تھے — آج سنتے ہیں نکالے گئے میخانے سے
یوں تو لے ابر پتا بھی نہیں لگتا تیرا — توبہ کرتے ہی جھلکتی ہے سیاہی تیری
آتا تھا کوئی نشۂ صہبا میں ڈوب کر — ملتے ہی آنکھ رنگ میں اپنے ڈبو گیا
کچھ زہر نہ تھی شراب انگور — کیا چیز حرام ہو گئی ہے
انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار — ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

واعظ، زاہد اور محتسب کی بھی داغ نے کافی خبر لی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

صبر لے زاہد نا فہم نہ میخواروں کا — بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا ۔
تعریف نے کوثر کی مجھے خوب پلائی — کیا بات ہے واعظ ترے عقبیٰ کا بھلا ہو
مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائیگی زاہد — کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

زاہد صد سالہ آیا میکدے میں بھول کر! | لا شرابِ کہنہ ساقی اس پرانے کے لئے
یہ ٹوٹ کر کبھی نہ بنے گا کسی طرح | زاہد شکست تو یہ شکستِ سبو نہ ہو
جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدے کو ہم | آتے ہوئے ادھر سے کئی پارسا ملے
اگرچہ بادہ کشی تھا گناہ اے زاہد | جو تجھ سے چھین کے پیتا تو کچھ گناہ نہ تھا
کل چھڑا لیں گے زاہد آج تو ساقی کے ہاتھ | رہن اِک چلّو میں میں نے حوض کوثر رکھدیا

ان اشعار میں داغ کے کلام کی سب خصوصیات ملتی ہیں، شوخی بھی ہے۔ طرزِ بیان کی شگفتگی بھی چٹخارے بھی اور نازک اشارے بھی، انھیں چیزوں کو دیکھ کر ایک نقاد کی رائے یہ ہو سکتی ہے کہ داغ کی خوشی رندانہ قسم کی ہے، داغ کی خمریات میں تمام دیگر عناصر کے علاوہ زبان کی چاشنی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ محاروں کی چستی کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ داغ خمریات کے ایک کامیاب شاعر ہیں:۔

امیر امیر، داغ کے ہمعصر اور حریف تھے۔ انھوں نے بھی خمریات کے مضامین باندھے ہیں، لیکن داغ کی خمریات کا رنگ حقیقی ہے۔ امیر کے یہاں وہ جوش و مستی نہیں ہے۔ اُنکا ایک نہایت مشہور شعر ہے ؎

جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے | انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں

ریاض امیر کی کمی کو ان کے شاگرد ریاض نے بدرجہ اتم پورا کیا۔ ریاض کی طبیعت میں ایک غیر معمولی شوخی تھی جو کسی کو طفلانہ اور کسی کو جوشِ جوانی معلوم ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے جس نے ریاض کو بوڑھاپے میں بھی جوان رکھا۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ شراب کے اشعار کیف سے خالی ہیں اور سرشاری سے معرّا۔ شراب اُن کے یہاں معصومانہ لہو ولعب کی چیز ہے۔ لیکن یہ خیال زیادہ وقیع نہیں جیسا کہ اُن کے نمونۂ کلام سے ظاہر ہوگا۔ ریاض نے لکھنؤ میں اپنی جوانی گزاری تھی، اُس وقت جب کہ لکھنؤ پر بھی شباب تھا اور ایسی صورت میں وہ خمریات کے اشعار نہ کہتے تو تعجب تھا، اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہاں اور بھی اک گھونٹ مئے ہوش ربا کا | اِسوقت مجھے ہوش نہیں شکر خدا کا
ہم گرے جو لڑکھڑا کر بزم میں! | سر سبو پر ہاتھ ساغر پر پڑا
حشر میں میکدہ والو جو خدا نے چاہا | یہی جلسہ یہی ساغر یہی مینا ہوگا
خم بدوش پر بغل میں صراحی وہ روزِ حشر | اٹھنا مزار سے وہ کسی بادہ خوار کا

مجھ سے مینا یہی کہتی ہے بہ آواز بلند ۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے اندیشۂ فردا کیسا

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی ۔۔۔ تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

آئی آوازِ اذانِ صبح اٹھو بھی ریاض ۔۔۔ میکدے میں بھی تو شور قلقلِ مینا ہوا

میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر ۔۔۔ مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

توبہ کرتے ہوئے آتا ہے یہ رہ رہ کے خیال ۔۔۔ منہ مرا دیکھ کے رہ جائیگا ساغر میرا

رحمت کو یہ ادا مری شاید پسند آسے ۔۔۔ ڈر ڈر کے کانپ کانپ کے پینا شراب کا

توبہ کر کے آج پھر پی لی ریاض ۔۔۔ کیا کیا کمبخت تو نے کیا کیا

نزع تک قلقل سے رکھی یاد اللہ اس لیئے ۔۔۔ پڑھ کے قُل بخشیگی ہمکو قلقلِ مینا ثواب

بھر گیا آنکھ میں شراب کا رنگ ۔۔۔ اُف رے ظالم ترے شباب کا رنگ

مل جائے تو شراب کے دریا بہائیں ہم ۔۔۔ اللہ دے اگر تو پئیں اور پلائیں ہم

ایک چھوٹی بحر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

اچھی پی لی، خراب پی لی ۔۔۔ جیسی پائی شراب پی لی

پی لی ہم نے شراب پی لی ۔۔۔ تھی آگ مثالِ آب پی لی

عادت سی ہو نشہ ہو نہ اب کیف ۔۔۔ پانی نہ پیا شراب پی لی

واعظ و زاہد پر تضحیک بھی ریاض کے کلام میں کافی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

لگا کے دھوکے سے منہ شیخ پھر نہ چھوڑ سکا ۔۔۔ پکارتا ہی رہا میں ارے شراب شراب

تھی ظرفِ وضو میں کوئی شے پی گئے کیا آپ ۔۔۔ اے شیخ یہاں کون ہے میں چور ہوں یا آپ

شب کو میخانے میں کیوں پہنچے تھے اے حضرت شیخ ۔۔۔ کہئے اچھی تو کٹی قبلۂ حاجات کی رات

ریاض کے یہاں شراب جوانی کی شراب معلوم ہوتی ہے۔ جس میں خمار اور سرور کے لطف کے ساتھ ساتھ ایک تلخی بھی ہے جو زندگی کی تلخ کامی کو دبا دیتی ہے، ریاض کی دُنیا غم و رنج سے آزاد ہے۔ انھیں ہر شے جوان رنگین اور پُر لطف معلوم ہوتی ہے اور اِس لیئے ان کی خمریات میں لطف اور رنگینی نمایاں ہیں۔ اور شوخیاں داغ کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ مسئلہ کہ واقعیٔ وہ رند مشرب تھے یا نہیں نفس مضمون سے علیحدہ ہے۔ شہادتیں دونوں اقسام کی موجود ہیں یعنی عینی شہادت پینے کی اور نہ پینے کے لیئے، بعض حضرات حلف اٹھانے کو تیار ہیں اِس لئے یہ مسئلہ اور بھی نازک ہو جاتا ہے، وہ خود کہتے ہیں :-

گناہ کوئی نہ کرتے شراب ہی پیتے — یہ کیا کیا کہ گنہ تو کیے شراب نہ پی

ہے ریاض اک جوان مست خرام — نہ پیے اور جھومتا جائے

کچھ کام نہیں مے سے گو عشق ہے اس شے سے — ہیں رندِ ریاض ایسے دامن بھی نہ تر دیکھا

بہرحال وہ پیتے تھے یا نہیں لیکن اُن کی خمریات نہایت مکمل ہے، اگر نہ پی کر ایسے مضامین باندھے ہیں تو یہ اُن کے کمالِ فن پر دال ہے۔

ریاض کے بعد جن شعرا کا ذکر آتا ہے انھوں نے خوب پی ہے، اُن کی رندی کے واقعات کانوں سے صرف سُنے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ جگر اور جوش غالب اور داغ کی برادری میں شامل ہیں۔ اُن کا نظریہ غرقِ جامِ شراب ہونا ہے، اور اُن کا خیال ہے کہ جو پی کر بہک نہ جائے وہ رند کہلانے کا مستحق نہیں۔ جگر نے شراب کی مستی کے قصے اس کی تلخی محسوس کر کے لکھے ہیں، وہ ساقی سے زیادہ صہبا پر زور دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب چند سال سے یہ کافر منھ سے لگی ہوئی چھُٹ گئی ہے لیکن اسی اعتبار سے کلام کی رنگینی میں بھی فرق آ گیا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:۔

غرقِ موجِ بادہ کر دے ساقیا — تا کجا ہیں اور دُنیائے خراب

ہوش ہے پھر مائل فرزانگی، — لا شراب او دستِ ساقی لا شراب

جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے — پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

وہی ہستی جو سمائی ہی نہ تھی عالم میں! — غرق یک ساغرِ پُر جوش ہوئی جاتی ہے

جگر یہ مئے ارغوانی نہیں ہے — ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

مل گئیں نظروں سے نظریں اور مل کر رہ گئیں — چشمِ ساقی دیکھ کر کیا جام و ساغر دیکھتے

پھر وہی حسرت ہے ساقی پھر اُسی انداز سے — پھر سوا ساغر کے سب کچھ غرقِ ساغر دیکھتے

جگر کی بادہ کشی اِن دنوں معاذ اللہ — جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی — اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

واعظ و ناصح کی تضحیک بھی عجب انداز سے کرتے ہیں:۔

ہو گیا کیا مریدِ مے زاہد — اب تو چہرے پہ نور رہتا ہے

مجھے اٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں — جو اٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

کس لئے جان دیتے ہیں رند شرابِ ناب پر — پوچھ نہ رند محتسب تھوڑی سی آج پی کے دیکھ

اُن کی رندی، اور مستی دیکھنے کیلئے "شکست توبہ" کافی ہے، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھاکے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑتاڑ کے تھرّا کے پی گیا

سرمستیٔ ازل مجھے جب یاد آگئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

جوش کے کلام میں بھی خمریات کا عنصر بہت نمایاں ہے، غزلوں کے اشعار میں اور شراب کے عنوان سے نظمیں موجود ہیں۔ ان کے یہاں شراب کی مستی صرف شراب ہی کی مستی ہے۔ اس کا خمار انھیں کسی کی چشمِ نیم باز کی یاد نہیں دلاتا بلکہ وہ اس نظریہ کے ماتحت شراب پیتے ہیں کہ "این دفتر بے معنیٰ غرق مے ناب اولیٰ"

وہ شراب کو لذت بڑھانے والی شئے سمجھتے ہیں۔ اس کی گرمی سے اتنا متاثر نہیں جتنا کہ اس کے نشے سے، جوش اس دنیا میں پیرِ مغاں کی حکومت دیکھنا چاہتے ہیں۔ "چند جرعے" اُنکی ایک کامیاب نظم ہے، اس میں انھوں نے ایک میخوار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے، شراب کی محفل گرم ہے۔ پہلا جرعہ پیتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ اندر سے دل گھبرا رہا ہے، خون میں تیزی اور رگوں میں ہلچل مچ گئی۔ خود پر بھروسہ ہوا اور اپنے اشعار کی داد خواہی دینے لگے۔ دوسرے جرعے پر وہ کیفیت طاری ہوئی کہ ہر شئے جوان معلوم ہونے لگی۔ وہ عمر جو تیزی سے گزرتی چلی جارہی تھی اک مرکز پر ٹھہرتی ہوئی معلوم ہوئی اور آہستہ آہستہ عقل کی وہ زنجیریں جنھوں نے کشمکش میں اسیر کر رکھا تھا کچھ ڈھیلی پڑنے لگیں۔ بیہوشی اور ہوش میں ایک مستقل جنگ چھڑ گئی، کبھی دُنیا روشن معلوم ہوتی تھی اور کبھی تاریک۔ اب تیسرا جرعہ چڑھایا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک دریا اُمنڈتا ہوا میخانہ کی طرف جارہا ہے۔ شراب میں جوش پیدا ہوگیا۔ ہر ذرہ آفتاب معلوم ہونے لگا زندگی کی میعاد بڑھ گئی اور موت کا خیال دل سے نکل گیا۔ مذہب کے خلاف بغاوت کی لہر دوڑ گئی، اُسوقت نعوذ باللہ انسان خود خدا بن گیا۔ چوتھا جرعہ پیتے ہی آسمان و زمین پر حکم لگانا شروع کردیا۔ ہر شئے رقصاں معلوم ہونے لگی۔ اسی کیفیت میں پانچواں جرعہ پی گئے تو اپنی شکست سے خوشی حاصل ہوئی۔ طاقت کا یہ عالم ہوا کہ زمین و آسمان کو پھونک ڈالنے کا خیال پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ جب شراب نے اپنا پورا قبضہ جمالیا تو یہ عالم ہوا کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ نمونہ ملاحظہ ہو :-

اے ہمنشیں وہ جوش مئے ارغواں ہے آج ۔۔۔ صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج
زیر نگیں زمیں ہے قبضہ میں آسماں ۔۔۔ آفاق پر حکومتِ کون و مکاں ہے آج
مرضِ زیست کا اے جوش زمانے میں علاج ۔۔۔ جز مئے کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں
گردن میں ہیں وہ بانہیں گردش میں ہیں پیمانے ۔۔۔ کیا دین ہے کیا دنیا شاعر کی بلا جانے

غزلوں اور نظموں کے علاوہ بعض مثنویاں بھی ذکر شراب میں موجود ہیں اور ساقی نامہ تو نظم کی ایک مستقل صنف کا حکم رکھتا ہے، ساقی نامے اکثر شعراء نے نہایت کامیاب لکھے ہیں۔ اقبال نے ساقی نامہ میں بادہ و ساغر کے پردے میں فلسفۂ خودی کے اسرار نہایت خوبی سے پیش کئے ہیں۔ مضمون کی طوالت مزید تشریح کی مانع ہے۔

موجودہ اُردو ادب ایک نئے دور سے گزر رہا ہے، آئے دن نت نئے تجربے ہو رہے ہیں، دیکھیں ہمارے زندہ دل نوجوان شعراء خمریات کے مضامین کو کوثر و تسنیم۔ ساقی و پیمانہ۔ مستی و بیخودی تک ہی محدود رکھتے ہیں یا وہسکی و برانڈی، پیگ اور بار میڈ (Bar Maid.) بدمستی اور بدکرداری سے ہم آغوش کر دیتے ہیں۔ [1]

(ظہیر الدین علوی)

---

[1] علوی صاحب کے مندرجہ بالا فاضلانہ مضمون میں قدیم و جدید شعرائے کرام نے ستائشِ شراب میں جیسی جیسی مضمون آفرینی کی ہے اُس سے ہمارے نوجوانوں کو اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہونا چاہیئے کہ وہ بادۂ گلرنگ کے شیفتہ تھے، بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے تھے جنھوں نے کبھی اسکی صورت بھی نہ دیکھی تھی، تاہم یہ لوگ بے وجہ خود گنہ گار اور دوسروں کی ترغیب کا باعث ہوئے، ضرورت ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ میں بہت سے مضامین جو قدیم شاعری میں زیب و زینت کا باعث تھے وہ ترک کر دیئے گئے ہیں اور انکی جگہ دوسرے مفید مضامین پر شعراء طبع آزمائی کرتے ہیں، اسی طرح شراب کی مدح و ستائش کا فرسودہ مضمون بھی ہماری شاعری کے عناصر سے یکسر خارج کر دیا جائے۔ اسلام نے شراب خوری کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ یعنی ایک ناپاک اور شیطانی فعل قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شراب کی مذمت اس سے زیادہ بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ شراب نہ صرف انسان کو خدا اور مذہب سے غافل کر دیتی ہے بلکہ اس سے روزمرہ کے فرائض میں خلل انداز ہو کر زندگی اور ترقی کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے پچھلے قومی نقصانات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو منظم و کار آمد بنا کر ملک و ملت کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں اس ناپاک شیطانی عمل کے ذکر سے اپنے سارے نثر و نظم کے لٹریچر کو پاک کر دینا چاہیئے۔ کیوں کہ اس قسم کے اذکار نوجوانوں میں گنہگاری کی تحریک اور سیہ کاری کی ترغیب پیدا کرتے ہیں۔

سید الطاف علی بریلوی

کتب خانہ اُچ شریف گیلانی بہاولپور

از جناب ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



انقلابِ زمانہ سے جہاں ہمارے ہاتھ سے سلطنت کی دولت گئی وہاں علم کی دولت نے بھی ہم سے رُوگردانی اختیار کی، اِس علمی دولت سے میری مراد عربی اور فارسی کے وہ قلمی نسخے ہیں جن میں سے بعض نسخوں کی تکمیل پر کاتبوں کی پوری پوری زندگیاں صرف ہوگئی ہیں اور جو آج یوروپ کے متعدد کتب خانوں کے زینت بنے ہوئے ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یورپ کے بعض کتب خانے انہی کی بدولت وجود میں آئے ہیں، اِسی متاعِ گراں بہا سے محرومی کے متعلق حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے بھی اپنی ایک نظم میں اشارہ کیا ہے ؎

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اِک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مُسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
"غنیؔ روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"

جو قلمی نسخے باہر والوں کی لُوٹ سے بچے، اُن میں سے کچھ تو دستبُردِ زمانہ کی نذر ہوگئے، البتہ کچھ علم دوست اصحاب کی نظرِ عنایت سے برباد ہونے سے بچ گئے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔

کتب خانہ اُچ شریف گیلانی کے قلمی نسخے بھی جن کی ایک کثیر تعداد ضائع ہوچکی ہے، ابھی تک اہلِ علم کی نظروں سے پوشیدہ تھے، اُن کو گوشۂ گمنامی سے نکالنے، تباہی اور بربادی سے بچانے، مرتب اور منظم صورت میں لانے کا سہرا عالی جناب خان بہادر کرنل

مقبول حسن قریشی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (علیگ) وزیر داخلہ دولتِ خداداد بہاولپور کے سر ہے۔ دربار بہاولپور اور ریاست بہاولپور میں جو شہرت اور مقبولیت جناب کرنل صاحب موصوف کو حاصل ہے وہ آپ اپنی مثال ہے اور گذشتہ چند سال میں آپ نے درگاہِ عالیہ قادریہ اُچ شریف گیلانی کے سلسلہ میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ وہاں تشریف لے گئے اور جب اِس علمی دولت کو کس مپرسی اور بربادی کی حالت میں دیکھا تو آپ نے اِس متاعِ بے بہا کو اِس بربادی سے بچانے کا تہیّہ کیا اور عالی مرتبت جناب صدر اعظم دولتِ بہاولپور کی توجہ اِس طرف منعطف کی۔ چنانچہ گذشتہ مارچ میں جب جناب ڈاکٹر سیّد ہادی حسن صاحب صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بہاولپور تشریف لے گئے تو جناب کرنل صاحب موصوف کی کوشش اور عالی مرتبت جناب صدر اعظم کی خواہش پر آپ نے کتب خانہ مذکورہ کا معائنہ فرمایا اور اپنے ملاحظات ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کئے۔ جس کے نتیجہ میں اُن قلمی نسخوں کی تفصیلی فہرست مرتب کرنے کا کام راقم حروف کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ گذشتہ اگست اور ستمبر میں میں نے وہاں جو کام کیا اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

پیشتر ازیں کہ اس کتب خانہ کے متعلق کچھ عرض کیا جائے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُچ شریف گیلانی اور صاحبِ اُچ شریف گیلانی کے نامور خاندان کا مختصر تذکرہ بھی پیش کیا جائے، کیوں کہ اس کے بغیر اس کتب خانے کی اصلیت اور اہمیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

قصبہ اُچ شہر بہاولپور سے جنوب مغرب کی جانب پچاس میل کے فاصلے پر اُس مقام پر واقع ہے جہاں سے اب دریائے گھارا سات میل کے فاصلہ پر بہتا ہے، اور پنجاب کے پانچ دریاؤں کا مقامِ اتصال جو "پنج ند" کے نام سے موسوم ہے، اُچ سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ زمانۂ قدیم میں دریائے گھارا اُچ کے متصل بہتا تھا، البتہ ۱۲۳۳ھ میں دریائے گھارا میں جو طغیانی آئی، اُس نے اُچ کی قابلِ دید عمارات کو تباہ کیا اور وہ تباہ شدہ عمارات آج بھی اُس طغیانی کی یاد دلا رہی ہیں زمانۂ قدیم میں تو اِس قصبہ کا نام صرف "اُچ" تھا لیکن اب اس کے تین نام اور تین حصے ہیں۔

(۱) اُچ شریف بخاری (۲) اُچ شریف گیلانی اور (۳) اُچ موغلہ

(۱) اُچ شریف بخاری کی نسبت حضرت سید جلال الدین بخاری سے ہے جو ۶۴۱ھ میں واردِ اُچ ہوئے اور اپنی تمام عمر زہد و ورع اور تبلیغ اسلام میں گزار کر ۶۹۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی اولاد میں سے بعض بزرگ اپنے زمانہ کے مشہور اہل اللہ میں شمار ہوتے ہیں، مثال کے طور پر

حضرت شیخ جلال الدین جہانیاں جہانگیر جہاں گشت کا نام پیش کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے بلادِ اسلامیہ
کی سیاحت کی بدولت "جہانگیر جہاں گشت" کا لقب پایا۔ ان کے "سیاحت نامہ" کا قلمی نسخہ اُچ
شریف گیلانی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور ۷۸۵ھ میں انتقال فرمایا، اُچ ہی مدفون ہیں۔ ہر
دو بزرگوں کے مزارات زیارت گاہِ خاص و عام ہیں، آپکی اولاد ابھی تک وہیں مقیم ہے۔

(۲) اُچ شریف گیلانی، کی نسبت حضرت شیخ محمد غوث قادری گیلانی سے ہے جو حضرت شیخ
عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ ۸۸۷ھ میں اُچ میں وارد ہوئے۔ انھوں
نے بھی اپنی تمام زندگی تبلیغ اسلام میں بسر کی اور ۹۲۳ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار بھی
مرجع خلائق ہے۔ آپ کی اولاد اب تک وہیں قائم ہے۔

(۳) اُچ موغلہ کی نسبت سلاطین مغلیہ کے ان حکام سے ہے جو اپنے اپنے عہد حکومت
میں وہاں مقیم رہے۔

ہمارا تعلق "اُچ شریف گیلانی" سے ہے۔ حضرت شیخ محمد غوث قادری گیلانی، بانیِ اُچ شریف
گیلانی (جن کا ذکرِ خیر اُوپر ہو چکا ہے) کے انتقال پر آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت سیّد
عبدالقادر ثانی سجادہ نشین ہوئے اور اپنی تمام عمر خدمتِ اسلام میں گزاری۔ آپ کا شمار بھی اپنے
زمانے کے مشہور اولیا اللہ میں سے تھا۔ ۹۴۰ھ میں وفات پائی اور اپنے والد بزرگوار کے
پہلو میں دفن ہوئے۔

موجودہ سجادہ نشین حضرت مخدوم حامد محمد شمس الدین عبدالقادر ثامن بانیِ اُچ شریف گیلانی
کے بیسویں سجادہ نشین ہیں۔ باوجود نوجوان ہونے کے پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں۔ نہایت خوش اخلاق
عالی حوصلہ اور وسیع النظر انسان ہیں۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والدِ بزرگوار حضرت مخدوم حامد محمد
گنج بخش سابع کے سائیہ عاطفت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم عالی جناب
خان بہادر کرنل مقبول حسن صاحب قریشی (جن کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے) کی نگرانی میں حاصل کی۔
اب بھی جب کہ آپ کی عمر پچیس ۲۵ سال کی ہے، انگریزی زبان اور علوم متداولہ کے حصول کا
شوق رکھتے ہیں، لیکن سجادگی اور خانہ داری کا کام اتنا زیادہ ہے کہ اِس شوق کا پورا ہونا
مشکل نظر آتا ہے۔

میاں محمد ابراہیم خاں صاحب برق بی۔اے۔ مدار المہام درگاہِ عالیہ قادریہ، جو ایک
نہایت زیرک، صاحبِ فہم و ذکا اور باوضع انسان ہیں، حضرتِ مخدوم صاحب کی زمینداری کے

وسیع کاروبار کو نہایت عمدگی اور قابلیت کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ابوالفضل مولوی محمد فقیر اللہ صاحب فاضل دیوبند، امام مسجد جامع اور صدر مدرس مدرسۂ عالیۂ قادریہ، کتب خانہ کے مہتمم ہیں، آپ کی ذاتِ گرامی کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ریاست بھاولپور کے اس علاقہ میں جہاں کے باشندے بالعموم نورِ علم سے بے بہرہ ہیں، آپ کی مثال اس چراغ کی سی ہے جو تنہا ایک صحرا میں روشن ہو اور جس کے نور سے اس مقام کے اطراف منور ہوں۔ درگاہ عالیۂ قادریہ کے محاسبِ اعلیٰ مولوی بقا محمد صاحب کا شمار وہاں کے پرانے بزرگوں میں سے ہے۔ آپ کو فارسی زبان میں کافی دسترس ہے، گفتگو عاقلانہ اور مدبرانہ ہے۔ نہایت قابل اور مردم شناس انسان ہیں۔

قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ کتب خانۂ اُچ شریف گیلانی کی بنیاد کب پڑی، لیکن قیاساً اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیاد بھی بانیٔ اُچ شریف گیلانی نے رکھی ہوگی۔ کیونکہ وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے اپنے سن ورود یعنی ۸۸۵ھ کے بعد وہاں پر ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا اور اس جہالت کی تاریکی میں علم کی روشنی کو پھیلانا شروع کیا، اس سلسلہ میں اُن کو کتابوں کی ضرورت بھی یقیناً پیش آئی ہوگی اور انھوں نے قلمی نسخے فراہم کئے ہوں گے، لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے کا کوئی نسخہ اب اس کتب خانہ میں موجود نہیں، چوں کہ بیشتر نسخے ضائع ہوچکے ہیں اس لئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ اُس وقت کے نسخے بھی ضائع ہوگئے ہوں۔

جس طرح کہ رفتہ رفتہ مدرسہ نے ترقی کی اسی طرح کتب خانہ میں بھی کتابوں کا اضافہ ہوتا گیا اس اَمر کی شہادت اِس بات سے ملتی ہے کہ مخدوم صاحبان نہ صرف یہ کہ خود اہلِ علم تھے، بلکہ اہلِ علم کے قدر دان بھی تھے۔ اور اُن کے ہاں کاتب بحیثیت مستقل ملازمین کے بھی رہتے تھے، کیونکہ اب بھی ایسے متعدد نسخے موجود ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف مخدوم صاحبان کے لئے لکھے گئے اور جن کے آخر میں خود کاتبوں کے قلم سے ایسی تحریریں ملتی ہیں جو میرے اس بیان کی شاہد ہیں، لیکن افسوس کہ جو دولت صدیوں میں جمع ہوئی تھی اُس کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوچکا ہے اور اب جو نسخے موجود ہیں، اُنکی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ اِن کے علاوہ اِس کتب خانہ میں مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جن کی تعداد ۰۰۰ کے قریب ہے۔

اب ہم ایک نہایت ہی اہم واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس کا اثر اِس کتب خانہ پر پڑا۔ نواب امیر محمد مبارک خاں فرمانروائے رسوم بھاولپور کے عہد حکومت (۱۱۴۲ھ تا ۱۱۸۵ھ) میں اُچ شریف گیلانی کے سجادہ نشین حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش ثالث تھے، غلام شاہ کلہوڑہ والیٔ سندھ نے جو

حضرت مخدوم صاحب کا ہم زلف اور والئی بہاولپور کا مخالف تھا، حضرت مخدوم صاحب کو والئی بہاولپور کے خلاف بھڑکایا، جس کے نتیجہ میں حضرت مخدوم صاحب نے ۱۱۸۵ھ میں اُچ شریف گیلانی کے گرد ایک مضبوط فصیل تیار کرا کر قصبۂ مذکورہ کو ایک قلعہ کی صورت میں بدل دیا اور بہت سا سامان جنگ بھی فراہم کیا، اس قلعہ کے ایک دروازہ پر جو "ہاتھی دروازہ" کے نام سے موسوم ہے، ایک قطعہ کندہ ہے جس کے آخری مصرعہ سے "سن تعمیر" نکلتا ہے۔

لیکن باوجود اس قدر استحکام اور دوسرے انتظامات کے فرمانروائے رسوم بہاولپور کے عہد میں فریقین کے مابین کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ ان کے بعد نواب محمد بہاول خان عباسی ثانی والی چہارم بہاولپور کے عہد حکومت (۱۱۸۶ھ تا ۱۲۲۴ھ) میں جب کہ حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش رابع معروف بہ "جنگ آور" اُچ شریف گیلانی کے سجادہ نشین تھے۔ طرفین میں پھر مخالفت کا شعلہ بلند ہوا اور ۱۲۱۷ھ میں فریقین کے درمیان ایک زبردست لڑائی ہوئی جس کا فیصلہ والئ بہاولپور کے حق میں ہوا اور حضرت جنگ آور اپنے شکست خوردہ مریدوں کے ساتھ سندھ میں چلے گئے اور ۱۲۲۱ھ میں بمقام کھوٹکی وفات پائی۔ البتہ ریاست کی فاتح فوجیں اُچ شریف گیلانی پر حملہ آور ہوئیں اور اس مقام کو فتح کرنے کے بعد فصیل کو گرا دیا۔ اگرچہ "ہاتھی دروازہ" اب تک باقی ہے، اس کے علاوہ حضرت جنگ آور کے محلات بھی اس حملہ سے نہ بچ سکے۔ اس وقت کی تباہ شدہ عمارات آج بھی اس واقعہ کی شہادت دے رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس حملہ کے سلسلہ میں کتب خانہ کو بھی نقصان پہونچا ہوگا اور اس ہنگامۂ گیرودار میں بہت سے قیمتی نسخے وہاں سے غائب بھی ہوگئے ہوں گے۔

اس واقعہ کے بعد ۱۲۳۰ھ تک یہ کتب خانہ کس مپرسی کی حالت میں رہا اور ۱۲۳۰ھ میں جب کہ حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش خامس ابن مخدوم حامد محمد شمس الدین خامس ابن حضرت جنگ آور سرکار بہاولپور کی اجازت سے اُچ شریف گیلانی تشریف لائے اور اپنے بزرگوں کی نعشوں کے صندوق بھی بانیٔ اُچ شریف گیلانی کے پہلو میں دفن کئے۔ انھوں نے از سر نو مکانات تعمیر کئے اور من جملہ دیگر اشیا کے اپنے آبا و اجداد کی اس علمی دولت کو بھی سنبھالا اور چوّن سال کی سجادگی کے بعد ۱۲۸۴ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کے بعد ان کے بیٹے مخدوم حامد محمد شمس الدین سادس سجادہ نشین ہوئے۔ یہ بزرگ چند کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ ایک اچھے مرتبہ کے شاعر بھی تھے، اور فارسی، اردو اور

بہاولپوری یا ملتانی زبان میں شعر کہتے تھے اور "سید" تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان اور چند کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ عمر کا اکثر حصّہ گوشہ نشینی میں گزرا اور عمر بھر ریاضت، مطالعہ و تصنیف میں مشغول رہے۔ ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی، ان کی وفات پر ان کے تینوں بیٹے یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوئے۔ تیسرے بیٹے حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش سابع عالم جوانی میں فوت ہوئے اور ایک کمسن بچّہ اپنی یادگار چھوڑا، جو حضرت مخدوم حامد محمد شمس الدین عبدالقادر ثامن کے لقب سے سجادہ نشین ہوئے۔ جن کا ذکر خیر اُوپر ہو چکا ہے۔ کمسنی کی وجہ سے اُن کی وسیع جائیداد کا انتظام جناب کرنل مقبول حسن صاحب قریشی کی کوشش سے کورٹ آف وارڈس کے تحت میں آیا، لیکن کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ مختلف اوقات میں جو مدارالمہام جائیداد کے انتظام کے لئے مقرر ہوتے رہے اُن میں سے کسی ایک نے بھی کتب خانے کی طرف توجّہ نہیں کی اور یہ علمی دولت ایک بند کمرے میں کس مپرسی کے عالم میں پڑی رہی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد جب جناب کرنل مقبول حسن صاحب قریشی کی نکتہ رس نگاہیں اِس دفینہ پر پڑیں تو انھوں نے اس کو وہاں سے نکلوا کر ایک ہوا دار کمرے میں رکھوایا۔ چنانچہ حضرت مخدوم صاحب کا بیان ہے کہ جب کتابیں اُس بند کمرے سے نکالکر دوسرے کمرے میں منتقل کی گئیں تو اُن کتابوں کی تعداد جو اُسوقت تک دیمک کی نذر ہو چکیں تھیں اتنی زیادہ تھی کہ اُن کو ایک بڑی لاری میں بھرا گیا اور وہاں سے سات میل کے فاصلہ پر لے جاکر دریائے گھارا کی آغوش میں سونپ دیا گیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو دولت حضرت مخدوم صاحب کے بزرگوں نے کئی سو سال میں جمع کی تھی اُس کا خاتمہ چند برسوں میں کچھ اس طرح سے ہُوا کہ آج صرف اُس کا ایک قلیل حصّہ باقی ہے۔ ع

قیاس کُن زِ گلستانِ من بہارِ مرا

حضرت مخدوم صاحب نے جوان ہو کر جب اپنی جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے کتب خانہ پر بھی مہربانی کی نگاہیں ڈالیں اور چند الماریاں بنوا کر ان باقی ماندہ کتابوں اور بزرگوں کے تبرکات کو اُن میں کسی حد تک محفوظ کیا۔ لیکن چُوں کہ موجودہ کتب خانہ کا فرش بھی کچا ہے اِس لئے یہ کتابیں اب بھی پُورے طور پر محفوظ نہیں ہیں۔ اگرچہ اب جناب کرنل صاحب موصوف کی ہدایت پر حضرت مخدوم صاحب نے اُن کی حفاظت کے لئے لوہے کی ایسی الماریاں خریدنے کا ارادہ کیا ہے جن کے اندر کتابیں قطعی طور پر محفوظ رہ سکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے ایسی الماریوں کا ملنا کچھ آسان نہیں۔

پیشتر ازیں کہ آپ کی خدمت میں تفصیلی فہرست کی ترتیب اور چند قیمتی اور نادر قلمی نسخوں کا بیان پیش کیا جائے یہ بیان کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ دہاں بہونچکر میں نے کتابوں کو کس حالت میں پایا کیوں کہ اس کے بغیر آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس سلسلہ میں مجھے اِس شدید گرمی کے موسم میں کسقدر محنت کرنی پڑی اور کس مشکل سے میں نے یہ اہم کام سرانجام دیا۔ پروردگار عالم کی یہ عین عنایت ہے کہ اس نے اپنے ایک ناچیز بندہ کو یہ علمی اور فنی کام کرنے کی ہمت عطا فرمائی۔

سب سے پہلا صبر آزما کام یہ تھا کہ قلمی اور مطبوعہ کتابوں کو الگ الگ کیا جائے۔ چنانچہ جب یہ کام شروع کیا گیا تو عجیب عجیب چیزیں نظر سے گذریں۔ بہت سے نسخے تو غیر مجلّد تھے۔ لیکن جو نسخے مجلّد تھے اُن کی جلد بندی میں کسی جلد ساز نے جو جو کرشمے دکھائے ہیں اُن کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً ایک جلد میں اگر ایک قلمی نسخہ تاریخ کے متعلق ہے تو اُس کے ساتھ نامی پریس کانپور کی مطبوعہ جنتری باندھ دی گئی ہے۔ اگر ایک جلد میں ایک قلمی نسخہ تصوّف کے متعلق ہے تو اس کے ساتھ دہلی کے کسی دواخانہ کی فہرست ادویات جلد کی ہوئی ہے۔ اگر ایک جلد میں ایک قلمی نسخہ مذہب کے متعلق ہے تو اس کے ساتھ لاہور کا کوئی مطبوعہ رسالہ جلد کر دیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں جب حضرت مخدوم صاحب کے روزانہ وظیفہ کا "دلائل الخیرات" کا نہایت ہی قیمتی قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا تو یہ دیکھ کر مجھے ہرگز تعجب نہیں ہوا کہ اس کے آخر میں شیخ فریدالدین عطار کی تذکرۃ الاولیا کے پہلے آٹھ اوراق سی دیئے گئے ہیں، غرضکہ اِس قسم کی مثالیں بکثرت تھیں۔ یہ سب کچھ آخر کیوں تھا، اِس لئے کہ بے چارے جلد ساز کو جو جاہل مطلق تھا، کیا علم تھا کہ جلد بندی میں بھی کسی عقل و نظر کی ضرورت ہوتی ہے، اُسے تو بس جن کتابوں کی تقطیع ایک سی نظر آئی، اُن کو ایک ہی جلد میں رکھدیا۔ کتابیں خواہ قلمی ہوں یا مطبوعہ، تاریخ کی ہوں یا تصوّف کی، منظوم ہوں یا منثور، اُسے اس سے کچھ مطلب نہیں، اس کو تو صرف جلد باندھنا ہے اور ایک ہی تقطیع کی ایک دو نہیں بلکہ تین چار کتابوں کو یکجا کرنا ہے۔

اِس مشکل سے رہائی پانے کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ عربی، فارسی، اُردو اور بہاولپوری یا ملتانی زبان کے قلمی نسخوں کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور پھر ہر زبان کے نسخوں کو مضمون وار تقسیم کرنے کے بعد تفصیلی فہرست کی ترتیب شروع کی جائے۔ چنانچہ یہ کام بھی بخیر و خوبی انجام پایا۔

اب ہم اُن چند قلمی نسخوں کا ذکر کرتے ہیں جو فن کتابت اور نقاشی کے لحاظ سے نہایت ہی پاکیزہ اور قیمتی نسخے ہیں، چوں کہ ابھی تمام کتابیں ہماری نظر سے نہیں گزریں اس لئے اِس وقت ہم یہ

نہیں بتا سکتے ہیں کہ قدامت کے لحاظ سے کون کون سے نسخے نادر ہیں، کون کون سے کم یاب اور کون کون سے نایاب ہیں۔ اِس کا فیصلہ تمام فہرست کے خاتمہ پر ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اِس کے متعلق ایک اور مقالہ آئندہ کسی صحبت میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

(۱) سب سے پہلے ہم ایک ایسے قرآنِ پاک کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں کے تبرکات میں شامل ہے، یہ کلامِ پاک کا ایک حصّہ ہے جو خطِ کوفی میں لکھا ہوا ہے۔ صفحۂ اوّل پر ایک کاغذ کا ٹکڑا چسپاں ہے جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ کلامِ پاک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے اوراق کی تعداد ۹۹ ہے، تقطیع میانہ ہے۔

(۲) کلامِ پاک کا ایک پُرانا اور بہت خوبصورت نسخہ ہے۔ تمام کلامِ پاک دوہرے سنہری حاشیہ کے اندر نہایت ہی اچھے خط میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اِس قیمتی نسخے کے دو پارے شروع سے اور دو پارے اخیر سے افتادہ ہیں۔ اِس کے اندر کئی اوراق پر بہترین سنہری نقاشی کی ہوئی ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۰۶ ہے۔

(۳) کلامِ پاک کا ایک نہایت نفیس نسخہ ہے۔ تمام کلامِ پاک دوہرے سنہری حاشیہ کے اندر نہایت خوبصورت خط میں لکھا ہوا ہے۔ اِس نسخہ کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ کاتب نے جس کا نام عبدالباقی ابن جان محمد خواہر زادۂ حاجی محمد حسین اللاہوری ہے۔ ایک پارہ ایک ورق پر ختم کیا ہے گویا تیس پارے تیس اوراق پر لکھے ہوئے ہیں، ہر صفحہ پر اکتالیس سطریں ہیں۔ خط اگرچہ خفی ہے لیکن صاف پڑھا جاتا ہے۔ سنِ کتابت درج نہیں۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

(۴) کلامِ پاک کا ایک نہایت قیمتی نسخہ ہے، جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ چھوٹی تقطیع ہے اور ہر صفحہ پر گیارہ سطریں ہیں۔ تمام کلامِ پاک دوہرے سنہری حاشیہ میں نہایت پاکیزہ خط میں لکھا ہوا، پہلے اور آخری ورق پر بہترین سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ اوراق کی تعداد ۸۰۷ ہے، کاتب کا نام محمد مراد اور سنِ کتابت ۱۱۴۰ ہجری ہے۔

(۵) کلامِ پاک کا ایک نہایت پاکیزہ نسخہ ہے، چھوٹی تقطیع ہے اور ہر صفحہ پر گیارہ سطریں ہیں، اِس نسخہ کی خاص صفت یہ ہے کہ ہر صفحہ کا وہ حصّہ جہاں اصل عبارت ہے تمام سنہری ہے، سطروں کے درمیان فارسی لفظی ترجمہ سُرخ روشنائی سے نہایت باریک خط میں لکھا ہوا ہے۔ تمام کلامِ پاک کے حاشیہ پر سنہری اور رنگین گُل کاری ہے۔ پہلے اور آخری ورق کے علاوہ سات اور اوراق پر بہترین سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے، افسوس ہے کہ باوجود اِس انتہائی محنت کے نہ کاتب نے

اپنا نام دیا ہے اور نہ سنِ کتابت۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

(۶) اِس کتب خانہ میں کلامِ پاک کا یہ ایک بہترین اور نہایت ہی بیش قیمت نسخہ ہے اِس کا طول سوا اکیس انچ اور عرض ساڑھے تیرہ انچ ہے۔ تمام کلامِ پاک تین سنہری اور رنگین حاشیوں کے اندر جلی خط میں لکھا ہوا ہے۔ سطروں کے درمیان فارسی لفظی ترجمہ سُرخ روشنائی سے لکھا ہُوا ہے، اور حاشیہ پر حسین الواعظ کاشفی (متوفی ۹۱۰ھ) کی "تفسیرِ حسینی" لکھی ہوئی ہے جو ۸۹۷ھ میں میر علی شیر نوائی صدرِ اعظم ابوالغازی سلطان حسین میرزا تیموری والیٔ خراسان کے لئے لکھی گئی تھی۔ پہلے اور آخری ورق پر اپنی قسم کی نہایت ہی خوبصورت سنہری اور رنگین نقاشی کی ہُوئی ہے۔ اِن کے علاوہ تمام کلامِ پاک میں ہر صفحہ پر سنہری اور رنگین گلکاری ہے۔ یہ نسخہ کاتب اور نقاش کی کتابت اور نقاشی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اِس بے نظیر نسخہ کا کچھ حصّہ دیمک کی نذر ہو گیا ہے، کاتب اور نقاش، جس نے اپنی پُوری زندگی اِس پر صرف کی ہوگی، نہ اپنا نام دیا ہے نہ سنِ کتابت۔ البتہ صفحہ اوّل پر ایک کاغذ کا ٹکڑا چپاں ہے، جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ نسخہ عالمگیری عہد کا ہے اس کا کاتب "یاقوت رقم" ہے۔ اور اِس کا ہدیہ دس ہزار روپیہ ہے۔ اوراق کی تعداد ۴۴۲ ہے اور ہر صفحہ پر چودہ سطریں ہیں۔ "یاقوت رقم" کی تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ اِس "خطاب" کے حامل دو شخص تھے:۔

پہلا شخص عبدالباقی المعروف بہ حدّاد والمخاطب بہ "یاقوت رقم" شاہجہانی حکومت کے آخری دور میں شاہزادہ اورنگ زیب کی دعوت پر ایران سے ہندوستان آیا اور یہاں پہونچکر اُس نے اپنی خوشنویسی کے بہت سے اعلیٰ نمونے شاہزادے کی خدمت میں پیش کیئے۔ جس کے صِلہ میں اُسکو "یاقوت رقم" کا خطاب عطا کیا گیا۔ خوشنویسی کے مذکورہ نمونہ جات میں ایک کلامِ پاک کا نسخہ بھی تھا جو خطِ خفی میں تیس اوراق پر لکھا ہوا تھا۔ اُس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ خطِ خفی میں بے نظیر تھا۔ اگرچہ عبدالباقی ایران واپس چلا گیا لیکن اپنے پیچھے ایسے بہت سے شاگرد چھوڑ گیا جنھوں نے اس کی طرزِ تحریر کو ایک عرصہ تک ہندوستان میں قائم رکھا۔

دوسرا شخص محمد عارف المخاطب بہ "یاقوت رقم خان" ہرات کا باشندہ تھا، اور عبدالباقی کے شاگردوں میں سب سے بہتر تھا، عالمگیر کے زمانے میں خوشنویسی میں

شاہزادوں کا استاد تھا۔ جنھوں نے خطِ نسخ کی تعلیم اس سے حاصل کی۔ چوں کہ کلام پاک کا یہ نسخہ خطِ جلی کا ایک بہترین نمونہ ہے اور عبدالباقی "یاقوت رقم" خطِ خفی میں مہارت رکھتا تھا اِس لئے میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ محمد عارف "یاقوت رقم خان" کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک خاص بات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ نہ صرف یہی ایک نسخہ ہے جس کے آخر میں کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں بلکہ کلام پاک کے بعض اور بھی ایسے قیمتی نسخے ہیں جن پر نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ سنِ کتابت۔ توکیا اِس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان کے کاتب باوجود اِس جاں کاہ اور جاں سوز محنت کے اپنے نام کو پوشیدہ رکھ کر دنیاوی نام ونمود کے خواہاں نہیں تھے، اور وہ اِس جاں گداز محنت کا معاوضہ صرف کلام پاک کے مالکِ حقیقی سے چاہتے تھے، جس نے اُن کو ایسے بے نظیر نسخوں کی کتابت کی طاقت بخشی اور تذہیب کا حوصلہ عطا فرمایا۔ میرے نزدیک یہ ایک حیرت انگیز امر ہے، جو گذشتہ زمانے کے مسلمان کاتبوں کی عالی ظرفی اور بے نیازی کی بہترین دلیل ہے۔ خدائے پاک اُن کو جزائے خیر دے۔

(۷) حدیث شریف کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" کا نہایت اعلیٰ نسخہ ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ "مشکوٰۃ المصابیح" کے جامع کا نام شیخ ولی الدین ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ خطیب تبریزی ہے۔ جنھوں نے ۷۳۷ھ میں اس کی تکمیل کی۔ یہ نسخہ دوہرے سنہرے حاشیہ کے اندر دو قسم کے بہترین خطوں میں لکھا ہوا ہے، حاشیہ پر بہترین خفی خط میں شرح لکھی ہوئی ہے۔ پہلے ورق پر نہایت اعلیٰ سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ ابواب کے عنوانات سُرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، نسخہ کے آخر میں نہ کاتب کا نام ہے نہ سنِ کتابت، گیارہویں صدی ہجری کی معلوم ہوتی ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۳۰۵ ہے۔

(۸) اِس چھوٹے سے پاکیزہ نسخہ میں تین رسالے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) **چہل حدیث**:۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چالیس حدیثیں ہیں جن کا ترجمہ فارسی نظم میں دیا گیا ہے۔ مختصر سا دیباچہ بھی فارسی میں ہے۔ اصل اور ترجمہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر بہترین نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ حدیثوں کی کتابت میں کاتب نے اِس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایک حدیث سنہری ہے تو دوسری رنگین،

پہلے ورق پر بہت خوبصورت سنہری اور رنگین نقاشی کی گئی ہے۔

(ب) **صد کلمہ** :۔ حضرتِ علی ابن ابی طالب کے ایک سو کلماتِ حکیمانہ ہیں، جن کا ترجمہ فارسی نظم میں دیا گیا ہے۔ اس کا مختصر دیباچہ بھی فارسی میں ہے۔ اِس حصّہ کی کتابت اور نقاشی بھی اُن ہی اصولوں پر کی گئی ہے جن پر کہ حصّۂ اوّل کی۔ مترجم کا نام محمّد ابن عبد الجلیل العمری الرّشید الکاتب المعروف بوطواط ہے، جو اُتسِز خوارزم شاہ کا کاتب تھا۔

رشید الدین کے متعلق ایک لطیفہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چوں کہ یہ شخص بہت ہی مختصر قدو قامت کا تھا اِس لئے "وطواط" یعنی ابابیل کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن باوجود اِس بہت ہی مختصر قدو قامت کے اُس کی زبان بہت تیز تھی، اور اُس کی تیزیٔ زبان کی وجہ سے بہت سے لوگ اُس کے دشمن ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ پادشاہ کے دربار میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، حضرتِ "وطواط" نے بھی جب زور زور سے جھکنا شروع کیا تو پادشاہ نے جس کے سامنے ایک بڑا قلم دان رکھا تھا اور جس کے پیچھے سے "وطواط" اُس کو نظر نہیں آتا تھا، مزاح کے طور پر کہا "یہ قلم دان میرے سامنے سے اُٹھاؤ تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون بول رہا ہے"۔ رشید الدین فی الفور کھڑا ہو گیا اور یہ جواب دیا۔ "آدمی اپنے جسم کے دو بہت ہی چھوٹے حصّوں کی بدولت آدمی ہے، یعنی اُس کا دِل اور اُس کی زبان"۔ یہ جواب سُن کر پادشاہ بہت خوش ہوا۔

اِس حصّہ کے آخر میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں :۔

"تمّت کلمۂ متبرکہ بدر المحفوظ سمرقند بتاریخ نہصد و ہفتاد و ہشت"

جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب نے یہ نسخہ ۹۷۸ھ میں سمرقند میں لکھا۔ مذکورہ دونوں حصّوں کا کاتب ایک ہی ہے۔

(ج) **چہل حدیث** :۔ رسولِ مقبول کی چالیس حدیثیں ہیں، جن کا لفظی ترجمہ فارسی نثر میں دیا گیا ہے۔ اصل اور ترجمہ دوہرے اور سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر اچھے خط میں لکھا ہوا ہے، پہلے ورق پر درمیانہ درجے کی سنہری اور رنگین نقاشی کی گئی ہے۔ کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں ہے، گیارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ کُل اوراق کی تعداد ۳۶ ہے۔

(۹) اِس چھوٹے سے خوبصورت نسخے میں عربی کا مشہور قصیدہ جو شرف الدین ابو عبداللہ محمد ابن سعید بصیری (متوفی ۶۹۴ھ یا ۶۹۷ھ) نے رسول مقبول کی مدح میں لکھا ہے۔ تمام قصیدہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر بہترین خط میں لکھا ہوا ہے۔ پہلے ورق پر عمدہ سنہری اور رنگین نقاشی کی گئی ہے۔ اس نسخہ پر چار مہریں ہیں جن میں "سید حسن بخش حسینی ۱۱۹۲" لکھا ہوا ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۶ ہے۔

(۱۰) بڑی تقطیع کا ایک نہایت ہی پاکیزہ نسخہ ہے۔ اس میں اسماء الٰہی، اسماء رسول مقبول، ایک منظوم عربی دعا، فارسی زبان میں رسول مقبول کا حلیۂ مبارک، اسماء حضرت علی ابن ابی طالب، اسماء حضرت فاطمۃ الزہرا، اسماء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، اور تنبیہ الانام مصنفہ ابو محمد عبدالجلیل عظوم ابن شیخ محمد عظوم کا پہلا ربع۔ تمام نسخہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ میں بہترین نسخ خط میں لکھا ہوا ہے۔ پہلے ورق پر نہایت اعلیٰ سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ حاشیہ پر سنہری اور رنگین گلکاری ہے۔ افسوس ہے کہ اس بہترین نسخہ کے آخر میں بھی کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۸۵ ہے۔

(۱۱) بڑی تقطیع کا ایک بہت ہی پاکیزہ نسخہ ہے جس میں دعائیں لکھی ہوئی ہیں۔ اِس نسخہ کی کتابت اور نقاشی بعینہ مذکورہ نسخہ کے مطابق ہے۔ کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اوراق کی تعداد ۴۰ ہے۔ اِس نسخہ پر دو مہریں ہیں، جن میں "سید حسن بخش حسینی ۱۱۹۲" لکھا ہوا ہے۔

(۱۲) ابو عبداللہ محمد ابن سلیمان الجزولی (متوفی ۸۷۰ھ) کی مشہور تصنیف "دلائل الخیرات" کا نہایت خوبصورت نسخہ ہے۔ اِس نسخہ کا دیباچہ اور مصنف کی مختصر سوانح حیات فارسی میں لکھی ہوئی ہے۔ تمام نسخہ دوہرے سنہری حاشیہ کے اندر بہترین خط میں لکھا ہوا ہے۔ اور حاشیہ پر فارسی میں مختصر شرح دی ہوئی ہے۔ پہلے ورق پر نہایت خوبصورت سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں، تیرھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۰۳ ہے۔

(۱۳) بہت چھوٹی تقطیع کا ایک خوبصورت نسخہ ہے جس میں ابو الحسن علی ابن عثمان ابن علی الجلابی الہجویری اللاہوری المعروف بہ داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ) کی مشہور تصنیف

"کشف المحجوب" کا انتخاب ہے۔ کشف المحجوب تصوف کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ جسمیں تصوف کے علمی و عملی مسائل کو باقاعدگی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ باریک نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ مرتب اور کاتب کا نام درج نہیں، آخری چند اوراق افتادہ ہیں۔ اس وجہ سے سنِ کتابت معلوم نہیں ہو سکتا۔ گیارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے، عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں۔ اوراق کی تعداد ۱۹۱ ہے۔ قدرے کرم خوردہ ہے۔

(۱۴) مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کی مشہور تصنیف "شواہد النبوۃ" کا بے نظیر نسخہ ہے۔ تمام نسخہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر نہایت ہی اعلیٰ باریک نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ عنوانات اور عربی فقرے یا جملے نہایت ہی پاکیزہ خطِ نسخ میں لکھے ہوئے ہیں۔ کاتب نے اِن کی کتابت میں اس اصول کو مدِ نظر رکھا ہے کہ ایک سنہری ہے تو دوسرا رنگین۔ حاشیہ پر کہیں کہیں باریک خطِ نستعلیق میں کچھ شرح بھی تھی جو جلد ساز کی نظرِ عنایت سے نہیں بچ سکی اور جلد بندی کے وقت کٹ گئی۔ اس بے نظیر نسخے کے آخر میں بھی کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں دسویں صدی ہجری کی معلوم ہوتی ہے۔ آخری صفحہ پر ایک تحریر ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شیخ فیضی فیاضی ملک الشعرائے دربار اکبری کے کتب خانہ میں تھا، اور اسی پر سن ۹۹۰ ہجری بھی دیا ہوا ہے۔ فیضی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس کے کتب خانہ میں ۴۶۰۰ بہترین قلمی نسخے تھے، اوراق کی تعداد ۲۶۰ ہے۔

(۱۵) مذکورہ بالا نسخہ کی طرح یہ بھی ایک نہایت اعلیٰ نسخہ ہے۔ اس نسخہ میں مولانا جامی کی "شواہد النبوۃ" کا باب ششم جس میں ائمۂ معصومین کی مختصر سوانح حیات ہیں، درج ہے۔ اس نسخہ کا دیباچہ شواہد النبوۃ کے دیباچے سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور صرف ایک دو مقام پر فرق ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مولانا جامی کی ایک مستقل تصنیف ہے، یہ نسخہ بھی بہترین خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، پہلا ورق غائب ہے، آخر کا کچھ حصہ دیمک کی نذر ہو گیا ہے، لیکن آخری ورق موجود ہے۔ جس پر کچھ تحریر تھا، جو بعد میں کسی نے سرخ روشنائی سے مٹا دیا ہے، ممکن ہے کہ اُس مٹی ہوئی تحریر میں کاتب کا نام یا سنِ کتابت یا اس نسخہ کے متعلق کوئی اور خاص بات درج ہو۔ یہ نسخہ بھی دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے اور چوں کہ دونوں نسخوں کے خط آپس میں ملتے جلتے ہیں، اس لئے اِس بات کا امکان ہے کہ دونوں کا کاتب ایک ہی ہو۔ اوراق کی تعداد ۸۵ ہے۔

غلام سرور

مخالفینِ اُردو سے خطاب

ہند سے مِٹ جائیگی اُردو خیالِ خام ہے!

(از حضرتِ دُعا ڈبائیوی)

ہند یعنی میرا، اُن کا، آپ کا، سب کا وطن — خوبیٔ تقدیر سے پایا ہے کیا اچھا وطن
ساری دُنیا سے نرالا افضل و اعلیٰ وطن — جس کی حسرت میں تڑپتا ہے جہاں ایسا وطن

جس نے دُنیا کا کُل مقصد سے دامن بھر دیا
انتہا یہ ہے کہ خود کو بھی حوالے کر دیا

جب سریرآرائے ملکِ ہند تھا شاہجہاں — اور کہا جاتا تھا یہ ہندوستاں جنت نشاں
غم نظر آتا نہ تھا ہر ایک دل تھا شادماں — ہر مکاں گویا تھا اپنے دیس کا رشکِ جناں

افتراقِ باہمی گو اک قلم معدوم تھا،
مختلف سب کی زبانیں تھیں جدا مفہوم تھا

ایک کی بولی سمجھنی دوسرے کو تھی محال — کاروبارِ زندگی مشکل تھا تا حدِّ کمال
تاجدارِ ہند کو اُس وقت یہ آیا خیال — وہ زباں ایجاد ہو جس کی نہ ہو کوئی مثال

سہل ہو جس کا سمجھنا، بولنا آسان ہو
اس قدر سادہ ہو جس پر سادگی قربان ہو

کچھ لئے الفاظِ ہندی، کچھ مدد بھاشا سے لی — کچھ تتبّع فارسی کا، کچھ عرب کی پیروی
خوشہ چینی اس نے دُنیا کے ہر اک خرمن سے کی — جس کا اُردو نام ہے وہ اس طریقے سے بنی

اس کو ہم سب نے بنایا یہ زباں ہے عام کی
مشترک شے پر نہیں تخصیص کچھ اسلام کی

پھر عداوت کس لئے اُردو سے اے اہلِ وطن — اتنی وحشت کس لئے اُردو سے اے اہلِ وطن

بغض و نفرت کس لئے اُردو سے اے اہلِ وطن　　ترکِ اُلفت کس لئے اُردو سے اے اہلِ وطن

جب خود اپنی ہی زباں کو تم ٹھکرا دوگے تم
پھر تمہارا کیا بھروسا کس کے کام آؤ گے تم

مُسلم و ہندو کا جھگڑا کیوں ہے اس کے درمیاں　　جس کو سب سمجھیں وہی ہے ہند کی واحد زباں
ہر طرف چرچا ہے اس کا ہر جگہ اس کا بیاں　　ہیں زبانیں اور بھی لیکن کشش ایسی کہاں

تیرے صدقے موہنی بخشی ہے کیا یا رب اسے
اتنی نفرت ہے مگر پھر بولتے ہیں سب اسے

اے وطن والو تمہاری وہ شرافت کیا ہوئی　　پاس داری وہ کہاں ہے وہ حمیّت کیا ہوئی
تم کو دعویٰ تھا محبّت کا محبت کیا ہوئی　　وہ نگاہِ مہر وہ چشمِ مروّت کیا ہوئی

ہند سے مٹ جائے گی اُردو خیالِ خام ہے
اتنی نفرت پر بھی یہ مقبولِ خاص و عام ہے

چھوڑ دو اس سے تم اب نفرت نصیحت مان لو　　خوبیاں جو اس میں ہیں اچھی طرح پہچان لو
ہند کی واحد زباں اُردو ہے اس کو جان لو　　خوب اسے تحقیق کر لو خوب اس کو چھان لو

ہو نہیں سکتی تمہاری آرزو پوری کبھی
تم مٹا دو بھی تو اُردو مٹ نہیں سکتی کبھی

مرحبا اے میری اُردوئے معلّیٰ مرحبا　　جن کی آنکھیں بند ہیں خوبی تری دیکھیں گے کیا
کس مپرسی کے خیالوں میں نہ ہو تو مبتلا　　تیرے سر پر ہے یقیناً سایۂ فضلِ خدا

ایک دن واحد زبانِ ہند تو ہونے کو ہے
آج اگر ناکام ہے کل سرخرو ہونے کو ہے

کاروبارِ زندگی میں ہر طرف تیرا ہے نام　　تیرے ہاتھوں ہے گھریلو زندگی کا انصرام
دوست تو پھر دوست ہیں دشمن کو بھی آئی ہے کام　　انتہا یہ ہے کہ تجھ کو بولتے ہیں خاص و عام

تو حقیقت میں ہمارے جیتے جی کے ساتھ ہے
مختصر یہ ہے ہماری زندگی کے ساتھ ہے

قدیم دکھنی شاعری کے موضوعات

(از جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدر آباد دکن)

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اُردو شاعری کے موضوعات پر حرف گیری کی جائے اور اُس کی تہی مائگی پر حقارت کی نظر ڈالی جائے، یا اس کو صرف عشقیہ شاعری کے باعث قابل اعتراض قرار دیا جائے، لیکن اب بھی ایک بڑے گروہ کی رائے یہ ہے کہ جدید موضوعات پر اُردو شاعری میں جو فکر کی جانے لگی وہ صرف مغربی خیالات کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

یہ خیال اس شاعری کے متعلق دُرست ہوسکتا ہے جو میر کے زمانہ میں شروع اور حالی کا دَور آنے سے قبل ختم ہوئی۔ مگر یہ تصور کرلینا کہ اُردو شاعری کی ابتداہی سے اِس میں سوا حُسن وعشق کی داستانوں۔ گل وبلبل کے افسانوں۔ شاہد وساقی کے تذکروں۔ ہجر ووصال کے قصوں۔ معشوق کی بے وفائی۔ رقیبِ روسیاہ کے گلہ شکووں اور جھوٹی مبالغہ آمیز مدح وستایش کے سوا کچھ نہیں تھا تو یہ دعویٰ حق بجانب نہیں ہوسکتا۔ قدیم اُردو یا دکھنی زبان کی شاعری کے جوشہ کار اب گوشۂ گمنامی سے باہر آرہے ہیں ان سے اب اس مفروضہ کی قطعی تردید اور اس خیال کا پورا ابطلان ہوتا ہے۔

اس کو ثابت کرنے کے لئے آج سے تین چار سو سال پہلے کی اُردو شاعری کے موضوعات کا ایک مجمل تذکرہ مناسب متصور ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اُردو شاعری کو اپنے موضوعات کے لحاظ سے کسی دُوسری زبان سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اُردو شاعری کی ابتداء

برسبیلِ تذکرہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ گو چند دکھنی نوجوانوں کی ہمت وسعی سے دکھنی ادب کا ایک بہت قابل قدر حصہ اب عام دست رس میں آگیا ہے۔ بریں ہمہ یہ امر اب بھی افسوسناک ہے کہ ہنوز اُردو زبان کی قدیم تاریخ پوری طرح روشن نہیں ہوئی اس لئے اب تک تیقن کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو شاعری کی ابتداء درحقیقت کب سے ہوئی۔ اور پہلا شاعر کون تھا۔ اس وقت تک زبان وادب کے جو نمونے دستیاب

ہوئے ہیں۔ ان سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں اُردو شاعری کی نہ صرف ابتداء ہو چکی تھی بلکہ اس میں اوبیاتی خصوصیات بھی پیدا ہو چکے تھے۔ تصنیف و تالیف عام طور سے رائج ہو چکی تھی۔ موجودہ معلومات کے لحاظ سے بہمنی عہد کے نظامی شاعر کی مثنوی کو جو ۸۶۳ھ ہجری میں مرتب ہوئی ہے۔ اور خواجہ بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کی مثنویوں کو اُردو شاعری کے ابتدائی نمونے قرار دینا ناگزیر ہے۔

اُردو شاعری کے اقسام

اس بات میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی اُردو شعراء نے اپنی فکر کی جولانی کے لئے جو میدان منتخب کیا اسی میں اس سے پہلے فارسی شعراء نے اپنی جودت و ذہانت کے جوہر دکھائے تھے۔ لامحالہ یہ امر ناگزیر تھا کہ اُردو شاعری اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر اس سے پہلے فارسی شاعری چل چکی تھی اور قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ رُباعی۔ قطعات وغیرہ کا وہی قالب تیار رہا جو اس سے قبل ایران میں بن چکا تھا۔ چنانچہ اُردو شاعری کے ابتداہی سے یہ تمام نظم نگاری کے اقسام اُردو نظم نگاری میں بھی پائے جاتے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعراء اُردو نے اولاً مثنوی میں اپنے قلم کا زور دکھایا، اس کے بعد قصیدہ اور غزل وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔ بہرحال یہ بحث خود علٰحدہ صراحت طلب ہے۔

اُردو شاعری کے موضوعات

اب اصل موضوع اُردو شاعری کے موضوعات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے، قدیم اُردو شاعری کا سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موضوع متعدد تھے۔ فکر کا میدان بہت وسیع تھا۔ تصوّف، فلسفہ، اخلاق، تاریخ، واقعہ نگاری، سوانح، نیچرل امور کی ترجمانی سب اس دائرہ میں شامل تھے۔ اُردو شاعری آج سے چار سو سال پہلے بھی اپنے موضوعات کے لحاظ سے کسی اور زبان کی شاعری سے کسی طرح شرمندہ نہیں تھی، اس کے متعلق اس قدر کثیر ذخیرہ موجود ہے کہ خود ایک مستقل کتاب تصنیف ہو سکتی ہے۔

تصوّف

یہ سب کو معلوم ہے کہ فارسی شاعری میں تصوّف کا خاص درجہ ہے، فارسی کے نامور اور جلیل القدر شعرا مثلاً ابوسعید ابوالخیر، مولانا رومی عطار، نظامی، اور حافظ وغیرہ کا کلام سراپا تصوّف ہی تصوّف ہے یا دنیا سے دل برداشتگی کی تحریص ہے۔ اس زمانہ میں عام طور سے اسلامی دنیا میں حملۂ تاتار کے نتیجہ کے طور پر خیالات میں جمود اور ہمتوں میں پستی پیدا ہو گئی تھی ان افرات نے ملک بہ ملک گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ ایران و مشرق وسطیٰ سے یہ خیالات دکن،

میں بھی آئے۔ اور دکھنی شاعروں کی نظم نگاری میں ان کا اثر صاف طور سے نمایاں ہونے لگا۔ خیالات خواہ کچھ ہی باہر سے دکن آئے ہوں لیکن تاریخ اسلام کے ہر دور کی خصوصیت کے طور پر اسلام کی سادہ تعلیمات اور عوام تک اس کے دل نشین اور سحر انگیز پیام کو پہونچانے کا کام بوریہ نشین مشائخ طریقت اور صاحبان حال درویشوں نے پورا کیا ہے۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ عوام کی زبان ہی کو وہ اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بناتے۔

ان وجوہ سے کئی دکھنی شعرا نے تصوف و سلوک کو اپنی نظم نگاری کا موضوع بنایا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز۔ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، شاہ برہان الدین اعلیٰ، قادر وغیرہ وہ پہلی ہستیاں ہیں جنھوں نے اس میدان میں کام کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اور دکھنی زبان میں معرفت اور حقائق الٰہیہ کے نکات بیان کئے، ان کے بعد آنے والوں نے پہلی بنیاد پر پوری عمارت کھڑی کر دی۔ بحری، وجدی، امین وغیرہ کی مثنویوں میں تصوف و سلوک کا گویا پورا فن بیان ہو گیا ہے۔ اور اس کو خود تصوف کے ادبیات کا ایک قیمتی حصہ قرار دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ قدیم شعراء کے غزلوں کے دواوین میں بھی تصوف کا رنگ صاف صاف نظر آتا ہے۔ سلطان محمد قلی کی اکثر غزلوں میں بادۂ حافظ کی ہی دو آتشہ چھلکتی ہے۔ ولی اور سراج، باقر آگاہ شاہ ندیم اللہ وغیرہ کے دواوین میں بھی یہ روح برابر کارفرما ہے۔

رزمیہ شاعری

شہ نامہ کے نقش قدم پر ما بعد کی فارسی رزمیہ مثنویاں۔ خاور نامہ، سکندر نامہ وغیرہ مرتب ہوئیں۔ خاور نامہ کے مصنف ابن حسام کو فردوسی ثانی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے شہ نامہ کے جواب میں خاور نامہ مرتب کیا تھا۔

یہ مثنویاں دکھنی شاعروں کے لئے ایک اچھا ماڈل ثابت ہوئیں۔ اور انھوں نے اس موضوع پر بھی اپنی ذہانت کی خوب داد دی ہے۔ دکھنی شاعری میں رزمیہ مثنوی کی ابتدا، خاور نامہ دکھنی سے ہوئی ہے۔ بیجاپور میں رستمی نے ۱۰۵۹ھ میں خدیجہ سلطان شہربانو کے حکم سے خاور نامہ ابن حسام کا ترجمہ دکھنی نظم میں کیا ہے۔ چوبیس ہزار شعر کی مثنوی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ مثنوی چھپ کر عام دسترس میں آجائے تو کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر رستمی کو بھی کم از کم ابن حسام کا سا اعزاز نصیب ہو جائے۔

رستمی کے بعد نصرتی نے علی عادل شاہ کی جنگی مہمات اور شوقی نے تالی کوٹہ کے معرکہ

کی روئداد رزمیہ مثنویوں میں لکھی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ فوجوں کی روانگی، ان کی ترتیب، واقعاتِ جنگ، صف آرائی کا حال، حملے کے طریقے، لڑائی کا سماں، بہادروں کا مقابلہ، سورماؤں کی جنگ، باجوں کی آواز، توپوں کی گونج، ہتیاروں کی جھنکار، شب خونی حملہ کی صراحت، دشمن کی فراری، لوٹ مار، قلعہ پر چڑھائی، اس کا محاصرہ، سپاہیوں کی گرفتاری، وغیرہ امور کی کتھا اس انداز میں لکھی ہے کہ کیا بیان ہو۔

غرضکہ رستمی کا خاور نامہ، نصرتی کا علی نامہ، شوقی کا فتح نامہ، نظام شاہ غضنفر کا جنگ نامہ عالم علی خاں وغیرہ رزمیہ مثنویوں کے شہ کار ہیں۔ ان کے علاوہ ظفر نامہ لطیف، جنگ نامہ سیوک وغیرہ بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ غواصی اور ابنِ نشاطی وغیرہ نے بھی اپنی عشقیہ مثنویوں میں بر سبیلِ تذکرہ رزمیہ حالات نظم کئے ہیں۔

اس موقع پر سلطان علی عادل شاہ شاہی کی مثنوی "خیبر نامہ" کا تذکرہ بھی ضروری ہے سلطان نے جنگ خیبر کے صحیح حالات نہایت عمدگی سے نظمائے ہیں۔ اس کی یہ مثنوی کلیات میں شامل ہے۔ حضرت علی اور مرحب کی لڑائی کا حال دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مرحب کا لڑائی کے لئے تیار ہونا، ہتیاروں سے آراستہ ہونا، جنگ کے لئے نکلنا، دو زبردست بہادروں کے مقابلہ کرنے کا حال دلکش انداز میں لکھا ہے۔

تاریخی موضوع تاریخ اور سوانح کے لئے نظم سے زیادہ نثر موزوں ثابت ہوئی ہے لیکن موزونی طبعی اس کو بھی نظم میں بیان کر کے لذت گیر ہوتی ہے۔ ہماری دکھنی شاعری میں اس قسم کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

نصرتی کا علی نامہ اور تاریخ اسکندری۔ مومن کا اسرارِ عشق اور رشیدا کی اعجاز احمد، باقر آگاہ کی ہشت بہشت وغیرہ اس عنوان کی مثنویاں ہیں۔

نصرتی نے علی نامہ میں تاریخ اور ادب کو جس طرح آمیز کیا ہے وہ اس کی سحر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ تاریخ اسکندری میں سکندر عادل شاہ کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ مومن نے اسرار عشق میں سید محمد جونپوری کے حالات نظم کئے ہیں اور رشیدا نے سیرت رسول کریم کو نظم کیا ہے انھوں نے سوانح نگاری کا جو انداز پیش کیا ہے اس کا معیار کافی بلند ہے۔ اسی طرح باقر آگاہ نے ہشت بہشت میں غزوات سے قطع نظر سیرت پاک کے دوسرے پہلو بھی اس اسلوب میں بیان کئے ہیں کہ انکی کوشش کو

نہ صرف کامیاب بلکہ اردو زبان کا نہ مٹنے والا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نیچرل شاعری

نیچرل شاعری کے موضوع پر شمالی ہند کے قدیم اساتذہ نے بہت کم توجہ کی ہے جو حقیقت میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ قدما کے دور میں نہ تو میر اور مرزا سودا نے اور نہ مصحفی اور انشاء نے توجہ کی۔ اور نہ ناسخ اور آتش کو اس کا کوئی ذوق تھا۔ ذوق، مومن، داغ، امیر کی شاعری بھی صرف غزل سرائی کا دوسرا نام ہے۔ اس طور پر عام طور سے یہ خیال قائم ہو گیا کہ جدید اردو شاعری میں نیچرل شاعری کی بنیاد خالص مغربی اثرات اور مغربی کلام کے مدنظر عالم وجود میں آئی ہے۔

یہ خیال اس حد تک بالکل درست ہے کہ شمالی ہند کی اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا سُر مغربی مضراب کا رہین منت ہے۔ لیکن یہ خیال دکھنی شاعری کی حد تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قدیم دکھنی شعرا صرف غزلوں کی پائمال زمین اور زلف و گیسو میں اُلجھ کر عشق و عاشقی کے فرسودہ خیالات ہی کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انھوں نے نیچرل شاعری کے میدان میں بھی جولانی کی ہے۔ ان کے کلام سے ایسے بیسیوں نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں جو بہتر سے بہتر انداز میں نیچر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم صرف سلطان محمد قلی کے کلیات کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں کئی ایسے عنوان ہیں جو نیچرل شاعری کے تحت بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں بارش اور موسم سرما پر کئی نظمیں ہیں۔ موسم بہار۔ نوروز۔ بسنت پر سلطان نے کئی نظموں میں اپنی بلند خیالی کی داد دی ہے۔ باغوں کی سرسبزی اور شادابی۔ تالابوں اور نہروں کے صاف شفاف پانی نے اس کے تخیل کو ایک سے زیادہ دفعہ اُبھارا ہے۔ میووں۔ ترکاریوں کی تر و تازگی نے اس سے شعر کہلوائے ہیں اس کے ساتھ ہی اُس نے غریبوں کی زندگی عوام کے معتقدات، کھیل تماشوں اور بازارات وغیرہ جیسے معاشرتی امور کو بھی شعر کہنے کا موضوع بنایا ہے۔

سلطان محمد قلی کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی اپنے کلام میں نیچر کے موضوع کے کئی عنوانوں پر شعر کہے ہیں۔ سلطان علی عادل شاہ نے علی داد محل، اس کے باغ اور حوض کی تعریف میں ایک زبردست قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں باغ کی سرسبزی اور شادابی اور انواع و اقسام کے پھولوں کی تر و تازگی، قسم قسم کے پھلوں کی فراوانی، حوضوں میں پانی کی روانی کی جو دلکش روداد لکھی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

نصرتی نے "کالی دھوپ" اور موسم سرما پر جو قصیدہ لکھا ہے وہ اپنے زور بیان کے لحاظ

سے خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی مثنوی گلشنِ عشق میں منظر نگاری کا جو حق ادا کیا ہے وہ تعریف کے لائق ہے۔

روزمرہ معاشرت

عصر حاضر میں روزمرہ معاشرت پر بھی شعراء کا اظہارِ خیال کرنا ایک متعارف امر ہے۔ اور یہ بھی جدید مغربی خیالات کا پرتو سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیچرل شاعری کی طرح روزمرہ معاشرت پر بھی قدیم دکھنی شاعری میں اچھی اچھی نظمیں مل سکتی ہیں۔

اگر ہم صرف سلطان محمد قلی کے ہی کلام کو لیں تو ہم کو روزمرہ معاشرت کے کئی عنوانوں پر نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ہر عنوان پر نئے انداز میں سلطان نے شعر نہیں کہے ہیں گہر افشانی کی ہے۔ مثلاً سالگرہ، عید میلاد النبیؐ، عید بعثت نبیؐ، مجلس شبِ معراج، عید مولودِ علی، عید غدیر، محفل شب برات، عید الفطر، عید الضحیٰ، شادی، بیاہ، رسوماتِ شادی، شاہی قصر اور ایوان وغیرہ۔

سلطان محمد قلی کے علاوہ ظل اللہ، علی عادل شاہ، نصرتی، ابنِ نشاطی، شوقی وغیرہ نے کامیابی سے روزمرہ پیش آنیوالے واقعات اور حالات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے شعراء نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں بھی شادی بیاہ، ضیافت وغیرہ کے عنوانوں پر اپنی نزاکتِ فکر، نزاکت خیال اور لطافت بیان کو پوری طرح نمایاں کیا ہے۔

اخلاقی شاعری

اخلاق اور موعظت کا میدان بھی فارسی شاعری میں ایک سیر حاصل موضوع ثابت ہوا ہے۔ گلستاں، بوستاں، حدیقہ سنائی وغیرہ جیسے شہ کار دکھنی شعراء کے لئے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوئے۔

دکھنی شعراء میں رازی کی مثنوی تحفہ ۱۰۴۵ھ تا حال معلوم شدہ اخلاقی مثنویوں کا پہلا نمونہ ہے۔ اسی زمانہ کی دوسری مثنوی پند نامہ شغلی ہے۔ ان مستقل مثنویوں کے علاوہ اخلاقی عنوانوں پر بیسیوں نظمیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً صبر و شکر۔ عذر دوست۔ احسانمندی۔ ایفاءِ عہد۔ نیکی و بدی۔ وفادار عورت، غور و فکر، حب وطن، حسن سلوک، وغیرہ ایسے عنوان ہیں جن پر ہمارے شعراء قطبی، مقیمی، غواصی، طبعی، نصرتی، ولی، وغیرہ نے کافی طور سے خیال آفرینی کی ہے۔

اس کے علاوہ دکھنی شعراء کے دواوین میں اخلاقی ابواب صبر و شکر، صداقت و راستی، توکل و قناعت، خوش خصلتی، خاکساری و پاکبازی، اطاعت و فرمانبرداری وغیرہ عنوانوں پر کافی سے زیادہ مواد مل سکتا ہے۔

مدحیہ شاعری دکھنی شاعری جہاں فقیروں اور صاحب حال درویشوں کے حجروں اور خانقاہوں میں پرورش پاتی رہی اور اس کی وجہ سے تصوف اور اخلاق ہماری شاعری کا ایک اہم موضوع بن گیا اور اسی طرح وہ پادشاہوں اور امیروں کے بلند و بالا قصروں، ذی شوکت وحشمت ایوانوں میں بھی پروان چڑھتی رہی۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ مدحیہ شاعری وجود میں نہ آتی۔ دکھنی پادشاہ نہ صرف بلند پایہ اور نازک خیال شاعر ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اپنی داد و دہش سے شعرا، اردو کی سرپرستی بھی فرمائی ہے۔ اس سے قطع نظر جہاں بادشاہت اپنے پورے لوازم کے ساتھ حکمرانی اور کامرانی کا ڈنکہ بجائے۔ وہاں بادشاہ کو خوش کرنے والوں یا سچی بات یہ کہ خوشامد کرنے والوں کا وجود بھی ضروری ہے۔ اس طرح اور جگہ کی مانند دکھنی شعرا، نے بھی قصیدہ گوئی میں پوری مہارت دکھائی ہے۔

سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، سلطان علی عادل شاہ، ظاہر ہے کہ اپنی تعریف آپ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے پیغمبر آخر الزماں علیہ السلام اور امام اعلیٰ مقام کی مدح ومنقبت میں اپنے تخیل کی پرواز دکھائی ہے۔ نصرتی نے بادشاہ کی تعریف کا حق ادا کیا ہے۔ یہ قصائد نہ صرف خوبی تمہید، حسن گریز، مدح حسن اور دعائے خیر پر ختم ہوتے ہیں بلکہ ان میں واقعہ نگاری کا بھی اچھا خاصہ حق ادا کیا گیا ہے۔ خصوصاً نصرتی کے قصیدے واقعہ نگاری کے عمدہ مرقع ہیں۔ نصرتی نے اپنے قصیدوں میں بادشاہ کی مدح ہی نہیں کی ہے بلکہ واقعات جنگ کو بھی حسن وخوبی اور عمدگی سے بیان کیا ہے اور بلاشبہ حقیقت نگاری کی ہے۔

قصیدوں میں تشبیہ کی ندرت، استعاروں کی جدت، خیالات کی بلندی، مضامین کا طمطراق الفاظ کی شوکت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو زندگی جاوید کی مستحق ہیں۔

افسوس ہے کہ دوسرے دکھنی شعرا کے قصیدے اب تک نہیں ملے ہیں، متداول تاریخوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ وجہی۔ غواصی۔ رستمی۔ شوقی وغیرہ سب نے بیسیوں قصیدے لکھے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اب سب ناپید ہیں۔ زمانہ مابعد میں جو قصیدے دکن میں لکھے گئے ہیں اُن کے متعلق ہم نے تفصیل سے ایک علحدہ مضمون میں روشنی ڈالی ہے جو مقالات ہاشمی میں شایع ہو چکا ہے۔

مرثیہ دکھنی مرثیوں کے سلسلہ میں ہمارے کئی مضمون مقالات ہاشمی میں شامل ہیں جن میں تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے یہاں صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ جس طرح شاعروں کے جذبات شکر گزاری نے قصیدہ کی صورت اختیار کی وہاں ان کے

جذبات حسرت و غم نے مرثیہ کی صورت اختیار کی۔ قدیم دکھنی شعراء میں نہ صرف مرثیہ گو شعراء موجود ہیں جنھوں نے سوا مرثیہ کے کسی اور موضوع پر طبع آزمائی نہیں کی بلکہ دوسرے شعرا نے بھی اس عنوان پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔

اوّل الذکر گروہ میں مرزا، ہاشم علی، امامی، کاظم وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔ اور آخر الذکر میں سلطان قلی، وجہی، غواصی، سلطان عبداللہ، نصرتی، لطیف وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں ان کے کلام میں بہتر سے بہتر مرثیے ملتے ہیں ان شاعروں نے مختلف عنوانوں پر مرثیے لکھے ہیں مثلاً اصغر کا ماتم، قاسم کی شادی، شہربانو کا الم، بے کس زینب، مسافر قیدی، ظلم دست کربلا، اصغر کی ماں، الوداع وغیرہ ہاشم علی، غلامی، مرزا، ذوقی، رضی ندیم، شرف، روحی، نظر وغیرہ کے مرثیے اپنے سوز و گداز رنج والم کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

ان مرثیوں کے علاوہ دکھنی شاعروں نے شہادت کے موضوع پر مستقل شہادت نامے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ولی ویلوری کا روضۃ الشہدا۔ عبداللہ کمینہ کی در مجالس۔ عطا کی دہ مجلس وغیرہ وہ مجلس کے نام سے ترکی مثنویاں لکھی گئی ہیں جن میں واقعات کربلا کو نظم کیا گیا ہے۔

عشقیہ شاعری بالآخر مجھے عشقیہ شاعری پر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ جس وقت دکن میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس وقت فارسی شعرا کے تین طبقے گزر چکے تھے۔ رودکی، اسدطوسی، فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی، اور حافظ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی مثنویاں اور غزلیں ایران سے نکل کر ہندوستان اور دکن تک پہونچ گئی تھیں اور خود ہندوستان میں خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم کی زمزمہ خوانی فضا میں گونج رہی تھی، ان لوگوں کے کلام نے جو حسن و عشق کی روداد سے لبریز اور محبت والفت کی داستان سے مملو تھا۔ شاعران دکن کے لئے ایک رہبر اور رہنما کا کام دیا۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اپنی اچھی مثنویاں لکھیں اور پھر فارسی مثنویوں کو دکھنی قالب میں بدل کر اس عمدگی سے پیش کیا کہ وہ گویا ان کی اپنی تصنیف ہو گئی۔

اچھی مثنویوں میں بہمنی عہد کے نظامی کی مثنوی کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ میں وجہی کی قطب مشتری، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، جنیدی کی ماہ پیکر، خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی مثنویوں میں احمد کی لیلیٰ مجنوں، غواصی کی سیف الملوک، اور طوطی نامہ، ابن نشاطی کی پھول بن، نصرتی کی گلشن عشق، ہاشمی کی یوسف زلیخا، ملک خوشنود کی ہشت بہشت

طبعی کی بہرام گل اندام، غلام علی کی پدماوت، ضعیفی کا قصہ تمیم انصاری وغیرہ نظر انداز نہیں کیجاسکتی۔

ان مثنویوں کے علاوہ جو حسن و عشق کی پرکیف و سرور داستانیں ہیں۔ دکھنی شعرائے غزلوں کا میدان بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا۔ اگرچہ موجودہ ذخیرہ کے لحاظ سے ولی کے پہلے غزلوں کا سرمایہ مثنویوں کے مقابل نہایت قلیل ہے لیکن جو کچھ ذخیرہ ملا ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دکھنی شاعروں نے اظہارِ عشق میں بھی کمی نہیں کی۔ اردو کے شعرانے جو سرمایہ غزل گوئی کا عام طور سے فراہم کیا ہے اس کے مدنظر یہ خیال درست ہے کہ شعراءِ اردو کا معشوق فرضی ہوتا ہے اور پھر اس کی مبالغہ آمیز طور سے جو تعریف کیجاتی ہے وہ حقیقت سے دور اور اصلیت کے منافی ہوتی ہے۔

لیکن دکھنی شعرائے جو غزل سرائی کی ہے اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اصلیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ سلاطین کے محل سرائیں اور شاہی قصر و ایوان میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کمی نہیں تھی۔ خصوصاً سلطان محمد قلی، اور علی عادل شاہ کی رنگین مزاجی اور عاشقانہ طبیعت کے باعث نہ صرف شاہی کوشک و ایوان بلکہ خود شہر گولکنڈہ اور بیجاپور حسن و رعنائی کے مرکز بن گئے تھے اس لئے شعراء کو اپنی غزلوں میں حقیقت نگاری کیلئے فرضی معشوق پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

خاتمہ

المختصر دکھنی شعرانے مختلف نہج پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوع ہمہ گیر سے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کھینچی ہے۔ اگر عشق کی روئداد میں حسن و رعنائی کا اظہار کیا ہے تو وہیں میدان جنگ کی دار و گیر کا صحیح نقشہ اور مرقع بھی پیش کر دیا ہے۔ اگر ان کے کلام میں تصوف اور عرفان جلوہ گر ہے تو وہیں انھوں نے فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ گھریلو زندگی کی روزمرہ واقعات کی حکایت بیان کی ہے تو مناظرِ قدرت کی دل نواز سحر طرازیاں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں۔ تاریخ و سوانح پر بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے پھر اخلاق، و پند میں بھی اپنے کلام کو یادگار بنا ڈالا ہے۔

دکھنی شعرائے اپنی دو تین سو سال کی محنت و کاوش کا جو عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ اس کی حفاظت اور ان سے کام لینا اب آپ کا کام ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے ایسے جواہر پارے موجود ہیں جن کا آجکل کی شاعری میں ملنا دشوار ہے۔ ان کے خیالات کو لینا اور موجودہ زبان میں ان کو تبدیل کرکے اہل ملک کے سامنے پیش کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نئی دنیا اور پرانی دنیا کو ملاکر ایک ایسی دنیا پیدا کر سکتے ہیں جس کی اس وقت سب کو ضرورت ہے۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی

ہم لقب حکمرانانِ اسلام

از مولانا محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ایم۔ اے (علیگ)

تمہید بادشاہوں کا لقب اختیار کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ اس بات کو بتاتی ہے کہ ان کے بادشاہوں نے نہ صرف اپنے لئے القاب منتخب کئے بلکہ اس کو اپنے گھرانے کے لئے مخصوص کر گئے۔ مثلاً ایران میں کسریٰ۔ مصر میں فرعون۔ روم میں قیصر حبش میں نجاشی۔ روس میں زار۔ چین میں فغفور۔ جاپان میں میکاڈو وہی حکمران رہے۔ اور جہاں جہاں وہی گھرانا اب تک حکمراں ہے یہی لقب چل رہا ہے۔

یہ القاب کیوں؟ اور کب سے تصنیف ہوئے؟ اور ان کے معنی کیا ہیں؟ یہ ایک طویل بحث ہے جس پر کسی آیندہ موقع پر روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن لفظ قیصر کے لئے ایک تاریخی لطیفہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ بقول ابوالفداء:۔ [۵۱]

"اگسٹس شہنشاہ روم (اٹلی) کو قیصر لقب دیا گیا۔ اس کے معنی "پھٹے ہوئے" کے ہیں۔

اس لئے کہ یہ خود نہیں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ مرنے کے بعد اس کی ماں کا پیٹ چاک کر کے اس کو نکالا گیا۔

اسی لئے اس کا لقب قیصر ہوا۔ جو بعد میں تمام شاہانِ روم کا لقب ہوا۔"

اسی طرح سے جاپانی لفظ میکاڈو کے لفظی معنی "باب عالی" کے ہیں۔ جس میں اظہار بلندی مقصود ہے۔ بہرحال یہ وہ دستور ہے جو ماقبل التاریخ سے چلا آرہا ہے۔

اسلامی سلطنتوں کے وجود میں آنے کے بعد دمشقی بنو اُمیہ اور متاخرین میں خلفاء آلِ عثمان نے سوائے اپنے خاندانی اور قبائلی ناموں کے اور کوئی شاہانہ لقب اختیار نہیں کیا۔ البتہ بنو عباس نے لقب اختیار کرنے شروع کئے۔ ان میں سے بھی ابتدائی خلفاء مثل السفاح وغیرہ نے صرف خلیفۃ المسلمین یا امیرالمومنین کے لقب پر اکتفا کیا جو ان کا اپنا اختیار کیا ہوا نہیں تھا بلکہ جمہور مسلمان کا

---

[۵۱] ابوالفداء جلد اوّل۔ مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۶۱۔

دیا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے نام کے علاوہ لقب اختیار کرنے کا دستور ہوا۔ چنانچہ ہر خلیفہ کا لقب کچھ نہ کچھ رہا۔ البتہ ازمنۂ سابقہ کے مقابلہ میں ایک فرق یہ رہا کہ ہر خلیفہ کا لقب ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ دوسرے ہر لقب میں نسبت یا تو خدا سے رہتی تھی یا دین سے۔ اس میں اغلباً خدا کی خوشنودی اور برکت مقصود ہوگی۔ تاکہ خدمتِ خلافت کے دینی اہمیت میں اور اضافہ ہو جائے۔ نسبت کی اس اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اگر یہ سوال کیا جائے کہ خلافت کے منصب کو اصلی صورت و شکل میں کس نے پیش کیا تو یقیناً عمر بن عبد العزیز خلیفۂ دمشق کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ فی الحقیقت منصبِ خلافت ملوکیت اور شہنشاہیت سے بالاتر چیز تھی۔ چنانچہ حضرت سلمانؓ سے روایت[۵] منقول ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ دوم نے نے سوال کیا "آیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ" حضرت سلمانؓ نے جواب دیا کہ "اگر آپ مسلمانوں سے مالگزاری وصول کرکے غیر حق پر صرف کر دیتے ہیں تو آپ بادشاہ ہیں، ورنہ خلیفہ" اسی زمرہ کی دوسری روایت حضرت سفیانؓ بن ابو العوجا سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "واللہ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ۔ پس اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ بہت سخت بات ہے" جواب دیا گیا کہ اے امیر المومنین دونوں میں فرق ہے۔ فرمایا "وہ کیا" عرض کیا گیا "خلیفہ حق کے خلاف نہ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے اور آپ بحمد اللہ ایسے ہی ہیں۔ بادشاہ لوگوں کو مجبور کرتا رہتا ہے اور ایک سے لیکر دوسرے کو دے دیتا ہے"۔

بہر حال خلفاءِ عباسیہ نے بھی مامون کے عہد تک نہ خود کوئی لقب اختیار کیا اور نہ دوسرے امیروں یا وزیروں کو کوئی خطاب یا لقب دیا۔ ۲۱۸ھ میں مامون کے مرنے پر جب اس کا بھائی ابو اسحٰق محمد بن ہارون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے معتصم باللہ کا لقب اپنے لئے اختیار کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ایسا چلا کہ نہ صرف خلفاء بنو عباس نے اپنے لئے نئے نئے بامعنی القاب اختیار کئے بلکہ بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے دوسرے ملکوں کے اسلامی بادشاہوں اور امراء کو بھی خطابات سے مالا مال کیا جو ان بادشاہوں اور امیروں نے نسلاً بعد نسل بطور افتخار بحال رکھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بنو عباس کی تقلید میں اندلس کے بنو امیہ، مصر کے بنو فاطمہ اور مغرب اقصیٰ کے بربری قبائل کے خود مختار امراء و سلاطین نے امیر المومنین

---

۵ حسن المحاضرہ - جلد دوم صفحہ ۸۲ -

یا خلیفۃ المسلمین کا اعلان کرنے کے بعد قریب قریب وہی القاب یا خطابات لینے اور اپنی نسلوں کے لئے منتخب کئے جو بنو عباس نے اپنے لئے منتخب کئے تھے۔ البتہ آل عثمان نے باوجود بنو عباس کی جانشینی کے ان القاب کو اختیار نہیں کیا۔

متاخرین بنو عباس کے زمانہ میں بہت سے باجگزار امراء ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر خود مختار ہو گئے تھے اس لئے انھوں نے بالخصوص بنو عباسی لقب اختیار کئے جو اغلباً ادعاء جانشینی کی خاطر ہوں گے یا یہ خیال ہوگا کہ ان خطابات یا القاب کے اختیار کرنے سے انکا دائرۂ اثر بھی اتنا ہی وسیع ہو جائے گا جیسا کہ بنو عباس کا تھا۔ فی الحقیقت یہ القاب وسعتِ دائرہ یا اثر کے سبب سے نہیں تھے بلکہ یہ دائرہ یا اثر ان القاب کا سبب تھا۔ سبب کی ناسمجھی نے القاب کی بے تکی تقلید ان سے کرائی کیونکہ ہر امیر کو خلیفہ بننے کا جنون تھا۔ بہر حال چونکہ ایک ہی قسم کے بنو عباسی لقب کے سلاطین مختلف خطوں اور زمانوں میں بہت سے ہوئے ہیں۔ اس لئے مختلف ملکوں کے خلفاء کی فہرست کے علاوہ ہم لقب حکمرانوں کی ایک فہرست مع نام ملک و زمانۂ حکومت ذیل میں دیجاتی ہے تاکہ متعلمین تاریخ کو بعض اوقات جو ہم لقبی سے غلط فہمی ہوتی ہے وہ نہ ہو سکے۔ اور وہ آسانی سے معلوم کر سکیں کہ یہ کس گھرانے اور کس ملک کا بادشاہ یا خلیفہ تھا۔

بنو عباس اور ان کے بعد آلِ عثمان میں جانشینی کا طریق وہ نہیں تھا جو اور سلاطین یا امراء میں تھا۔ بلکہ خاندان کا بڑا وارث تخت و تاج ہوتا تھا۔ اور تخت بڑے بیٹے ہی کے لئے مخصوص نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا کہ بنو عباس کے گھرانے میں اگر ایک خلیفہ کے ۴ لڑکے تھے تو ان چاروں کو یکے بعد دیگرے حکمرانی کا موقع ملا۔ دونوں بھائی السفاح اور المنصور یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ اسی طرح سے ہادی و ہارون الرشید۔ ابناء مہدی۔ امین۔ مامون اور معتصم ابناء ہارون الرشید۔ واثق و متوکل ابناء معتصم۔ مکتفی۔ مقتدر۔ قاہر۔ ابناء معتضد۔ راضی۔ متقی۔ مطیع ابناء مقتدر۔ مسترشد و مقتفی۔ ابناء مستظہر۔ یکے بعد دیگرے خلفا ہوئے۔ بنو امیہ میں اس قسم کی ایک مثال صرف عبد الملک بن مروان کی اولاد میں ملتی ہے۔ جس کے چاروں لڑکے ولید۔ سلیمان۔ یزید۔ ہشام یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ آل عثمان میں بھی قریب قریب یہی طریق رائج رہا۔

دولتِ عباسیہ کی تباہی کے بعد جو ہلاکو کے ہلاکت آمیز افعال اور ابن علقمی کی غداری کا صریحی نتیجہ تھی، بچے کھچے عباسی وہاں سے روپوش ہو کر مختلف اسلامی خطوں میں پناہ گزیں ہوئے

اور جس طرح سے اموی گھرانے کے پریشاں روزگار اور بے یار و مددگار شہزادے عباسیوں کے چنگل سے بچ کر دور دراز ممالک میں پہونچے جو آخرکار اندلس میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اسی طرح سے بنو عباس کے شہزادے بھی مصر میں پہونچے اور انھوں نے ایک حد تک بنو عباس کی خلافت کا احیا کیا۔ مگر دونوں صورتوں میں فرق یہ رہا کہ بنو امیہ کے بچے ہوئے افراد نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے حکومت یا خلافت کا احیا کیا۔ اور بنو عباس کے بچے ہوئے افراد خلافت کی احیا میں، دوسرے طاقتور حکمرانوں کے محتاج اور زیر بار منت رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو مصر میں بنو عباس کی خلافت دوبارہ زندہ ضرور ہوئی۔ مگر اس کا اقتدار بیسویں صدی عیسوی کے یوپ سے زیادہ مصر اور بیرونِ مصر میں نہ ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ والئ مصر کے ادنیٰ اشارہ پر خلافت اور خلیفہ کی زندگی کا انحصار تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک خلیفہ کو تین۳ بار معزول کیا گیا، اور تین۳ بار پھر اس کو خلیفہ بنایا گیا۔ بخلاف اندلس کے کہ وہاں خلافت اور سلطنت دو جدا چیزیں نہیں تھیں۔

۶۵۶ھ کا بغداد تباہی کا ایسا منظر تھا کہ شاید اس کی مثال موجودہ زمانہ کی ظالمانہ بمباری بھی نہ پیش کر سکے۔ کیونکہ اس قدر قتل و خون کسی فاتح نے بالخصوص کسی مقبوضہ شہر پر کبھی نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ ہلاکو نے کیا۔ اسی زمانہ میں بنو عباس کے باقیات الصالحات جس میں مستعصم مرحوم کا چچا ابوالقاسم بن احمد بن ظاہر بامر اللہ بھی تھا۔ مصر میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ سلطان ملک الظاہر والئ مصر نے جو مستعصم باللہ شہید کی طرف سے حکمراں تھا۔ اور جس کو مستعصم نے "قسیم امیر المومنین" کا لقب دیا تھا۔ ان سب کی آؤ بھگت کی اور اس کے ساتھ ہی ابوالقاسم کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے مستنصر باللہ ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ اور فوجی امداد دے کر تاتاریوں کے مقابلے کے لئے پوری پوری تیاری کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ سلطان نے دولتِ عباسیہ کے احیاء کے خاطر مدد دی ہو۔ کیونکہ وہ اسی دولت کا ساختہ و پرداختہ تھا۔ اور اسی لئے بیعت بھی کی ہو تاکہ اس نواح کے جملہ مسلم حکمراں اس طرف رجوع کر کے نہ صرف تاتاری یلغار کی روک تھام کریں۔ بلکہ اسلامی مرکز (جو صدیوں سے بغداد تھا) کی تباہی کی تلافی بھی کریں۔ مگر یہ امداد کارآمد نہ ثابت ہوئی۔ مستنصر اس معرکہ میں کام آگیا۔ اور ہزیمت خوردہ فوجیں مصر واپس آگئیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ خلیفہ یا خلافت بلا دولت کا مفہوم سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ محض ایک نام نہاد پیشوا ہو اور حکومت کوئی اور کرے۔ بالفاظ دیگر خلیفہ گر کی ماتحتی میں محکوم رہ کر

زندگی بسر کرے۔ غرضیکہ اسی اصول حکمرانی کے تحت مصر کے حکمرانوں نے اپنے بنائے ہوئے خلفاءؑ کو اپنا دست نگر رکھا۔ اور حسب مرضی وقتاً فوقتاً خلیفہ بناتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی خلیفہ کو کئی بار معزول کیا گیا اور کئی بار پھر خلیفہ بنایا گیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے مصری حکمرانوں کے اختیار عزل و نصب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قطع نظر اس کے کہ انھوں نے کسی ایک کو خلیفہ بنا کر چند روز یا چند مہینوں کے بعد اس کو معزول کیا اور اس کے بعد دوسرا بنا لیا۔ ایسا بھی ہوا کہ عزل و نصب میں کافی وقفہ بھی رہا کیونکہ بنانے کے لئے سوچنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور جب حسب مرضی انتخاب کر لیا تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور گویا خلیفہ بنا دیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ ایک ہی عہد میں کسی ایک کو خلیفہ بنایا گیا اور اس کے چند روز بعد اس کو معزول کر کے دوسرا بنا لیا گیا تھوڑے دنوں کے بعد اپنے کئے پر وہ حکمراں گویا نادم ہوا اور اس نے اس کو معزول کر کے پھر سابقہ معزول شدہ کو خلیفہ بنا دیا۔ خلیفہ کیا تھا فی الحقیقت ایک کھلونا تھا جس سے امرائے وقت کھیلا کرتے تھے اور اُس کو خلیفہ کہتے تھے۔ چنانچہ اس طرح معتصم باللہ اور متوکل علی اللہ دو بار معزول کئے گئے اور دو بار خلیفہ بنائے گئے۔ بغداد کے با اختیار خلفاء میں صرف ایک اس قسم کی مثال ملتی ہے کہ مقتدر باللہ کو پہلے خلافت ملی لیکن چونکہ بعض دیانت دار امراء و وزراء محض اس کی کمسنی کی وجہ سے اس انتخاب کے مخالف تھے لہٰذا پھر ایک انقلاب ہوا اور بہترین اور فاضل تر خلیفہ عبداللہ بن المعتز کا انتخاب عمل میں آیا۔ مگر خود غرض عنصر جیسا کہ سلطنتوں میں دستور رہا اور ہے۔ ایسا غالب تھا کہ آخر کار اس کی کوششیں اور سازشیں بار آور ہوئیں۔ اور عبداللہ بن المعتز نہ صرف معزول ہوا بلکہ قتل بھی کر دیا گیا تاکہ انقلاب در انقلاب کا تخیل ہی باقی نہ رہے۔ اور کمسن مقتدر کو پھر تخت خلافت پر بٹھا دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعمال با اثر امراء و وزراء ہی کے تھے۔ لیکن یہ اقتدار انتخاب ہی تک رہتا تھا اس کے بعد خلیفہ خود مقتدر ہوتا تھا۔ لیکن مصر کے خلافت کی نوعیت بالکل بدلی ہوئی تھی، یہاں کا خلیفہ ہر وقت مصر کے حکمراں کا محتاج رہتا تھا۔ جو حکمراں کی اطاعت بیعت لے کر خریدتا نہیں تھا بلکہ اپنی اطاعت احسانمندی کے صلے میں اس کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے مقریزی کے حوالے سے متوکل علی اللہ کی خلافت کے متعلق لکھا ہے :-[۵۳]

سُلطان نے اس کے لئے قلعہ میں ایک مکان دیا تاکہ اس میں رہے اور جب چاہے وہ اپنے

---

[۵۳] حسن المحاضرہ - جلد دوم - مطبوعہ مصر - صفحہ ۹۰ -

شہر کے مکان میں سوار ہو کر آجایا کرے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی ننوے اولادیں ہوئیں جن میں سے بعض اس کے سامنے ہی مر گئیں۔ ان میں سے پانچ لڑکے وقتاً فوقتاً خلیفہ بھی ہوئے۔ ایسی کہیں اور مثال نہیں ملتی ہے۔ اکثر اس کے بھائی بھی خلیفہ ہوئے جن میں سے چار کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اتفاقاً متوکل دو بار معزول ہونے کے بعد خلیفہ ہوا۔ ایسا سوائے مقتدر کے، اور کسی کے لئے نہیں ہوا۔"

بعینہٖ یہی صورت چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں اندلس میں ہو گئی تھی۔ اور وہاں کے امراء و وزراء ہر روز گویا خلافت سے کھیلا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سرزمین سے خلافت کا ایسا جنازہ اٹھا کہ نہ خلافت رہی اور نہ خلیفہ گر ہی رہے۔ اسی خلافت گردی یا خلیفہ گری ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب اہلِ قرطبہ نے جن کو اس کھیل کی عادت ہو چکی تھی ۴۲۸ھ میں تختِ خلافت عبدالرحمٰن ناصر کے گھرانے کے ایک شخص امیہ نامی کو پیش کیا تو اُس نے زندگی کو موت پر جس کا نام ان لوگوں نے خلافت رکھ دیا تھا۔ ترجیح دی اور یہ جواب دے کر[۵۴]

"آج تم میرے ہاتھ پر بیعت کر دگے اور کل تم مجھ کو مار ڈالو گے"

ایسا غائب ہوا کہ پھر پتہ نہ چلا۔

مصر کے آخری عباسی خلفاء میں صرف مستعین باللہ وہ خوش نصیب خلیفہ ہوا جس کو خلافت کے ساتھ حکومت بھی ملی اور جس نے آٹھ سال کی حکمرانی کے بعد بعض سیاسی مصالح کی بنا پر کنارہ کشی اختیار کر کے باقی ماندہ عمر اسکندریہ میں گزاری۔

منسلکہ جدولوں کی چھ ۶ قسمیں ہیں:-

پہلی جدول میں خلفاءِ عباسیہ بغداد ہیں۔ دوسری میں بنو امیہ دمشق۔

تیسری میں بنو فاطمہ مصر۔ چوتھی میں بنو امیہ اندلس۔

پانچویں میں بنو عباس مصر ہیں۔ چھٹی جدول وہ ہے جس میں ہم لقب خلفاء اور حکمرانوں کے القاب، مقامات، اور حتی الامکان سال ہائے وفات کو لکھ دیا گیا ہے۔

میری ناقص رائے میں متعلم و معلمین تاریخ دونوں کے لئے یہ جداول معاون و مفید ثابت ہوں گے:۔

---

۵۴ ابو الفداء، جلد دوم صفحہ ۱۴۷۔ مطبوعہ مصر۔

(۱) فہرست خلفائے بنو عباس بغداد

سال حکومت ۵۲۰

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	مقام دارالخلافت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۱	ابوالعباس عبداللہ بن محمد	السفاح	بغداد	۴ سال ۸ ماہ	۳۳ سال	سنہ ۱۳۶ھ	بہ قضائے الٰہی فوت ہوئے۔
۲	ابوجعفر عبداللہ بن محمد	المنصور	”	۲۲ ” ۳ ” کچھ یوم	۶۳ ”	سنہ ۱۵۸ھ	بیر میمونہ میں احرام باندھے ہوئے مرا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بقول اس کے خود کے ذی الحجہ میں پیدا ہوا۔ ذی الحجہ میں خلیفہ ہوا۔ اور ذی الحجہ ہی میں بدوران حج اسکا انتقال ہوا۔ (ابوالفداء۔ جلد ۲۔ ص ۷)
۳	ابوعبداللہ محمد بن منصور	مہدی	”	۱۰ سال ۱ ماہ	۴۳ سال	سنہ ۱۶۹ھ	بقضائے الٰہی فوت ہوا۔
۴	موسیٰ بن مہدی	ہادی	”	۱ سال ۳ ماہ	۲۶ سال	سنہ ۱۷۰ھ	” ” ”
۵	ہارون بن مہدی	رشید	”	۲۳ سال ۲ ماہ ۱۸ یوم	۴۷ سال ۵ ماہ ۵ یوم	سنہ ۱۹۳ھ	” ” ”
۶	امین بن ہارون	امین	”	۴ سال ۸ ماہ	۲۸ سال	سنہ ۱۹۸ھ	عیاش و شرابی تھا۔ طاہر بن حسن والیٔ رے نے اسکو شکست دیکر قتل کر دیا۔
۷	ابوالعباس مامون بن ہارون	مامون	”	۲۰ سال ۵ ماہ ۵ یوم	۴۸ سال	سنہ ۲۱۸ھ	بہ قضاء الٰہی فوت ہوا۔
۸	ابواسحٰق محمد بن ہارون الرشید	معتصم باللہ	”	۸ سال ۸ ماہ	۴۷ سال	سنہ ۲۲۷ھ	بنو عباس کا آٹھواں خلیفہ بقضائے الٰہی فوت ہوا۔
۹	ہارون بن معتصم	واثق باللہ	”	۵ سال ۹ ماہ	۳۲ سال	سنہ ۲۳۲ھ	عیاش تھا۔ شیر کے گوشت کھانے سے مختلف امراض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔
۱۰	جعفر بن معتصم	متوکل علی اللہ	”	۱۴ سال ۱۰ ماہ ۳ یوم	۴۰ سال	سنہ ۲۴۷ھ	بیٹے نے قتل کرایا۔
۱۱	محمد بن جعفر متوکل	منتصر باللہ	”	۶ ماہ دو یوم	۲۵ سال ۶ ماہ	سنہ ۲۴۸ھ	زہر دیا گیا۔
۱۲	احمد بن محمد معتصم	مستعین باللہ	”	۳ سال ۹ ماہ	۳۴ سال	سنہ ۲۵۲ھ	معزول ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔
۱۳	محمد بن متوکل	معتز باللہ	”	۴ سال ۶ ماہ ۲۱ یوم	۲۴ سال ۲۳ یوم	سنہ ۲۵۵ھ	” ” ”
۱۴	ابواسحٰق محمد بن واثق	مہتدی باللہ	”	۱ سال	۳۸ سال	سنہ ۲۵۶ھ	قتل کیا گیا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	مقام تخت نشینی	زمانۂ حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
١٥	ابو العباس احمد بن متوکل	معتمد علی اللہ	بغداد	٢٣ سال	٥٠ سال	سنہ ٢٧٩ھ	اس کا بھائی موفق باللہ اس پر اسقدر حاوی تھا کہ فی الحقیقت وہی خلافت کرتا تھا۔ اور یہ محض مجبور تھا یہانتک کہ ایکبار اسکو ٣٠٠ دینار کی ضرورت ہوئی تو اسوقت اسکو نہ مل سکے۔ اسوقت اُس نے یہ دو شعر کہے ؎ الیس من العجائب ان مثلی یری ما قل ممتنعا علیہ وتوخذ باسمہ الدنیا جمیعا وما من ذالک شئی فی یدیہ (ابو الفداء - جلد دوم - صفحہ ٥٦)
١٦	ابو العباس احمد بن موفق بن متوکل	معتضد باللہ	″	٩ سال ٩ ماہ ١٣ یوم	٤٧ سال	سنہ ٢٨٩ھ	بقضاء الٰہی فوت ہوا - عیاشی کی وجہ سے تندرستی خراب ہوگئی تھی۔
١٧	ابو محمد علی بن احمد موفق	مکتفی باللہ	″	٦ سال ٦ ماہ	٨١ سال	سنہ ٢٩٥ھ	بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
١٨	ابو الفضل جعفر بن معتضد	مقتدر باللہ	″	٤ ماہ	١٣ سال		١٣ سال کی عمر میں خلیفہ ہوا کمسنی کی وجہ سے بعض امراء نے سنہ ٢٩٦ھ میں معزول کردیا تھا۔
١٩	ابو العباس عبد اللہ بن المعتز	راضی باللہ - غالب باللہ - مرتضی باللہ یا منتصف باللہ	″	ایک یوم	٤٩ سال	سنہ ٢٩٦ھ	معزول کرکے قتل کیا گیا۔
٢٠	ابو الفضل جعفر بن معتضد	مقتدر باللہ	″	٢٤ سال ١١ ماہ ١٦ یوم	٣٨ سال	سنہ ٣٢٠ھ	ابن معتز کے بعد پھر اسکو خلیفہ کیا گیا۔ قتل کیا گیا۔
٢١	محمد بن معتضد	قاہر باللہ	″	١ سال ٦ ماہ	٥٣ سال	سنہ ٣٣٩ھ	معزول کرکے اندھا کیا گیا۔ بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
٢٢	محمد بن مقتدر	راضی باللہ	″	٦ سال ١٠ ماہ	٣٢ سال	سنہ ٣٢٨ھ	بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
٢٣	ابو اسحاق ابراہیم بن مقتدر	متقی باللہ	″	٣ سال ٥ ماہ ٢٠ یوم	٦٠ سال	سنہ ٣٥٧ھ	سنہ ٣٣٣ھ میں معزول کیا گیا اور اندھا کیا گیا قید میں مرا۔ واقعی متقی و پرہیزگار تھا۔
٢٤	ابو القاسم عبد اللہ بن مکتفی	مستکفی باللہ	″	١ سال ٤ ماہ	٤٦ سال	سنہ ٣٣٨ھ	سنہ ٣٣٤ھ میں معزول و اندھا کیا گیا۔ بقضاء الٰہی فوت ہوا سنہ ٣٣٨ھ۔ احمد بن بویہ دیلمی شیعی کو معز الدولہ کا خطاب دیا۔ اسی نے یہ سلوک کیا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دارالخلافہ	مدت خلافت	عمر وقت وفات	سن وفات	کیفیت
۲۵	الفضل بن المقتدر	مطیع اللہ	بغداد	۲۹ سال ۵ ماہ	۶۳ سال	سنہ ۳۶۴ھ	سنہ ۳۶۰ھ میں فالج ہوا سنہ ۳۶۳ھ میں اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہوا۔ بقضاء الٰہی فوت ہوا اسی کے عہد میں سنہ ۳۴۹ھ میں ۳ لاکھ ترکمان مسلمان ہوئے۔ (ابوالفداء۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۲)
۲۶	عبدالکریم بن مطیع	الطائع للہ	″	۱۹ سال	۷۳ سال	سنہ ۳۹۳ھ	سنہ ۳۸۱ھ میں معزول کیا گیا۔ بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
۲۷	احمد بن اسحاق بن مقتدر	قادر باللہ	″	۴۱ سال ۳ ماہ	۸۷ سال	سنہ ۴۲۲ھ	تہجد گزار اور مخیر تھا۔ بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
۲۸	ابو جعفر عبداللہ بن قادر باللہ	قائم بامر اللہ	″	۴۵ سال	۷۷ سال	سنہ ۴۶۷ھ	فقیر منش، پابند اوقات، اور تہجد گزار تھا۔ بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
۲۹	عبداللہ بن محمد ذخیرۃ الدین بن قائم بامر اللہ	مقتدی بامر اللہ	″	۱۹ سال ۹ ماہ	۳۸ سال ۸ ماہ کچھ دن	سنہ ۴۸۷ھ	اچانک موت واقع ہوئی بعض کا بیان ہے کہ اسکی لونڈی ارغوان نے زہر دیا تھا۔
۳۰	ابوالعباس احمد بن مقتدی	مستظہر باللہ	″	۲۴ سال ۳ ماہ ۱۱ یوم	۴۱ سال ۶ ماہ چند یوم	سنہ ۵۱۲ھ	بقضاءِ الٰہی فوت ہوا۔
۳۱	ابو منصور فضل بن مستظہر	مسترشد باللہ	″	۱۷ سال ۶ ماہ ۲۰ یوم	۴۳ سال ۳ ماہ	سنہ ۵۲۹ھ	نہایت نیک اور مقبول عام تھا۔ جماعت اسمٰعیلیہ نے بمقام مراغہ خیمہ میں معہ اسکے محافظ دستے کی قتل کر دیا۔
۳۲	ابو جعفر منصور بن مسترشد	راشد باللہ	″	۱ سال	۳۰ سال	سنہ ۵۳۲ھ	معزول کیا گیا۔ اسکے بعد سنہ ۵۳۵ھ میں بمقام اصفہان خراسانیوں نے حملہ کر کے اسکو قتل کر دیا اور وہیں دفن ہوا۔
۳۳	محمد بن مستظہر	المقتفی باللہ	″	۲۴ سال ۳ ماہ ۱۶ یوم	۶۶ سال	سنہ ۵۵۵ھ	خناق کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا۔
۳۴	یوسف بن مقتفی	مستنجد باللہ	″	۱۱ سال	۴۸ سال	سنہ ۵۶۶ھ	بقضاءِ الٰہی فوت ہوا۔
۳۵	ابو محمد حسن بن مستنجد	المستضیٔ باللہ	″	۹ سال ۶ ماہ	۳۹ سال	سنہ ۵۷۵ھ	″ ″ ″
۳۶	ابوالعباس احمد بن مستضیٔ	ناصر لدین اللہ	″	۴۷ سال	۷۰ سال	سنہ ۶۲۲ھ	فالج میں مبتلا ہو کر اندھا ہو گیا تھا اور اسی میں مرا شیعہ ہو گیا تھا۔ کنجوس تھا۔
۳۷	ابو نصر محمد بن ناصر لدین اللہ	ظاہر بامر اللہ	″	۹ ماہ	۵۲ سال	سنہ ۶۲۳ھ	بقضائے الٰہی فوت ہوا۔ سستی تھا۔ بے فیض تھا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دار السلطنت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۳۸	ابو جعفر منصور بن ظاہر	مستنصر باللہ	بغداد	۱۷ سال	۵۲ سال	سنہ ۶۴۰ھ	بقضاءِ الٰہی فوت ہوا سب سے زیادہ مدارس اسی نے بنوائے۔
۳۹	ابو احمد عبد اللہ بن مستنصر	مستعصم باللہ	״	۱۶ سال		سنہ ۶۵۶ھ	کم سمجھ اور نرم تھا وزیر موئدالدین بن علقمی شیعی نے ہلاکو سے سازش کرکے نہ صرف اسکو قتل کرایا بلکہ بغداد کو بھی تباہ و غارت کرایا اور اس طرح دولتِ عباسیہ کا خاتمہ کیا۔

(۲) خلفاءِ بنو اُمیّہ (دمشق)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دار السلطنت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۱	حضرت امیر معاویہؓ	امیر المومنین	دمشق	۱۹ سال ۳ ماہ ۲۷ یوم	۷۵ سال	سنہ ۶۰ھ	
۲	یزید بن معاویہ		״	۳ سال ۶ ماہ	۳۸ سال	سنہ ۶۴ھ	
۳	معاویہ بن یزید		״	۴۰ روز	۲۱ سال	سنہ ۶۴ھ	نہایت دیندار اور پاکباطن تھا خلافت کا خواہشمند نہیں تھا چنانچہ جس روز اسکو خلیفہ کیا گیا اسی کے چند روز بعد اس نے لوگوں کو جمع کرکے دستبرداری کا اعلان کیا۔ تم اپنے معاملہ کو خوب سمجھتے ہو جسکو چاہو امیر بناؤ اسکے بعد گھر میں چلا گیا اور مرکر باہر نکلا۔ (ابو الفداء)
۴	مروان بن حکم		״	۹ ماہ ۱۸ روز	۶۳ سال	سنہ ۶۵ھ	یزید کی اولاد کی موجودگی میں یہ حکمراں ہوا خالد بن یزید کی ماں سے اس نے نکاح کرلیا تھا۔ اس نے ایک روز اس کا گلا گھونٹ دیا۔
۵	عبد الملک بن مروان		״	۱۳ سال ۴ ماہ	۶۰ سال	سنہ ۸۶ھ	عالم اور فقیہ تھا لیکن حکومت نے علمی خوبیاں ختم کردی تھیں۔
۶	ولید بن عبد الملک		״	۹ سال ۷ ماہ	۴۲ سال ۶ ماہ	سنہ ۹۶ھ	طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کا مغربی کارنامہ اسی کے عہد کا زریں کارنامہ ہے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخریٰ وغیرہ کی موجودہ شکلیں اسی کی رہین منت ہیں کیونکہ عمارتوں کا بہت ہی دلدادہ تھا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دارالسلطنت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۷	سلیمان بن عبدالملک		دمشق	۲ سال ۸ ماہ	۴۵ سال	سنہ ۹۹ھ	تخمہ سے مرا۔
۸	عمر بن عبدالعزیز		〃	۲ سال ۵ ماہ	۴۰ سال	سنہ ۱۰۱ھ	شہید کیا گیا۔
۹	یزید بن عبدالملک		〃	۴ سال ۱ ماہ	〃	سنہ ۱۰۵ھ	عیاش تھا۔
۱۰	ہشام بن عبدالملک		〃	۱۹ سال ۹ ماہ	۵۵ سال	سنہ ۱۲۵ھ	
۱۱	ولید بن یزید بن عبدالملک		〃	۱ سال ۳ ماہ	۴۲ سال	سنہ ۱۲۶ھ	عیاش تھا۔ بیٹے نے قتل کیا۔
۱۲	یزید بن ولید		〃	۵ ماہ ۱۲ یوم	۴۶ سال	〃	باپ سے مقابلہ و مقاتلہ کیا تھا جس میں باپ کام آیا تھا۔
۱۳	ابراہیم بن ولید		〃	تقریباً ۴ ماہ			انتقال کا حال معلوم نہ ہوا۔
۱۴	ابو عبدالملک مروان بن محمد	الحمار	〃	۵ سال ۱۰ ماہ ۱۵ یوم	۶۲ سال	سنہ ۱۳۲ھ	بمقام (مصر) بنو عباس کے مقابلہ میں قتل ہوا۔ چونکہ صدی کی آخر کا خلیفہ تھا اس لئے الحمار کا لقب پایا کیونکہ عربی میں صدی کی آخر کو الحمار کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ گدھے کی طرح سے جفاکش بھی تھا۔

(۳) امرائے عبیدی علوی المعروف بہ خلفائے بنو فاطمہ (مصر)

(۲۴۵ سال حکمراں رہے)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دارالسلطنت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۱	عبداللہ بن محمد	المہدی	رقادہ (افریقیہ) مہدیہ	۲۴ سال ۱ ماہ ۲۰ یوم	۶۳ سال	سنہ ۳۲۲ھ	اسی نے مہدیہ ساحلی شہر بنواکر اپنی حکومت کا اسکو پایۂ تخت بنایا۔ سنہ ۳۰۱ھ میں اپنے بیٹے کو لشکر جرار دیکر مصر پر حملے کیلئے روانہ کیا جہاں اسکو بقول ابوالفداء اکثر مورخین کا قول ہے کہ نسباً اہل بیت میں سے نہیں تھا۔ بلکہ سعید بن حسین نے سلمیہ میں آکر ایک یہودی حداد نامی کی بیوہ سے شادی کر لی جسکا ایک لڑکا تھا چونکہ سعید کے کوئی اولاد نہیں ہوئی لہذا اس یہودی بچے کو ولی عہد کر لیا جو بعد میں عبداللہ مہدی کے نام سے مشہور ہوا۔ واللہ اعلم

نمبر شمار	نام خلیفہ	خطاب	پایۂ تخت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۲	ابوالقاسم محمد بن مہدی	قائم بامر اللہ	رقادہ (افریقہ) مہدیہ	۱۲ سال	۵۰ سال	۳۳۴ھ	
۳	ابوطاہر اسمٰعیل بن محمد	منصور باللہ	"	۷ سال ۱۶ یوم	۳۹ سال	۳۴۱ھ	
۴	ابوتمیم محمد بن اسمٰعیل	المعز لدین اللہ	قاہرہ (مصر)	۲۵ سال	۴۵ سال ۶ ماہ	۳۶۵ھ	اس کے زمانہ میں بحیرۂ روم میں بہت فتوحات ہوئیں تقریباً بیشتر مغرب اقصیٰ فتح ہوا عبدالرحمن ناصر خلیفہ اندلس سے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ ابوالحسن جوہر نے جو اسکے باپ کا غلام تھا اور جو بڑھتے بڑھتے وزیر اور سپہ سالار ہوا۔ مغرب اقصیٰ کے بیشتر مقامات کے علاوہ مصر بھی فتح کیا اور قاہرہ کی بنیاد ڈال کر اسی نے سب سے پہلے جامع ازہر بنوائی جو آج تک ہے۔ قاہرہ کی فتح کے بعد معز نے پایۂ تخت بدلا اور قاہرہ کو پایۂ تخت قرار دیکر ۳۶۲ھ میں وہاں حکومت منتقل کر دی۔
۵	ابومنصور نزار بن المعز	عزیز باللہ	مصر	۲۱ سال	۴۲ سال	۳۸۶ھ	
۶	منصور بن عزیز	حاکم بامر اللہ	"	۲۵ سال	۳۶ سال	۴۱۱ھ	منصور بن عزیز اپنے زمانہ کا فرعون گزرا ہے متلون مزاج اور ظالم تھا جب بہن پر فحش کی تہمت لگائی تو ۲ دو غلاموں کے ذریعہ سے قتل کرا دیا۔
۷	ابوالحسن علی بن حاکم	ظاہر لاعزاز دین اللہ	"	۱۶ سال		۴۲۷ھ	نہایت نیک تھا۔
۸	ابوتمیم محمد بن ظاہر	مستنصر باللہ	"	۶۰ سال ۴ ماہ	۸۰ سال	۴۸۷ھ	اتنی طویل حکومت کسی اسلامی بادشاہ یا خلیفہ نے نہیں کی۔
۹	ابوالقاسم احمد بن مستنصر	المستعلی باللہ	"	۷ سال ۲ ماہ	۲۸ سال	۴۹۵ھ	
۱۰	ابوعلی منصور بن مستعلی	آمر باحکام اللہ	"	۲۹ سال ۵ ماہ ۱۵ یوم	۳۴ سال	۵۲۴ھ	قتل ہوا۔
۱۱	ابوالمیمون عبدالمجید بن مستعلی	حافظ لدین اللہ	"	۱۹ سال ۷ ماہ	۷۷ سال	۵۴۴ھ	بد سیرت تھا۔ لاولد تھا۔
۱۲	ابوالمنصور اسمٰعیل بن حافظ	ظافر باللہ	"	۵ سال	۲۲ سال	۵۴۹ھ	قتل کیا گیا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دار الخلافہ	مدت خلافت	عمر	سن وفات	کیفیت
۱۳	ابوالقاسم عیسیٰ بن ظاہر	فائز بنصر اللہ	مصر	۶ سال ۲ ماہ	۱۱ سال	سنہ ۵۵۶ھ	مرگی سے مرا۔
۱۴	ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن حافظ	عاضد لدین اللہ	"	۱۱ سال	۲۱ سال	سنہ ۵۶۷ھ	

نوٹ۔ مستنصر باللہ کے عہد سے خلافت برائے نام تھی۔ وزراء مختار کل تھے جو اپنے تئیں ملوک سے ملقب کرتے تھے یہی صورت بنو بویہ کے قبضہ کے بعد بغداد کے خلفاء کی ہو گئی تھی۔

(۴) خلفاء بنو امیہ (اندلس)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دار الخلافہ	مدت خلافت	عمر	سن وفات	کیفیت
۱	عبدالرحمٰن بن معاویہ اموی	داخل	قرطبہ (اندلس)	۳۳ سال	۴۷ سال	سنہ ۱۷۱ھ	عبدالملک بن مروان کا پوتا تھا۔
۲	ابو ولید ہشام بن عبدالرحمٰن		"	۷ سال ۷ ماہ ۸ یوم	۳۹ سال	سنہ ۱۸۰ھ	
۳	حکم بن ہشام		"	۲۶ سال	۵۲ سال	سنہ ۲۰۶ھ	۱۹ لڑکے تھے۔
۴	عبدالرحمٰن بن حکم		"	۳۱ سال ۳ ماہ	۶۲ سال	سنہ ۲۳۸ھ	۴۵ لڑکے تھے۔
۵	محمد بن عبدالرحمٰن		"	۳۴ سال ۱۱ ماہ	۶۵ سال	سنہ ۲۷۳ھ	۳۰ لڑکے تھے۔
۶	منذر بن محمد بن عبدالرحمٰن		"	۱ سال ۱۱ ماہ	۴۶ سال	سنہ ۲۷۵ھ	
۷	عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن		"	۱۵ سال	۴۲ سال	سنہ ۳۰۰ھ	۱۱ لڑکے تھے اس نے اپنے بیٹے محمد پر شرعی حد لگا کر اس کو قتل کیا تھا۔
۸	ابوالمظفر عبدالرحمٰن بن محمد مقتول بن عبداللہ	الناصر لدین اللہ	"	۵۰ سال ۶ ماہ	۷۳ سال	سنہ ۳۵۰ھ	خلافت اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ ۱۱ لڑکے تھے۔ سنہ ۳۲۵ھ میں اسی نے مشہور محل "الزہراء" بنوایا جس کی لمبائی شرقاً و غرباً دو ہزار سات سو گز اور چوڑائی شمالاً و جنوباً ایک ہزار پانچ سو گز اور دروازے ۱۵ تھے۔
۹	حکم بن عبدالرحمٰن ناصر	مستنصر باللہ	"	۱۵ سال ۵ ماہ	۶۳ سال ۷ ماہ	سنہ ۳۶۶ھ	عالم اور فقیہ تھا۔
۱۰	ہشام بن حکم بن ناصر	مؤید باللہ	"	۳۷ سال	۴۷ سال	سنہ ۴۰۳ھ	ایک بار قید کیا گیا اسکے بعد پھر ۳ سال کے لئے خلیفہ ہو گیا پھر اسکے بھتیجے نے حکومت پر قبضہ کیا اور اسکو محل سے نکال دیا اسکے بعد اسکا پتہ نہ چلا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	مقام دار الخلافہ	مدت خلافت	عمر بوقت وفات	سن وفات	کیفیت
۱۱	سلمان بن حکم بن سلیمان بن ناصر	مستعین باللہ	قرطبہ (اندلس)	۴ سال		۴۰۷ھ	
۱۲	عبدالرحمن بن محمد بن عبدالملک بن ناصر	مرتضیٰ باللہ	"				چند ماہ برائے نام خلیفہ رہا۔
۱۳	عبدالرحمن بن ہشام بن عبدالجبار بن ناصر	مستظہر باللہ	"	۲ ماہ		۴۱۴ھ	۴۱۴ھ میں قتل ہوا۔
۱۴	محمد بن عبدالرحمن بن عبیداللہ بن ناصر	مستکفی باللہ	"	۱ سال ۴ ماہ			۴۱۶ھ میں معزول ہوا اور زہر دیا گیا۔
۱۵	ہشام بن محمد بن عبدالملک بن ناصر	معتد باللہ	"	۱۲ سال		۴۲۸ھ	۴۲۸ھ میں معزول ہوا اور اسی سال مر گیا۔

(۵) خلفاء بنو عبّاس (مصر)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	مقام دار الخلافہ	مدت خلافت	عمر بوقت وفات	سن وفات	کیفیت
۱	ابوالقاسم احمد بن ظاہر عباسی	مستنصر باللہ	مصر	۶ ماہ		۶۶۰ھ	مستعصم باللہ آخری خلیفہ بغداد کا چچا تھا۔ ۶۵۹ھ میں بھاگ کر مصر چلا آیا تھا۔ سلطان ملک ظاہر والی مصر نے بیعت کر کے خلیفہ بنایا۔ اور تاتاریوں کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا جہاں وہ قتل ہو گیا۔
۲	ابوالعباس احمد بن ابوبکر بن امیر ابو علی حسن عباسی	حاکم بامر اللہ	"	۴۰ سال		۷۰۱ھ	مستعصم کے چچا مستنصر کے قتل کے بعد ایک سال تک کوئی خلیفہ نہیں ہوا۔ ۶۶۱ھ میں ملک ظاہر نے اسکو خلیفہ بنایا۔
۳	ابوالربیع سلیمان بن حاکم	المستکفی باللہ	قوص (مصر)	۳۹ سال	۵۲ سال	۷۴۰ھ	بجائے قاہرہ کے قوص میں دار الخلافہ رہا بقضائے الٰہی فوت ہوا۔
۴	ابراہیم بن ابو عبداللہ محمد بن حاکم	واثق باللہ	"	۱ سال			۷۴۲ھ میں ایک سال کی خلافت کے بعد معزول کیا گیا۔
۵	ابوالعباس احمد بن مستکفی	حاکم بامر اللہ	"	۱۱ سال		۷۵۳ھ	۷۴۲ھ میں اپنے باپ ملک الناصر فرج کے مرنے کے بعد ملک منصور نے بیعت کی تھی۔ طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا۔
۶	ابوالفتح ابوبکر بن مستکفی	معتضد باللہ	"	۱۰ سال		۷۶۳ھ	
۷	ابو عبداللہ محمد بن معتضد باللہ	متوکل علی اللہ	"				
۸	نجم الدین زکریا بن ابراہیم بن حاکم بامر اللہ	معتصم باللہ	"	۱۵ یوم			

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	پایۂ تخت	دورِ حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۹	عمر بن ابراہیم بن ابو عبداللہ محمد بن حاکم	واثق باللہ	مصر	۳ سال			تا ۷۸۸ھ
۱۰	نجم الدین زکریا	معتصم باللہ	”	۲ سال تا ۷۹۱ھ		سنہ ۸۰۱ھ	دوبارہ خلیفہ بناکر پھر معزول کیا گیا۔ بحالتِ معزولی سنہ ۸۰۱ھ میں انتقال ہوگیا۔
۱۱	ابو عبداللہ محمد بن معتضد باللہ	متوکل علی اللہ	”	۷ سال	۵۴ سال	سنہ ۸۰۸ھ	دوبارہ خلیفہ کیا گیا تھا۔
۱۲	احمد بن متوکل	معتمد علی اللہ	”				صرف ولی عہد رہا۔ باپ نے اپنی زندگی میں ولیعہدی سے معزول کردیا تھا۔
۱۳	ابوالفضل عباس بن متوکل	مستعین باللہ	”	۰ سال		سنہ ۸۳۰ھ	یہ وہ خلیفہ تھا جسکو خلافت کے ساتھ حکومت بھی ملی تھی کیونکہ اہلِ ملک نے ملک الناصر والیِ مصر کو معزول کرکے تھا اِن حکومت سپرد کردی تھی۔ سنہ ۸۱۶ھ تک خلیفہ رہا اسکے بعد خود دست بردار ہوکر اسکندریہ چلا گیا جہاں ۱۴ برس کے بعد طاعون میں مبتلا ہوکر وفات پاگیا۔
۱۴	ابوالفتح داؤد بن معتضد باللہ	معتضد باللہ	”	۳۰ سال		سنہ ۸۴۵ھ	
۱۵	ابوالربیع سلیمان برادر متوکل	مستکفی باللہ	”	۹ سال		سنہ ۸۵۴ھ	
۱۶	ابوالبقا حمزہ برادر متوکل	قائم بامر اللہ	”	۵ سال		سنہ ۸۶۳ھ	یہ بھی معزول کیا گیا۔ اسکندریہ میں انتقال ہوا اور اپنے بھائی مستعین باللہ کے برابر دفن ہوا۔
۱۷	ابوالمحاسن یوسف برادر متوکل	مستنجد باللہ	”	۲۱ سال		سنہ ۸۸۴ھ	
۱۸	عبدالعزیز ابوالعز	مستہو باللہ	”				
	یعقوب بن متوکل	مستمسک باللہ					

(۶) ہم لقب خلفاء و حکمرانان اسلام

نمبر شمار		لقب	خاندان	پایۂ تخت	سال وفات	کیفیت
۱	۱	المنصور	عباسی	بغداد	سنہ ۱۵۸ھ	
	۲	〃	عبیدی علوی	مہدیہ (مغرب)	سنہ ۳۴۱ھ	
	۳	المنصور باللہ	مومنی (موحدین)	مغرب و تونس	سنہ ۵۹۵ھ	یہ عبدالمومن کا پوتا تھا۔ اسکا نام ابو یوسف یعقوب تھا ۱۵ سال حکومت کی ۴۱ سال کی عمر میں مرا۔
	۴	المنصور	ایوبی کردی	حماۃ (شام)	سنہ ۶۱۷ھ	ناصرالدین محمد نام تھا سلطان صلاح الدین کے مرنے کے بعد حماۃ کا امیر ہوا تھا۔
	۵	المنصور (لاجین)	ترکی	مصر		سنہ ۶۵۷ھ میں معزول ہوا اسکا نام علی نورالدین تھا اسکا باپ معزالدین ایبک ترکمانی الملقب بہ ملک المعز سب سے پہلا ترکی وہاں کا حاکم ہوا بہ عمر ۱۱ سال ۸ ماہ معزول ہوا تھا۔
	۶	〃	〃	〃	سنہ ۶۹۸ھ	حسام الدین لاجین کو قتل کیا گیا۔
	۷	المنصور	ایوبی	حمص (شام)		
	۸	〃	ترکمانی	ماردین	سنہ ۶۳۶ھ	ناصرالدین ارتق ارسلان بن ایلغازی نام تھا۔
	۹	〃	تاتاری	〃	سنہ ۷۱۲ھ	نجم الدین غازی بن قزل ارسلان نام تھا۔
	۱۰	〃	عرب	یمن	سنہ ۶۴۸ھ	عمر دین علی بن رسول نام تھا۔ قتل کیا گیا۔
	۱۱		ترک	مصر		
۲	۱	رشید	عباسی	بغداد	سنہ ۱۹۳ھ	
	۲	〃	مومنی (موحدین)	مغرب و تونس	سنہ ۶۳۰ھ	
۳	۱	مامون	عباسی	بغداد	سنہ ۲۱۸ھ	
	۲	〃	حمودی	قرطبہ	سنہ ۴۳۱ھ	علی بن حمود کا بھائی تھا ۴ سال کی حکمرانی کے بعد بھتیجے کا مغلوب ہوا اور یہ قید کر دیا گیا۔ اور اسی حالت میں مرا۔

نمبر شمار		لقب	نام خاندان	پایۂ تخت	سال وفات	کیفیت
	۳	مامون	مومنی (موحدین)	تونس	۶۳۰ھ	ابو العلاء ادریس بن یعقوب الملقب بہ مامون تقریباً ۶ سال حکمراں رہا۔
۴	۱	معتصم باللہ	عباسی	بغداد	۲۲۷ھ	
	۲	"	"	مصر	۸۰۱ھ	
۵	۱	واثق باللہ	"	بغداد	۲۲۲ھ	
	۲	"	ابو حفصی ہنتاتی	تونس	۶۷۸ھ	یحییٰ بن محمد بن ابو زکریا نام تھا اپنے چچا ابو ابراہیم سے مغلوب ہو کر معزول ہوا ۔ اپنے بنو عم کے ہاتھوں قتل ہوا۔
	۳	"	مومنی (موحدین)	مراکش و تونس	۶۶۸ھ	ابو دبوس کے نام سے مشہور تھا۔ ۳ سال سلطنت کی۔
	۴	"	عباسی	مصر	۷۴۲ھ	میں معزول کیا گیا۔
	۵	"	"	"	۷۸۸ھ	
۶	۱	معتمد علی اللہ	"	بغداد	۲۶۹ھ	
	۲	"	لخمی	اشبیلیہ	۴۸۴ھ	
	۳	"	عباسی	مصر		صرف ولیعہد رہا۔
۷	۱	معتضد باللہ	"	بغداد	۲۸۵ھ	
	۲	"	لخمی	اشبیلیہ	۴۶۴ھ	نہایت ظالم اور عیاش تھا۔
	۳	"	عباسی	مصر	۷۶۳ھ	
	۴	"	"	"	۸۴۵ھ	
	۵	"	مومنی (موحدین)	مراکش و تونس	۶۴۶ھ	علی بن ادریس نام تھا۔
۸	۱	راضی باللہ	عباسی	بغداد	۲۹۶ھ	عبداللہ بن المعتز نام تھا۔
	۲	"	"	"	۳۲۹ھ	
۹	۱	مرتضیٰ باللہ	"	"	۲۹۶ھ	عبداللہ بن المعتز کا لقب تھا۔
	۲	"	اموی	قرطبہ		چند ماہ برائے نام خلیفہ رہا۔ سال وفات معلوم نہ ہو سکا۔

	نمبر شمار	لقب	خاندان	مقام سلطنت	سال وفات	کیفیت
	۳	مرتضیٰ باللہ	مومنی (موحدین)	مغرب و تونس	سنہ ۶۶۵ھ	عمر بن ابراہیم نام تھا۔ ابو حفص کنیت تھی۔
	۴	”	ابو حفصی ہنتانی	تونس	سنہ ۶۶۴ھ	
۱۰	۱	مستکفی باللہ	عباسی	بغداد	سنہ ۳۳۴ھ	
	۲	”	اموی	قرطبہ	سنہ ۴۱۶ھ	
		”	عباسی	مصر	سنہ ۷۴۰ھ	
	۴	”	”	”	سنہ ۷۵۴ھ	
۱۱	۱	قائم بامر اللہ	”	بغداد	سنہ ۴۶۷ھ	
	۲	”	عبیدی علوی	مہدیہ (افریقہ)	سنہ ۳۳۴ھ	مصری علوی خلافت کا بانی تھا۔
	۳	”	عباسی	مصر	سنہ ۸۶۳ھ	
۱۲	۱	مستضیٔ باللہ	”	بغداد	سنہ ۵۷۵ھ	
	۲	”	مومنی (موحدین)	مغرب و تونس	سنہ ۶۲۱ھ	عبدالواحد بن یوسف بن عبدالمومن نام تھا۔ پوتے کی جگہ پر بیٹھا تھا۔ حکومت نے عیاش کر دیا تھا۔ صرف شراب نہیں پیتا تھا۔ ۹ ماہ کی حکومت کے بعد معزول و قتل ہوا۔ بڑھاپے میں حکومت ملی تھی۔
۱۳	۱	ناصر لدین اللہ	عباسی	بغداد	سنہ ۶۲۲ھ	
	۲	”	اموی	اندلس	سنہ ۳۵۰ھ	
	۳	”	مومنی (موحدین)	مغرب و تونس	سنہ ۶۱۰ھ	ابو عبداللہ محمد بن یعقوب الملقب بہ ناصر نام تھا۔ تقریباً ۱۶ سال حکمرانی کی۔
	۴	ناصر	ایوبی کردی	مصر	سنہ ۵۸۹ھ	سلطان صلاح الدین ایوبی کا ناصر لقب تھا۔ متقی اور پرہیزگار۔ مجاہد تھا۔
	۵	”	”	حماۃ (شام)		صلاح الدین بن منصور۔
	۶	”	ترکی	والیٔ مصر	سنہ [illegible]ھ	سلطان ملک ناصر محمد بن برقوق ملک مظاہر فا[illegible] صالحی۔

نمبر شمار		لقب	نام خاندان	دارالسلطنت	سال وفات	کیفیت
	۷	ناصر	ایوبی	حلب	۶۵۹ھ	یوسف نام ملک الناصر لقب تھا۔ ظاہر بن صلاح الدین ایوبی کا پوتا تھا۔
	۸	″	کردی	کرک	۶۵۶ھ	داؤد بن ملک المعظم عیسیٰ نام تھا۔
۱۴	۱	ظاہر بامر اللہ	عباسی	بغداد	۶۲۳ھ	
	۲	ظاہر	ایوبی۔کردی	حلب	۶۱۳ھ	غیاث الدین غازی نام ملک الظاہر لقب ابن سلطان صلاح الدین ۴۴ سال کی عمر تھی۔ ۳۱ سال حکومت کی۔
	۳	ظاہر لاعزاز دین اللہ	عبیدی۔علوی	مصر	۴۲۷ھ	
	۴	ظاہر	ترکی	″	۶۷۶ھ	ابو الفتح رکن الدین بیبرس نام۔ نہایت دیندار عادل اور منصف تھا۔
۱۵	۱	مستنصر باللہ	عباسی	بغداد	۶۴۰ھ	
	۲	″	اموی	اندلس	۳۶۶ھ	
	۳	″	عبیدی۔علوی	مصر	۴۸۷ھ	
	۴	″	موحدی (موحدین)	مغرب و تونس	۶۲۰ھ	یوسف بن ابو عبد اللہ ناصر محمد عباس نام تھا۔ ۱۰ سال حکومت کی۔
	۵	″	عباسی	مصر	۶۶۰ھ	مستعصم باللہ کا چچا تھا۔ بھتیجے کے قتل کے بعد بھاگ کر مصر آگیا تھا جہاں سلطان ملک الظاہر نے ۶۵۹ھ میں اس کو نہ صرف پناہ دی بلکہ اس کو خلیفہ مان کر بیعت کی اور تاتاریوں کے مقابلہ کیلئے مدد کی اسی مقابلہ میں ۶۶۰ھ میں اسکا خاتمہ ہوا۔
	۶	″	ابو حفصی	تونس	۶۷۵ھ	ابو عبد اللہ محمد بن ابو زکریا بن عبد الواحد نام تھا۔
	۷	مستنصر باللہ ثانی	″	″	۶۹۵ھ	ابو حفص عمر بن ابو زکریا نام تھا۔ کم و بیش ۲۰ سال حکمرانی کی۔
	۸	مستنصر باللہ ثالث	″	″	[illegible]	ابو عبد اللہ [illegible] محمد بن واثق باللہ ۔ ۱۴ سال حکومت کی۔

ابرار حسین

نباتاتی تنفّس

(از جناب ڈاکٹر رفیق احمد خانصاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ پی ایچ ڈی چیرمین شعبۂ نباتات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سبز پودا آفتاب کی روشنی میں ہوا سے کاربن ڈک ایڈ[1] اور زمین سے پانی حاصل کرکے مختلف اقسام کی شکر تیار کرتا اور آکسیجن[2] چھوڑتا ہے۔ یہ عمل جو بالعموم پتّوں کے اندر واقع ہوتا ہے ترکیب شعاعی کہلاتا ہے۔ پتّوں کے اس حیرت انگیز فعل پر عالم ذیحیات کا قیام ہے۔ اگر پتّوں کی یہ عجیب و غریب خصوصیت مفقود ہو جائے تو نہ صرف پودے بلکہ حیوانات بھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے سطح زمین سے بالکل معدوم ہو جائیں اکثر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پودہ اور حیوان کی خوراک میں قطبین کا فرق ہے۔ یعنی اوّل الذکر کی خوراک کی نوعیت غیر نامیاتی ہے۔ مثلاً پانی کاربن ڈکسائڈ اور نمکیات برعکس اس کے حیوان کی غذا کا بہت بڑا حصہ مندرجہ ذیل تین قسم کی نامیاتی اشیا پر مشتمل ہے۔ اوّل شکریات اور نشاستہ۔ دوم انڈہ اور گوشت کے مخصوص اجزا۔ یعنی لحمیات جو ترکاری۔ دال اور پھل وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سوم روغنیات۔ مثلاً چربی، مکھن اور گھی وغیرہ درحقیقت پودہ اور حیوان کی خوراک میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ پودا ایک معصوم مزدور کی مانند پتّوں اور جڑوں کے ذریعہ معمولی غیر نامیاتی اشیا جذب کرکے شکریات اور نشاستہ لحمیات اور روغنیات تیار کرتا ہے۔ اور پھر ان کو بطور غذا استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن حیوان ایک متکبر سرمایہ دار کی طرح غریب پودہ کی محنت و مشقت سے پیدا کردہ کمائی کو سمیٹ کر اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ بہرحال جہاں تک کیمیائی قابلیت کا تعلق ہے پودے کا درجہ حیوان سے بہت بلند ہے۔ اس دلچسپ موضوع پر انشاءاللہ پھر کبھی مقالہ پیش کیا جائے گا۔ یہاں پر صرف یہ بتلانا کافی ہوگا کہ روشنی کی

نوٹ (1) اس مقالہ میں کاربن ڈائی اکسائیڈ کو کاربن ڈکسائیڈ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ گیس جلنے کے فعل سے قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ نیز حیوانات کے سانس لینے سے جو کثیف ہوا منہ سے نکلتی ہے اس میں یہ گیس تقریباً ۴ فیصدی تک پائی جاتی ہے۔

(2) آکسیجن کھلی ہوا میں تقریباً ۲۱ فیصدی تک موجود ہوتی ہے۔ سانس کے لئے یہ گیس نہایت ضروری ہے۔

موجودگی میں پتہ کے جسم کے اندر ترکیب شعاعی کے عمل سے شکریات پہلے وجود میں آتی ہیں۔ بعدازاں خالص کیمیائی عملیات کے ذریعہ نشاستہ اور پھر لحمیات اور روغنیات پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض سبز پودے ایسے بھی ہیں جن میں حسب معمول نشاستہ بنانے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس لئے ان پودوں کے برگی خلیوں میں نشاستہ کے بجائے صرف شکریات موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً سوسن۔ پیاز وغیرہ۔

سائنس کی موجودہ ترقی کے باعث صنعتی ممالک میں طرح طرح کے کیمیائی مرکبات مصنوعی طریقوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ سینکڑوں کارخانوں میں بڑی بڑی بھٹیاں آتشکدوں کی مانند شب و روز گرم رہتی ہیں اور لاکھوں مزدور شہد کی مکھیوں کی طرح نہایت انہماک سے کام کرتے ہیں۔ اِن عالیشان کارخانوں میں مرکبات بنانے کے لئے معدنی کوئلہ یا بجلی سے طاقت مہیا کی جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیچارہ بے دست و پا پودہ سادہ غیر نامیاتی اشیائے پیچیدہ نامیاتی مرکبات تعمیر کرنے کے لئے قوت کہاں سے حاصل کرتا ہے؟ اس سلسلہ میں مختصراً یہ بیان کرنا کافی ہوگا کہ کیمیائی ترکیب دینے کے لئے سبز پودا سورج کی کرنوں سے وہی کام لیتا ہے جو انسان کوئلہ یا بجلی سے۔ چنانچہ شعاعی توانائی پودے کے تیار کردہ مرکبات کے اندر غیر مرئی روپ میں مضمر رہتی ہے۔ جب کبھی ان مرکبات کا کیمیائی انتشار ہوتا ہے تو فوراً توانائی رہا ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک اتوار کو صبح کے وقت جبکہ انجنیر سٹفنسن اور پروفیسر بکلینڈ (ماہر ارضیات) گرجا سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کو دور سے دھواں اڑاتی ہوئی متحرک ریل گاڑی دکھائی دی۔ انگلستان کے یہ دونوں مایۂ ناز سائنسدان نوایجاد ریل گاڑی کا دلچسپ نظارہ دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد سٹفنسن نے بکلینڈ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "بکلینڈ میرے ایک سوال کا جواب دیجئے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا طاقت ہے جو اس ریل گاڑی کو حرکت دے رہی ہے؟" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کونسا مشکل سوال ہے۔ بیشک ریل کو انجن کھینچ رہا ہے۔" سٹفنسن نے دوبارہ استفسار کیا "مگر یہ بتائیے کہ انجن کو کیا چیز دھکیل رہی ہے؟" بکلینڈ بولے "اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں کہ انجن کو آپ کے شہر کا کوئی مستری چلا رہا ہے۔" سٹفنسن نے جواب دیا۔ "نہیں انجن کو آفتاب کی روشنی حرکت دے رہی ہے۔" بکلینڈ نے متعجب ہو کر دریافت کیا۔ "بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" سٹفنسن نے اس معمہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔ "آپ بخوبی جانتے ہیں کہ لاکھوں سال قبل درختوں کے جنگل کے جنگل زمین کی آغوش میں دفن ہو کر دباؤ۔ گرمی اور کیمیائی اثرات کی وجہ سے کوئلہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ اب کوئلہ زمین سے نکال کر انجن کے چلانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ جب

کوئلہ جلتا ہے تو اس میں سے وہی شعاعی قوت جو زمانۂ قدیم میں درختوں نے اپنی نشو و نما کے لئے سورج سے حاصل کی تھی، حرارت کی شکل میں خارج ہوتی ہے۔"

جو کچھ سٹفنسن نے اپنے دوست بکلینڈ سے کہا وہ بالکل صحیح ہے۔ درحقیقت نہ صرف انجن بلکہ ہماری دنیا کے کارخانہ کا ہر پرزہ سورج کی تپش کی وجہ سے متحرک اور بےچین ہے۔ یہاں پر یہ بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ مادی دنیا کے دو بڑے حصے ہیں۔ اوّل عالم غیر ذیحیات جو تین طبقات میں منقسم ہے یعنی جمادی۔ آبی اور ہوائی۔ دوسرا عالم ذیحیات جو نباتات اور حیوانات پر مشتمل ہے۔ رب العالمین نے اپنے خاص فیض و کرم سے انسان کو زمین کی خلافت بخشی تھی مگر تنگ نظر اور احسان فراموش انسان نے جمادی۔ آبی۔ ہوائی۔ نباتی اور حیوانی طبقات کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ چنانچہ پربت۔ دریا۔ آندھی۔ درخت اور جانور کی پرستش میں مبتلا ہو کر تمام کائنات میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر حقیر ترین ثابت کر دیا۔ البتہ سورج کی پوجا کسی قدر حق بجانب تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اگر نظرِ عمیق سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ سطح زمین پر جو کچھ رونق ہے اس کا سبب بہت حد تک آفتاب ہے۔ شان و شوکت سے چمکنے والے اِس آسمانی چراغ کی بدولت دنیا میں ہلچل جاری ہے۔ باد و باراں کا شور۔ بحری موجوں کی گرج۔ ندی نالوں کی تڑپ۔ نہروں اور دریاؤں کا اضطراب اور پہاڑی آبشاروں کی گونج۔ شمسی تپش کے کرشمے ہیں۔ اسی طرح پھولوں کی رنگینی اور نزاکت۔ پھلوں کی شیرینی اور لطافت۔ طیور کی پرواز اور نغمہ سرائی۔ چوپاؤں کی تگ و دو اور کرخت صدائی۔ درندوں کی خوفناک حرکتیں اور وحشتناک آوازیں۔ انسانی اقوام کی کشمکش اور خونریز لڑائیاں۔ حُسن کی شوخیاں اور عشق کی مستیاں۔ شعر و سخن کی مجلسیں اور سرود و رقص کی محفلیں۔

الغرض یہ سب آفتاب کی شعاعی قوت کے عجیب و غریب مظاہرے ہیں۔ اگر اِس قوت کو خواہ وہ اصلی حالت میں ہو یا تبدیل شدہ شکل میں۔ کچھ مدت کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے تو تمام دنیا بے جان اور ساکت ہو جائے۔ اگرچہ زندگی اور حرکت کا قیام آفتاب کی زبردست طاقت پر منحصر ہے تاہم آتش پرستوں کا ناری دیوتا ایک عظیم الشان نورانی ہستی کا ادنیٰ غلام ہے۔

سطور بالا میں اس امر کی مختصراً تشریح کی گئی ہے کہ سبز پتے شمسی نور سے فیض یاب ہو کر سادہ غیر نامیاتی اشیائے مختلف اقسام کی غذا بناتا ہے۔ یہ تعمیری عمل پتوں کے چھوٹے چھوٹے نازک خلیوں کے اندر واقع ہوتا ہے۔ دراصل یہ ننھے برگی خلیے قدرت کے بے نظیر کارخانے ہیں۔ جن کی تعجب انگیز کارگزاری دیکھ کر سائینس داں انگشت بدنداں ہیں۔ ایک صاحب نے اندازہ لگایا تھا کہ

متحدہ امریکہ کے پودے ہر سال جس قدر شکر تیار کرتے ہیں اس کی مقدار بلحاظ حجم ایک مکعب میل ہوتی ہے یعنی اگر یہ شکر کسی معجزہ کے ذریعہ اکٹھی کر کے ایک جگہ جمع کر دی جائے تو ایک میل لمبی، ایک میل چوڑی اور چاروں طرف سے ایک میل اونچی شکر کی پہاڑی کھڑی کی جا سکتی ہے۔ غرضیکہ تیار شدہ غذا پتوں کے باکمال کارخانوں سے نکل کر باریک شریانوں کے ذریعہ پودہ کے مختلف حصوں میں پہنچتی ہے۔ اگر پودا یا حیوان کے جسم کے اندر غذا کی تقسیم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ دولت کی تقسیم کے قدرتی قوانین کس قدر مکمل اور صحیح ہیں۔ اس امر کی وضاحت کسی تندرست توانا انسان کے جسم کو پیش نظر رکھ کر زیادہ آسانی اور خوبی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

انسان کا دھڑ مثل ایک بڑی قوم کے ہے جس کے لاتعداد خلیئے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ان خلیوں کی مختلف جماعتیں ہیں۔ مثلاً دل۔ دماغ۔ جگر۔ پھیپھڑے۔ بازو۔ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ۔ ان سب کو خون کے ذریعہ خوراک ملتی ہے۔ چنانچہ غذا کی دولت سے بھرا ہوا خون لہریں مارتا ہوا جسم کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ خلیہ کے قریب پہنچتا ہے۔ مگر کسی خلیہ یا خلیوں کی کسی جماعت کی مجال نہیں کہ ضرورت سے زیادہ خوراک غصب کر کے خود فربہ ہو جائے۔ حسد و ہوس۔ خود غرضی۔ بددیانتی۔ لالچ و ریاکاری کا کہیں نشان نہیں۔ سب ایک کڑے نظام کے اندر اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہیں اگرچہ کام اور خوراک کے لحاظ سے ان کی حیثیت جداگانہ ہے تاہم مساوات اور اخوت کا یہ عالم ہے کہ اگر کہیں پاؤں کی انگلی میں کانٹا چبھ جائے تو سارا جسم تکلیف کے مارے بیتاب ہو کر تڑپنے لگتا ہے۔ کیا اعضاءِ رئیسہ اور کیا اعضاءِ غیر رئیسہ۔ سب کے سب جسم کے مجروح حصہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ صحت ہو یا بیماری۔ راحت ہو یا تکلیف۔ خوشی ہو یا غم۔ ہر حالت میں تمام خلیئے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی جسم کے بعض حصے خوراک کا خزانہ بالعموم چربی کی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر ان کی ذہنیت وہ نہیں جو بدقسمتی سے ہمارے خود پسند دولتمندوں کی ہوا کرتی ہے۔ جب کبھی انسان کو باہر سے کافی خوراک نہیں ملتی تو اس کے اندرونی سرمایہ دار معاً ذہن جسم کی تندرستی و طاقت بحال رکھنے کے لئے جمع کردہ غذائی دولت کے خزانوں کو بلا تامل نثار کر دیتے ہیں۔ دیگر حیوانات اور پودوں کے اجسام میں بھی غذا کی تقسیم کا اسی قسم کا کامل اور بے عیب طریقہ پایا جاتا ہے۔

اس مضمون پر ان شاء اللہ پھر کسی موقع پر مفصل بحث کی جائے گی۔ اس وقت صرف یہ بتلانا ضروری ہے کہ جہاں تک توانائی حاصل کرنے کا سوال ہے کسی جاندار جسم میں شکریات۔ نشاستہ۔

لحمیات اور روغنیات کی وہی اہمیت ہے جو مشین میں لکڑی ۔ کوئلہ ۔ تیل اور پٹرول وغیرہ کی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح انجن کی بھٹی میں ایندھن جلنے کے لئے آکسیجن کا موجود ہونا ضروری ہے اسی طرح پودہ یا حیوان کے جسم کے اندر غذائی اشیائ کے مکمل تجزیہ کے واسطے اس گیس کی موجودگی لازمی ہے ۔ غرضیکہ دونوں صورتوں میں آکسیجن جذب ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ چھوٹتی ہے نیز توانائی کی کثیر مقدار کسی نہ کسی شکل میں نجات پاتی ہے ۔ پہلے عمل کو احتراق اور دوسرے کو تنفس کہتے ہیں۔ اگرچہ سطحی طور پر ان دونوں تخریبی عملیات میں مشابہت پائی جاتی ہے تاہم ان کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔

تنفس تمام جاندار اجسام کی ایک اہم خصوصیت ہے ۔ کوئی حیوان یا پودہ ایسا نہیں جو مسلسل سانس نہ لیتا ہو جب تک جان باقی ہے ہر ذوی روح کے جسم میں آکسیجن کا انجذاب اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اخراج متواتر جاری ہے ۔ مگر جوں ہی موت آتی ہے یہ عمل ختم ہو جاتا ہے ۔ غرضیکہ تنفس زندگی کا نشانہ ہے اور عدم تنفس موت کا ثبوت ۔

پودوں میں کوئی مخصوص تنفسی اعضا نہیں ہوتے ۔ اس لئے وہ اپنے تمام حصوں سے آکسیجن جذب کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ باہر نکالتے ہیں ۔ بعض غیر معمولی حالات میں پودے آکسیجن حاصل کئے بغیر بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں ۔ چونکہ یہ عمل تخمیر سے مطابقت رکھتا ہے اسلئے اگر اسکو تخمیری تنفس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ۔ دراصل نباتاتی تنفس کی دو شکلیں ہیں ۔ اوّل ۔ آکسیجنی تنفس جس میں آکسیجن کی موجودگی کی وجہ سے شکر یا تی غذا مکمل طور پر کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں منتقل ہو کر مذکور توانائی کی رہائی کا باعث ہوتی ہے ۔ اس امر کی پہلے تشریح کیجا چکی ہے کہ سبز پودہ کاربن ڈائی آکسائیڈ ۔ پانی اور شعاعی توانائی سے شکر تعمیر کرتا ہے ۔ لہٰذا جب شکر کا تجزیہ عمل میں آتا ہے تو یہ تینوں اجزا کلی طور سے منتشر ہو جاتے ہیں ۔ دوم ۔ تخمیری تنفس جس میں شکر کی تحلیل نامکمل رہنے کی وجہ سے الکحل بن جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں نہ صرف توانائی کا نکاس بلکہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اخراج بھی آکسیجنی تنفس کی نسبت بہت کم ہوتا ہے ۔ اکثر حضرات نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ لکڑی پوری طرح سے جلنے کے بعد راکھ بن جاتی ہے ۔ اگر احتراق یعنی جلنے کا عمل پورا نہ ہو تو لکڑی کوئلہ میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ پہلی صورت میں توانائی کا سب ذخیرہ روشنی اور حرارت کی شکلوں میں زائل ہوتا ہے ۔ مگر دوسری حالت میں توانائی کی بیشتر مقدار کوئلہ میں مخفی رہتی ہے ۔ کم و بیش یہی فرق آکسیجنی تنفس اور تخمیری تنفس کے مابین پایا جاتا ہے ۔ بہرحال تخمیری تنفس سبز پودوں میں طبعی طریقۂ عمل نہیں ہے ۔

اس لئے عام طور پر آکسیجنی تنفس کو اختصار کی غرض سے صرف تنفس کہا جاتا ہے۔

علم النباتات کی بعض کتابوں میں تخمیری تنفس کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اگر سبز پودوں کو آکسیجن نہ ملے تو وہ جلد مرجاتے ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ بیان سراسر غلط ہے۔ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ نباتاتی اجسام آکسیجن کے بغیر بہت دیر تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت میں بعض اوقات ان کی صحت پر مضر اثر پڑتا ہے۔ تقریباً پندرہ سال گزرے کہ کیمبرج یونیورسٹی کے کہنہ مشق محقق ڈاکٹر بلیک مین اور ہندوستان کے مشہور ماہر نباتیات پروفیسر پریجا نے انگلستان کی شاہی انجمن کے سامنے ایک مشترک مقالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے اپنے تجربات کی بنا پر اس بات کا اعلان کیا تھا کہ کچھ عرصہ آکسیجن میسر نہ ہونے کے بعد سیب کا تنفس معمولی ہوا میں کسی قدر تیز پڑ جاتا ہے مگر چند گھنٹہ میں آہستہ آہستہ وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچے سیب کے تنفس پر عدم آکسیجن کا تقریباً ستر گھنٹہ کے بعد بھی کوئی مضر اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر وہ نیم پختہ ہو تو وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جس کو ڈاکٹر بلیک مین اور پروفیسر پریجا نے دریافت کیا تھا۔ البتہ پختگی مکمل ہونے کے بعد سیب اتنا کمزور اور حساس ہو جاتا ہے کہ اس میں آکسیجن کی غیر موجودگی کے ضرر رساں اثرات کو برداشت کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی اس لئے صرف تین یا چار گھنٹہ تک بلا آکسیجن رہنے کے بعد ہی اُس کی تنفس کی رفتار ہمیشہ کے لئے کم ہو جاتی ہے۔

جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر پودہ کے مختلف حصّوں کے تنفس میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً کلیوں میں پتوں کی نسبت سانس کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ نیز پتوں کے مقابلہ میں ٹہنیوں اور جڑوں کا تنفس کمزور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں پودہ کا ہر حصّہ اپنی عمر کے مطابق کبھی آہستگی اور کبھی سرعت کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ اس امر کی مفصّل تشریح ذیل میں کی جائے گی۔ یہاں پر یہ بتلانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ عالم نباتات میں بھی تذکیر و تانیث کا سلسلہ موجود ہے۔ جہاں تک سانس کا تعلق ہے نر کو مادہ پر فوقیت حاصل ہے۔ یعنی نر پودہ کا کوئی حصّہ مادہ کے اُسی حصّہ کی نسبت کسیقدر تیزی سے سانس لیتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پودوں کے مختلف اعضا کی عمر کا ان کے تنفس پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اس امر کی وضاحت کرنے کے لئے پھل سب سے بہتر شے ہے۔ کسی مکمل مگر کچے سیب کا امتحان کرنے سے یہ بات بآسانی معلوم ہو سکتی ہے کہ نشو و نما کے معراج پر پہنچ کر اُس کا پوست سخت اور گہرا سبز اور جسم گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ صورت میں کشش مگر مزاج میں ترشی ہوتی ہے۔ اِس زمانہ کو اگر سیب کا عہد شباب کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اپنی حیات کی اِس خوشگوار منزل پر پہنچ کر وہ جوانی کے نشہ میں

پہلے کسی قدر تیز مگر پھر آہستہ سانس لیتا ہے۔ بعدازاں اس کے چہرہ پر زردی اور سرخی اور جسم میں بتدریج علاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ نیز قدرت اس کے ڈھلتے ہوئے جسم کو مختلف اقسام کے عطریات سے معطر کرتی ہے۔ زندگی کے اس دور میں داخل ہو کر سیب کے تنفس کی رفتار یکایک بڑھنے لگتی ہے۔ بےخبر مصور سیب کے ظاہرہ رنگ و روپ سے متاثر ہو کر اس کی شکل وصورت کی تصویر کھینچتا ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ بےچارہ سیب اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی کا احساس کر کے پریشاں اور ہراساں ہے۔ اور نہایت اضطراب اور گھبراہٹ سے لمبے لمبے سانس لیتا ہے۔ نیز رنگین طبع عاشق اپنی نوعمر معشوقہ کے خوبصورت رخسار کو خوش رنگ سیب سے تشبیہ دیتا ہے۔ مگر وہ بھی نہیں سمجھتا کہ سیب کو عشق ومحبت کی داستان سے کچھ دلچسپی نہیں۔ اس کا جوش اور ولولہ قریب الاختتام ہے اور وہ بیتابی کے ساتھ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ ہاں اگر پختہ سیب کو کسی متوسط عمر کی شیریں مزاج خاتون کے نورانی چہرہ سے مشابہت دی جائے تو بعید از عقل نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ بعض حاسد مردوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ راقم الحروف نے مرد کو یہ عزت کیوں نہیں دی۔ درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ نباتاتی دنیا میں پھل کسی حد تک وہی فرائض ادا کرتا ہے جو حیواناتی دنیا میں مادہ سرانجام دیتی ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا منزل سے گزرنے کے بعد سیب بڑھاپے سے مغلوب ہو کر نڈھال ہو جاتا ہے۔ اس کی نرم جلد پر جھریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اور ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے سانس کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اس کمزوری اور بیچارگی کی حالت میں مختلف اقسام کے جراثیم چیلوں۔ کوؤں اور گدھوں کی مانند اس کے نیم مردہ جسم کو کھانے لگتے ہیں۔ آخر کار ان مصیبتوں کو خاموشی سے برداشت کرنے کے بعد بےبس سیب ایک ہلکا سانس لے کر ہمیشہ کے لئے بےجان ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سیب لقمۂ اجل ہونے سے پہلے بالعموم لقمۂ دہن بن جاتا ہے۔

جب مکمل ہرا سیب درخت سے توڑ کر علیحدہ کیا جاتا ہے اُس وقت اُس کے اندر اُن خاص شکریات کا کافی ذخیرہ موجود ہوتا ہے جو تنفس کے لئے براہ راست استعمال میں آتی ہیں۔ اس لئے تنفس کسی قدر تیز ہوتا ہے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے اس قسم کی شکریات کی مقدار بتدریج کم ہونے کی وجہ سے تنفس بھی نسبتاً گھٹ جاتا ہے۔ جب سیب پکنا شروع ہوتا ہے تو اُس زمانہ میں اُس کا فعلیاتی نظام رفتہ رفتہ اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ شکریات اور تحلیلی عمل پیدا کرنے والی اشیا میں آزادانہ اختلاط ہونے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں شکریات کے تجزیہ کی رفتار بڑھنے

کی وجہ سے تنفس میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مخصوص شکریات کے ذخیرہ میں کمی واقع ہونے کے باعث تنفس کی رفتار پھر آہستہ ہو جاتی ہے۔

بیرونی حالات کا زندہ نباتاتی اجسام کے تنفس پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ مثلاً آکسیجن کی مقدار بڑھانے یا گھٹانے سے تنفس علی الترتیب تیز یا سست ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر بلیک مین نے تجربات سے معلوم کیا تھا کہ سیب کا تنفس ۵تا۱۰ فیصدی آکسیجن میں کم سے کم درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سنگھ نے ڈاکٹر بلیک مین کی نقالی کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ لنگڑا آم کا تنفس ۹ فیصدی آکسیجن میں حد درجہ تک گر جاتا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں ان دونوں ماہرین سائنس کے تجربات کے نتائج کسی قدر نامکمل ہیں۔ اصل میں واقعہ یہ ہے کہ پختگی شروع ہونے کے وقت سیب کو کم از کم سانس لینے کے لئے صرف ڈیڑھ فیصدی آکسیجن درکار ہوتی ہے۔ اس کے بعد جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اسی طرح سانس کو حد درجہ تک گھٹانے کے لئے زیادہ آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ڈھلکے ہوئے سیب میں مذکورہ بالا کیفیت پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات ۱۲ فیصدی سے بھی زیادہ آکسیجن استعمال کی جاتی ہے۔ اگر بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر سنگھ مختلف عمر کے لنگڑا آم لیکر تجربات کرتے تو ان کو اپنی غلطی کا خود احساس ہو جاتا۔

ایک مرتبہ پھلوں کے تنفس پر تجربہ کرتے ہوئے چند تندرست اور تر و تازہ سیبوں کو ایک موٹے آہنی صندوقچہ کے اندر بند کر کے آلات کے ذریعہ اُن پر خالص آکسیجن کا دباؤ ڈالا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دباؤ کی شدت کی وجہ سے سیبوں نے اچانک سانس لینا چھوڑ دیا۔ اگرچہ سیبوں کی شکل وصورت اور ذائقہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اُن میں زندگی کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک یا دو روز تک کمرہ میں بلوری ڈھکن کے اندر رکھا رہنے کے بعد ان کے مردہ جسم جانوروں کی لاشوں کی مانند سڑنا شروع ہو گئے۔ یہ ایسا معمہ ہے جس کے متعلق وثوق کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آکسیجن کی مانند حرارت کی کمی و بیشی سے بھی تنفس بڑھتا یا گھٹتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر متنفس کی حیات کا طول معین ہے۔ مگر یوگ کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہر شخص کے سانس کی مقدار مقرر ہے۔ اس لئے تیز سانس لینے سے عمر گھٹتی اور آہستہ سانس لینے سے عمر بڑھتی ہے۔ جہاں تک نباتاتی اجسام کا تعلق ہے یوگیوں کا دعویٰ کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ درخت سے علیحدہ ہونے کے بعد پھل کے جسم سے کاربن ڈائی آکسائڈ کی جو مقدار خارج ہوتی ہے اُس کا وزن فطرت کے رجسٹر میں غالباً پہلے سے درج ہوتا ہے۔ اگر پھل کسی وجہ سے جلدی سانس لینا شروع

کرنے تو وہ نسبتاً قلیل مدت تک زندہ رہتا ہے۔ برخلاف اس کے تنفس کی رفتار آہستہ ہو جانے سے اس کی عمر طویل ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ دونوں صورتوں میں خارج شدہ کاربن ڈکسائڈ کی کل مقدار تقریباً مساوی ہوتی ہے۔ اس قانون قدرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے محققین نے وقتاً فوقتاً ایسے ذرائع دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جن کے استعمال سے تنفس کو ضرورت کے مطابق ہلکا کرکے پھل کو عرصہ دراز تک محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً سردی میں پھل دیر تک قائم رہتا ہے۔ نیز ہوا میں آکسیجن کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ عرصہ تک ٹھیک رہ سکتا ہے۔ اس لیے پھلوں کو برقرار رکھنے کے لئے عام طور پر یہ دونوں طریقے بیک وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ گرمی کی وجہ سے پھل سرعت کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گرمی میں وہ جلدی پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں ہزاروں من کیلوں اور دیگر پھلوں کو ایتھلین گیس کی مدد سے بھی پختہ کیا جاتا ہے۔ یہ گیس کوئلہ کے دھوئیں میں موجود ہوتی ہے اور اس کے اثر سے نباتاتی اجسام کا تنفس بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس امر کا انکشاف پہلی مرتبہ تقریباً بیس سال قبل ایک نوجوان انگریز ہر کلاٹس نے کیا تھا۔ اس کے بعد امریکہ کے سائینسدانوں نے خود بخود اس حقیقت کو دریافت کر لیا۔ بدقسمتی سے دنیائے سائینس بیچارے ہر کلاٹس کے دلچسپ تجربات سے اب تک بے خبر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پتوں کے تنفس کا مطالعہ کرنے کے دوران میں ایک صبح ہر کلاٹس کو تنفس کی رفتار میں اچانک تیزی دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ چونکہ بعض اوقات مختلف امراض کی وجہ سے نباتاتی اجسام کا تنفس معمول سے تجاوز کر جاتا ہے اس لئے سب سے پہلے اُس نے تجرباتی پتوں کا بغور امتحان کیا مگر وہ بالکل صحیح و سالم تھے۔ اس کے بعد اُس نے آلات کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کی مگر وہ بھی ہر ممکن نقص سے پاک تھے۔ بعد ازاں پریشانی اور مایوسی کی حالت میں وہ اپنے اُستاد کے پاس پہنچا اور ان کو اس قسم کی شیطانی مداخلت سے آگاہ کیا۔ تمام واقعہ سُن کر اُستاد مسکراتے ہوئے اور بڑے اعتماد کے ساتھ کمرہ میں گئے۔ وہاں داخل ہوتے ہی انھوں نے کمرہ کی فضا میں کوئلہ کی گیس کی بدبو محسوس کی جس کو ہر کلاٹس زکام کی وجہ سے معلوم نہیں کر سکا تھا۔ تحقیقات کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک نو آوردہ اور ناتجربہ کار ملازم نے پہلے روز شام کے وقت کپڑے کے جھاڑن سے میز پر صاف کرتے ہوئے بے خبری میں گیس کی ٹونٹی کو تھوڑا سا کھول دیا تھا۔ اس لئے رات بھر گیس آہستہ آہستہ ہوا میں مل کر بیرونی نلکی کے راستہ سے پتوں کی صندوقچی کے اندر داخل ہوتی رہی۔ اگلے روز صبح کے وقت جب ملازم مذکور کو

اپنی غلطی کا احساس ہوا تو خوف زدہ ہو کر اس نے سب سے پہلے گیس کی ٹونٹی بند کی اور پھر کمرہ کی ہوا صاف کرنے کی غرض سے تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ چونکہ باہر ہوا تیز چل رہی تھی اس لئے تھوڑی دیر کے بعد کمرہ کی فضا بہت حد تک صاف ہو گئی۔ غرضیکہ اس دلچسپ حادثہ نے یہ بات منکشف کر دی کہ نباتاتی تنفس پر کوئلہ کی گیس کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ مزید تحقیقات کے بعد ہر کلائس نے معلوم کر لیا کہ کوئلہ کی گیس کے جز ویات میں سے زیادہ تر ایتھیلین گیس کی وجہ سے نباتاتی اجسام بےچین ہو کر سرگرمی سے سانس لینے لگتے ہیں۔

حال ہی میں یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ قدرت خود پکتے ہوئے پھل کے اندر ایتھیلین گیس نہایت قلیل مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اگر کسی تیار پھل کو گدرے پھل کے ساتھ ایک چھوٹے بکس میں بند کر دیا جائے تو پختہ پھل کی پیرانہ صحبت سے متاثر ہو کر خام پھل بھی جلدی پکنے لگتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پکے ہوئے پھل کے جسم سے گیس نکل کر کچے پھل میں داخل ہوتی ہے اور اس کے تنفس کی رفتار کو تیز کر دیتی ہے۔ غرضیکہ خربوزہ کا خربوزہ کو دیکھ کر رنگ بدلنا ایسی حقیقت ہے جس سے اب کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

بہت مدت ہوئی کہ بعض سائنسدانوں نے معلوم کیا تھا کہ کچھ دیر روشنی میں رکھا رہنے کے بعد سبز پتّہ کے تنفس میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ دراصل روشنی کے اثر کی وجہ سے ترکیب شعاعی عمل میں آتی ہے۔ اور شکریات کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ تنفس کی رفتار کسی حد تک شکریات کی مقدار پر منحصر ہوتی ہے اس لئے روشنی کے بالواسطہ اثر سے سبز پتہ کا تنفس تیز ہو جاتا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ نباتیات کے صدر پروفیسر نسری رنجن نے وسیع پیمانہ پر تجربات کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ روشنی براہ راست اثر پذیر ہو کر تنفس میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اگرچہ راقم الحروف کو پروفیسر موصوف کے نتائج سے کلیتاً اختلاف نہیں مگر اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس پیچیدہ مسئلہ کو مکمل طور پر حل کرنے کے لئے مزید تحقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

آجکل تعلیمیافتہ لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بیمار اور کمزور اشخاص کے لئے ڈاکٹر بالعموم انگوری شکر تجویز کیا کرتے ہیں۔ اس شکر کے کھاتے ہی جسم میں کچھ عرصہ کے لئے طاقت محسوس ہونے لگتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ایک تجربہ کار اور قابل معلّم جن کا جسم کسی قدر لاغر ہے ٹینس کھیلنے سے پہلے کبھی کبھی انگوری شکر کھایا کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے استعمال سے جسم میں طاقت آجاتی ہے۔ اسی طرح اگر پودہ کے کسی جاندار عضو میں شہد یا انگوری شکر کا ہلکا شربت پچکاری کے ذریعہ داخل کیا جائے

تو وہ بھی چست ہو کر تیزی سے سانس لینے لگتا ہے۔

تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ پودہ کا ہر نازک حصہ نہایت حساس ہوتا ہے۔ اگر کسی تندرست پتہ کو انگلی سے چھوا جائے تو اس کے تنفس کی رفتار فوراً تیز ہو جاتی ہے۔ دراصل کمسنی اور نوجوانی کے زمانہ میں پتہ ذکی الحس اور نازک طبع ہوتا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے اُسی نسبت سے اُس کے خواص کمزور ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت پھلوں کی ہے۔ اگر کچے پھل کی جلد کو نشتر سے کاٹا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد شگاف مندمل ہو کر خشک ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے پکے پھل کی جلد پر اس قسم کا معمولی جرّاحی عمل کرنے کے بعد زخم کبھی درست نہیں ہوتا بلکہ سڑنے لگتا ہے۔

اکثر حضرات نے دیکھا ہوگا کہ بدنصیب شرابی وہسکی کا پہلا جام پیتے ہی بے حجاب ہو کر بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ قہقہہ لگاتا ہے۔ گاتا ہے اور بعض اوقات ناچتا ہے۔ دوسرا پیالہ خالی کرنے کے بعد اس کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ آواز بدل جاتی ہے۔ جسم میں طاقت نہیں رہتی اور ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ تیسرا دَور ختم کرتے ہی روسیاہ شرابی بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑتا ہے۔ اگر کہیں بہت زیادہ چڑھا لے تو پھر موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ کم و بیش یہی حال نباتاتی اجسام کا ہے۔ اگر پتّہ کے نازک جسم میں ہلکی شراب داخل کیجائے تو وہ مسرور ہو کر سرعت کے ساتھ سانس لینا شروع کرتا ہے۔ شراب زیادہ مقدار میں پہنچانے کے بعد اس کا تنفس بڑھتی ہوئی بدمستی کی وجہ سے بتدریج کم ہونے لگتا ہے۔ آخرکار بے گناہ پتّہ اِس تباہ کُن شے کے زہریلے اثر سے مغلوب ہو کر بالکل مردہ ہو جاتا ہے۔

افیون اور اس قسم کے دوسرے مرکبات کا اثر بھی نباتاتی تنفس پر یہی ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اس امر کی چند الفاظ میں تشریح کرنا ضروری ہے کہ تنفس کی رفتار درحقیقت نباتاتی جسم کے تخریبی عملیات کی شدّت کو ظاہر کرتی ہے یعنی تنفس کا تیز یا سُست ہونا تخریبی عملیات کی زیادتی یا آہستگی کا ظاہرہ ثبوت ہے۔ اگر کسی وجہ سے سانس کی رفتار بڑھتی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ نباتاتی جسم کے اندر غذائی اشیاء کی کیمیائی ٹوٹ پھوٹ سُرعت کے ساتھ ہونے لگتی ہے۔

گزشتہ موسم گرما میں ایک دن صبح سویرے راقم الحروف چہل قدمی کرتا ہوا نقوی پارک کی طرف نکل گیا۔ اُس وقت عجیب و غریب منظر تھا۔ موذن کی درد بھری آواز۔ کوئل کی جگر سوز فریاد اور پپیہہ کی فلک شگاف صدا سے فضا گونج رہی تھی۔ بادِ سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے درختوں کی

نازک ڈالیوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مگر مشرق کی جانب ارض و سما اپنے چہروں سے سیاہ نقاب اُٹھتا دیکھ کر شرم کی وجہ سے گلابی رُو ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی قدر اُجالا ہو گیا اور ہر شئے دکھلائی دینے لگی۔ اس وقت راقم الحروف کی نظر ایک تنہا پتہ پر پڑی جو ایک لمبی اور پتلی شاخ کے سرے پر ٹھنڈی ہوا میں جھوم جھوم کر اپنے خالق کی حمد و ثنا کر رہا تھا۔ راقم الحروف نے دل ہی دل میں پتہ سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا وہ ذیل میں درج ہے۔ دراصل یہ مختصر خطاب آج کے مقالہ کا خلاصہ ہے۔

اے نازک برگِ سبز! کیا تجھے معلوم ہے کہ خود غرض اور مغرور انسان تیری اصلیت سے ناآشنا ہے۔ وہ تیری دلفریب رنگینی اور خوشنما شکل دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے مگر تیری حقیقت سے غافل ہے۔ وہ اپنی عظمت کے نشہ میں تجھے کائنات کا صرف زمرّدی زیور تصور کرتا ہے۔ اُس کو کیا خبر کہ تیرے نازک جسم کا ہر رگ و ریشہ خالقِ دوعالم کی حیرت انگیز صنعت اور کاریگری کا شاہد ہے۔ اور تیری ادنی ہستی میں قدرت کے عظیم الشان راز پنہاں ہیں۔ اِسے کیا علم کہ تو قانون فطرت کی ایک ورقہ کتاب ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ تیری زندگی کا ہر فعل اِس کے لئے سبق آموز ہے۔ تو ہر لمحہ پروردگارِ عالم کے قانون پر پابند ہے۔ تجھے "اَلصَّلوٰۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمُ" کے پیغام کی ضرورت نہیں۔ یہ منادی صرف خوابیدہ اور راحت پسند لوگوں کے لئے ہے۔ تجھے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔ تو مستقل طور پر پاک اور صاف ہے۔ نماز اور روزہ تجھ پر فرض نہیں۔ تیرا ہر فعل بذاتِ خود عبادتِ الٰہی ہے۔ غرضیکہ تو اپنے معبود کا فرمانبردار بندہ ہے۔

اے ہری پوشاک والے! تیری رگوں میں خون نہیں مگر تیرے جسم کا ہر خلیّہ زندگی کا مسکن ہے۔ تیرے پہلو میں قلب نہیں مگر تیرے سینہ میں احساسات کا دریا موجزن ہے۔ تو شگفتہ ہو یا پژمردہ۔ مسرور ہو یا رنجور۔ ہر حالت میں

مہر بہ لب ہے۔ صرف ترجمانِ فطرت ہی تیرا راز دار ہے۔ وہ تیرے تنفس کی رفتار کا امتحان کر کے تیری اصلی کیفیت کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ تو معصوم ہے مگر ذلیل نہیں۔ خاموش ہے مگر بے حس نہیں۔ اپنی عمر کا بہترین حصہ محنت و مشقت اور بے لوث خدمت میں صرف کر کے آخر کار خزاں کے موسم میں جوگیا کفنی اوڑھ کر دم توڑتا ہوا مادرِ وطن سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اور تھوڑی دیر ہوا میں منڈلا کر زمین پر گرتا ہے اور ہمیشہ کے لئے پیوست خاک ہو جاتا ہے۔ تیری معصومیت، بے غرضی اور بے نیازی عدیم المثال ہے۔

اے سبز پوش برگ! شباب ہو یا پیری۔ گرمی ہو یا سردی۔ ہر حالت اور ہر موسم میں تو اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ تیرا علی الصباح بیدار ہو کر مصروفِ کار ہونا اور پھر دن بھر آفتاب کی روشنی میں سادہ اشیاء سے شکریات۔ نشاستہ اور دیگر مرکبات تیار کرنا ایسا عقدہ ہے جس کو شہرۂ آفاق ماہرینِ سائنس بھی سالہا سال کی کاوش کے بعد حل نہ کر سکے۔ تیرے کرشمات دیکھ کر وہ آج تک محو حیرت ہیں۔ مگر تو ہے کہ ان کمالات کے باوجود عجز و انکساری کا مجسمہ ہے۔ تیری ہی مسلسل محنت و مزدوری پر عالمِ ذی رُوح کا انحصار ہے اور تو ہی عالمِ ذیحیات کا پیٹ پالتا ہے۔ بیشک تو رزق کا فرشتہ ہے۔ بدطینت اور بدکردار انسان اشرف الکائنات ہو یا نہ ہو مگر بالیقین تو رازق المخلوقات ہے۔[۱]

رفیق احمد

۱؎ یہ مقالہ فروری ۱۹۴۵ء کو مجلس مصنفین علی گڑھ کے ترپنویں (۵۳) اجلاس میں زیر صدارت ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر پڑھا گیا۔

نقد و نظر

اوراقِ گل

مرتبہ خان بہادر مولوی ضمیر احمد ہاشمی ڈپٹی ریونیو منسٹر رامپور۔ صفحات ۳۶۷۔ حجم ۲۶ × ۲۰ / ۸ آرٹ پیپر۔ عمدہ لکھائی چھپائی اور مجلّد شایع ہوئی ہے۔ سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ ریاست رامپور کی یہ چھٹی کتاب ہے۔

اوراقِ گل ہندوستان کے انتیس ۲۹ چوٹی کے شعرائے عہدِ حاضر کی تصاویر۔ عکس تحریر۔ حالاتِ زندگی اور انتخاب کلام کا ایک دل آویز مجموعہ ہے۔

'بزمِ سخن' رامپور کے مختلف مشاعروں کے 'گل دستہ' کو جس جدت اور اچھوتی ترتیب و تزئین کے ساتھ سجایا گیا ہے وہ مصطفیٰ آباد رامپور کے موجودہ دَورِ ترقی اور حسنِ مذاق کی بہترین مثال ہے۔

'اوراقِ گل' کی اشاعت سے پہلے ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالہم و ملکہم، سادہ اور سپاہیانہ زندگی بسر کرنے اور اپنی رعایا کی تعلیمی۔ تجارتی اور صنعتی ترقی میں پر دست جوش و ولولہ کے ساتھ ہمہ وقت مصروف رہنے کے باوجود ایک نغز گو شاعر بھی ہیں اور اس خصوص میں اپنے بلند مرتبت "صاحبِ سیف و قلم" اسلاف کے صحیح جانشین ہیں۔ 'اوراقِ گل' کو اعلیٰحضرت بندگانِ ہمایوں کی تصویر اور ایک ہندی منقبت سے بھی زینت دی گئی ہے۔

عُلیا حضرت ہز ہائی نس رفعت زمانی بیگم صاحبہ دام اقبالہا کا کلام فرحت انضمام بھی جو سونے پر سہاگے کا مرادف ہی رونق افزائے 'اوراقِ گل' ہے۔ بیگم صاحبہ کی غزل ملاحظہ ہو: ؎

ایسے بیمار کی دوا کیا ہے — جو بتاتا نہیں ہوا کیا ہے
کون سنتا ہے اس زمانے میں — کس سے کہئے کہ التجا کیا ہے
لبِ بیمار تھر تھراتے ہیں — جھک کے سنئے کہ مدعا کیا ہے
مجھ کو جو دیکھتا ہے روتا ہے — کوئی کیا جانے ماجرا کیا ہے
درد پر دوسروں کے ہنس دینا — یہ بھی اچھا ہے تو برا کیا ہے

فخرِ خاتونِ ہند ہے عصمت
ہم سے پوچھے کوئی وفا کیا ہے

'اوراقِ گل' کی فاضلانہ "تقریب" جناب کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب بہادر سی۔ آئی۔

ای۔ بی۔ اے (کینٹب) بار ایٹ لا وزیر اعظم ریاست رامپور نے اور دیباچہ خود لائق مرتب نے سپرد قلم فرمایا ہے۔ آخر میں اشاریہ (انڈکس) ہے جو اردو کی کتابوں میں بہت کم ہوتا ہے۔

ہماری تمنا ہے کہ کتاب خانۂ رامپور کی مطبوعات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے اور نہ صرف ادبی کتابوں کی اشاعت سے زبان اردو کو مالا مال کیا جائے بلکہ اُن علمی و تاریخی نوادر کو بھی کام میں لایا جائے اور اُن کو چھاپنے کی جانب توجہ شاہانہ مبذول کرائی جائے جن کے لئے کتاب خانۂ رامپور سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔

خوش قسمتی سے مولانا امتیاز علی خانصاحب عرشی جیسے ذہین و طبّاع اور انتھک کام کرنیوالے عالم کتاب خانہ کے ناظم ہیں اور اُن کی موجودگی سے اس سے زیادہ فائدہ اُٹھائے جانیوالی کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ آخر میں ہم دوبارہ 'اوراقِ گل' کی اشاعت کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جناب مرتب کی خدمت میں اُن کی اس کامیاب ادبی خدمت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مجلّہ طیلسانین انجمن طیلسانین جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی علمی رسالہ ہے۔ اس کا شمار حیدرآباد کے معیاری رسالوں میں کیا جاتا ہے۔ اِس کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّہ عام اور دوسرا حصّہ معاشیات۔

حصّہ عام میں ادبیات، سیاسیات، عمرانیات، اخلاقیات، نفسیات، قانون اور فلسفہ پر ماہرینِ فن کے مضامین شایع ہوتے ہیں۔

حصّہ معاشیات صرف معاشی عنوانات کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس میں نظری اور عملی معاشیات پر اہلِ قلم کے مضامین شامل ہوتے ہیں اور مقامی و بیرونی مسائلِ حاضرہ پر علمی پیرائے میں بحث کیجاتی ہے۔

یہ رسالہ رائل سائز کے کم از کم دو سو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اعلیٰ مضامین اور اسقدر زیادہ ضخامت کے باوجود اس کا سالانہ چندہ مقامی خریداروں سے پانچ روپے سکۂ عثمانیہ اور بیرونی خریداروں سے ۴ ۱۲ سکۂ انگریزی مع محصول ڈاک ہے۔ ملنے کا پتہ:۔

دفتر مجلّۂ طیلسانین باغِ عامہ حیدرآباد دکن

شاعراتِ اردو ۸۳۲ صفحات کی اس ضخیم باتصویر اور مجلّد کتاب کو قومی کتب خانہ بریلی نے حال میں شایع کیا ہے۔ اس کتاب کا عرصہ سے انتظار تھا اب اُسے زیورِ طبع سے آراستہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔

بریلی روہیلہ مجاہدین اسلام کی حکومت کا دار السلطنت اور جدید روہیلکھنڈ کا صدر مقام ہے۔ صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے پانچ بڑے شہروں میں اُس کا شمار ہے۔ ایک ڈگری کالج ۳ انٹرمیجیٹ کالج

اور قریب ایک درجن لڑکوں اور لڑکیوں کے ہائی اسکول ہیں لیکن وہاں آجتک اُردو کی کتابوں کا کوئی قابل ذکر کتب خانہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو ایک باہمت اور ذوق سلیم رکھنے والے عزیز منشی خلیل الرحمٰن نے پورا کیا اور اُن کا قایم کردہ "قومی کتب خانہ" روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس کتب خانہ میں ہندوستان کی قریب قریب تمام جدید مطبوعاتِ اردو فروخت ہوتی ہیں۔

خلیل الرحمٰن صاحب نے خود اپنی کتابیں شایع کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے۔ "شاعراتِ اُردو" سلسلۂ مذکور کی پہلی کتاب ہے۔ کتاب کیا ہے اُردو زبان کی ترقی میں خواتین نے جو حصّہ لیا ہے اُس کی مکمل قاموس اور ایک سیر حاصل جائزہ (سَروے) ہے۔

لائق مؤلف محمد جمیل احمد ایم۔ اے بریلوی نے تاریخ ادبیاتِ اُردو کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے نہایت قیمتی مواد فراہم کردیا ہے جس کی امداد سے آیندہ کام کرنیوالوں کی مفید رہنمائی ہوگی۔

"تذکرۂ شاعراتِ اردو" ہر اردو داں گھر میں موجود رہنا چاہئے تاکہ اُس کے مطالعہ سے ہماری خواتین میں ذوقِ ادب پیدا ہو۔ اس کتاب کی قیمت پچیس روپے بھی کم ہوتی لیکن صرف ؏ ۱۲ میں ملتی ہے۔ (سیّد الطاف علی بریلوی)

سنٹرل دواخانہ دہلی

یہ دواخانہ فی الحقیقت باصطلاح عام "دواخانہ" نہیں ہے بلکہ "دواسازی کا کارخانہ" ہے جس کے لئے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ باندازِ کیمیادی یونانی دواسازی کا دہلی کیا بلکہ ہندوستان میں یہ پہلا کارخانہ ہے جس نے صحیح معنوں میں دواسازی کی رہنمائی کی۔ حکیم سید انوار احمد صاحب اشرف دہلوی نے۔ جو اب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس فن کو۔ جو الکلیہ اس لئے موروثی فن ہے کہ اس فن کے امام حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تھے۔ بام عروج پر پہنچا کر طب یونانی میں چار چاند لگا دئے۔ ایسی محنت اور تحقیقات دواسازی کا یہ ثمرہ ہے کہ آج اس کو شاہ دکن کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ۲ دو فرمان جن کا عکس فہرست زیر نظر میں شایع کیا گیا ہے۔ اس اعتماد کی شہادت دے رہے ہیں جو اس دواخانہ کو جو اس کو دواسازی کی دنیا میں حاصل ہے۔ اور جو بالخصوص شاہ دکن کو ہے۔ مرحوم و مغفور حکیم اجمل خاں بہادر کے اعتماد کے متعلق صرف یہ لکھدینا کافی ہے کہ وہ میر صاحب کو اپنے وقت کا "جابر بن حیان" سمجھتے تھے جو دوسری صدی ہجری کا امام الکیمیا گزرا ہے۔

غرضکہ حکیم سیّد انوار احمد صاحب اشرف کا یہ دواخانہ کم و بیش ساٹھ سال سے وہ انسانی خدمات انجام دے رہا ہے جس کی مثال طبی دنیا میں مشکل سے ملتی ہے۔ فقط (مینجر)

رسائل ۶۳۸

مصنف

نمبر ۹

مجلس مصنفین علی گڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

زیرِ ادارت

[illegible]

الطاف [illegible] بیگ

قیمت سالانہ [illegible] روپئے

(1.9125

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باہتمام خان صاحب جواہر خاں

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا

ذکرِ ماضی

اور

فکرِ فردا

"سرسید اور اُن کے نورتن۔ محسن الملک۔ وقار الملک۔ مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ مولوی سلیم پانی پتی۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی اور نواب عماد الملک نے ہندوستان کے سب سے بڑے تعلیمی و ثقافتی مرکز علی گڑھ کی ترقی پسند علمی و تحقیقی روایات کا آغاز کیا۔

عہدِ ثانی کے نورتن نواب صدر یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ مولوی عبد الحق۔ مولانا طفیل احمد۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سجاد حیدر یلدرم۔ مولوی عزیز مرزا اور مولوی عنایت اللہ نے روایات مذکورہ کو قائم و ترقی پذیر رکھا۔

تیسرے دور کے نورتن۔ رشید احمد صدیقی۔ عبد الماجد دریابادی۔ خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ ہاشمی فرید آبادی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ پروفیسر حبیب۔ قاضی تلمذ حسین اور پروفیسر الیاس برنی نے علی گڑھ کی علمی و ادبی رونق کو چار چاند لگا دئے۔

پہلی محفل کے نورتن اپنی اپنی آب و تاب دکھا کر رخصت ہو گئے۔ دوسری مجلس کے بھی کچھ نورتن داغِ مفارقت دے گئے۔ عہدِ ثالث کے نورتن اپنی پوری درخشانی و تابانی کے ساتھ ہندوستان کی دنیائے علم و ادب کو منور کئے ہوئے ہیں۔

اب چوتھے دور کا آغاز ہے۔ سپیدۂ صبح نو نمودار ہو چکا ہے۔ نئی تزئین۔ اور نئے پھبن کے ساتھ ایک نیا دربارِ علم و فن ترتیب دیا گیا ہے۔

دوسرے اور تیسرے دور کے بڑے بڑے ممتاز اکابر نمایاں نشستوں پر متمکن ہیں۔ مگر بیچ بیچ میں بہت سی کرسیاں خالی ہیں۔

سرسید کے جانشینِ علمی اور دربارِ علم کے "صدر الصدور" کا فرمان ہے کہ اُن کو پورا کیا جائے اور آج کے انعقادِ دربار کی یہی غایت ہے۔

کون کہاں بیٹھے اور کیا کام کرے، یہ فریضہ ایک "قریشی النسل حکیم و دانا" کو سپرد کیا گیا ہے۔

دربارِ علم کا نقیب حضرت "صدر الصدور" کے ایما پر اس مبارک کام کے افتتاح کی درخواست کرتا ہے

بیا کہ تازہ نوائی تراود از رگِ ساز ۔۔۔ مئے کہ شیشہ گداز د بساغر اندازیم

یہ تھا وہ "سپاس نامہ" جو جناب خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی صاحب ایم۔ اے صدر شعبۂ ریاضی پرووسٹ سرسید ہال۔ ممبر اگزیکٹو کونسل مسلم یونیورسٹی۔ ممبر ایجوکیشن بورڈ یو پی و آنریری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت میں "مجلس مصنفین" اور اس کے سہ ماہی علمی رسالہ "مصنف" کے دفتر "بیت المصنف" کی رسم افتتاح کے موقع پر، نومبر ۴۴ء کو پیش کیا گیا۔ قریشی صاحب نے بھی تقریر فرمائی جو حد درجہ "حکیمانہ" اور ساتھ ہی پُر لطف تھی۔ "مصنف" کے صفحات کم ہو جانے کے باعث پوری تقریر نقل نہیں کی جا سکتی۔ البتہ وہ اشعار نذرِ ناظرین کئے جاتے ہیں جو موصوف نے مجھ ناچیز کے بارے میں ارشاد فرمائے ؎

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ میخواہم ازیں ۔۔۔ تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

با چنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم ۔۔۔ در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

"بیت المصنف" کی رسم افتتاح کے ٹھیک چار روز بعد ۱۱ر نومبر ۴۴ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں جناب خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی صاحب کی جانب سے "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے قیام کی اسکیم پیش ہو کر منظور ہوئی جس کی ملک کے اسلامی حلقوں میں آجکل دھوم ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے قایم ہونے سے نہ صرف وقت کی ایک اہم ترین ضرورت پوری ہو گی۔ بلکہ مسلمانانِ ہند کے قدیم تعلیمی ادارہ کانفرنس کو بھی ایک نئی زندگی مل جائیگی۔ یہ ہے اُس خواب کی جاں نواز تعبیر جو راقم السطور نے متذکرۂ بالا سپاس نامہ سپردِ قلم کرتے وقت دیکھا تھا۔ ایک شاعرانہ اور موہوم تمنّا کا اسقدر جلد بابِ اجابت تک پہنچنا اور واقعہ کی شکل اختیار کر لینا ایسی عجیب و غریب خوش نصیبی ہے کہ اُس پر جسقدر بھی اظہارِ شکر کیا جائے کم ہے۔

ہمارے "دربارِ علم کے صدر الصدور" جناب ڈاکٹر الحاج مولوی محمد حبیب الرحمن خانصاحب شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس نے سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی مجوزہ اسکیم کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ :-

"سر سید علیہ الرحمہ نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو قائم کیا اور اُس کا سب سے بڑا مقصد اور نصب العین یہ رہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بہر ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح قسم کی تعلیم کو رائج کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے گزشتہ اٹھاون سال کی مدت میں نہایت استقلال کے ساتھ تصنیف و تالیف و تراجم کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت۔ اردو کی ترویج اور ترقی کے ذرائع کی بہم رسانی۔ معلومات تعلیمی کے لئے اعداد و شمار کی ترتیب و تدوین۔ اصلاحِ تمدن کے وسائل کی تحقیق و اشاعت۔ ضرورت مند طلبہ کو وظائف۔ مدارس و انجمن ہائے اسلامیہ کو امداد اور ملک کے طول و عرض میں صوبائی اور آل انڈیا تعلیمی کانفرنسوں کے انعقاد وغیرہ کی شاندار خدمات انجام دیں۔ لیکن ان کارناموں کے باوجود ہمارے گرد و پیش آجکل علمی تحقیق و تدقیق نیز تعلیمی۔ صنعتی اور اقتصادی تعمیر نو کی جو زبردست کوششیں ہو رہی ہیں اُنکا اقتضا ہے کہ کانفرنس کے دائرۂ عمل میں مزید وسعت پیدا کیجائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ۱۹۴۳ء کے سالانہ اجلاس کانفرنس بمقام کلکتہ۔ نواب کمال یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کی فیاضی سے ایک تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ کمیٹی مذکور نے جناب آنریبل سر عزیز الحق صاحب کامرس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کی قیادت میں ہندوستان کا طویل دورہ کرکے ایک رپورٹ تیار کی جو سالانہ اجلاس کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۴۴ء بمقام علیگڑھ منظور ہوئی۔

اس رپورٹ کی سب سے اہم اور مفید سفارش ایک "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کا قیام ہے۔ جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی صاحب ایم۔ اے سکریٹری کمال یار جنگ ایجوکیشن کمیٹی و آنریری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک مفصل اسکیم (بصورت رزولیوشن) ۱۱ر نومبر ۱۹۴۴ء کو میری تائید کے ساتھ کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں پیش کی اور اجلاس مذکور نے بالاتفاق اُسے پاس کیا۔"

سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:۔

(۱) اسلامی علوم اور اسلامیات کے وسیع مطالعہ اور اعلیٰ تحقیقات کے کام کی تنظیم۔

(۲) تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ لٹریچر جو یورپین اور مشرقی زبانوں میں موجود ہے اُس کا جائزہ۔

(۳) تاریخ۔ مذہب۔ فلسفہ۔ سائنس۔ ادب اور فنونِ اسلامیہ سے متعلق قدیم و جدید تحقیقات کے رجحانات کا مناسب تجزیہ۔

(۴) مسلم ہسٹری کی ایسی معیاری کتابوں کی تدوین اور اشاعت جو اسلام اور اُس کے کلچرل روایات کی تشریح کر سکیں اور جن کا مواد گہرے مطالعہ اور تحقیقات کا نتیجہ ہوں۔

(۵) ادبیات السنہ مشرقیہ اسلامیہ کی اشاعت و تحقیق کی ہمت افزائی۔

(۶) اسلامیات سے متعلق ایک میوزیم اور ریسرچ لائبریری کا قیام جس میں قلمی کتابیں، نادر مخطوطات فرامین، نقاشی کے نمونے، تصاویر اور ایسی چیزیں جمع کی جاویں جن سے اسلامی تاریخ اور کلچر کے مطالعہ میں مدد ملے اور ایسی چیزیں ہندوستان یا جس جگہ بھی موجود ہوں اُن کی فہرستیں تیار کرنا۔

(۷) ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ موسومہ "اسلامک ریسرچ" جاری کرنا اور اُس میں مسلمان علما اور محققین کی تحقیقات کے نتائج شائع کرنا۔

(۸) انسٹی ٹیوٹ کا ایک اپنا پریس قائم کرنا جس میں اُس کا رسالہ، کتابیں اور دوسرا اُردو کا کام چھاپا جا سکے۔

(۹) علمی تحقیقات کے دوسرے اداروں سے اتحاد عمل کرنا۔

(۱۰) انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے کاموں کی ہمت افزائی کی غرض سے حسب ضرورت وظائف، انعامات اور مالی امداد دینا۔

(۱۱) ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت کے لئے ایسے دوسرے طریقے اختیار کرنا جو وقتاً فوقتاً انسٹی ٹیوٹ کے مناسب حال ہوں۔

مذکورالصدر اغراض و مقاصد کی روشنی میں :-

(أ) "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کا کام ۔۔ سیکشنوں میں تقسیم ہوگا۔

(ب) ہر ایک سیکشن کا کام ایک ایک ممبر اسٹاف کے چارج میں رہوگا۔

(ج) ممبران اسٹاف اُن خاص مضامین میں جو اُن کو سپرد کئے جائیں گے اپنی اپنی تحقیقات کا کام جاری رکھیں گے۔

(د) ممبران اسٹاف ایک ایک سال کا اپنا پیشگی کام تجویز کریں گے اور انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر اس کام کی نگرانی کرے گا اور اس کی مناسب تنظیم کرے گا۔

(ھ) ممبران اسٹاف اپنے اپنے مضامین کی تحقیقات کے موضوع کے انتخاب میں اس امر کا خاص لحاظ رکھیں گے کہ اُن سے بالکل نئی معلومات کا دروازہ کھلے، یا وہ ایسی ہوں کہ اُن پر دوسرے لوگوں نے بہت ہی کم کام کیا ہو۔

(و) تاریخ اسلام اور ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کے سیکشن کا یہ فرض ہوگا کہ علاوہ عام تحقیقاتی کاموں کے وہ تاریخ کی ایسی کتابیں تیار کریگا جو ہندوستان کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہو سکیں۔

(ز) ممبران اسٹاف انسٹی ٹیوٹ کے وظیفہ یاب ایسے دو۔ دو ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی کا کام بھی انجام دیں گے جن کو مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبہ ہائے تعلیمی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریوں کیلئے بحالے تیار کرنے کے لئے داخل کیا ہو۔

(ع) انسٹی ٹیوٹ بیرون جات کے علمی تحقیقات کرنے والے اصحاب کو بھی مالی امداد دے گا۔ نیز اپنے اسٹاف اور لائبریری سے فائدہ اٹھانے کی سہولت بہم پہونچائے گا۔ ایسے تحقیقات کرنے والے لوگوں سے ان کے کام میں انسٹی ٹیوٹ اشتراکِ عمل بھی کرے گا، اگر ان کا کام انسٹی ٹیوٹ کے بنائے ہوئے پروگرام سے ہم آہنگ ہوگا۔

(ط) انسٹی ٹیوٹ اپنے اغراض و مقاصد اور اپنے علمی تحقیقاتی کام کو ہندوستان کی تمام تعلیم یافتہ مسلم آبادی میں مقبولیت حاصل کرانے کی غرض سے پروپگنڈے کے جدید وسائل مثلاً توسیعی تقریروں، تعلیمی نمائشوں اور آل انڈیا و صوبائی کانفرنسوں کے انعقاد کے طریقے بھی اختیار کرے گا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۴ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم کی مشرح تفصیلات قلم بند کرنے آمد و خرچ کے پہلو پر غور کرنے اور اسکیم مذکور کو کانفرنس کے موجودہ نظامِ عمل میں مدغم کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی کا بھی با اختیار اضافہ تقرر کیا ہے جو اپنی سب کمیٹیاں مقرر کرنے اور عہدہ دار منتخب کرنے کی مجاز ہوگی۔ نیز اپنی رپورٹ ورکنگ کمیٹی کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آخر جنوری ۱۹۴۵ء تک پیش کرے گی۔

اُمید ہے کہ آخر جنوری تک کمیٹی کا کام ختم ہونے اور فروری مارچ میں کانفرنس کا نیا سالانہ بجٹ منظور ہو جانے کے بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں انسٹی ٹیوٹ قائم ہو جائیگا۔ انشاء اللہ!!

گزشتہ سہ ماہی کا پورا وقت پونا۔ بمبئی۔ اورنگ آباد اور حیدر آباد کے تعلیمی سفر۔ کانفرنس کے سالانہ انتخابات اور سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سلسلہ کی غیر معمولی مصروفیتوں میں کچھ اس طرح گزرا کہ 'مجلس مصنفین' اور 'مصنف' کی جانب بہت کم توجہ ہوسکی۔ اسی وجہ سے اس مرتبہ 'بزمِ مصنف' بہت مختصر ہے۔ تاہم جیسی کچھ بھی ہے حاضر ہے۔

بزمِ مصنف

قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھ 'بیت المصنف' کا افتتاح مبارک ہو۔ سپاس نامہ ملگیا تھا۔ طرزِ نگارش کی ندرت کے کیا کہنے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! 'بیت المصنف' کے لئے عنقریب کتابیں جمع کر کے روانہ کرونگا، میری تصنیفات بھی اُس میں شامل ہونگی۔ کچھ دن انتظار کیجئے۔

حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر قبلہ ہماری مجلس علم و ادب کے آخری صدر نشین ہیں اور اس تاریک ملک میں تیرہ بختوں کے روشن چراغ، اسلاف کے نام لیوا بزرگوں میں اس وقت اِنکی ذاتِ اقدس مغتنمات سے ہی۔ آپنے حضرت موصوف کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہی وہ حرف بحرف صحیح اور اس سے مجھے کُلّی اتفاق ہے۔ اور میں آپ کی اُس دعائے خیر میں شریک ہونے کو اپنا اسلامی اور قومی فرض سمجھتا ہوں اور زور وروں سے آمین کہتا ہوں۔

پروفیسر محمد محفوظ الحق صاحب چیرمین شعبۂ عربی و فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ رسالہ مصنّف کی دوسری جلد کا ۳ ملا آج سے پہلے آپ کا رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا تھا اور افسوس کرتا ہوں کہ کیوں نہیں گزرا۔ اِس نمبر کے مضامین علمی و تحقیقی ہیں۔ اور مجھے بیحد پسند ہیں۔ آپ کے رسالہ کا میعار بلند ہے اور ہمیشہ بلند رکھئے۔

مولوی ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات اورنگ آباد دکن مصنف کا شکریہ رسالہ کے دونوں مضامین (ظفر کی شاعری اور غالب نے اردو خطوط نویسی کب سے شروع کی) اچھے ہیں، کاش میں مصنف کے دوسرے پرچے بھی دیکھ سکتا۔ رسالہ میں مصنفین کی تصنیفات کا ذکر بھی کر دیا جایا کرے تو ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہونے میں مدد ملے۔

مولانا سید طفیل احمد صاحب ستمبر ۴۳ء کے مصنف میں اپنے اظہر صاحب رضوی کے متعلق میری رائے کا تذکرہ فرمایا ہے، میں یقیناً رضوی صاحب کی تبصرہ نگاری اور انکے لٹریچر کا جو میں مصنف میں پڑھتا ہوں بہت معترف ہوں مگر میری یہ رائے سر سید رضا علی کے اعمالنامے کے تبصرہ کے سلسلہ میں نہیں ہی۔ جو رضوی صاحب نے لکھا ہی اس وقت میری ذہن میں نہیں ہے کہ رضوی صاحب نے اعمالنامہ کے بارہ میں کیا لکھا ہے۔ اُنکی رائے جو کچھ بھی ہو مگر خود مجھ پر اعمالنامہ کی خوبیوں کا بڑا اثر ہے۔ سر سید رضا علی صاحب کی خدمت میں مجھے قدیم نیازمندی کا فخر حاصل ہی اور میں اُنکی اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی خوبیوں، محبت، مروت، وضعداری اور انگریزی زبان دانی میں بلند مرتبہ کا ہمیشہ سے معترف ہوں مگر اعمالنامہ کے مطالعہ سے قبل اُردو زبان میں اُن کی سحر بیانی کا اندازہ نہ تھا ایک بار تو اسکے سرسری مطالعہ سے متاثر ہو کر بے اختیار اسکا تبصرہ لکھنا شروع کیا مگر قبل اس کے کہ وہ مکمل ہو کتاب احباب میں گشت کرنے لگی اور جس کے ہاتھ پڑ جاتی ہے بمشکل چھوٹتی ہے۔ ایک میرے محترم دوست نے تو اسکی نسبت فرمایا ہی کہ میں نے اُردو زبان میں اسقدر دلکش اور دلفریب کتاب دیکھی ہی نہیں۔ بہرحال اسوقت مجھے اعمالنامہ پر ریویو کرنا نہیں ہے صرف مختصر طور پر اُس دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب کے تاثرات کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مولوی سید عبد الحمید صاحب تاج محل جنرل سکریٹری بزم نظیر آگرہ رسالہ "مصنف" موصول ہوا۔ مضمون "ظفر کی شاعری" جس خوبصورتی سے قلمبند کیا گیا ہے بالکل نیا طرز ہے۔ مختصر اور تاریخی نقطۂ نظر سے گراں مایہ ہے۔ میاں نظیر اکبر آبادی کو مورخین اور اہل قلم حضرات نے فراموش کر دیا ہے کاش آپکی توجہ ہو جائے تو بہت کام ہو۔ نظیر اکبر آباد کا آخری اور پہلا شاعر تھا۔

پروفیسر طاہر صاحب فاروقی آگرہ کالج آگرہ مصنف کا نیا شمارہ ملا۔ بقامت کہتر کے ساتھ بقیمت بہتر نکلا۔ مگر میں اس پر کوئی رائے نہیں لکھتا اس لئے کہ آپ رایوں کو چھاپ کر ہم لوگوں کی تشہیر کرنیکا خاص "ادبی شوق" رکھتے ہیں۔ پس آپ ٹھیرے خطرناک قسم کے آدمی اور ایسے حضرات سے دُور رہنا ہی اچھا ہے۔

ملاقات اور لطف صحبت کو عرصہ ہو گیا یہ آشتیٔ چشم و گوش تکلیف دہ ہوتی جا رہی ہے کیا آپ بھی میری طرح قطب بنتے جا رہے ہیں۔ مجھے تو احباب نے قطب کا خطاب دے ہی دیا ہے آپ بجائے قطب کے ابدال بنتے تو بہتر ہے تاکہ مدارج سلوک بہ آسانی طے ہوں۔ اور شہود و مشاہدہ کے اعلیٰ درجات تک ہم دونوں کی رسائی ہو جائے۔ "سیرت اقبال" کا نیا ایڈیشن اس کتاب بازاری میں شائع ہوا ہے۔ میری درخواست پر ناشرین نے آپکو ایک جلد ارسال کی ہے قبول فرمائیے اور ممنون کیجئے۔

مجلس کے جلسے

اُنچاسواں جلسہ مجلس مصنفین کا ۴۹ واں جلسہ زیر صدارت مولوی ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے .... سات نومبر ۴۴ء پانچ بجے شام کانفرنس لائبریری سلطان جہاں منزل علیگڑھ میں جناب مولوی ظہیر الدین علوی صاحب کی دعوتِ عصرانہ پر منعقد ہوا اور علوی صاحب ہی نے "اردو شاعری میں خمریات" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ اسی جلسہ میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا "بیتُ المصنّف" کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔

پچاسواں جلسہ ۱۲ر نومبر ۴۴ء کو زیر صدارت ڈاکٹر محمد رفیق احمد خانصاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی چیرمین شعبۂ نباتات مسلم یونیورسٹی $4\frac{1}{2}$ بجے شام کانفرنس لائبریری میں جناب مولانا ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے اُستاد شعبۂ فارسی کی دعوت چائے پر منعقد ہوا۔ اور اس میں ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اپنا مقالہ "کتب خانہ اُچ شریف گیلانی

ریاست بہاولپور" پڑھا۔

اس جلسہ میں ریاست حیدرآباد دکن کے مشہور آرٹسٹ مسٹر افضل حسینی بھی شریک ہوئے اور ختم مقالہ کے بعد موصوف نے نہ صرف اپنی نادر تصاویر دکھائیں۔ بلکہ ہندوستان کی غربی اور مغرب زدگی پر ایک پُراثر تقریر بھی فرمائی۔

رسالہ کا کوٹا ہمارے معاونین کو اس اطلاع سے ایک گونہ اطمینان ہوگا کہ 'مصنف' کے لئے بقدر اُس کی نصف ضخامت کے کاغذ کا کوٹا مقرر ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس مرتبہ ہم ۸۰ صفحات کے بجائے ۷۲ صفحات کا پرچہ شایع کر رہے ہیں، خدا سے دعا ہے کہ بقیہ نصف کی بھی جلد از جلد اجازت حاصل ہو جائے اور ہم بدستور ڈیڑھ سو سے دو سو صفحات کا 'مصنف' شایع کر سکیں۔

ضخامت کی کمی کے باعث جس طرح 'تاریخی نوادر' اور اردو نثر کے بہترین نمونوں کا سلسلہ رُکا ہوا ہے۔ اُسی طرح موصولہ کتابوں پر ہمارے مستقل تبصرہ نگار سیّد اظہر حسین رضوی صاحب کے تبصروں کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہے۔ ضخامت میں اضافہ ہوتے ہی انشاءاللہ اظہر صاحب کے تبصرے پیش کئے جائیں گے۔

وفیات ۱۶ مارچ ۴۴ء کو میری ایک ہی حقیقی ہمشیر کے انتقال کے بعد ۲۱ ستمبر ۴۴ء کو ایک جوان العمر بھتیجی داغِ مفارقت دے گئی جسے اُس کے والدین کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے میں نے اپنی لڑکی کی طرح پالا تھا اور ابھی دو سال ہوئے شادی کی تھی۔

مخدومی مولانا سیّد طفیل احمد صاحب قبلہ میرے سب سے بڑے غمگسار تھے کہ خود اُن کے یہاں ۸ دسمبر ۴۴ء کو اُن کے بڑے بھتیجے برادرم خلیل احمد کاظمی سینیر مارکٹنگ انسپکٹر لکھنؤ کا اچانک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اسی سہ ماہی میں ایک دوسرا سانحۂ ارتحال وہ بھی قلب کی حرکت بند ہونے سے ۲۶ ستمبر ۴۴ء کو جناب مولوی نصیر الحق صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی (علیگ) سب جج بھنڈارہ کا ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مرحوم کے دو عالمانہ مقالات "خود شناسی کی ضرورت اور مشکلات" نیز "قیامت اور سائنس" مصنف ۶ بابتہ مارچ ۴۴ء اور مصنف ۷ بابتہ جون ۴۴ء میں ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے!!

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے

کہ حسرت سنج ہوں۔ عرضِ ستم ہائے جُدائی کا

سیّد الطاف علی بریلوی
محرر رسالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواب صدیق حسن خاں

(از جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

صدیق حسن نام۔ والاجاہ امیر الملک نواب صدیق حسن خاں بہادر خطاب۔ حسینی سید تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے تعلق کا یہ شرف تینتیس ۳۳ پشتوں سے قائم تھا۔

آپ کے دادا سیّد اولاد علی خاں کو ریاست حیدرآباد دکن سے نواب انور جنگ بہادر کا خطاب اور پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر ملی تھی۔ اس کے علاوہ ہزار سوار و پیادہ کی افسری اور گولکنڈہ کی قلعہ داری کی عزت بھی حاصل تھی۔ سنہ ۱۲۱۸ھ میں نواب انور جنگ نے حیدرآباد میں وفات پائی۔ انھوں نے نواب شمس الامرا بہادر کی بہن بیگم کے خاندان میں جو بھوجی کے لقب سے مشہور تھیں ایک عقد کرلیا تھا مگر اُس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اپنے اصلی وطن قنوج میں جو شادی کی تھی اُس سے ایک لڑکا سیّد اولاد حسن اور ایک لڑکی منوں بی بی اُن کی وفات کے وقت موجود تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد سیّد اولاد حسن بحیثیت وارث اصلی حیدرآباد سے طلب کیے گئے۔ مگر یہ اپنا آبائی مذہب امامیہ ترک کرکے اہل سنّت والجماعت کے زمرہ میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کے زہد و اتقا نے ترکۂ پدری کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کیا۔

سیّد اولاد حسن کی ولادت سنہ ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں قنوج میں ہوئی۔ اُن کے والد نواب انور جنگ بہادر نے حیدرآباد سے تعلق قائم ہوجانے کے بعد وطن سے رشتہ توڑ دیا تھا۔ اس لئے بچپن ہی سے یہ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے اور محض اپنے ذوقِ سلیم کی رہنمائی میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ عبدالقادر قنوجی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے جن کا شمار اُس زمانہ کے نامور علما و مشائخ میں تھا۔ علم کی پیاس انھیں قنوج سے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے دہلی لے گئی۔ جہاں خاندان ولی اللّٰہی کے فیض کا چشمہ جاری تھا۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھی اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی
مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ
کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور جب سید صاحب نے سکھوں سے جہاد
کے لئے پنجاب اور سرحد کا سفر اختیار کیا تو یہ بھی ہم رکاب رہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد سند خلافت
لے کر سید صاحب کے ارشاد کے بموجب وطن لوٹ آئے اور آخر عمر تک نہایت سرگرمی کے ساتھ
تبلیغ و ہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اُن سے بڑی محبت تھی،
اور ہمیشہ "سید برادر" کے لفظ سے مخاطب فرماتے تھے۔ آپ کے دوسرے خلفا کی طرح سید
اولاد حسن صاحب کی ہدایت و ارشاد میں بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی تاثیر دی تھی۔ چنانچہ قنوج اور
نواح قنوج کے دس ہزار آدمیوں سے زیادہ مُرید ہو کر بدعت سے تائب اور سنت کے پابند ہو گئے
اور کئی ہزار ہندو اسلام سے مشرف ہوئے۔[1] ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۲ء میں انتقال فرمایا۔

سید صدیق حسن ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء اپنی ننھیال
بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ اِن کی والدہ مفتی محمد عوض صاحب مرحوم کی صاحبزادی تھیں جو علم و
فضل اور زہد و توکل میں ممتاز اور بریلی کے مفتی اسلام مشہور تھے۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک
مرتبہ نواب آصف الدولہ بہادر بریلی آئے تو مفتی صاحب سے ملنے گئے اور زر نقد و جواہر مع سند
جاگیر نذر میں پیش کیا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور معذرت کر کے واپس کر دیا۔

صدیق حسن خاں کی عمر پانچ سال کی تھی کہ یتیم ہو گئے۔ بڑے بھائی سید احمد حسن بھی جو
عمر میں صرف دو سال بڑے تھے ابھی لڑکے تھے۔ چونکہ سید اولاد حسن مرحوم نے تبدیل مذہب
کی وجہ سے تمام رشتہ داروں سے جو شیعہ تھے قطع تعلق کر لیا تھا اس لئے اقربا میں بھی ان
یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ ترکہ پدری میں ایک مختصر کتب خانہ، دو تین باغ،
کسی قدر زمین اور ایک مکان ہاتھ آیا تھا۔ حیدرآباد کی جائداد سے سید اولاد حسن مرحوم پہلے
ہی دست بردار ہو گئے تھے۔ ان بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری والدہ
ماجدہ پر عائد ہوئی نواب صاحب مرحوم اپنی خود نوشت سوانح عمری **ابقاء المنن بالقاء المحن**
میں اپنے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

---

[1] مآثر صدیقی مؤلفہ نواب علی حسن خاں مرحوم۔ حصہ اول ص ۵۰-۵۵۔

"میں یتیم تھا۔ کوئی مرد میرے اقربا میں ایسا نہ تھا کہ وہ مجھ کو پرورش کرتا۔ ہم دو بھائی تین خواہر نے کنارِ مادر میں تربیت پائی۔ ظاہر میں کوئی ذریعہ رزق کا نہ تھا۔ محض اللہ تعالیٰ نے ہم کو خزانۂ غیب سے پالا۔ مُریدین والد مرحوم اگرچہ کثرت سے تھے خصوصاً اہلِ حرفہ جن کی اولاد ابتک باقی ہے۔ لیکن کوئی مستقل معاش کا نہ تھا۔ محض اللہ تعالےٰ پر توکل تھا۔ والدہ مغفورہ مرحومہ نے بعد والد مرحوم کے معلم مقرر کرکے قرآن شریف و گلستاں و بوستاں وغیرہ پڑھوائی۔ سید احمد حسن برادر کلاں ذہین شخص تھے اور دو برس مجھ سے بڑے تھے۔ وہ جلد فارسی سیکھ کر عربی پڑھنے لگے۔ گھر میں کتاب خانہ والد مرحوم کا تھا۔ جب شیخ حسینی خادم والد مرحوم کتابوں کو دھوپ دیتے ہمارا کھیل یہی تھا کہ ہم ایک ایک کتاب کھول کر ہر جگہ سے دیکھتے پڑھتے۔ کوئی جگہ سمجھ میں آتی کوئی نہ آتی۔ محض ورق گردانی کی برکت سے شوق علم کا دل میں پیدا ہو گیا۔ پھر سید احمد علی مرحوم ساکن فرخ آباد بوجہ ارادت والد مرحوم مجھ کو اپنے گھر لے گئے۔ چند ماہ بدفعات وہاں رہ کر کچھ عربی پڑھی مگر حالت بے نیازی اور غفلت میں۔ پھر بعض مُریدین واسطے طلب علم کے کانپور لے گئے۔ یہاں بھی کچھ کچھ پڑھا۔"[۵۱]

ایک دیندار ماں کی آغوش میں جیسی تربیت پائی اُس کا حال بھی اُنھیں کی زبانِ قلم سے سُنئے۔ فرماتے ہیں :۔

"میں سات برس کا بچہ تھا۔ میرے گھر کے دروازہ پر مسجد تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وقت صبح سوتا ہوتا تھا بجرد اذان کے والدہ مرحومہ مجھ کو اُٹھا کر وضو کرا کر مسجد میں بھیج دیتی تھیں کبھی گھر میں نماز پڑھنے نہ دیتیں۔ اگر نیند کی سستی سے نہ اُٹھتا منہ پر پانی ڈال دیتیں۔ اس سبب عادت نماز کی لڑکپن سے برابر رہی۔ پھر دس برس کی عمر میں شاید روزہ رکھوایا۔ تب سے عادت صوم کی پڑی۔"[۵۲]

اکیس سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے اور وہاں کے اربابِ کمال کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ قیام دہلی کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

"کانپور سے قاضی کلو ساکن چھپرا مؤ مجھ کو شوق دلا کر دہلی لے گئے۔ قریب دو برس کے

---

۵۱ ابقاء المنن بالقاء المحن۔ مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۳۰۵ھ۔ ص ۱۱

۵۲ " " " " " " " ص ۱۴

وہاں رہنا ہوا۔ مولوی بشیر الدین قنوجی بن ناظم کریم الدین مرحوم وہاں وارد تھے۔ دو تین ۳ روز اُنھوں نے مہمان رکھا۔ پھر مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب مجھ کو آکر لے گئے اور مکان نواب مصطفےٰ خاں مرحوم میں ٹھہرایا۔ یہ مکان متصل چتلی قبر کے تھا۔ پھر مفتی صاحب سے سبق شروع کیا۔ کتب علوم آلیہ مرتب پڑھی۔ اس جگہ مولوی نوازش علی واعظ اور خواجہ ضیاء الدین واعظ شاگرد مولوی قطب الدین مرحوم اور مولوی عبدالخالق اور مولوی حفیظ اللہ واعظ اور مولوی عبدالکریم اور مولوی [illegible] رب علی اور مولوی قطب الدین مترجم مشکوٰۃ شریف اور مولوی سید نذیر حسین صاحب اور ہر گروہ کے علمائے موجودین کو دیکھا۔ اگرچہ زیادہ صحبت کسی عالم کی نہیں ہوئی اور مولوی نصیر الدین واعظ جامع مسجد کو بھی دیکھا۔ یہ زمرۂ سید احمد صاحب میں سے تھے۔ اور طلبہ مستعدین میں مولوی فیض الحسن سہارن پوری اور مُلا نواب صاحب مقیم حال مکہ معظمہ کو پایا اور مولوی فضل حق خیر آبادی کو دیکھا۔ پھر اُن کے فرزند مولوی عبدالحق سے بارہ گر جلسۂ قیصریہ میں بمقام دہلی ملاقات ہوئی۔ اور خانقاہ مرزا مظہر جانجاناں قدس سرہٗ میں شاہ احمد سعید و شاہ عبدالغنی کو پایا۔ شعراء میں مرزا غالب دہلوی اور شیخ ابراہیم ذوق و امام بخش صہبائی اُس وقت تک زندہ تھے۔ اُمراء میں نواب مصطفےٰ خاں مرحوم اور نواب امین الدین خاں .... وضیاء الدین خاں اور اُن کی اولاد کو پایا۔ نواب امین الدین خاں نے چاہا تھا کہ مجھ سے نکاح اپنی دختر کا کر دیں۔ مفتی صاحب کے ذریعہ سے تحریک بھی کی تھی مگر وہ مغل تھے اس لئے میں نے منظور نہ کیا۔ زمانۂ قیام دہلی میں اندر قلعہ کے بہادر شاہ اور اُن کے ولی عہد مرزا فخر الدین وغیرہ شاہزادگان کو پایا۔ حکماء میں حکیم امام الدین خاں و حکیم احسان اللہ خاں کو دیکھا۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر کوئی ایسا نہ ملا جو دُنیا سے دست بردار خداوند تعالےٰ کا خدمتگار ہو ؎

در مسجد و خانقہ بسے گردیدم	بس شیخ و مرید را کہ پا بوسیدم
نے یک ساعت ز ہستی خود رستم	نے آنکہ ز خویش رستہ باشد دیدم "[۵۱]

علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مفتی صاحب سے وطن واپس جانے کا قصد ظاہر کیا۔ اُنھوں نے اجازت کے ساتھ سند تکمیل تعلیم بھی عنایت کی۔ گھر پہونچے تو فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے قیام کے بعد قسمت آزمائی کے لئے بھوپال کا رُخ کیا۔ چھبیس ۲۶ روز میں یہ سفر

۵۱۔ ابقاء المنن بالقاء المحن ـ مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۳۰۵ھ ـ ص ۱۳

ختم ہوا۔ ایک کرایہ کے مکان میں اُترے۔ بھوپال میں کوئی ایسا شناسا نہ تھا جو نواب سکندر بیگم کی خدمت میں اِن کی سفارش کرتا۔ اتفاق سے شیخ علی عباس صاحب مرحوم چریا کوٹی وہاں موجود تھے۔ وہ غالباً ان کے والد مرحوم سے واقف تھے۔ بڑی ہمدردی فرمائی اور مدار المہام ریاست منشی محمد جمال الدین خاں بہادر سے اِن کی سفارش کی۔ مدار المہام صاحب مرحوم دولت و اقتدار کے باوجود نہایت خدا پرست، علم دوست، قدر شناس اور وسیع الخلق بزرگ تھے۔ اُنھوں نے اِس غریب الوطن کی سرگزشت بیگم حاجہ کے گوش گزار کی۔ اُنھوں نے فوراً نقیب بھیج کر طلب فرمایا اور بڑے اخلاق سے پیش آئیں اور ان سے گفتگو کر کے بہت خوش ہوئیں۔ مدار المہام صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ تو اس قابل تھے کہ ان کو اپنے سایۂ عاطفت یعنی دامادی میں لیتی مگر مجبوری یہ ہے کہ میں اِن سے قبل ایک صاحب کو نواب شاہ جہاں بیگم سے منسوب کر چکی ہوں اور حسب قرارداد صدر (گورنمنٹ آف انڈیا) وہ نامزد ہو چکے ہیں۔"[۵۱]

دوسرے روز پھر طلب فرمایا اور اب کی بار پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ التفات فرمایا اور یکم رمضان ۱۲۷۱ھ سے آستانۂ خاص کے ملازموں میں منشی گیری کی خدمت پر بعوض بیس روپئے ماہوار مقرر کیا۔ چند مہینوں کے بعد ریاست کی میر دبیری خالصہ کی خدمت خالی ہوئی تو اس پر پہلے چالیس روپئے اور پھر پچاس روپئے ماہوار مشاہرہ پر مقرر کیا۔ اس کے بعد سرکار سے میر دبیری کا خلعت بھی عنایت ہوا۔ جس کی مجموعی قیمت ایک سو پندرہ روپئے تھی۔ بد قسمتی سے وہ خلعت کوئی چُرا لے گیا۔ یہ امر غالباً بیگم حاجہ کو ناگوار خاطر ہوا۔ اسی سال کے آخر میں سابق میر دبیر منشی عبد العلی خاں (جو مشہور شاعر میاں مسکین کے بیٹے تھے) اپنے عہدہ پر واپس بلا لئے گئے۔ نواب سکندر بیگم نے عبد العلی خاں کی تقصیرات معاف کر دیں اور صدیق حسن خاں کو میر دبیری کی جگہ خالی کرنی پڑی۔ دوسری بدقسمتی یہ کہ اِسی زمانہ میں مولانا علی عباس صاحب مرحوم سے حقہ کی اباحت اور کراہت کے متعلق مناظرہ ہوا۔ صدیق حسن خاں اس کی اباحت کے قائل تھے اور مولانا کراہت کے۔ مناظرہ نے مناقشہ کی صورت پکڑی اور مناقشہ سرکاری خدمت سے معزولی کا سبب ہوا۔ خود لکھتے ہیں:—

"بے فائدہ باں یار عزیز طرف شدم و محسن قدیم را کہ باعث ایں ملازمت بود بر سر اساءت آوردم محبت باہم گیر ایں فساد۔ نوبت ایں ناخوشی بمعزل من کشید۔ بیکار شدم۔"[۵۲]

---

۵۱ ماثر صدیقی حصہ دوم ص ۲۰۔

۵۲ " " " ص ۲۲-۲۳

سلسلۂ ملازمت منقطع ہوگیا تو وطن واپس ہوئے مگر روزگار کی فکر نے پھر گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ کانپور پہونچے۔ یہاں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ وہ ہنگامۂ انقلاب شروع ہوا جسے .... ہم ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مستورات کی تنہائی کے خیال سے مجبوراً قنوج لوٹنا پڑا۔ وہاں فرخ آباد کے ایک رئیس کا فوجی دستہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اُس سے انگریزی فوج کی جھڑپ ہو گئی۔ اس لڑائی میں قنوج کے تمام مکانات مسمار اور کھیتیاں برباد ہو گئیں۔ دوسرے روز قتل عام کی افواہ اور مارشل لا جاری ہونے کی گرم خبر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہر طرف بھاگڑ مچ گئی اور جس کو جہاں موقع ملا نکل کھڑا ہوا۔ نواب صاحب مرحوم لکھتے ہیں :۔

"افواج سرکاری نے بوجہ بغاوت رئیس فرخ آباد قنوج کو تاراج کیا تو میرا گھر بار بھی بالکل دست بُرد غنیمت ہوگیا۔ سوائے چند کتب کے کوئی چیز اثاث البیت سے باقی نہ رہی۔ تب میں بلگرام گیا اور تا فرد ہونے ہنگامۂ غارتگری کے وہاں رہا۔"[1]

بلگرام کے قیام کا زمانہ نہایت تکلیف میں بسر ہوا۔ نواب صاحب مرحوم کے صاحبزادے میر علی حسن خاں **مآثر صدیقی** میں لکھتے ہیں :۔

"والا جاہ کو کئی مہینے تک صرف ایک سیاہ جامہ خشن اور نان خشک شبینہ پر وقت گزاری کرنا پڑی۔ جب کپڑا پھٹ جاتا اپنے ہاتھ سے سی لیتے۔ جب میلا ہو جاتا خود دریا پر جاکر دھولاتے۔ متعلقین کا بھی اس سے زیادہ بہتر حال نہ تھا۔ مگر باوجود اس تہی دستی اور فاقہ مستی کے نہ کسی سے کبھی قرض لیا نہ کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلایا اور اپنی حالتِ بے مایگی پر صابر و قانع رہے۔"[2]

جب حکومت کی آتشِ انتقام فرد ہونا شروع ہوئی تو خانماں خرابوں کو گھر یاد آیا۔ صدیق حسن خاں بھی اپنے عزیزوں کے ساتھ قنوج واپس آئے۔ فکرِ معاش بھی ساتھ آئی۔ مجبوراً پھر رختِ سفر باندھا۔ فتح پور اور الٰہ آباد ہوتے ہوئے مرزاپور پہونچے اور اکبر علی خاں سوداگر شاہ جہاں پوری کے ہاں معرفت سابقہ کی بنا پر مہمان ہوئے۔ اُنھوں نے بڑی خاطر داری کی۔ وہیں ریاست بھوپال سے نواب سکندر بیگم کا فرمان طلبی کے لئے صادر ہوا۔ ۳ محرم ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء کو مرزاپور سے روانہ ہوئے۔ کثرتِ بارش کی وجہ سے بیس روز جبلپور میں رکنا پڑا۔ ۴ صفر ۱۲۷۵ھ کو بھوپال پہونچے۔ پہلے

---

[1] ابقاء المنن ص ۹۰۔ [2] مآثر صدیقی حصہ دوم ص ۲۹

منشی جمال الدین خاں بہادر سے ملے اور اپنی سرگزشت بیان کی۔ اُنھوں نے بڑی ہمدردی فرمائی اور نواب سکندر بیگم سے سب حال عرض کیا۔ چونکہ فرمان کو صادر ہوئے عرصہ ہو گیا تھا اور اہلِ غرض نے تاخیر سے فائدہ اُٹھا کر بیگم صاحبہ کو صدیق حسن خاں کی طرف سے برگشتہ کر دیا تھا اس لئے اُنھوں نے نہ صرف ملازم رکھنے سے انکار کر دیا بلکہ اُن کے شہر سے چلے جانے کا حکم بھی جاری کیا۔ ہندوستانی ریاستوں کے ارکان کی دراندازیاں اور اُن کے فرمانرواؤں کی ذہنیتیں اکثر حیرت انگیز ثابت ہوئی ہیں۔ صدیق حسن خاں نے یہ شعر پڑھا اور بھوپال سے روانہ ہو گئے۔

ما ز بھوپال گزشتیم تو دل شاد نشیں

قفل بر در مزن و خار بہ دیوار منہ

واپسی میں ریاست ٹونک پہونچے۔ چونکہ وہاں کے والی نواب وزیر الدولہ مرحوم حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اُنھوں نے صدیق حسن خاں کو بڑے اصرار سے روکا اور پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ آٹھ مہینے یہ ٹونک میں رہے۔ وہاں اُن کی بڑی دلجوئی اور خاطر داری کیجاتی تھی مگر طرزِ معاشرت کی ناموافقت سے ہمیشہ برداشتہ خاطر رہتے تھے۔ آخر ملازمت ترک کرنے کے ارادہ سے چار مہینے کی رخصت کی درخواست نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ ابھی اس پر کوئی حکم نہیں ہوا تھا کہ سکندر بیگم کی جانب سے منشی جمال الدین خاں بہادر کا ایک فرمان اِن کی طلبی کے لئے پہونچا۔ افترا پردازوں کی تمام کوششوں کے باوجود یہ بار بار طلب کیا جانا صاف اشارہ تھا کہ دستِ قضا نے بھوپال کی ریاست ان کے نام کے سامنے لکھدی ہے۔ چنانچہ ۱۰ محرم ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء کو تیسری بار ریاست کی تاریخ نگاری کی خدمت تفویض ہوئی اور پچھتّر روپئے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ بیگم صاحبہ کی یہ عنایت دیکھ کر ٹونک کی ملازمت سے استعفےٰ دیدیا۔

مدار المہام صاحب مرحوم پہلی ہی ملاقات سے صدیق حسن خاں کے علم و فضل اور خدا پرستی کے قدرشناس تھے اور اِن سے محبت کرتے تھے۔ اس محبت کو مستحکم کرنے کی غرض سے اُنھوں نے چاہا کہ اپنی صاحبزادی زکیہ بیگم کا نکاح ان کے ساتھ کر دیں۔ یہ صاحبزادی بیوہ تھیں۔ مدار المہام صاحب مرحوم نہایت پابند شرع بزرگ تھے اور آیۃ کریمہ فَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ کے مطابق اِن کے نکاح ثانی کی فکر میں تھے۔ صدیق حسن خاں نے اس رشتہ کو مبارک خیال کیا۔ چنانچہ ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ھ کو مہر فاطمی پر نکاح ہو گیا۔

اب سے (۱۰۰) سو برس پہلے نکاح ثانی شرفا میں نہایت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ یہ صرف

حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تبلیغ کا فیض تھا کہ ہندوستان میں یہ سنّت پھر جاری ہوگئی۔ سکھوں کے خلاف جہاد کرنے میں سید صاحب اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے جو حیرت انگیز جد وجہد کی اور بالآخر اسی راہ میں اپنے کو قربان کر دیا اُس کی عظمت میں کسے شک ہو سکتا ہے، لیکن رد بدعت اور ترویج سنت میں اِن بزرگوں کے کارنامے اسلامی ہند کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہیں گے، اور ان کی روشنی سے آج بھی ہماری آنکھیں منور ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنی تلوار سے فتح کیا تھا مگر ہندوؤں نے اپنے مشرکانہ خیالات اور رسم و رواج کے افسوں سے ان فاتحوں کی روح کو اسیر کر لیا۔ شرک و بدعت کی سیکڑوں باتیں مسلمانوں میں رائج ہوگئیں اور جزو دین سمجھی جانے لگیں۔ اس بے دینی کے خلاف پہلی آواز جو ہندوستان میں بلند ہوئی وہ حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جبکہ اکبر اور جہاں گیر کے مصالح ملکی اور اُن کی غیر اسلامی روش سے اسلامی تہذیب و تمدن کی صورت اس ملک میں مسخ ہو کر رہ گئی تھی اور مشرکانہ رسوم کی آمیزش سے دین تمام تر آلودہ ہو چکا تھا۔ دو صدیوں کے بعد دوسری آواز آپ ہی کے ہم نام حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ کی بلند ہوئی جس کی گونج سو (۱۰۰) سال سے زیادہ گزرنے پر بھی آج ہمیں سنائی دے رہی ہے۔ توحید خالص کا عقیدہ اور کتاب و سنّت کی جس قدر پابندی آج ہندوستانی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ زیادہ تر اسی بزرگ اور اس کے خلفا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ فجزاھم اللہ جزاءً حسنًا۔

کچھ دنوں کے بعد تاریخ نگاری کے علاوہ ریاست کے دستور العمل کی ترتیب کی خدمت بھی صدیق حسن خاں کو سپرد ہوئی اور تنخواہ بجائے پچھتّر کے سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ نو سال تک انہی دونوں خدمتوں پر مامور رہے اور اپنے فرائض نہایت پابندی اور دیانتداری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ نواب سکندر بیگم بھی قدر دانی فرماتیں۔ صاحب مآثر صدیقی لکھتے ہیں :۔

"حالانکہ رئیسۂ معظمہ نہایت تمکنت مزاج تھیں اور امور ریاست میں سختی کے ساتھ اصولِ سیاست کو عمل میں لاتی تھیں۔ باایں ہمہ کبھی انھوں نے والا جاہ کے ساتھ نا ملائم سلوک نہیں کیا نہ کبھی سختی اور دُرشتی سے پیش آئیں بلکہ اپنی روشِ مزاج کے خلاف سر دربار جشنِ عیدین میں سروقد کھڑی ہو کر تعظیم دیا کرتی تھیں اور سلام و کلام میں تقدیم کرتی تھیں۔ خصوصاً جب سے وہ قنوج ہو کر مراجعت فرمائے وطن ہوئی تھیں اور اُن کو والا جاہ کے خاندانی حالات کا علم ہو گیا تھا اُس وقت سے بہت کچھ اُن کی مراعات ملحوظ خاطر رہا کرتی تھی۔" ص ۹۱

مآثر صدیقی حصہ دوم ص ۹۲

یکم شعبان سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۶ نومبر سنہ ۱۸۶۸ء کو نواب شاہ جہاں بیگم تخت ریاست پر متمکن ہوئیں۔ نواب سکندر بیگم مرحومہ کے آخر عہد حکومت ہی میں صدیق حسن خاں حج کا ارادہ کر چکے تھے مگر بیگم صاحبہ کی علالت کی وجہ سے سفر نہ کر سکے۔ اب شاہ جہاں بیگم کی مسند نشینی کے بعد اُنھوں نے پھر درخواست کی جو منظور ہو گئی اور یہ ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۸۵ھ کو بھوپال سے روانہ ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نے چند صندوق قیمتی کپڑوں اور دوسری گراں بہا اشیا کے ساتھ کر دئے تھے کہ مکہ معظمہ پہونچ کر فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ حج و زیارت سے فارغ ہو کر ربیع الاول سنہ ۱۲۸۶ھ میں بخیریت بھوپال پہنچ گئے۔ مکہ معظمہ میں چار مہینے سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع ملا۔ یہاں بہت سی کتابیں تفسیر و حدیث وغیرہ کی خریدیں اور بعض رسائل اپنے ہاتھ سے نقل کئے۔ تبرکاً محدثین یمن کے سامنے قرأت حدیث بھی کی۔ مکہ معظمہ ہی میں ایک روز نواب تجمل حسین خاں مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ جن کی شان میں مرزا غالب نے یہ اشعار لکھتے تھے ؎

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کِس کا نام آیا　　کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد نواب صاحب مرحوم ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور زندگی کے بقیہ ایام خانۂ خدا کے زیر سایہ شکستہ حالی اور فقر و فاقہ میں گزار دی۔ صدیق حسن خاں نے اُن کو جس حالت میں دیکھا وہ حوادثِ روزگار کی ایک زندہ تصویر تھی۔

حج سے واپسی کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم نے صدیق حسن خاں کو تاریخ نگاری کی خدمت سے سُبکدوش کر کے سر رشتۂ تعلیمات کا افسر مقرر کیا۔ یہ خدمت ایک ایسے شخص کے لئے جس کی زندگی کا مقصد احیاء کتاب و سنت اور خدمتِ علم تھا نہایت موزوں تھی اور اُنھوں نے اِسے بڑی مسرت کے ساتھ قبول کیا۔ ایک سال کے بعد جب ریاست کی میر دبیری کی جگہ خالی ہوئی تو بیگم صاحبہ نے دربار صدر نشینی کے موقع پر سند "امیر الانشائی" خطاب "خانی" اور خلعت سے سرفراز فرمایا اور مشاہرہ دو سَو (۲۰۰) روپئے ماہوار مقرر کیا۔

نواب شاہ جہاں بیگم کو عنانِ حکومت ہاتھ میں لئے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ انتظام مملکت کی ذمہ داریوں اور پیشِ نظر وسیع اصلاحات کی اہمیت کا تقاضا یہ ہوا کہ کسی قابل، متدین، شریف اور مخلص فرد کو ہمدم اور مشیر بنایا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ بیگم صاحبہ کے دل میں عقد ثانی کی خواہش بھی

پیدا ہوئی۔ اُن کا پہلا نکاح نواب نظیر الدولہ بخشی باقی محمد خاں بہادر کے ساتھ ۱۲۷۱ھ میں ہوا تھا۔ نواب صاحب مرحوم قوم افغان سے تھے۔ نکاح کے بارہ سال بعد صفر ۱۲۸۴ھ میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی وفات کے پانچ مہینے بعد بیگم صاحبہ مسندِ ریاست پر بیٹھیں۔ انصرامِ حکومت میں مدد دینے کے لئے نظرِ انتخاب جس شخص پر پڑی تھی وُہی نکاح ثانی کے لئے بھی پسند آیا۔ چنانچہ ۸ر شوال ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء کو اُنھوں نے سادہ طریقہ پر بعوض پچیس (۲۵) ہزار روپئے دین مہر صدیق حسن خاں کے ساتھ عقد کرلیا۔ حکومت ہند سے مشورہ پہلے سے کرلیا گیا تھا اور اس تجویز کی منظوری باضابطہ آگئی تھی۔ صدیق حسن خاں ابتک امیر الانشائی کے منصب پر مامور تھے۔ ۲۱ر ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ (۱۰ر جولائی ۱۸۷۱ء) کو بیگم صاحبہ نے ایک دربار عام منعقد کرکے خلعت نہ پارچہ مع پنج عدد جواہر و چتر آفتابی و چنور و اسپ و فیل و پالکی نیز مُہر و خطاب معتمد المہام بہادر نائب دوم ریاست سے معزز فرمایا اور بجائے معاش امیر الانشائی جس کی مقدار چار ہزار تین سو اکتیس (۴۳۳۱) روپئے دس (۱۰) آنہ سالانہ تھی منصب معتمد المہامی کی جاگیر چوبیس (۲۴۰۰۰) ہزار روپئے سالانہ کی مرحمت فرمائی۔[51] اس کے بعد بیگم صاحبہ کی تحریک سے خطاب نواب والاجاہ امیر الملک بہادر بھی حکومت ہند کی طرف سے مل گیا۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۸۷۲ء کو پولیٹکل ایجنٹ منجانب گورنر جنرل سندِ خطاب اور خلعتِ فاخرہ لیکر بھوپال آئے اور دوسرے روز ایک شاندار دربار منعقد ہوا جس میں یہ اعزازات دئے گئے۔ یکم شعبان ۱۲۸۹ھ سے بیگم صاحبہ نے پچھتر ہزار (۷۵۰۰۰) چار سو بہتر (۴۷۲) روپئے سالانہ کی جاگیر تاحینِ حیات عنایت فرمائی۔

نکاح کے بعد بیگم صاحبہ نے نواب صدیق حسن خاں کو اپنا مشیر خاص بناکر وسیع اختیارات دیدئے تھے اور اس بات کی بھی خواہش کی تھی کہ حکومت ہند کی منظوری حاصل کرکے انھیں تاحیات مستقل مختار ریاست بنادیں۔ مگر خود نواب صاحب نے کوشش کرکے انھیں اس ارادہ سے باز رکھا۔[52] یکم جنوری ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں جب ملکہ وکٹوریہ کے نام کے ساتھ قیصرۂ ہند کے خطاب کے اضافہ کا اعلان کیا گیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم بھی مدعو کی گئیں۔ نواب صدیق حسن خاں بھی اُن کے ساتھ دربار میں شریک ہوئے اور جب بیگم صاحبہ وائسرائے سے ملنے تشریف لے گئیں تو نواب صاحب بھی ساتھ گئے۔ لارڈ لٹن نے بیگم صاحبہ کو "قیصر ہند" کا طلائی تمغہ دینے کے بعد کہا کہ "خاص آپ کے شوہر کے لئے سترہ (۱۷) ضرب سلامی تمام قلمرو دولتِ انگلشیہ میں ہمیشہ کے لئے مقرر کی گئی۔"

---

۵۱ مآثر صدیقی حصہ دوم ص[illegible]۔ ابقاء المنن ص[illegible]۔ ۵۲ ابقاء المنن ص ۱۱۲۔

اس کے بعد نواب صاحب سے مصافحہ کر کے شترضرب توپوں کی سلامی کی مبارک باد دی۔

۱۲۹۵ھ میں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے اُس امداد کے صلہ میں جو جنگ رُوم و رُوس کے دوران میں ریاست بھوپال نے کی تھی، نیز نواب صدیق حسن خاں کی تفسیر فتح البیان کے مطالعہ سے محظوظ ہو کر بیگم صاحبہ کے لئے تمغۂ شفقت اور نواب صاحب کے لئے تمغۂ مجیدی درجہ دوم اور منشی جمال الدین خاں بہادر کے لئے تمغۂ مجیدی درجہ سوم اپنے فرامین کے ساتھ روانہ کیا۔

ان تمام اعزازات کے باوجود نواب شاہ جہاں بیگم کے ساتھ یہ ازدواجی تعلق مبارک نہیں ثابت ہوا۔ بلکہ جیسا کہ مؤلف مآثر صدیقی نے لکھا ہے "جس تاریخ سے رئیسۂ عالیہ خلد مکاں نے اپنا نکاح ثانی اُن سے کیا اور اُن کو اپنا معاون و مددگار نظم و نسق ریاست میں بنایا اُسی وقت سے اسباب مخالفت فراہم ہونا شروع ہوئے۔" مخالفت کے مختلف اسباب تھے۔ نواب صاحب کو کتاب و سنت کی پابندی اور اصلاح دینی میں جو غیر معمولی انہماک تھا اُس نے قدرۃً اہلِ بدعت کو برانگیختہ کیا۔ ریاست کی تنظیم اور تجدید قواعد و قوانین کے سلسلہ میں اُن عمال کو شکایت پیدا ہوئی جو بدنظمی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے۔ بعض لوگ بیگم صاحبہ تک رسوخ حاصل کرنے میں نواب صاحب کے وجود کو سنگِ راہ محسوس کرنے لگے۔ غالباً ملکی اور غیر ملکی کا جذبہ بھی کسی حد تک کارفرما تھا۔ بہرحال اس عام برہمی کی ابتدا یوں ہوئی کہ بیگم صاحبہ کے پاس نواب صاحب کے متعلق شکایتی خطوط آنا شروع ہوئے۔ جب اِن کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تو خود نواب صاحب کے نام گمنام تحریریں آنے لگیں جن میں قتل کی دھمکی اور گالیاں ہوتی تھیں۔ جب اِن سے بھی کام نہ چلا تو اخباروں کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب یہ تدبیر بھی ناکام رہی تو قصبہ دیوری میں جو بھوپال کے مشرقی ضلع میں واقع ہے دورۂ ریاست کے موقع پر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو بعض متوسلین ریاست نے کھانے میں زہر دلوا دیا۔ نواب صاحب اِس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"زمانہ ابتدائے عقد نکاح میں ساتھ رئیسہ کے مجھ کو اور اُن کو اندر طعام چاشت کے زہر دیا گیا تھا۔ عین حالت تناول غذا میں مجھ کو اور اُن کو قے و دست شروع ہو گئے۔ ایک دو دن تک بالکل بے خبری رہی۔ تیسرے دن جب سب مادہ سمیت بتقدیر اللہ تعالے خارج ہو گیا تب ہوش آیا۔ یہ علاج بھی خزانۂ غیب سے ہوا۔

درقتل ما کمر دگی انتظار تو
کوتاہی کہ بود ز عمرِ دراز بود"[۵۱]

[۵۱] ابقاء المنن ص۱۱۹

جب یہ مہلک وار بھی خالی گیا تو بیگم صاحبہ کو بعض مستورات کے ذریعہ عقیم دوائیں استعمال کرائی گئیں۔ اس کے بعد حملہ کا محاذ بدل دیا گیا اور نواب صاحب پر مختلف انتظامی اور مذہبی الزامات قائم کر کے انگریز حکام تک پہونچانا شروع کئے گئے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں سر ہنری ڈیلی ریزیڈنٹ سنٹرل انڈیا مقرر ہو کر اندور آئے تھے۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ جب وہ بھوپال آئے تو بیگم صاحبہ کسی خاص عذر سے دستور ریاست کے مطابق اُن کے استقبال کو نہ جاسکیں اور اپنے بجائے نواب ولی عہد صاحبہ کو بھیج دیا۔ یہ بات ریزیڈنٹ صاحب کی ناخوشی کا باعث ہوئی۔ انھوں نے انتقاماً یہ حکم صادر فرمایا کہ آئندہ سے پہلی ملاقات ریزیڈنٹ کی فرودگاہ یعنی جہانگیر آباد کی کوٹھی پر ہوا کرے اس کے بعد وہ بازدید کے لئے سرکاری محل پر جائیں گے[1]

ریزیڈنٹ کی ناراضی سے فائدہ اُٹھا کر دشمنوں نے نواب صاحب کے خلاف طرح طرح کے الزامات تراشنا شروع کئے اور اُن کو تحریریں اُس کے پاس بھیجنے لگے "مثلاً نواب شاہ جہاں بیگم کو پردہ نشین بنا کر ریاست کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا، بعض اشخاص کی جاگیریں بلا وجہ ضبط کر لینا، انتظام ریاست میں ضرورت سے زیادہ سختی برتنا، نواب شاہ جہاں بیگم اور ولیعہد نواب سلطان جہاں بیگم میں ناموافقت پیدا کرانا" صاحب بہادر آنکھ بند کر کے وہ تمام عرائض حکومت ہند میں روانہ فرماتے رہے۔ لیکن حکومت نے اِن عرایض پر کوئی مخالفانہ کارروائی کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ اس کے بعد جب مسٹر لیپل گریفن کابل سے عہدۂ ریزیڈنسی پر اندور آئے تو اُنھوں نے وہ یادداشتیں دیکھیں جو مسٹر ہنری ڈیلی نواب صاحب کے متعلق چھوڑ گئے تھے۔ ساتھ ہی سازش کرنے والوں نے یہ دیکھ کر کہ ذاتی اور انتظامی شکایتیں کارگر نہیں ہوتیں تو جہاد اور بغاوت کے اتہام سے نواب صاحب کو حکومت کی نظر میں خطرناک ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ طلسمی الفاظ ہیں کہ ان کے سنتے ہی حکومت کا دماغی توازن کبھی کبھی درہم برہم ہو جاتا ہے اور غور و فکر کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ دشمنوں کی یہ آخری تدبیر پوری طرح کامیاب ہوئی۔ ترغیب جہاد کے متعلق جو الزام لگایا گیا تھا اُسکے متعلق مؤلف مآثر صدیقی لکھتے ہیں:۔

"والا جاہ مرحوم نے اپنی بعض کتابوں میں مسائل شرعیہ کے ذیل میں جامعیت کے شوق اور وسعت معلومات کے لحاظ سے مسئلۂ جہاد کے متعلق علامہ سید حسن بن جلال یمنی کے رسالہ

---

[1] مآثر صدیقی جلد سوم صفحہ ۱۲۰

بانیان اور سیّد عبد اللہ بن عبد الباری یمنی کے رسالہ سیف تبار کا ترجمہ اور اسی طرح دوسرے علماء متقدمین کے اقوال اور تحریروں کو یکجا جمع کر دیا ہے اور بعض مقامات پر ان کا حوالہ بھی دیدیا ہے مگر ساتھ ہی اس کے انھیں کتابوں میں بطور قول فیصل اپنی رائے مسئلہ جہاد اور زمانۂ غدر ہندوستان کی نسبت مختلف مضامین میں ظاہر کر کے گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ بپابندیٔ شرع شریف ایفائے عہد و وفاداری پر ثابت قدمی اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ مخالفین نے نہایت دلیری اور چالاکی سے والا جاہ کی تحریروں کو دانستہ نظر انداز کر کے تحریرات و مضامین منقولہ کو بطور دستاویز اثباتِ جرم گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا اور مسئلۂ جہاد کی محض نقل و بیان گورنمنٹ کی مخالفت اور بغاوت کا مرادف ٹھہرایا اور کتاب ہدایت السائل۔ ترجمان وہابیہ اقتراب الساعۃ اور موعظہ حسنہ یعنی مجموعہ خطب جس میں اتفاقاً مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا وہ خطبہ بھی جو سکھوں سے جہاد کرنے پر مبنی تھا چھپ گیا تھا، اُن کو اپنے دعوے کی دلیل قرار دے کر حکام کے سامنے پیش کیا......"[۵۱]

اس بیان سے ترغیب جہاد کے الزام کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ مسئلۂ جہاد اسلام کا ایسا مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ اس کی تفصیلات سے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کے مجلدات پُر ہیں۔ اور اسلام کے متعلق وہ کونسی قابلِ ذکر کتاب لکھی گئی ہے جس میں یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا۔ پھر نواب صدیق حسن خاں کی کتابوں کی کیا خصوصیت تھی اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ وہ اپنی کتابوں میں حکومت کے ساتھ پوری وفاداری برتنے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے والد حضرت سید احمد بریلوی کے خلفاء میں تھے اور سکھوں کے خلاف سرحد کی مہم میں بھی کچھ دنوں شریک رہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُنھوں نے تقویٰ کی بنا پر پانچ لاکھ کی جاگیر سے جو ترکۂ پدری میں مل رہی تھی ہاتھ اُٹھا لیا اور ساری عمر اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر عُسرت اور تنگدستی میں گزار دی۔ مگر نواب صدیق حسن خاں تو نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر تھے جن کا شمار حکومت برطانیہ کے مخصوص ترین وفاداروں میں تھا۔ خود اُن کو بھی حکومت ہند کی طرف سے خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا اور تمام مملکتِ انگلشیہ میں سترہ ضرب توپ کی سلامی اُن کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ جو غریب اِن سنہری زنجیروں میں سر سے پاؤں تک جکڑا ہوا ہو اُس سے کارزار جہاد کی سرفروشی کی

---

[۵۱] مآثر صدیقی حصہ سوم ص۱۳۱۔

توقع کرنا اُنہی دماغوں کا کام ہو سکتا ہے جن پر اس لفظِ جہاد کے معنی کا بوسس کی طرح مسلط ہوں۔ تاہم اس معاملہ میں ہم حکومت ہند کو ایک حد تک معذور خیال کرتے ہیں ؎

بہ بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد

۱۸۵۷ء کے واقعات کی یاد ابھی تازہ تھی۔ سرحد پر سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی باقی ماندہ جماعت سے آویزش کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی سال تک قایم رہا اور حکومت کو متعدد شکستیں اُٹھانا پڑیں۔ اُس نے اپنا غصہ ہندوستان کے اُن سر برآوردہ مسلمانوں پر اُتارا جن کا کچھ بھی تعلق سرحد کی تحریک جہاد سے پایا گیا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں مولوی محمد جعفر صاحب رئیس تھانیسر مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی، مولانا عبدالرحیم صاحب عظیم آبادی، محمد شفیع صاحب سوداگر لاہور، مولانا احمد اللہ صاحب رئیس پٹنہ وغیرہ آٹھ آدمیوں پر سازش کا مقدمہ قائم کیا گیا اور ان سب کو پھانسی کی سزا تجویز ہوئی جو بعد میں حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ تبدیلی کسی رعایت کی بنا پر نہ تھی بلکہ محض شدت انتقام کے تقاضے سے تھی۔ کیونکہ پھانسی کے حکم نے ملزمین کو درجۂ شہادت کا مژدہ سنایا تھا اور وہ جلد سے جلد دار و رسن کے ذریعہ اس رُتبۂ بلند کو حاصل کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ حکومت نے تو اپنی دانست میں انتہائی سزا تجویز کی تھی مگر جب یہ دیکھا کہ اس سے یہ "مذہبی دیوانے" اور خوش نظر آتے ہیں تو بجائے پھانسی دینے کے سب کو کالے پانی روانہ کر دیا کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں [۵۱] اُسے کیا معلوم تھا کہ جس راہ میں اِن دیوانوں نے دُنیا کے تمام عیش و آرام کو ٹھکرا کر قدم رکھا ہے اُس کی ہر سختی نفسِ مطمئنہ کے لئے مسرت و شادمانی کا ایک تازہ پیام لاتی ہے ؎

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

ترغیب جہاد کے بعد دوسرا بڑا الزام تبلیغ وہابیت کا تھا۔ وہابیت بھی اُس زمانہ میں جہاد سے کم خطرناک نہیں سمجھی جاتی تھی اس لئے کہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی محققانہ تصنیف "ہندوستانی مسلمان" میں بزعم خود یہ ثابت کر دیا تھا کہ حکومت سے لڑنا مسلمان اپنا مذہبی فرض جانتے ہیں

---

۵۱ سیرت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ - مؤلفہ سید ابوالحسن علی ندوی - ص ۹۳-۲۰۲

اور وہابیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں۔ کتاب کے عنوان میں انھوں نے یہ فقرہ لکھا تھا:۔

"کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از رُوئے ایمان ملکۂ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟"

یہ کتاب خاص طور پر بنگال کے مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی تھی۔ اُنہی پر وہابیت کے جرم میں مقدمات قایم کئے جا رہے تھے اور بہتوں کے لئے قید اور عبور دریائے شور کی سزائیں تجویز ہو رہی تھیں، مگر کتاب کا مضمون ہندوستان کے تمام مسلمانوں پر منطبق ہوتا تھا اور حکومت نے وہابیت اور بغاوت کو عملاً ہم معنی سمجھ لیا تھا۔ سر سید مرحوم نے ہنٹر کی رُسوائے عالم کتاب پر ایک مفصل تبصرہ لکھ کر اخبار پائنیر کے کئی نمبروں میں شایع کرایا اور مصنف کے کذب و افترا کا پردہ چاک کیا۔ پھر اس ریویو کو حافظ احمد حسن صاحب مرحوم نے ایک مستقل رسالہ کی حیثیت سے اردو۔ انگریزی۔ دونوں زبانوں میں لندن میں چھپوا کر شایع کیا۔ اس طرح سر سید اور بعض دوسرے بزرگوں کی کوشش سے وہابیت کے جو خطرناک معنی حکومت نے اپنے ذہن میں قایم کر لئے تھے وہ دُور ہو گئے۔

دوسری طرف ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث نے اپنے لئے اس لفظ کا انتساب توہین کا باعث سمجھا۔ جو لوگ صرف کتاب وسنت کے اتباع کے مدعی تھے اور ائمۂ اربعہؒ کے اجتہاد کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے وہ عبد الوہاب نجدی کی پیروی کا ننگ و عار کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے متعلق لفظ وہابی کے استعمال کے خلاف حکومت ہند میں سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی ہند میں جماعت اہلِ حدیث کے نام کے ساتھ لفظ وہابی کا استعمال حکومت نے ممنوع قرار دیدیا اور جو لوگ محض وہابیت کے جرم میں قید کر دئے گئے تھے وہ رہا کر دئے گئے۔ (۱۸۸۸ء)

یہ سب کچھ ہوا مگر نواب صدیق حسن خاں پر جو الزامات عاید کئے گئے تھے وہ بدستور قایم رہے۔ جب حکومت ہند کے سامنے اُن کا مقدمہ باضابطہ پیش ہوا اور مخالفین کی طرف سے جن میں سر لیپل گرفن، ایجنٹ گورنر جنرل بھی شامل تھے سزائے سخت کا مطالبہ ہوا تو حکومت نے بایں خاطر

بالآخر بیگم صاحبہ کلکتہ تشریف لیجا کر وائسرائے سے ملیں اور خانگی تعلقات میں اس مداخلت بیجا کے خلاف احتجاج کیا۔ لارڈ ڈفرن نے نواب صاحب کو تاج محل میں رہنے کی اجازت دی۔ اور معاملات ریاست پر بھی غور کرنے کا وعدہ کیا۔

جو الزامات نواب صاحب مرحوم پر قائم کئے گئے تھے اور جن کی بنا پر یہ سزا ملی تھی اُن کا مرافعہ حکومت میں کر دیا گیا تھا، لیکن ابھی اُس کا فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ فریادرسی کے لئے شہنشاہ حقیقی کے دربار سے طلبی کا فرمان صادر رہوا، اور چند ماہ مرض استسقا میں مبتلا رہ کر ۲۹، جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۰، فروری ۱۸۹۰ء کو اُنسٹھ[59] سال تین[3] مہینے کی عمر میں تہجد کے وقت قیدِ حیات اور بند غم دونوں سے ایک ساتھ رہائی پائی۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جس وقت اِس سانحۂ ارتحال کی خبر حکومت ہند کو پہونچی اُسی وقت ایک تار مسٹر الیف ہنوی ایجنٹ گورنر جنرل نے حکومت کی طرف سے بیگم صاحبہ کے پاس بھیجا کہ مرحوم کی نعش کے ساتھ شاہی اعزاز عمل میں لایا جائے۔ مگر چونکہ نواب صاحب مغفور کی وصیت کے مطابق مراسم تجہیز و تکفین بپابندی سنتِ مطہرہ نہایت سادہ طریقہ پر ادا کر دئے گئے تھے اِس لئے اعزاز شاہی سے گرانبار ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اِس کے بعد ۱۲، اگست ۱۸۹۰ء کو مسٹر ہنوی نے ایک باضابطہ مراسلہ اِس مضمون کا بھیجا کہ حکومت ہند نے بیگم صاحبہ کی درخواست منظور فرمالی کہ "آں عالیہ کے شوہر عالی مقدار سرکاری مراسلت میں اور تحریرات میں نواب صاحب بہادر مرحوم شوہر رئیسہ کے خطاب سے یاد کئے جائیں۔" [۱]

صاحب مآثر صدیقی اپنے والد بزرگوار کے حُلیہ و اخلاق و شمائل کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میانہ سڈول موزوں قد، نہ طویل نہ قصیر، کھلا ہوا ملیح رنگ مائل بہ صباحت۔ بھرے ہوئے رُخسار۔ سیدھی سُتواں ناک، کشادہ پیشانی۔ کتابی خوبصورت چہرہ۔ میانہ سر و گردن و ساقیں۔ چوڑا سینہ۔ مختصر ریش۔ متناسب اندام۔

نہایت خوش خلق، شیریں کلام، کم سخن، ظریف الطبع، آزاد و بے پرواہ مزاج، لطیفہ سنج، کثیر الحلم، قلیل الغضب، منکسر و متواضع، سب و شتم سے کبھی اُن کی زبان آلودہ اور آشنا

---

[۱] مآثر صدیقی حصہ سوم۔ صفحہ ۲۰۴

نہیں ہوئی۔ جب اُن کو کسی خادم پر بہت غیظ و غضب آتا تو اُن کی زبان سے جو سخت سے سخت دشنام نکلتی وہ یہ تھی کہ اُس کو کاٹ کا احمق کہہ کر خطاب کرتے تھے اور دَورانِ غضب میں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا کرتے تھے۔ عیدین اور جمعہ کو جب وہ عیدگاہ یا مسجد کے دروازہ پر پہونچتے تو اپنا جوتا خود اُٹھاتے اور جھاڑتے تھے۔ اگر کوئی خادم سر پر آفتاب گیر لگانا چاہتا تو فوراً روک دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس دُھوپ سے آفتابِ محشر کی گرمی بہت زیادہ ہوگی اُس سے کون بچائے گا۔" [۵۱]

"قبل امارت وغنا اور بعد امارت وغنا کبھی کوئی مکان ذاتی اُنھوں نے اپنے لئے بنایا اور نہ مصارف ذاتی میں کبھی اُنھوں نے اپنی استطاعت سے باہر قدم رکھا۔ بعد نکاح رئیسۂ عالیہ تو اُن کا ذاتی صرف نہایت قلیل واقل تھا۔ رئیسۂ عالیہ کے محل میں اُن کا قیام تھا اور تمام اُن کے مصارف کا بار رئیسۂ عالیہ کی ذات پر تھا۔ صرف بوقت ضرورت وہ کاغذ وقلم و دوات اور خطوط وغیرہ کا معمولی خرچ اپنی جیب خاص سے کیا کرتے تھے۔ البتہ ہزاروں روپیہ سالانہ وہ اپنی جاگیر سے صلۂ ارحام، مراعاتِ اہلِ حقوق، امداد مساکین وبیوگان اور یتامیٰ اور اہلِ حاجت اور غرباءِ وطن پر صرف کیا کرتے تھے جس کی صحیح تعداد کا علم جز وہم لوگوں کو بھی باوجود اُن کی اولاد ہونے کے نہ تھا۔ بعد وفات اُن کے حسب باشندگانِ قنوج اور اہلِ حاجت کی درخواستیں آنا شروع ہوئیں اور اُن کی فہرست اسماء مرتب ہوئی اُس وقت علم ہوا۔ اُن میں سے بعض لوگوں کی امداد تو ہم لوگوں نے بدستور جاری رکھی اور جو باقی بچے اُن کا وظیفہ رئیسۂ عالیہ نے مراحمِ شاہانہ سے اپنی ڈیوڑھی خاص سے مقرر فرمایا۔ جَزَاہَا اللّٰہُ خَیْرًا۔" [۵۲]

اپنے مذہب کے متعلق نواب صاحب مرحوم خود لکھتے ہیں :-

"رجماً بالغیب مجھ پر یہ طوفان باندھا گیا کہ میں خدانخواستہ حق میں ائمۂ اربعہ کے عموماً اور حق میں امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے خصوصاً بے ادب نامہذب ہوں، حالانکہ یہ نرا افترا ہے۔ اس کی تکذیب کے لئے میرا رسالہ جلبُ المنفعتہ نام بس کرتا ہے۔ اگر میں ایسا ہوتا تو اپنی کتبِ فقہ میں ہرگز کسی مسئلۂ حنفی کی ترجیح نہ کرتا، حالانکہ مسک الختام و شروح تحریدات صحیحین وغیرہا میں بہت جگہ مذہب امام عالی مقام کو میں نے راجح لکھا ہے اور دوسرے مذہب کو

---

[۵۱] مآثر صدیقی حصہ چہارم ص۶۵۔

[۵۲] " " حصہ چہارم ص۶۴۔

مرجوح یا ضعیف یا مردود قرار دیا ہے، اور کسی کتاب میں کوئی لفظ طعن یا تشنیع کا حق میں مقلدین مذاہب کے زبانِ قلم سے نہیں نکلا۔ چہ جائے حضرت ائمہ اربعہ کے۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ میرا اعتقاد حق میں ان چاروں امام فقہ کے اور حق میں جمیع محدثین ۔۔ جملہ علمائے پاکِ دین کے ویسا ہی ہے جیسا کہ حق میں صحابہ و تابعین و تبع تابعین، اور تمام سلف صالحین کے ہے، اگرچہ مجھ کو اُن کے تفاضل درجات پر نزدیک خدا کے آگاہی حاصل نہیں ہے۔ میں ان سب کے حق میں بے ادبی کرنے کو سم قاتل و زہر ہلاہل جانتا ہوں میں بحمد تعالیٰ اُن لوگوں میں نہیں ہوں کہ دُنیا کے کتوں سے ڈر کر تقیہ کروں۔ اگر میں ایسا ہوتا تو کیوں یہ آفات مجھ پر کیوں آتے، اور نہ میں ریاکار ہوں اس لئے کہ ریا واسطے تحصیل مال و جاہ و عزت کے ہوتی ہے جو اللہ نے مجھ کو میرے حوصلہ و ہمت سے بہت زیادہ دیا ہے۔ مجھ کو اس تحصیل حاصل سے کیا نفع۔ بے شبہ میں کسی کی رائے مجرد و اجتہاد کا مقلد نہیں ہوں جب تک کہ اُس کو موافق دلیل و سنت کے نہ کرلوں خواہ وہ علم ظاہر سے علاقہ رکھتا ہو یا علم باطن سے۔ یہ طریقہ مسائل حلت و حرمت میں مطرد ہے اور اصول عقائد میں متحد۔ رہے وہ اُمور جن کو کچھ تعلق ان دونوں اقسام سے نہیں ہے وہاں میں معانی آیات و احادیث میں جملہ علماء و اکابر و صلحاء و ائمہ سلف کے اقوال و اصول پر اعتماد کرتا ہوں خواہ علماء حنفیہ ہوں یا شافعیہ یا حنابلہ یا مالکیہ یا علماء صوفیہ و مشائخ طریقہ۔"[1]

طریقت میں سلسلۂ نقشبندیہ کے پیرو تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ میں جملہ طرائق صوفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کو موصل الی اللہ جانتا ہوں اور مشائخ جملہ طرق کو مانتا ہوں لیکن طریقہ میرے آباء و اساتذہ و مشائخ کا نقشبندیہ ہے گو اور طرائق کی بھی اجازت حاصل تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے قولِ جمیل میں سب طرائق کے اشغال و اذکار لکھے ہیں۔ وہ نہایت مختصر و مرغوب و محبوب و مطلوب ہیں۔ میرے والد ماجد مرحوم نقشبندی تھے اور میرے شیخ سنت قاضی محمد بن علی شوکانی یمنی بھی اسی طریقہ نقشبندیہ میں تھے۔"[2]

نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی شہرت نہ صرف تمام ہندوستان بلکہ دُنیائے اسلام کے تقریباً ہر حصہ میں اُن کی تصانیف کے پروں پر پہونچی۔ اُنھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں دو سو بائیس[۲۲۲]

---

[1] ابقاء المنن ص ۱۱۹ [2] ابقاء المنن ص ۹۲

کتابیں لکھی ہیں جن کے مضامین تفسیر، حدیث، فقہ، اخلاق، تصوف، تاریخ، شعر و ادب، لغت، عروض، تذکرۂ شعراء، سیاست اور انساب وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ بعض اہلِ نظر کی رائے میں ان کتابوں کا اکثر حصہ مصنفین سلف کی تالیفات سے منقول ہے۔ نواب صاحب مرحوم اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ صاف الفاظ میں خود اعتراف کرتے ہیں کہ :۔

"غالب تالیفات میرے نقول آثارِ سلف اور تراجم مؤلفات علمائے راسخین ہیں۔ جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ یا نقل ہو کر آئے ہیں۔ وہ علم درحقیقت علمائے سابقین و ائمۂ امت کا علم ہے نہ میرا علم و اجتہاد۔ میں فقط اُن کا حامل و نقال ہوں۔ معہذا میں نے اُس حمل و نقل کو امانت و دیانت کے ساتھ ادا کیا ہے، نہ سرقت و خیانت کے ساتھ، اور حتی الامکان اس امر کا التزام رکھا ہے کہ قول راجح کو نقل کروں اور مذہب قوی کو بتاؤں اور موافقت کتاب و حدیث کو ملحوظ رکھوں اور رائے بحث سے تحذیر کروں اور کسی جگہ بھی مذاہب فرقِ ناجیہ سے خارج نہ ہوں۔" [۱]

ممکن ہے کہ بعض مقامات پر ماخذ کا حوالہ نہ دیا ہو لیکن یہ فردگزاشت اِس عام اعتراف کی بعد جو اُوپر نقل کیا گیا کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ اور اُن کی تالیفات کی افادی حیثیت سے تو اُن کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، خصوصاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ صد درجہ نافع اور کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات سے پُر ہیں۔ کتابوں کی خریداری اور اپنی مذہبی تالیفات کو مفت تقسیم کرنے میں ہزاروں روپے بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ اِبقاء المنن میں لکھتے ہیں :۔

"ایک منت اللہ تعالیٰ کی مجھ پر یہ ہے کہ جب اُس نے مجھ کو علم کتاب و سنت عطا کیا اور سب علوم متداولہ و فنون رسمیہ سے نفرت بخشی تو اپنے خزانۂ کرم سے وہ کتب علمائے سلف و ائمۂ ملت کی عنایت فرمائی جو اس زمانہ آفت نشانہ میں نہایت کمیاب عزیز الوجود ہیں۔ کچھ تو میری کشش و کوشش سے میسر ہوئی اور میں نے اُن کو خاطر خواہ بالغ قیمت دیگر عرب و عجم سے حاصل کیا جیسے فتح الباری کہ کامل نسخہ اُس کا اقلیم ہند میں دیکھا سُنا نہ گیا تھا، چھ سو (۶۰۰) روپیہ کلدار کو حدیدہ سے خرید کیا۔ وہ قلمی ابنِ علان کا ہے۔ پھر اُسی نسخہ سے بصرف پنجاہ ہزار (۵۰۰۰۰) روپیہ دوسرا نسخہ بلدۂ مصر مطبع بولاق میں طبع کرایا۔ اب نسخہ مطبوعہ مصر سے منافع اہلِ ہند میں

---

[۱] ابقاء المنن ص۵۷ –

کتاب مذکور پھر جا بجا طبع ہو رہی ہے۔ اور ابن کثیر کو مع فتح البیان چھپوایا۔ یہ طبع ثانی ہے
بعد نظر ثانی کے وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔۔۔۔" [1]

"ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میرا اکثر مال اشاعت کتب علوم کتاب و سنت میں صرف ہوا۔
ہر کتاب کے ایک ہزار نسخے طبع ہو کر بلادِ قریب و بعید و اقالیم دور و دست میں تقسیم کئے گئے، کسی
سے قیمت کسی کتاب کی نہیں لی گئی، مصارف انطباع کو جب دیکھا جاتا ہے تو آلاف الوف
تک پہونچتے ہیں۔" [2]

پچاس سال سے زیادہ ہوئے کہ والاجاہ امیر الملک نواب سید محمد صدیق حسن خاں بہادر کا
انتقال ہو گیا۔ لیکن سید صدیق حسن شایع کتاب و سنت آج بھی زندہ ہے، اور جب تک
علوم دینیہ کے پیاسے قرآن و حدیث کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے اُس کی
تالیفات کا فیض بھی بدستور جاری رہے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ "علم"
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

[1] ابقاء المنن ص۲۱-۲۲
[2] " " ص۲۵

محمد عُزیر

تاریخ سلاطین گجرات کے عربی مآخذ

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

صوبۂ گجرات پر جس کو اورنگ زیب رح نے "زیب و زینت ہندوستان" کہا ہے۔ گجراتی سلاطین کے خاندان نے ۱۸۵ برس تک حکمرانی کی ہے۔ اِن کی تاریخ گویا چھوٹے پیمانے پر تمام اسلامی ہند کی تاریخ ہے جو ان کی ملک گیری، حمیتِ اسلامی، خداترسی اور علمی سرپرستی کے لحاظ سے بیحد نتیجہ خیز اور دلچسپ ہے، مگر ابتک اس پر کامل توجہ نہیں کی گئی جس کی یہ صحیح طور سے مستحق ہے گجرات کے اسلامی عہد کے تاریخی واقعات ہندوستانی مؤرخین کی لکھی ہوئی ہندوستان کی عام تاریخوں میں قلمبند کئے گئے ہیں جنکے اقتباسات الیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں ترجمہ کر کے درج کئے ہیں، لیکن مستقل طور پر تاریخ گجرات پر فارسی میں لکھی ہوئی کم و بیش ایک درجن[1] کتابوں میں سے ابتک صرف تین چار کتابیں شایع ہوچکی ہیں، کچھ گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں، اور کچھ یورپ و ہندوستان کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

---

[1] کتب ذیل فارسی زبان میں مستقلاً سلاطین گجرات پر لکھی گئی ہیں۔ (۱) تاریخ مظفر شاہی۔ مظفر شاہ اوّل پر۔ اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ (۲) تاریخ احمد شاہی۔ احمد شاہ اوّل پر مصنفہ علوی شیرازی منظوم اسکا کوئی مخطوطہ نہیں معلوم ہوا۔ (۳) طبقات محمود شاہی۔ محمود اوّل (بیگڑہ) پر اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم (فہرست ج ۳ ص ۹۶۶) میں موجود ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ پیشاور میں کسی صاحب کے پاس ہے۔ (۴) تاریخ مظفر شاہی۔ مظفر ثانی پر۔ مولوی ابوظفر ندوی نے اسکو مع گجراتی ترجمہ شائع کردیا ہے۔ (۵) تاریخ بہادر شاہی۔ اس کا کوئی مخطوطہ نہیں ملا۔ مابعد کی تاریخوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ (۶) مآثر محمود شاہی۔ محمود دوم پر۔ بعض کا یہ خیال کہ طبقات محمود شاہی اور یہ دونوں ایک ہی کتاب ہیں۔ صحیح نہیں۔ (۷) مرآۃ سکندری چھپ گئی ہے۔ انگریزی میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ (۸) تاریخ گجرات از میر ابو تراب ولی کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کی ہے۔ (۹) تحفۃ السادات از آرام کشمیری۔ کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ (۱۰) تاریخ مظفر شاہی۔ مظفر ثالث پر۔ کوئی نسخہ نہیں ملا۔ (۱۱) تاریخ گجرات از محمود بن جلال منور الملک بخاری ایک طرح کی ڈائری ہے جو سنہ ۹۲۴ھ کے بعد لکھی گئی ہے۔ بوڈلین لائبریری میں ایک مخطوطہ موجود ہے۔ (۱۲) مرآۃ احمدی مشہور ہے اور چھپ گئی ہے بعض حصص کا انگریزی ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔

عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی کتابوں میں گجرات سے متعلق بہت کچھ تاریخی مواد موجود ہے جو "عربی حوالہ جات" (Arab References) کے نام سے جمع کیا گیا اور شایع ہو چکا ہے[۱] مگر چونکہ اس کا تعلق تمامتر گجرات کے ہندو عہد سے ہے، اس لئے ان کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ عربی زبان میں سلاطین گجرات کی تاریخ پر صرف ایک مستقل کتاب ظفر الوالہ بمظفر وآلہ موجود ہے جو خوش قسمتی سے تین ۳ جلدوں میں چھپ چکی ہے اس کے علاوہ عربی کی بعض تاریخ و سیر کی کتابوں میں جو نویں ۹ اور دسویں ۱۰ صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں، "سلطنت گجرات" کی تاریخ سے متعلق بعض مفید معلومات پائی جاتی ہیں جو اس عہد کی تاریخ کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جہانتک ہمیں معلوم ہے سوائے دو ۲ تین ۳ کتابوں کے ابتک عربی مآخذ کا استعمال نہیں کیا گیا، حالانکہ ان میں جو معلومات ملتی ہیں وہ سلطنت گجرات کی تاریخ کی تحقیق و مطالعہ میں بڑی کارآمد اور مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ سر ڈینیسن راس بھی اسکے قائل ہیں کہ:-

> "وہ عربی تواریخ جو حجاز، یمن، عدن اور فتح مصر اور اس کے ساتھ ہی بحرِ قلزم پر عثمانلی ترکوں کے قابض ہونے پر لکھی گئی ہیں ان سے بھی اس کام (تاریخ گجرات) میں مدد لینی چاہئے گو ان میں سے اکثر کتابیں مؤرخین عرصہ ہوا معلوم کر چکے ہیں، لیکن بعض کا نام تو صرف ان کے حوالوں سے ہی ہم جانتے ہیں۔"[۲]

عربی مصادر

۱۔ الضوء اللامع فی اہل القرن التاسع - مصنفہ شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن السخاوی (المتوفی سنہ ۹۰۲ھ)۔ اس میں احمد آباد، گجرات، اسکے سلاطین اور ان علمائکے حالات ملتے ہیں جو نویں ۹ صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۹۴ھ میں مصر میں ۱۲ جلدوں میں شایع ہو گئی ہے۔

۲۔ بدائع الزھور فی وقائع الدھور - مصنفہ احمد ابن ایاس المصری (المتوفی سنہ ۹۳۲ھ) یہ کتاب تاریخ مصر پر ۳ جلدوں میں مصر میں شایع ہو چکی ہے۔ اس کا تکملہ جو سنہ ۹۰۶ھ تا سنہ ۹۲۱ھ تک کی تاریخ مصر پر مشتمل ہے اس کو ریٹر Ritter جرمنی نے استامبول سے دو ۲ جلدوں میں شایع کر دیا ہے اس میں سلاطین غوری اور ترکی کے حالات کے ضمن میں سلاطین گجرات سے ان کے تعلقات اور پرتگیزوں کے مقابلہ میں ان کی امداد سے متعلق بعض اہم معلومات ملتی ہیں۔

۳۔ ریاض الرضوان فی مآثر المسند العالی آصفخان - عبد العزیز آصف خاں وزیر سلطان بہادر شاہ و محمود شاہ ثانی کے حالات و سوانح۔ مصنفہ شہاب الدین احمد بن

---

[۱] منشی فضل اللہ فریدی مترجم مرآۃ سکندری نے یہ اقتباسات جمع کئے ہیں۔ جو بمبئی گزیٹیر جلد اول حصہ دوم میں شامل ہیں۔
[۲] تاریخ گجرات مؤلفہ کمسریٹ کا پیش لفظ۔

محمد ابن حجر الہیتمی مشہور عالم و فقیہ (المتوفی ۹۷۴ھ)۔ ۹۴۲ھ میں سلطان بہادر شاہ نے مغل بادشاہ ہمایوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کا خطرہ محسوس کیا تو اُس نے اپنے حرم کو مع اپنے قیمتی خزانے کے اپنے وزیر آصف خاں کے ہمراہ مکۂ معظمہ کو روانہ کر دیا۔ آصف خاں ۱۲ سال تک مکہ میں رہے اور ۹۵۵ھ میں احمد آباد واپس آئے۔ خود بہت بڑے عالم و فاضل شخص تھے اس لئے افاضل و علماء مکہ کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے جن میں ایک علامہ ابن حجر ہیتمی بھی تھے جو آصف خاں کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے آصف خاں کے حالات میں یہ رسالہ لکھا ہے۔ اس کتاب کے مخطوطات لیڈن اور برلن کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں[۱] ظفر الوالہ[۲] میں اس کتاب کا متن (ملخص) منقول ہے۔

۴۔ مرأۃ الممالک۔ مصنفہ علی بن حسین معروف بہ سیدی علی رئیس قپودان (کپتان)[۳] مشہور ترک عالم بحریات ادیب و شاعر۔ یہ سلیمان اعظم سلطان ترکی کے جنگی بیڑے کے کپتان تھے سلطان نے ان کو پندرہ ترکی جہازوں کا بیڑا البصرہ سے خلیج فارس وہاں سے بحر عرب ہوتے ہوئے نہر سویز کو لیجانے کا حکم دیا تھا۔ مگر وہ ساحل بحر ہند کے بحری طوفان سے ناواقف تھے اس لئے راستہ بھول بیٹھے اور ساتھ ہی اپنا بیڑا بھی غرق کر دیا۔ وہ خشکی پر اپنا سفر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ سواحل گجرات سے بالائی ہندوستان، سندھ، کھوٹان، توران، خراسان، خوارزم اور ایشیائے کوچک ہوتے ہوئے قسطنطنیہ پہونچ گئے۔ اپنی اس کتاب کے چوتھے باب میں اُنھوں نے اپنے وقائع سفر ہندوستان اور باب پنجم میں سفر گجرات کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ۹۶۱ھ میں وہ احمد آباد میں تھے جہاں اُنھوں نے بحریات پر اپنی معرکۃ الآرا کتاب "محیط" ختم کی۔ وہ شاعر تھے اور کاتبی تخلص کرتے تھے۔ وہ احمد شاہ (۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء - ۹۶۹ھ/۱۵۶۱ء) کے عہد میں گجرات آئے تھے اور اُنھوں نے اُس زمانے میں جو واقعات دیکھے یا سُنے وہ اِس کتاب میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء میں قسطنطنیہ میں چھپ گئی ہے۔ کئی یورپین زبانوں میں اِس کا ترجمہ ہوا ہے۔ پروفیسر ویمبری نے انگریزی میں اِس کا ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۹۹ء میں لنڈن سے شائع ہوا ہے۔

۵۔ البرق الیمانی فی فتح العثمانی۔ مصنفہ علامہ قطب الدین محمد بن قاضی خاں

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ [۲] جلد اوّل ص ۳۳۳ تا ص ۳۹۰

[۳] 〃 〃 〃 جلد ۱ ص ۲۸۱۔ ص ۲۸۸؛ کمسریٹ کی تاریخ گجرات ص ۴۷۔ ص ۴۸۔

محمود النهروالی (المتوفی سنہ ۹۹۰ھ) مکہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد جو ہندوستان کے ایک اہل علم خاندان سے تھے، نہروالہ پٹن سے ہجرت کر گئے تھے اور اسی نسبت سے یہ النہروالی کے نام سے مشہور ہیں[51] اس کتاب میں پرتگیزوں کے ساتھ سلطان بہادر شاہ کی لڑائیوں اور سلیمانی توپوں کا ذکر ہے جو سلطان سلیم بن سلیمان نے پرتگیزوں کے مقابلہ کے لئے مصر سے سلیمان بادشاہ کے جنگی بیڑے کے ہمراہ ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں سلطان بہادر شاہ کو بھیجی تھیں۔ اصل میں یہ کتاب یمن میں ترکی حکومت (سنہ ۹۰۰ھ تا سنہ ۹۸۲ھ تک کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے لندن، پیرس، اسکوریال اور کتب خانۂ خدیویہ میں پائے جاتے ہیں۔[52]

۶۔ **النور السافر فی اخبار القرن العاشر**۔ مصنفہ محی الدین عبدالقادر بن الشیخ بن عبداللہ العیدروسی (م سنہ ۱۰۳۷ھ)۔ مصنف کا خاندان یمن سے آیا تھا۔ اِن کے والد ہندوستان آئے اور گجرات میں رہ پڑے۔ مصنف خود احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں اُنھوں نے وفات پائی چنانچہ ان کا مزار بھی وہیں ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے اُن علماء و مشاہیر گجرات کا ذکر کیا ہے جو دسویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ اس کے ضمن میں مصنف نے اس صدی میں گجرات اور سلاطین سے متعلق بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ چونکہ وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور مدۃ العمر وہیں رہے اسلئے کئی واقعات اُنھوں نے چشم دید لکھے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۰۱۲ھ میں لکھی گئی ہے، اور بغداد میں ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں طبع ہو چکی ہے۔

۷۔ **ظفر الوالہ بمظفر وآلہ**۔ مصنفہ عبداللہ بن محمد بن عمر المکی الآصفی النغانی معروف بہ حاجی الدبیر۔ مصنف سنہ ۱۰۲۰ھ تک زندہ تھا۔ اِس نے یہ کتاب سنہ ۱۰۱۵ھ۔ سنہ ۱۰۲۰ھ کے مابین لکھی ہے یہ سلطنت گجرات کی تاریخ سے متعلق معلومات کا ایک خزانہ ہے اس میں بیسیوں عربی فارسی کتابوں کے حوالے دئے گئے ہیں جن میں سے اکثر کا آج کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس کا آخری حصہ مصنف کے چشم دید حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک واحد قلمی نسخہ سر ڈینیسن راس کو کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے کتب خانے میں ہاتھ لگا اور اُنھوں نے اس کو تین ۳ جلدوں میں سنہ ۱۹۱۰ء، سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۸ء علی الترتیب شائع کیا۔ اُس وقت سے لیکر اب تک بہت کم مصنفین نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور

---

[51] ان کے حالات و تصانیف کے لئے دیکھو النور السافر ص ۳۸۳؛ عقد المنظوم بہامش ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۶۸۔

[52] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ ص ۸۳۴؛ اسی مصنف کی ایک کتاب "الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام" چھپ گئی ہے جس میں گجرات سے متعلق بعض اشارات پائے جاتے ہیں۔

چھپ جانے کے باوجود یہ کتاب اب نایاب ہوگئی ہے۔ اس مبسوط و مفصل کتاب کا اُردو میں ترجمہ یا خلاصہ لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ غیر عربی داں بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔

۸۔ **السنا الباهر**:۔ مصنفہ محمد بن ابی بکر الشلی (گیارھویں صدی ہجری)[۵۱] یہ النور السافر (نمبر ۵) کا ذیل ہے۔ اس میں سلاطین گجرات اور پرتگیزوں کی لڑائیوں کا ذکر ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ مصر میں امیر احمد تیمور پاشا کے کتب خانے میں نمبر ۲۰۳۳ پر شعبۂ تاریخ میں موجود ہے۔

۹۔ **نزهة الجليس ومنية الاديب الانيس**:۔ مصنفہ العباس بن علی بن نور الدین المکی الموسوی۔ یہ کتاب ۱۱۴۸ھ میں لکھی گئی ہے اور ۱۲۹۳ھ میں مصر کے مطبع وھبیہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ مصنف کی سیاحت مصر، فلسطین، ایران، ہندوستان اور یمن کے حالات میں بطور روزنامچہ کے لکھی گئی ہے۔ ضمناً اکثر عربی ادبیات وغیرہ کی غیر متعلق بحثوں کی طرف مصنف نے گریز کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب سلطنت گجرات کے خاتمہ کے بعد اور گجرات بعہد مغول کے آخری دور میں لکھی گئی ہے تاہم یہ اس عہد میں گجرات سے متعلق بعض کارآمد معلومات پر مشتمل ہے، اس لئے اس کا ذکر یہاں ضروری سمجھا گیا۔ مصنف نے اپنی سیاحتوں کے دوران میں سیاحت گجرات[۵۲] (۱۱۳۷ھ تا ۱۱۳۹ھ) کا مختصر حال لکھا ہے جس سے اس زمانہ کی ملک گجرات کی پُر آشوب سیاسی حالات پر روشنی پڑتی ہے، جبکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ گجرات اور اس کے علاقے مرکزی حکومت کے ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے، اور مرہٹوں کی تاخت و تاراج نے ملک میں بدنظمی اور انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ مصنف نے مرہٹوں کی سازشوں اور صوبہ داری گجرات کے دو اُمیدواروں کے مابین چپقلش اور انکی خونریز لڑائیوں کے واقعات چشم دید لکھے ہیں۔ لیکن اس نے اپنے سفرنامۂ گجرات کو دوسرے ممالک کی روداد سفر کے ساتھ ایسا مدغم کر دیا ہے کہ اس کے بیانات کو مسلسل پڑھنا بہت دشوار ہے تاوقتیکہ پوری کتاب نہ پڑھی جائے۔ ہمارے فاضل اور محترم دوست علامہ عبدالعزیز میمن (پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ان تمام عبارتوں کو جو گجرات سے متعلق ہیں یکجا جمع کرکے ان کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا جو ۱۹۲۷ء میں رسالہ زبان (مانگرول) میں شائع ہوچکا ہے۔

مندرجۂ بالا تصانیف کے علاوہ ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں بھی گجرات سے متعلق بعض بیانات

---

[۵۱] اسی مصنف کی ایک کتاب المشرع الروی فی مناقب آل باعلوی چھپ گئی ہے۔ اسمیں گجرات کے بعض بزرگوں کے حالات ملتے ہیں۔ [۵۲] دیکھو کتاب مذکور، جلد اول ص ۳۶۷، ص ۳۷۱، ص ۳۸۵، ص ۳۸۹، ص ۳۹۱، ص ۳۹۲، ص ۳۹۶، جلد دوم: ص ۱۷، ص ۲۰، ص ۲۲، ص ۲۸، ص ۵۰، ص ۵۱، ص ۶۳، ص ۶۵، ص ۹۲، ص ۹۳، ص ۱۳۱، ص ۱۳۳، ص ۱۳۵۔

پائے جاتے ہیں جو سلاطین گجرات سے پہلے کے فرمانروایان خاندان تغلق سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی اور اُردو میں اُن کے تراجم بھی ہو چکے ہیں اور موجودہ زمانہ کے مورخین نے ان کو استعمال بھی کیا ہے۔[۱]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مختلف مقامات پر خصوصاً احمد آباد میں بے شمار عربی کتبات پائے جاتے ہیں جن کو عربی مصادر میں شمار کرنا چاہئے۔ اگرچہ ان کی ایک کثیر تعداد شائع ہو چکی ہے[۲] تاہم ان کتبات کی روشنی میں تاریخ گجرات کا مطالعہ کرنے کی ابتک مکمل اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔ بہر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (دکن کالج پونہ) نے اس سمت میں آغازِ کار کیا ہے۔ اور احمد آباد کے آثارِ قدیمہ کے تمام عربی فارسی کتبات پر ایک مختصر کتاب[۳] لکھ کر احمد آباد کی تاریخ کو ان کتبات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اسی طرح بمبئی کے مشہور پارسی مورّخ پروفیسر کمسریٹ (سابق پروفیسر گجرات کالج) کی ضخیم تاریخ گجرات کا ذکر کئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ تاریخ گجرات کے اسلامی عہد پر یہ ایک جامع تاریخ ہے جو مدتوں کی تحقیق و تدقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ اور مصنف کی براہ راست عربی مصادر سے واقفیت نہ ہونے پر بھی اس نے اپنی کتاب میں بعض کا استعمال کیا ہے، اور بعض جگہ عربی کتبات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ خصوصاً ابن بطوطہ اور سیدی علی رئیس پر اس کتاب کے ابواب بہت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ اسی طرح ظفر الوالہ کے بعض حوالے بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ احمد آباد میں حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف کے کتب خانہ میں عربی کی قلمی کتابوں کا ایک معتدبہ ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے مخطوطات میں سے اکثر نسخوں کے اول یا بعد میں سادہ کاغذ پر یا سرورق پر مختلف قسم کی تحریرات اور مہریں پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر مشہور علمائے گجرات کی دستی تحریریں ہونے کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، نیز ان تحریروں میں تاریخ سوانح ادب اور ثقافتِ گجرات سے متعلق بعض معلومات پائی جاتی ہیں، جن کو راقم نے اِس فہرستِ کتب میں درج کر دیا ہے جو اس نے کتب خانہ مذکور کی کمیٹی کے ایماء سے تیار کی ہے۔

---

[۱] تاریخ گجرات از کمسریٹ ص۲۱ ۔ [۲] یہ کتاب برجلیس اور دیگر ماہرین آثار قدیمہ نے شائع کر دیئے ہیں۔ رسالہ انڈین اینٹی کویری اور بھاؤ دنگر کے مجموعہ کتبات عربی و فارسی میں بھی کاٹھیاواڑ کے اکثر کتبات متعلق سلاطین گجرات موجود ہیں۔

[۳] The Muslim Monuments of Ahmadabad.

یہ بھی اس موضوع پر ہماری معلومات کا ایک اچھا ذریعہ ہے اور ہماری ثقافتی اور دماغی میراث کا صحیح اندازہ کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ تاریخ گجرات کے "عہد سلطنت" کی تمام حیثیات پر تحقیقات کو مکمل کرنے کی غرض سے مندرجہ بالا عربی ماخذ کا خاص طور سے مطالعہ کیا جائیگا جس سے تاریخ گجرات کی بعض گم شدہ کڑیوں کا پتہ لگانے میں بڑی مدد ملے گی۔

اُردو کا حق

(از پروفیسر آغا سروش صاحب اورنگ آباد دکن)

اے وطن کے جاں نثار اے ساکنِ ہندوستاں
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ تیری عظمت کے نشاں

اگلے وقتوں کی نشانی ہے جو اِک اُردو زباں
اس کا دشمن ہو رہا ہے بے سبب سارا جہاں

باپ دادا کی کمائی ہاتھ سے جانے لگی
حد یہ ہے تیری زباں کو تجھ سے شرم آنے لگی

تھیں اسی دن کے لئے ضرب المثل کی شوخیاں
آج سچ مچ پھنس گئی بتیس[۳۲] دانتوں میں زباں

مشکلوں پر مشکلیں اور گتھیوں میں گتھیاں
آگے آگے دیکھئے ہوتے ہیں کتنے امتحاں

آج تو بچ جائیں گے تلوے خلش سے خار کی
کل تجھے چلنا پڑے گا دھار پر تلوار کی

کام چل جائے زباں ہی سے اگر شمشیر کا
کارگر ہو جائے کوئی چست فقرہ تیر کا،

پھر تو کیا کہنا تری ہنستی ہوئی تقدیر کا
آنکھ میں پھر جائے نقشہ دورِ عالمگیر کا،

اس مہم کو ہے زباں اور سپاہی کی تلاش
ہو اسی اجڑی ہوئی دلی میں جس کی بود و باش

قوم کی بے اعتنائی کا گلہ کرتا نہیں،
نام اس کی سعیٔ ناقص پہ کبھی دھرتا نہیں

ان کے الزام اپنے سر لینے سے بھی ڈرتا نہیں
مشکلوں کا سامنا کرنے سے جی بھرتا نہیں،

تاکہ ہندستان سے مٹ جائے قوموں کا بگاڑ
اک ضعیفی میں اٹھایا سر پہ اُردو کا پہاڑ

سر راس مسعود

اور

اردو ادب

(از مولانا نظامی صاحب بدایونی مولف قاموس المشاہیر)

سر راس مسعود کل ہند انجمن ترقی اردو کے عرصہ تک صدر رہے ہیں۔ انجمن کے نامور معتمد اعزازی ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے جنھیں بجا طور پر کچھ دنوں سے اخبار والوں نے "بابائے اردو" کہنا شروع کر دیا ہے، اکتوبر ۱۹۳۷ء رسالہ اردو مسعود نمبر کے نام سے شائع کیا تھا اس رسالہ میں "بابائے اردو" نے جو مضمون خود سر مسعود پر لکھا تھا، اس کو ماہ دسمبر کے "مصنف" میں نقل کر کے مدیر "مصنف" نے سر مسعود کی یاد کو تازہ کر دیا، اس کو پڑھ کر میرا دل چاہا کہ "سر راس مسعود اور اردو ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر مرحوم کی اس دلچسپی اور جد و جہد کو جو وہ اردو ادب سے رکھتے تھے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر "مصنف" کے صفحات کے ذریعہ سے پیش کر دوں۔

میں نے مرحوم کو سب سے پہلے ۱۸۹۴ء کے آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس کے اجلاس میں، جو کانفرنس کا نواں اجلاس تھا، علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال قریب تھی، اس کے بعد ان کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہو گیا۔ علی گڑھ میں ان کی تعلیم و تربیت سر سید کی وفات کے بعد سر تھیوڈر ماریسن کی نگرانی میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے تھوڑے عرصہ کے بعد وہ ولایت بھیج دیئے گئے اور آکسفورڈ کے مشہور اٹین کالج میں داخل ہو گئے، وہاں سے انھوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں پٹنہ میں وکالت شروع کی، لیکن وکالت کے پیشہ کا ماحول انکی طبیعت کی افتاد کے ناموافق تھا اس لئے وہ تھوڑے دنوں کے بعد پٹنہ ہی میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر مقرر ہوئے، اور وہاں سے ترقی پا کر

گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ ابھی اس عہدہ پر پہونچے ہوئے ایک سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ سرکارِ آصفیہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ خالی ہوا اور وہ ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد بلا لئے گئے۔

ظاہر ہے کہ ان کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ انھیں مشرقی علوم میں دستگاہ حاصل کرنیکا موقع نہ ملا تھا۔ البتہ انگریزی زبان اور اس کے ادب پر ان کو ایسی قدرت حاصل تھی کہ اچھے اچھے انگریز ادیب اُن پر رشک کرتے تھے، وہ فرانسیسی زبان بھی خوب جانتے تھے۔

ولایت کے دورانِ قیام میں ہی ان کو باوجود اس کے کہ اردو، فارسی کے ادب میں ان کی پوری تعلیم نہ ہوئی تھی، اُردو اساتذہ کے کلام پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ ولایت میں جب وہ کالج کی چھٹیوں میں وہاں کے سبزہ زاروں اور پُرلطف مناظر کی سیر کرنے کے لئے شہر کی آبادی سے باہر جاتے تھے اپنے انگریز دوستوں کو "زہرِ عشق" کے وہ اشعار جو بے ثباتیٔ دنیا پر شاعر نے لکھے ہیں، سُنایا کرتے تھے اور انگریزی میں ان کا مطلب سمجھا کر داد حاصل کرتے تھے۔

ہندوستان پہونچکر انھوں نے اُردو اساتذہ کے دیوانوں کو بالاستیعاب پڑھنا شروع کر دیا اور نہ صرف شعراء کے کلام کو پڑھتے تھے بلکہ اُردو ادب کی نثر کی مشہور اور مستند کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مستند شعراء اور نثر نگاروں کی تصانیف سے ایک انتخاب "نصابِ اُردو" کے نام سے تالیف کیا، جس میں نظم و نثر کے مستند اُردو ادب کے نمونے جمع کئے ہیں اور جس سے اُردو ادب کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، یہ مجموعہ ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا اور عرصہ تک کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل رہا۔ ۱۹۴۳ء میں اِس مجموعہ کا دوسرا اڈیشن "مستند اُردو کے نمونہ" کے نام سے نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا ہے۔

۱۹۱۳ء میں ان کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے جس نے اُردو ادب کی عملی خدمت پر اُن کو آمادہ کیا۔ اُن دنوں وہ پٹنہ سے دہلی گئے ہوئے تھے کہ اُن کی ملاقات اپنے ایک فرانسیسی دوست سے جو سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، ہوئی۔ باتوں باتوں میں اُن سے اُردو ادب کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور مرزا غالب کا ذکر آگیا، اور یہی وہ گھڑی تھی کہ مرحوم کو یہ دُھن لگ گئی کہ اُردو اساتذہ کے کلام کے نفیس اور پاکیزہ اڈیشن

شائع ہوں۔ فرانسیسی دوست کی اس گفتگو کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے جو انھوں نے بہ حیثیت صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سنہ ۱۹۳۰ء میں بنارس کے اجلاس میں فرمائے تھے، آپ نے فرمایا :-

"میں اپنی ایک دفعہ کی ذلت کو کبھی نہیں بھول سکتا جب میں اتفاقاً اپنے ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ دہلی جا نکلا۔ ان کے لئے دیوانِ غالب کی ایک جلد خریدنے کا ذمہ لیا اور اس غیر فانی شاعر کے کلام کی ایک ستھری جلد کی تلاش میں دلی کی گلیوں میں مارا مارا پھرا لیکن جو بہتر سے بہتر نسخہ دستیاب ہوا وہ اس گھٹیا زرد رنگ کے کاغذ پر چھپا ہوا تھا جس سے یورپ میں لوگ اپنے بوٹ بھی نہ صاف کرنا چاہیں گے۔ جب میں نے یہ کتاب اپنے فرانسیسی دوست کے ہاتھ میں دی اس وقت اس کے چہرہ سے تعجب اور حیرت کے جو آثار نمودار ہوئے ان کے تصور سے میں اب تک کانپ جاتا ہوں۔ اُسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ میری مادری زبان کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کا یہ بہترین نسخہ تھا جو خود اس شاعر کے وطنِ عزیز میں دستیاب ہوا۔"

مرحوم کو دیوانِ غالب کے بہترین نسخہ کے تلاش میں جس وقت سے ناکامی ہوئی اُسی وقت سے انھیں یہ فکر پیدا ہوگئی کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ اُردو شعراء کے دیوان بھی اسی شان اور نفاست کے ساتھ چھپ کر نکلیں جس طرح سے کہ انگلستان اور فرانس جیسے مہذب ممالک میں وہاں کے شعراء کے مجموعے شائع ہوتے ہیں۔

اس خدمت کو انجام دینے کے لئے انھوں نے ہندوستان کے مطابع پر نظر ڈالی تو ان کی سب سے پہلی نگاہ منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے نامی پریس، کانپور پریس، کانپور پر پڑی، جس نے دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم، آثار الصنادید، مسدس حالی وغیرہ کے نفیس ایڈیشن شائع کر کے اردو، فارسی کی کتابوں کے دلفریب اور دلکش نسخے شائع کئے تھے اور اس زمانے میں نام پیدا کیا تھا۔ فرانسیسی دوست کی ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کو ایک خط لکھا جس میں فرانسیسی دوست کی ملاقات کے حوالہ سے استدعا کی کہ وہ "اُردو کے اساتذہ کے کلام کے خوشنما ایڈیشن چھاپنے کا انتظام کریں۔"

مئی یا اپریل سنہ ۱۹۱۳ء میں جب کہ رعد معہود کا مذکورہ بالا خط منشی صاحب مرحوم کے پاس پہنچ چکا تھا مجھ سے منشی صاحب مرحوم کان پور میں ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب مرحوم ہمارے ملک کی

نامور طابع اور ناشر ہی نہ تھے بلکہ وہ اُردو کے ایک اچھے ادیب اور جرنلسٹ بھی تھے اور مجھے ۱۸۹۰ء میں جب میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے اخبار "عالم تصویر" کی نامہ نگاری کرتا تھا، ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا تھا۔ وہ میرے مضامین کو اپنی اصلاح کے بعد اخبار میں درج کرتے اور اصلاح شدہ اصل مضمون میرے پاس یہ لکھ کر واپس کر دیتے کہ "صاحبزادے غلطیوں کی اصلاح کو غور سے دیکھو۔" ان کے اس شفقت آمیز برتاؤ نے ۱۹۰۳ء میں مجھے سچ مچ اخبار نویس بنا دیا جس کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں اپنا مطبع 'نظامی پریس' کے نام سے جاری کرنا پڑا، پریس کے انتظام میں جب مشکلات پیش آئیں تو منشی صاحب مرحوم کے مشوروں سے مجھے مدد ملتی رہی۔ ۱۹۱۳ء کی ملاقات بھی اسی سلسلہ میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو اثنائے گفتگو میں فرمایا:۔

"میاں صاحبزادے ایک چیز اور لیتے جاؤ جو تمہارے لئے میں نے محفوظ رکھی ہے"۔ بکس کھولکر ایک خط نکالا جو اُردو میں لکھا ہوا تھا اور یہ وہی خط تھا جو راس مسعود مرحوم نے ان کو دیوان غالب کی طباعت کے متعلق لکھا تھا۔ فرمایا 'کیا تم ان سے واقف ہو جن کا یہ خط ہے؟' میں نے کہا کہ "یہ خط سر سید مرحوم کے پوتے مسعود کا ہے میں نے ان کو ۱۸۹۴ء میں اُن کی بسم اللہ کے دن دیکھا تھا" فرمایا کہ "تم نے جس بچہ کو آج سے بیس سال پہلے دیکھا تھا اب وہ بڑا آدمی ہے۔ اس کا یہ خط لیتے جاؤ اور اس کے منشا کو پورا کرو۔ وہ اُردو ادب کا دلدادہ ہے اور تمھارا بھی یہی مذاق بلکہ یہی پیشہ ہے"۔

میں نے بدایوں آکر دیوان غالب کی طباعت کے متعلق مسعود مرحوم سے مراسلت کا سلسلہ شروع کر دیا، انھوں نے لکھا کہ مجھ سے مراد آباد آکر اس بارہ میں سید محمد علی کی کوٹھی پر مل لو۔ سید محمد علی مرحوم اس وقت وہاں ڈسٹرکٹ جج تھے۔ میں تو مراد آباد پہنچا لیکن اسی روز وہ ایک ضروری تار پہونچنے پر علی گڑھ چلے گئے۔ مراد آباد میں تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن پہلی ملاقات اُن سے کچھ دنوں بعد علی گڑھ میں ہوئی اور دیوان غالب کی طباعت کو دلکش اور دلچسپ بنانے کے متعلق انھوں نے ایسے ایسے مفید مشورے دیئے کہ میں حیران رہ گیا۔ کہ اس عمر میں اُن کی نظر حسن طباعت اور ترتیب و تصحیح کے متعلق کیسی وسیع ہے، سب سے پہلی بات تو انھوں نے یہ بتائی کہ جو نسخہ چھپے وہ بہترین کاغذ پر جلی قلم سے نہایت خوشخط ہو۔ صحت کا خاص خیال رکھا جائے اور اشارات املائی سے بھی مزین ہو۔ فرمایا کہ اس سے

یہ فائدہ ہوگا کہ اشاراتِ املائی شعر کے مطلب کو بڑی حد تک حل کردیں گے۔ چنانچہ پہلا ایڈیشن ان کی ہدایتوں کے مطابق ۱۹۱۴ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی پہلی کاپی ان کے پاس اس روز پہونچی تھی جب علی گڑھ میں ان کی شادی کا جلسہ رچا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کی رسید میں جو خط بھیجا اس میں لکھا کہ "اس نسخہ کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور شادی کی خوشی دوبالا ہوگئی"۔

اسی زمانہ میں آپ نے ادب اُردو کی ترقی کے لئے ایک اسکیم بنائی اور اس کو عملی صورت دینے کے لئے نظامی پریس بدایوں کا انتخاب کیا۔ اس کے متعلق اپنے احباب کے نام جنھیں آپ نے اُردو ادب کی ترقی کا حامی خیال کیا۔ ایک گشتی خط جاری کیا، اُس میں آپ نے اس اسکیم کو اپنے ان تاثرات کا مرہون منت بتایا تھا جو ان کے قلب پر اپنے فرانسیسی دوست کے لئے 'دیوان غالب' کے بہترین اور خوشنما نسخہ کے حصول کی ناکامی کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس اسکیم کے تحت میں جب دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن مشرح نکلا تو ان کی سفارش پر اعلیٰ حضرت تاجدار دکن نے اس اسکیم کی سرپرستی قبول فرمائی اور جو کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوں ان کو 'سلسلہ آصفیہ' کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت فرمائی۔ دیوان غالب کے کئی ایڈیشن میرانیس کے تمام مراثی تین جلدوں میں، مولانا طباطبائی کے مدون کئے ہوئے اور خواجہ میر درد کا دیوان نواب صدر یار جنگ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ مگر ان کتابوں کی نکاسی کی رفتار خلاف توقع سست رہی، جس کا تذکرہ انھوں نے بنارس کے خطبہ صدارت میں مندرجہ ذیل الفاظ میں افسوس کے ساتھ کیا:-

> "اُردو شعراء کا کلام جس ذلیل حالت میں شائع ہوتا ہے اس کی ذلت کو دور کرنیکے خیال سے چند سال ہوئے کہ دوستوں کی مدد سے میں نے اپنے ایسے بڑے بڑے شعراء کے کلام کو جیسے کہ میر اور انیس عمدہ چھپے ہوئے نسخوں میں شائع کرنا شروع کیا۔ لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ میرے ہم وطن اس کیلئے تو تیار ہیں کہ ردی ناولوں پر جو تیسرے درجہ کی انگریزی میں لکھے گئے ہوں سات روپیہ خرچ کردیں لیکن خود اپنے بڑے مصنفوں کی تصانیف کے دیدہ زیب نسخوں پر چار روپیہ بھی خرچ کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ہم دوسروں سے یہ توقع کرنیکا کیا حق رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا احترام کریں جب کہ ہم خود اپنی چیز کا احترام کرنے کیلئے تیار نہیں"۔

حیدرآباد پہنچتے ہی اعلیٰ حضرت حضور نظام کی حکومت کی یہ تجویز کہ اعلیٰ تعلیم کو ملکی زبان میں دینے کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے، مسعود صاحب کے سامنے آئی انھیں اردو ادب سے طبعی دلچسپی تھی اور وہ اس مسئلہ پر عرصہ سے غور کر رہے تھے۔ اب اراکین سلطنت آصفیہ سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد انھیں کامل یقین ہوگیا کہ بدنصیب ہندوستان دوسری مہذب ممالک کی طرح اُس وقت تک تعلیم یافتہ نہیں بن سکتا اور نہ اس کے چہرہ پر سے جہالت اور ناخواندگی کا بدنما داغ دور ہوگا جب تک کہ ملکی زبان میں اعلیٰ تعلیم نہ دی جائے گی۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم پا کر جب لوگ نکلیں گے تو عوام میں علمی خیالات کی لہر خود بخود دوڑ جائے گی اور اس طرح سے ہندوستان میں عام ناخواندگی کا جو دَور دَورہ ہے وہ دُور ہو جائے گا۔ موجودہ تعلیم کی مذمت جو غیر ملکی زبان میں دیجاتی ہے وہ بلاخوفِ لومۃ لائم اکثر پبلک جلسوں میں کیا کرتے تھے سنہ ۱۹۳۶ء میں سینٹ ہاؤس کلکتہ میں آپ نے فرمایا تھا:۔

"جن لوگوں نے ہمارے نظام تعلیم کو مرتب کیا ہے وہ اس میں ایک ایسے اصول پر عمل کرنے کے مجرم ہوئے ہیں جس کی زبانی تبلیغ بھی وہ اپنے ملک میں نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس بدیہی بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ ہر شخص اپنی مادری زبان ہی کو سہولت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور اگر کسی کو بغیر وقت ضائع کئے کوئی علم حاصل کرنا ہے تو اس مقصد کے لئے مادری زبان کا استعمال لازم ہے"

حیدرآباد کی نظامت تعلیم کے فرائض کے ساتھ ساتھ انھیں نواب عماد الملک بہادر کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کا صدر منتخب کیا گیا۔ اردو ادب کے وہ ہمیشہ سے حامی تھے اب ان کو اس شعبۂ اردو ادب کی عملی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ اس انجمن کے لئے انھوں نے انگریزوں تک سے چندے وصول کئے اور نہ صرف انگریزوں سے بلکہ جاپانی قوم کے علم دوست لوگوں کو جاپان کے قیام کے زمانہ میں انجمن کا ممبر بنایا۔ جاپان کے نظام تعلیم کے متعلق جاپان سے واپس آکر انھوں نے جو رپورٹ سرکار نظام کو دی تھی اُس کا اردو ترجمہ "جاپان کا تعلیمی نظم ونسق" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جاپانی قوم کے علمی اور صنعتی ترقی کے راز کو معلوم کر لیا تھا۔

اردو ادب اور شاعری میں جو پاکیزہ ذوق اور وسیع نظر [illegible]

اُردو شعرا کے تذکرہ سے ملتا ہے جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں "انتخاب زریں" کے نام سے لکھا تھا اور وہ نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا ہے۔ اس تذکرہ کی تمہید میں اُردو شاعری کی نسبت انھوں نے لکھا ہے:-

"یہ مجموعہ انتخاب زریں کے نام سے جو آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنن طبع کا سبب ہوگا بلکہ ان لوگوں کو جو اُردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کر دے گا کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور اس مجموعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ اگر اردو شاعری کے بہترین حصہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی سے اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو ان الذکر کا وجہ گراں ہوا نہ رہے گا اور حقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ اردو وہ زبان ہے جس کا شمار زمانۂ حال کی نوزائیدہ زبانوں میں ہے تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں اُردو نظم کو وہ جلا دی گئی جو مہذب اور شستہ خیالات کے لئے اہل الاصول ہے"

ایڈورڈ مارگن مارسٹر جو ایک مشہور انگریزی ناول نویس ہیں مسعود مرحوم کے انتقال کے بعد ایک مضمون میں لکھتے ہیں:- "یہ نکتہ فراموش نہیں ہونا چاہئے کہ روحانی طور پر مسعود شاعر تھے" اس انگریز ادیب نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرحوم کو فارسی، اُردو، انگریزی اور عربی شعرا کے ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار زبانی یاد تھے اور وہ انھیں نہایت شوق، جوش اور برجستگی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ لیکن میں نے ایک دفعہ اُن سے سوال کیا کہ "جب شعر و سخن سے آپ کو اس قدر دلچسپی ہے تو آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟" فرمایا "میں نے ایک دفعہ چند فارسی اشعار کا انگریزی نظم میں ترجمہ کرنے کی ضرور کوشش کی تھی لیکن میری طبیعت شاعری کی پابندیوں کی زحمت اٹھانے کی متحمل نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی" اس میں شک نہیں کہ اشعار کو زبانی یاد رکھنے میں اُن کا حافظہ اسقدر قوی تھا کہ لوگ تعجب کرتے تھے۔ مولانا حالی کی صد سالہ جوبلی کے موقع پر ایک پرائیویٹ صحبت میں سر اقبال کی موجودگی میں جب ان کے اشعار مسعود نے زبانی سنانا شروع کئے تو ایسا تانتا بندھا کہ سر اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ "آپ کو میرا اتنا کلام یاد ہے کہ خود مجھے بھی اتنا زبانی یاد نہیں"

رائٹ آنریبل ایچ۔ اے۔ ایل۔ فشر انگریزی کے ایک مشہور ادیب نے ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا "سچ یہ ہے کہ ایسی نمایاں قوت اور ایسے دلکش والے انسان سے ٹھیک ٹھیک ایسے ہی کارناموں کی توقع ہونی چاہئے تھی"

اگر مسعود مرحوم کی ایک دوسری تالیف کا جس نے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کر دیا اس مضمون میں ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی۔ یہ کتاب سرسید مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے

جسے ۱۹۲۲ء میں مسعود نے تالیف کیا تھا اور جو مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارنپور کے مقدمہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ مقدمہ نگار مرحوم نے بالکل صحیح لکھا ہے :۔

"اگر سید راس مسعود ان مکتوبات کے جمع کرنے اور اُن کے چھپوانے کا اہتمام نہ کرتے تو بلاشبہ مزید مدت گزرنے پر سید اعظم رحمتہ اللہ کی اُن تحریرات کے بیش بہا ذخیرہ کا وجود بھی دنیا میں قائم نہ رہتا اور ملک اُس کے استفادہ سے ہمیشہ کو محروم رہ جاتا۔.........

سید راس مسعود کا یہ ساری قوم کے سر پر احسان ہے کہ انھوں نے اس ضروری کام کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیکر قوم کو اس کے اخلاقی فرض سے سبکدوش کر دیا"

مسعود مرحوم کا ذاتی کتب خانہ جس میں ہر زبان کی کتابیں موجود تھیں، نہایت نفیس تھا۔ صرف یہی نہیں کہ کتابیں الماریوں کی زیب و زینت بنی ہوئی ہوں بلکہ ان کے مطالعہ سے اُن کے دماغ میں اُن کے مضامین کا بڑا حصہ موجود تھا۔ بات بات پر وہ مشہور مصنفین کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اُن کی مجالست ہر ادبی ذوق والے کے لئے ایک پر لطف صحبت ہوتی تھی۔ خواجہ غلام السیدین نے جنھیں علی گڑھ میں اُن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ ایک مضمون میں بہت صحیح لکھا تھا :۔

"طلباء جو کم از کم خیالات اور جذبات کی دنیا میں بلندی اور پاکیزگی اور خلوص کے جویا ہوتے ہیں جنکی فطرت ادب میں اپنے ذوق جمال کی تسکین چاہتی ہے انکی سر راس مسعود کی صحبت کو ایک ادبی نعمت تصور کرتے تھے"

واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی ترقی کی بہت سی اسکیمیں مرحوم کے انتقال سے عالم خیال میں رہ گئیں اور اردو ادب کو ان کی رحلت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا

یہ اسکیمیں کیا تھیں اس کی تفصیل مشکل ہے کیونکہ مجھے اُن کی زندگی کے آخری دو تین سالوں میں جبکہ وہ بھوپال میں تھے ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ وہ اپنی اسکیموں کا ذکر اپنے گرد وپیش کے لوگوں سے اسی وقت کرتے تھے جبکہ کوئی تجویز انکے دماغ میں آتی تھی انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے غالباً سنہ ۱۹۳۶ء کے آخر میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ "مجھ سے بھوپال آکر ملو میں نے اردو کے متعلق ایک نئی اسکیم سوچی ہے اُس کا حال زبانی کہوں گا" صرف خط ہی نہیں لکھا بلکہ بدایوں کے ایک مقتدر صاحب اُن سے بھوپال جا کر ملے تو اُن کے ذریعہ سے زبانی پیغام بھی بھیجا لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ میں خود علیل تھا اس لئے ملاقات کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کو وہ اردو ادب کی محبت اور اس کی ترقی کی اسکیموں کو دماغ میں لئے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

میں ابھی یہ مضمون ختم نہ کرنے پایا تھا کہ انجمن ترقی اردو بھوپال کے معتمد حضرت مائل نقوی کا ایک مضمون زمانہ میں نظر سے گزرا جس میں انھوں نے سر راس مسعود کی اُن دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے جو بھوپال کی ادبی فضا میں اُن سے ظہور میں آئیں انھوں نے لکھا ہے کہ مرحوم نے اپنے ذاتی صرف سے وہاں دار التصنیف کی بنیاد ڈالی تھی اور اس ادارہ کو وہ بڑے پیمانہ پر عملی صورت اس طرح دینا چاہتے تھے کہ کسی پُر فضا بلند مقام پر ایک درجن کوٹھیاں تعمیر کر دی جائیں اور ہر کوٹھی کو علم و ادب کے کسی شعبہ سے منسوب کر کے اسے جملہ لوازمات سے مکمل کر دیا جائے پھر ہر فن کے ماہر کی خدمات کم از کم ڈھائی سو روپیہ ماہانہ پر حاصل کی جائیں اور اُن سے یہ معاہدہ کر لیا جائے کہ ہر سال چھ ماہ تمام علائق سے منقطع ہو کر کوٹھی میں قیام کریں اور تین سال کے بعد اپنے فن پر ایک رسالہ تیار کر دیا کریں انھوں نے اس اسکیم کو عملی صورت دینے کے لئے ۱۵ لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ اس رقم کو آسانی سے جمع کر لیں گے۔ جگہ کا بھی انتخاب کر لیا تھا جس کا اظہار نہیں کیا تھا، یہ بھی کہا تھا "میری زندگی کا یہ آخری کارنامہ ہوگا۔ دیکھیں قسمت کو یہ منظور نہ تھا مائل صاحب کے اس مضمون کو پڑھ کر مجھے مرحوم کے اس خط کا خیال آگیا

ترقی پسند شاعری

(از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب ایم اے - پی - ایچ - ڈی)



اگر آپ اپنی پرانی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کا زمانہ ذہنی، معاشرتی، مذہبی اور اقتصادی اعتبار سے بڑا پر آشوب گزرا ہے۔ پرانی قدروں کے ایوان میں زلزلے کے سے جھٹکے محسوس ہوئے ہیں نئے تصورات کی بنیاد پر زندگی کی نئی تعمیر شروع کی گئی ہے۔ اگرچہ آنے والی صبح کے آثار ابھی دھندلے ہیں لیکن یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریک رات کا بڑا حصہ گزر چکا ہے۔ انقلاب کی جس درخشاں صبح سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں ادب اس کا ایک پہلو ہے۔

یہ سنکر آپ کو غالباً بالکل تعجب نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے علاوہ اور ملکوں کا ادب بھی تجربہ اور انقلاب کی آزمائش سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ یہاں میں مختصر طور پر ان تجربوں کا ذکر کروں گا جو انگریزی شعر و ادب میں کئے گئے اور جن سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے نوجوان شعرا متاثر ہوئے ہیں اس طور پر آپ کے سامنے وہ پس منظر آجائیگا جس میں ہمیں اردو کی موجودہ ترقی پسند شاعری کو دیکھنا ہے۔ یہی شاعری آج آپ سے میرے کلام کا موضوع ہے۔

پچھلے چالیس سال کی مختصر مدت میں انگریزی شاعری میں کئی مستقل رجحانات ملتے ہیں۔ ابتدائی وکٹوریائی عہد کے شعرا کے کلام کا ایک نمایاں عنصر اُن کی رجائیت تھی لیکن اس عہد کے آخری شعرا بالخصوص جیمس تامسن (James Thomson
تامس ہارڈی [illegible] اور اے۔ ای۔ ہاؤس مین
[illegible] A. E. Housman کے یہاں ایک قنوطی زاویہ نگاہ ملتا ہے۔ جیمس تامسن زندگی کے آلام اور مصائب کو محسوس کرکے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، معمولی مناظر میں شان ہیں اُسے ایک ایسی دنیا میں جس کا خالق کوئی نہ ہو تنہائی کے اشارے

معلوم ہوتے ہیں۔ اس مسلک میں وہ کبھی کبھی معمولی واقعات میں تخیل کی رنگ آمیزی سے بھی
کام لیتا ہے۔ طامس ہارڈی بھی انسان کی مصیبتوں پر غور کرتے کرتے اُس کے خالق پر بھی
سوچنے لگتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان کا احساس اور اس کی فکر اُس کے حق میں
مصیبت ہیں کیونکہ یہی اُس کے مصائب کا سرچشمہ ہیں۔ ہاؤس مین کا انداز اُس سے مختلف ہے
وہ قانون الٰہی یا انسان کے ساختہ قوانین پر بحث نہیں کرتا بلکہ زندگی سے گھبرا کر اور مایوس
ہو کر دیہاتی سکون میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔

اس (Decadent) دبستان کے اثرات دوسری صورتوں میں بھی نمودار
ہوئے اخلاق، مذہب اور آرٹ کی مستقل قدریں اپنا اقتدار کھو بیٹھیں، چنانچہ وائلڈ
(Wilde) اور اُس کے ساتھیوں نے (Baudelaire) اور
سوئن برن (Swinburne) کی مثالوں کو سامنے رکھ کر عجیب عجیب ارواح اور
اعمالِ خبیثہ کا مطالعہ کیا۔

یہی زمانہ ہنلے (Henley) نے پایا۔ اُس نے شاعری میں انقلاب کی ضرورت
کو محسوس کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے ماحول میں معمولی معمولی چیزیں ایسے نقوش پیدا
کر سکتی ہیں جو شاعری کا موضوع بن سکیں، اُس نے غیر مقفی نظمیں لکھیں اور چند نئے پیمانے
رائج کئے، (W. W. Gibson) نے مزدوروں کے طبقہ کو موضوعِ شاعری
بنایا، اور کانوں، کارخانوں اور جہازوں میں کام کرنے والے ادنیٰ مزدوروں کی عورتوں
کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا، اُس نے بڑی دلخراش حالتیں بیان کیں، بے سروسامانی میں
بچوں کا پیدا ہونا، بیماریاں، موت اور حادثات، ان نظموں میں اُس کا خاص موضوع ہیں۔
اُس کی ایک نظم میں ایک مزدور برفباری کے طوفان میں محنت کر رہا ہے ایک اور نظم میں
ایک مزدور ایک کان میں کام کرتے کرتے ختم ہو جاتا ہے۔ ایک نظم کا موضوع ایک ایسی
سادہ مزدور لڑکی ہے جو بے یار و بے مددگار ہے۔ ایک دوسری نظم میں ایک مزدور کے
دل میں محبت کے خوابیدہ احساسات بیدار ہو رہے ہیں ——— یہی ہیں Gibson
کے لئے موضوعات (W. H. Davies) بھی افلاس کے شدید مصائب سے
متاثر نظر آتا ہے لیکن وہ دور سے کھڑے ہو کر اُن مناظر کو دیکھتا اور ششدر رہ جاتا ہے
آخر میں وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ احساسات کو بیدار کرنے اور اُن میں شدت پیدا

کرنے کے لئے انسان کو فطرت سے لگاؤ پیدا کرنے کی ضرورت ہے Rupert Brooke معمولی مناظر سے شدید احساس پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ شاعری میں جمالیاتی شعور ضرور ہو۔

ٹکنیک کے اعتبار سے جس دور کی (یعنی Georgian) شاعری کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں بہت اہم ہے۔ نظم کی پرانی بندشوں کو توڑ کر یہ کوشش کی گئی کہ نظم روانی اور بیان میں عام گفتگو سے زیادہ سے زیادہ قریب آجائے

اس کے بعد کے شاعر اپنے خاص رجحانات کی بنا پر (Imagist) کہے جاتے ہیں جن میں F. S. Flint T. E. Hume Hilda Doolittle، Ezra pound Richard Aldington اور Amy Lowell زیادہ ممتاز ہیں۔ ان کے چار اصول تھے۔

(۱) موضوع براہ راست بیان (۲) مختصر الفاظ (۳) خاص تصورات (images) سے مدد لینا (۴) فطری وزن کا استعمال، اسی زمانہ میں انگریزی شاعری نے جاپانی اور چینی شاعری سے بعض چیزیں اخذ کیں اور آزاد نظم عام طور پر رائج ہو گئی، اس تحریک سے متاثر ہونے والوں میں... T. E. Hume بھی تھا، اس کا بھی یہی خیال تھا کہ عصر حاضر کی زندگی نے انسان اور فطرت کی ہم آہنگی کو بالکل برباد کر دیا T. E Hume بھی تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتا ہے لیکن ہر موقع پر اس کا بیان صاف رہتا ہے۔ Georgian شعراء کی طرح اس کے بیان غیر مربوط اشاروں کا سلسلہ نہیں ملتا۔ یہ Imagist اظہار کے صاف اور فطری انداز کو پسند کرتے تھے چنانچہ قوافی کے اصولوں کی سختی کو انھوں نے ترک کرنا چاہا لیکن قبل اس کے کہ یہ تحریک عام طور پر اپنی خوبیوں کو ظاہر کر سکے کچھ نومشق شاعروں نے اسے اختیار کر لیا اور اسے نیم پختہ اور بے ربط خیالات کے اظہار کا ایک آسان ذریعہ سمجھ کر استعمال کرنے لگے اگر آپ موجودہ اردو ترقی پسند شاعری پر نظر ڈالیں تو ایک متوازی کیفیت نظر آئے گی بعض شعراء نے آزاد نظم کو اصولی طور پر اختیار کیا ہی لیکن اکثر لوگوں نے جن میں پابند شعر کہنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی جن کے خیالات خام اور جذبات غیر مربوط تھے اسے محض آسان سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔

Richard Aldington بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر ہے وہ بھی حالات کا جائزہ لے کر انسانیت اور خود اپنے آپ سے متنفر ہو جاتا ہے آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ن۔م۔ راشد اور چند دوسرے ترقی پسند اردو شعرا کا بھی یہی انجام ہوا ہے۔

یہ شاعر اپنے تجربے کر رہے تھے کہ جنگ کا آغاز ہو گیا، اور اس کا اثر شاعری پر بھی بڑا جنگ کی وجہ سے سوسائٹی کی قدریں بدل گئیں اور سوسائٹی کی ضروریات کا احساس درشدید ہو گیا، نئے اور پرانے اصولوں میں تصادم ہوا اور ایک تذبذب کی کیفیت پیدا ہو گئی امن اور استقلال قائم کرنے کی کوشش ایک فطری امر تھا، اس کی بھی دو صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو عہد ماضی میں پناہ لی جائے اور پرانی تہذیب قدیم معاشرت اور آبائی تصورات دوبارہ رائج کئے جائیں یا ایک نئی دنیا بنا لی جائے۔ انگریزی شاعری میں دونوں کے نمونے ملتے ہیں۔

ان حالات میں ایک اور جماعت شعرا کی آگے بڑھی۔ اسے Sitwell Group کہتے ہیں۔ یہ سب لوگ شہر سے نفرت کرتے ہیں لیکن بعض متقدمین کی طرح فطرت کے دامن میں بھی انھیں پناہ نہیں ملتی۔ اس لئے وہ آخر کار خود زندگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جنگ نے تقریباً ایسا ہی اثر موجودہ اردو شعرا پر کیا ہے۔ زندگی سے نفرت، فرار اور آخر خودکشی پر انجام انھیں رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ Sitwell Group کے شعرا اس حقیقی دنیا سے فرار اختیار کر کے اپنے خیالات کی ایک نا خواندہ دنیا الگ بناتے ہیں اسی لئے ان کے کلام میں مبہم تلمیحات اور ناتمام کہانیاں بہت ہیں۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ہماری موجودہ اردو شاعری بھی بڑی حد تک اسی دور سے گزر رہی ہے۔
جس طرح Miss Sitwell کی شاعری میں "موت" کی ہیبت جاری و ساری ہے اور ہر ہر قدم پر زندگی کے عبث ہونے کا احساس شدید نظر آتا ہے اسی طرح ہمارے شاعر آلام روزگار سہتے سہتے زندگی کو ہی وبال اور عبث سمجھنے لگے ہیں۔ Sitwell Group کا ایک خاص کارنامہ قابل غور ہے۔ انگریزی شعرا میں Miss Sitwell پہلی مرتبہ نظم کو جدید موسیقی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی موجودہ دور میں گیتوں کا عام رواج اسی قسم کی تحریک کہا جا سکتا ہے

آخر میں میں صرف تین انگریز شاعروں کا اور ذکر کروں گا جن میں سے کم از کم ایک نے
ہمارے چند ترقی پسند شعرا کو متاثر کیا ہے۔ میرا مطلب Herbert Read،
T.S. Elliot اور D.H. Lawrence سے ہے ہربرٹ ریڈ
جنگ سے متاثر ہے۔ دنیا سے بیزار ہے، محبت پر بھی اُسے اعتبار نہیں کیونکہ اُس کے
نزدیک اکثر محبت کا انجام نفرت پر ہوتا ہے، اسی لئے وہ ایک اپنی دنیا بناتا ہے جو
خوابوں کی دنیا کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے شاعروں کا بھی یہی محبوب مشغلہ ہے۔ چنانچہ آگے
چل کر آپ اس کی تفصیل اور تشریح سنیں گے، D.H. Lawrence کی
تین خصوصیات قابل لحاظ ہیں :-

(۱) اشاریت اور ابہام (۲) جنسیات (۳) موجودہ نظام سے بیزاری
اور اس کی اصلاح یا یہ ممکن نہ ہو تو ایک نئے نظام کی تعمیر اس نظام میں وہ بالعموم مرد عورت
اور اس کے جنسی تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے لارنس نے پابند نظمیں لکھیں بعد میں آزاد نظمیں
کہنے لگا۔ اُس کے تصورات اُس کا تفکر اُسے خودکشی تک پہنچاتے ہیں۔ اردو شعرا میں
جنسیت اور ابہام اسی طرح ہے جس طرح Lawrence کے یہاں ملتا ہے۔ لارنس
کی بعض چیزیں جو زیادہ قابل اعتراض تھیں سرکاری حکم سے ممنوع قرار دی گئیں اور اُن
کی اشاعت قانوناً بند ہے۔ اردو شاعروں میں راشد کے یہاں کچھ کچھ Lawrence
کی جھلک ملتی ہے لیکن D.S. Lawrence کی عظمت ابھی راشد کو حاصل نہیں۔ اس تمہید
کے بعد میں مقالہ کے اصل موضوع یعنی ترقی پسند شاعری پر آتا ہوں۔

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی، غالباً یہ ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا
کہ ہر صورت میں ادب حیات سے متعلق بلکہ اس کا ترجمان رہتا ہے۔ ادب کا وہ دَورِ قدیم جو
ادب برائے ادب کا جمالیاتی دَور کہا جاتا ہے اُس میں بھی اُس عہد کی تہذیب،
اُس کی معاشرت کی دھڑکنیں اور زندگی کی قدریں صاف موجود ہیں، مثال کے لئے صرف میر
کے کلام کو دیکھئے اور اب جبکہ ادب برائے زندگی کا تصور ایک تحریک سے گزر کر اصول
بن چکا ہے اب بھی ادب ہماری پُرآشوب حیات، ہمارے پیچیدہ احساسات اور تفکرات کا
مجموعہ ہے، زندگی ہمیشہ زندگی رہی ہے صرف اس کی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ اسی طرح ادب
کے موضوعات اور سانچے ہیں، زندگی کی طرح ادب بھی جاندار اور ارتقا پذیری سے پیدا ہوتا ہے۔

ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ بڑھتا ہے اور حالات سازگار نہ ہوں تو مر بھی سکتا ہے۔ اپنی زندگی کی ہر منزل میں اسکی وضع قطع تراش خراش علیٰحدہ ہوتی ہے۔ یہی ادب میں ترقی ہے۔

پچھلی جنگ عظیم ہم میں سے اکثر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، لیکن جنھیں بطور واقعہ یاد نہیں اُس کے اثرات جو کم و بیش اِس دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز تک باقی تھے انھوں نے بھی ضرور محسوس کئے ہیں، اگرچہ اُس عہد کے ادب کے نمونے اب ہمارے یہاں Out of date یعنی سال خوردہ کہلاتے ہیں تاہم چکبست کا کلام ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی شاعری اس اعتبار سے ادب کی اس زندگی کی پہلی آواز ہے جو ۱۹۱۴ء کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چکبست کا ذکر کرنے سے پہلے اُس کے پس منظر کو دیکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ جدید کی تعمیر قدیم کی بنیادوں پر ہی ہوسکتی ہے۔ دراصل حالی سے ہی اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور حالی کی شاعری اس دور میں عبوری ادب کا ایک اچھا نمونہ ہے، ایک طرف ان کے دل کی رام کہانی ہے جو وہ اس وقت تک سناتے رہے جب تک ان کا دل زندہ رہا، دوسری طرف ان کی وہ شاعری ہے جس میں زندگی کا احساس ایک کروٹ لیتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حالی چوں کہ خود پہلے دور کی پیداوار تھے اور ذہنی تصورات و محسوسات کے ساتھ شعری پیمانے بھی انھیں وہی پسند تھے جو وہ بچپن سے دیکھتے چلے آئے تھے اِس لئے وہ اس نئے ادب کے دور سے صرف ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکے، یہ انکی ناکامی ہے یا کامیابی اُس کا فیصلہ کرنا آج بہت مشکل ہے۔ ہم صرف اِتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حالی نے جو کیا اس سے زیادہ کرنا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی، حالی میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ان لوگوں میں رہ کر جو "سرگشتۂ خمار رسوم و قیود" تھے انھوں نے بڑی جراءت سے کام لیا اور اُن پابندیوں کو توڑنے کا پہلا اعلان کیا، اسوقت تک ہماری شاعری کا فن یا ٹکنیک جیسا دقیق اور اصولی بن چکا تھا۔ اُس کا اعادہ ضروری نہیں۔ وزن، ردیف، قافیہ ایسے پیمانے تھے جن کے سوا اور پیمانوں میں شراب سخن چھلکائی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جس دن حالی نے یہ اعلان کیا کہ وزن شعر کے لئے ایک ضروری شرط نہیں۔ اور قافیہ بھی اگرچہ شعر کے حُسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے لوازم میں نہیں، بلکہ اچھے شعر میں صرف سادگی اصلیت اور جوش کا ہونا کافی ہے۔ اس دن گویا قدیم شاعری کے قصر کو جس میں اردو شعرا کی تین سو سالہ تعمیری کوششیں شامل تھیں

تخریب کے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس ہوا جس سے اُس میں بعض شگاف پیدا ہو گئے اور انھیں شگافوں میں سے مستقبل کی شاعری کا نور چھن چھن کر آنے لگا، لیکن پوری عمارت کو گرانے کے لئے اور زلزلوں کی ضرورت تھی اور نئی عمارت کی تعمیر ابھی نئے معماروں کے انتظار میں تھی۔ اِن نئے معماروں میں معمارِ اعظم اقبال تھا۔

اقبالؔ کے مفکرانہ نظرئے اور ان کی اسلامی شاعری بھی لوگوں کو اُن کے اہم ترین کارنامے نظر آتے ہیں لیکن ادب کی تاریخ میں ان کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں انقلابی اور ترقی پسند تھے۔ بیداریٔ جمہور کی خاطر وہ ہر نقشِ کہن مٹانے کو تیار رہتے۔ اُن سے پہلے شاعری نفیِ حیات اور ہزیمت خوردہ ذہنیت کی شاعری تھی، انھوں نے اثباتِ حیات اور رجائیت کی شاعری کا آغاز کیا، اُن سے پہلے شعروادب میں فرشتے اور سلاطین ہی تھے انھوں نے شیطان اور مزدور کو بھی ایوانِ شاعری میں داخل ہونے کی اجازت دی اور ان سب باتوں میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے نہ اُن کے جذبات ہنگامی تھے اسی لئے اُن کے کلام میں گہرائی اور ابدیت ہے، لیکن اقبالؔ اس انقلاب کے صرف نقیب تھے جو آگے آنیوالا تھا ان کی ترقی پسندی اُن کے موضوعات اور تصورات تک محدود ہے، وہ خود اپنی شاعری میں مروّجہ اور سکہ بند اصناف سے آزادی حاصل نہ کرسکے، یہ آزادی اُن کے لئے دشوار بھی تھی، شاعری کی ابتدا کی تو داغؔ کے شاگرد ہوئے جو غزل کے بادشاہ تھے۔ غزل اصنافِ سخن میں قاعدوں اور اصولوں کی پابندی کی ایک انتہائی شکل ہے، اقبال نے مدتوں اسی پیمانے میں مشق کی، آخر میں غزلیں کم ہوگئیں، ان کی جگہ مکمل اور مسلسل نظمیں زیادہ آگئیں لیکن قافیہ اور وزن کی احتیاط جو قدامت سے ورثہ میں ملی تھی قائم رہی۔

ٹکنیک میں پہلے ترقی پسندوں میں عبدالحلیم شررؔ اور اسمٰعیل میرٹھی کے نام زیادہ مشہور ہیں ان دونوں نے اُردو میں پہلی مرتبہ غیر مقفیٰ نظم لکھنے کی کوشش کی اور چند نمونے پیش کئے لیکن ان دونوں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ اسے ایک تحریک بنا سکیں، انھوں نے ایک تجربہ کیا اور بس، یہ تجربہ ایک تحریک تو کیا ایک ہیجان بھی نہ بن سکا۔ کیونکہ شررؔ اور اسمٰعیل سے لیکر عرصہ تک لوگوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں کی، البتہ اتنا اثر ضرور نظر آتا ہے کہ حالی سے لیکر اسمٰعیل تک لوگوں کے خیالات آنیوالے دور کے لئے تیار ہوتے گئے۔ چنانچہ مولانا شبلی بھی جو پرانی وضع کے بزرگ تھے اور خود اپنی شاعری میں متقدمین کی تقلید کرتے تھے اس سے

نہ بچ سکے، انھوں نے شعر العجم میں جہاں شاعری کی ماہئیت سے بحث کی ہے وہاں انھیں خیالات کا اعادہ کیا ہے جو حالی کے یہاں ملتے ہیں یعنی وزن اور قافیہ کو شعر کی ضروری شرط قرار نہیں دیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ترقی پسندی کے آثار ہیں لیکن عملاً ترقی پسند شاعری اس کے بہت بعد شروع ہوئی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم بھی نئی شاعری کے نقیب تھے انھوں نے اُردو عروض کو ہندی پنگل سے قریب تر کرنے کی سعی کی۔ گیت لکھے اور بعض نئے شعری پیمانے انہیں رائج کئے۔ اُن کی تصنیف میں سُریلے بول اسی نئی تحریک کی ایک آواز ہے۔

ترقی پسند شاعری کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن اس تحریک کی طرف منتقل ہوتا ہے جو سنہ ۱۹۳۶ء میں چند نوجوانوں نے ترقی پسند ادب کے نام سے شروع کی تھی، اس تحریک کا پہلا ادبی اعلان وہ مشہور بدنام مجموعہ ہے جو "انگارے" کے نام سے موسوم تھا، اس تحریک میں پہلے پہلے سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ کے نام نمایاں رہے، احمد علی کا مجموعہ 'شعلے' بھی اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے 'انگارے' کا جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے، پُرانی چال کے ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا۔ رجعت پسندوں نے بڑی لے دے کی اور آخر کار کتاب سرکار نے ضبط کر لی۔

سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک اس تحریک نے اپنی عمر کے سات سال گزارے لیکن اس میں زیادہ تر نام اُن لوگوں کے ہیں جن کی ادبی زندگی سنہ ۱۹۳۶ء سے پہلے شروع ہو چکی تھی سنہ ۱۹۳۶ء میں یہ ہوا کہ وہ لوگ جو منتشر طور پر علیحدہ علیحدہ تجربے کر رہے تھے انھیں ایک زاویہ اور ایک پلیٹ فارم مل گیا لیکن اس کے باوجود جو مدّت ترقی پسند ادب کے تجربے کو گزری ہے بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ترقی پسند مصنفین اپنے اس دور کو 'بُحران' کا دور کہتے ہیں اور وہ خود نہیں جانتے کہ ان کا مستقبل کیا ہو گا۔ تاہم پچھلے چند سالوں کے نظم و نثر کے مجموعہ کا مطالعہ کیا جائے تو موضوعات اور ان کے اظہار کے بعض اسالیب خاص رجحانات کی صورت میں نظر آتے ہیں، یہی میرے خیال میں ترقی پسندی کے عام رجحانات ہیں۔

اِن عام رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے دو چیزیں سامنے رکھنا کافی ہیں۔ ادبی رسالے اور نظموں کے مجموعے۔ رسالوں میں ادبی دنیا (لاہور) ادب لطیف (لاہور) ساقی (دھلی) ہمایوں (لاہور) بشیر اور نگار (لکھنؤ) جامعہ (دہلی) کثیر ترقی پسند شاعری کی اشاعت کے لئے ذمہ دار ہیں۔ کلام کے مجموعوں میں جوش کے کئی مجموعے ہیں۔

احسان دانش کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ن۔م۔ راشد کی ماورا، فیض احمد فیض کی نقش فریادی (دو اڈیشن) مجاز کی آہنگ (دو اڈیشن) احمد ندیم قاسمی کی دھڑکنیں، جاں نثار اختر کی سلاسل، اختر الایمان کا گرداب، میراجی کے گیت، ان رجحانات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دو مجموعے ایسے ہیں جن میں بہترین ترقی پسند شاعری کے منتخبات ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کا شائع کردہ مجموعہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں، مکتبہ اردو لاہور کا شائع کردہ مجموعہ ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کے منتخبات پر نظر ڈالنے سے ۴ خاص رجحانات محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا بڑا حصہ رومانی یا شاعرانہ ہے، جہاں شاعر زندگی سے فرار اختیار کر کے رومان میں پناہ لیتا ہے، دوسرا حصہ سیاسی اور انقلابی جس میں ذہنی۔ سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنے کے جذبات اشتراکی تصورات کے پس منظر میں ملتے ہیں۔ تیسرا رنگ فاحشانہ نظموں کا ہے جن میں سے اکثر میں فحاشی مقصود بالذات ہے اور چند میں عریانی سے کوئی اور مقصد ہے۔ چوتھا رجحان اشاریت یا ابہام کا ہے یعنی ایسے تصورات اور نقوش اشاروں اور کنایوں کی شاعری جس میں شاعر کی دنیا اس دنیا سے بہت دور اس کی زبان ایک اجنبی کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ نظم ایسی بھی ملتی ہے جس میں فکر کی گہرائی ہے لیکن یہ اس تحریک کے خاص رجحانات میں نہیں آتی کیونکہ اس کے نمونے نایاب ہیں۔

ان رجحانات کے مطالعہ کے لئے آپ پہلی قسم یعنی رومانی نظموں میں رات کی بات (مختار صدیقی) نفسیات (عظیم قریشی) تو اگر واپس نہ آتی (جوش) جواب تغافل (عدم) برات (مقبول حسین) ننھا قاصد (اختر شیرانی) دسہرا اشنان (شاد عارفی) حسینہ کی موت سعید احمد اعجاز) رقص (یوسف ظفر) ۱۹۴۱ء کی نظموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کی نظموں میں اس قسم کی نظمیں میں کون ہوں (ظفر پرویز) نومیدی جاوید (راجہ مہدی علیخاں) سعی خام (سعید احمد اعجاز) مہمان (مجاز) تصور کے دھندلکے میں (احتشام) بیزار نگاہیں (جذبی) گلاب (ضیاء جالندھری) آخری سجدہ (احمد ندیم شوق) ولولے (یوسف ظفر) یہ کیا (مقبول حسین احمد پوری) طوائف (جذبی) تفاوت راہ

(اعجاز بٹالوی) ساتھی (مجید امجد) ایک عورت (سلام مچھلی شہری) کی دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے رجحان یعنی سیاسی، انقلابی یا اشتراکی کی ترجمانی ان نظموں میں ملتی ہے
۱۹۴۱ء میں (۱) انتباہ (فیض احمد فیض)۔ (۲) تیرے ہی بچے تیرے ہی پالے (مطلبی)
(۳) نقشِ پا (اختر الایمان)

۱۹۴۲ء میں (۱) اندھیر نگری (شاد عارفی)۔ (۲) دوراہا (ڈاکٹر تاثیر) سیاسی لیڈر کے نام (فیض احمد فیض)۔

الہامی رجحان دونوں سالوں میں ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر سب کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے نمونے راشد کی خودکشی، زنجیر، میراجی کی رخصت اور دھوبی کا گھاٹ راجہ مہدی علی خاں جنت کی سیر، مخدوم محی الدین کی اندھیرا، سلام مچھلی شہری کی اندیشہ اور ساتھ رنگ میں ملتے ہیں۔

فاحشانہ رنگ میں مخمور جالندھری کی دو نظمیں انوکھا بیوپاری اور تالاب راشد کی نظم انتقام، شریف کنجاہی نظم پسپائی، سلام مچھلی شہری کی ڈرائنگ روم دیکھنے سے اس تحریک کا یہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے، ترقی پسند شعرا میں جوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ ان کے کلام کا ابتدائی حصہ اگرچہ اپنی صورت کے اعتبار سے نظم کی پرانے اور مسلمہ اصولوں کی پابندی میں نظر آتا ہے لیکن شروع سے ان کی توجہ غزل سے زیادہ نظم پر رہی۔ نظم کے موضوعات میں ان کے ہاں بڑا تنوع ہے۔

مناظر فطرت سے وابستگی کا اظہار، رومان اور انقلاب ان کی نظموں کے تین اہم عناصر ہیں۔ انقلاب کے پہلے نقیبوں میں جوش بھی ہیں، ان کے یہاں یہ انقلاب سیاسی، ذہنی، اقتصادی اور مذہبی بیک وقت ہے لیکن ان کے ہاں اس کی شدت رفتہ رفتہ ہی آئی ہے اب تک ان کے یہاں ایک کہنہ مشق استاد کی پختگی اور توازن نمایاں ہے ایک چیز جو جوش کو ترقی پسند شاعروں میں بڑا مرتبہ دلاتی ہے ان کی "شعریت" ہے۔ اگر رومان اور شعریت جوش کی شاعری کے ترکیبی عناصر نہ ہوتے تو شاید ان کا ذکر اس سلسلہ میں سب سے پہلے نہ آتا، ان کے یہاں الہام یا اشاریت جو اکثر ترقی پسند اپنا طرۂ امتیاز بنائے ہوئے ہیں بالکل نہیں۔ عریانی بھی جوش کے یہاں مقصود بالذات نہیں، البتہ مذہب اور اس کے متعلقات میں جوش نے ایک رندِ لاابالی کی بیباکی اور جسارت کا اظہار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے شوخی اقبالؔ کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اُس سے اقبال کا مقصد انسان کی برتری اور اُس کی خودی کی عظمت کا احساس ہے۔ جوش کے یہاں تضحیک اور استہزا ہے، لیکن جوش کی ابتدائی شاعری میں یہ عناصر نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موجودہ ماحول اور اُن کے متوسلین نے اِس بارہ میں انھیں زیادہ متاثر کیا ہے، جوش یوں بھی اپنی عمر کی اُس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں قوت ارادی ضعیف ہو جاتی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ جوش کا یہ رنگ بھی اسی کمزوری کی علامت ہو یا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ علی الرسم زمانہ ہے۔ جوؔش کی شاعری انقلابی ہونے کے باوجود شعروادب میں متقدمین کی عظمت کی قائل ہے۔ اگر نوجوان ترقی پسند اس پیرِ مغاں سے قدامت کی عظمت بھی سیکھ لیں تو ان کی بہت سی خامیاں دُور ہو جائیں۔

پنجاب کے رسالوں اور شاعروں کا ذکر آنے سے آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ترقی پسند شاعری میں زندہ دلانِ پنجاب کا بڑا حصّہ ہے۔ پنجاب میں جو نام اس سلسلہ میں سب سے پہلے ملتے ہیں وہ تاثیر اور عابد علی کے ہیں۔ تاثیر پہلے غزلیں کہتے تھے، پھر گیت کہنے لگے، گیتوں میں محبت کے راگ کے ساتھ روٹی اور بھوک کے مسائل بھی آنے لگے، دہقان کا مستقبل، مزدور کا گیت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ محبت کے گیتوں میں 'تم بھی پیت کرو تو جانو' اور 'مان بھی جاؤ جانے بھی دو' اچھے رومانی گیت ہیں، لیکن شاعری کے ٹکنیک میں تاثیر نے اُس وقت کوئی خاص اضافہ نہیں کیا، اور غالباً ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۲ء تک نظم غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کا رواج عام نہ ہو سکا، کارواںؔ کے سالناموں میں پہلی مرتبہ اس قسم کے بعض تجربے پھر نظر آئے۔

بعض اور نوجوان ترقی پسند شاعروں کا ذکر کرنے سے پہلے میں احسانؔ دانش کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اشتراکی شاعری ترقی پسند شاعری کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ احسانؔ بھی بڑی حد تک اشتراکی شاعر ہے لیکن اس کی اشتراکیت 'ڈرائنگ روم' کی اشتراکیت نہیں، نہ وہ اُس کے یہاں زمانے کے فیشن یا ترقی پسندی کے نشان کے طور پر ہے، وہ ایک مزدور تھا اور اگرچہ اپنی جد و جہد سے اس نے اپنی زندگی کو ہموار بنانے میں کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے، تاہم اُس کی کشمکش جماعت کی کشمکش کیساتھ اب تک

جاری وہ صحیح معنوں میں مزدوروں کا کامریڈ ہو اُس نے مزدوروں کے ساتھ کام کیا ہے ، اُن کے دکھ درد میں شریک ہوا ہے اس لئے اس کے خیالات کارل مارکس ، لینن اور اسٹالن کی بحثوں سے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُن کا منبع خود اس کا تجربہ احساس اور تجزیہ ہے اس لئے خلوص کی جو بُو باس اس کے یہاں ہے وہ اُس کے معاصرین میں سے اور کسی کو نصیب نہیں اِس اعتبار سے میرے خیال میں ترقی پسند شاعری کے اشتراکی پہلو کا سب سے اچھا ترجمان احسان ہے۔ وہ بہت سے عیبوں سے بھی پاک ہے۔ اُس کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی شدت نہیں ، اُس کے خیالات سطحی اور جذبات ہنگامی نہیں ، اُس کی شاعری اُس کے شدید احساس کی پیداوار ہے ، اُس کے یہاں عریانی نہیں ۔ زندگی سے فرار نہیں وہ ٹکنیک کے نئے اور پرانے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا نہ اپنے کلام کو مبہم اشاروں اور دور از کار کنایوں سے چیستان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شاعری اُس کی شدید قوت حاسہ کا آزادانہ اور برجستہ اظہار ہے۔

اب بعض اور ترقی پسندوں کو لیجئے ۔ پہلا نام فیض کا سامنے آتا ہے۔ وہ ترقی پسندی کی رو میں غیر ارادی طور پر نہیں بہہ گیا ہے بلکہ اُس نے شاعری کے موضوعات اور ٹکنیک پر غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے اسی لئے اس کے کلام میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو سطحی ہیجانات یا وقتی جذبات کی بجائے گہرے احساسات سے وابستہ ہیں اور اسی لئے اُنہیں دیرپا ہونے کی صلاحیت ہے۔ فیض کی ابتدائی شاعری میں رومان اور ٹکنیک میں پابندی نظر آتی ہے لیکن بہت جلد وہ زندگی کی الجھنوں میں گرفتار نظر آتا ہے ، اس کے رومان کی دنیا ویران ہوتی معلوم ہوتی ہے لیکن محبت کا اب بھی اس پر غلبہ ہے ، ایک مشہور نظم کا عنوان "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" ہے ؎

تو ہے تو درخشاں ہے حیات ، — تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے !
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات — تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

لیکن تلخ حقائق رومان کی دنیا میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے وہ دُنیا جس میں ہیں ؎

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم — خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے — پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

چنانچہ فیض کا موضوع سخن محبت کے سوا اور چیزوں پر بھی احاطہ کرتا ہے ، موضوع سخن

کے عنوان سے فیض نے ایک نظم لکھی ہے ؎

آج تک سرخ و سیاہ صدیوں کے سائے کے تلے — آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزرا کیا ہے!
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں — ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

دنیا کے ان آلام اور مصائب سے گھبرا کر فیض محبت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ انگریزی شاعروں میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اکثر نے یہی راہ فرار اختیار کی ہے لیکن فیض کے لئے غم روزگار کی تلخی وہاں بھی کم نہیں ہوتی، وہ سوچتا اور غور کرتا ہے اور طامس ہارڈی کے بقول یہی اُس کے آلام کی بنیاد ہے۔ سوچ کے عنوان سے فیض نے لکھا ہے ؎

تو کہ میری بھی ہو جائے — دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن — اپنے کٹے سے کٹ نہ سکیں گے

ٹکنیک کے اعتبار سے اب فیض میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس ٹکڑے سے آپ اُس کے موجودہ موضوعات اور ٹکنیک دونوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں:۔

سیاسی لیڈر کے نام:۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ — رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز — جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے رنگین و سیہ سینے میں — اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اِک جال سا بُن رکھا ہے — دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

ظلمت شب میں امید کی کرن کا یہ وہی فلسفہ ہے جسکی پہلی جھلک اقبال نے دکھائی تھی اپنی ایک اور نظم "انتباہ" میں بھی فیض اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں ؎

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں — ہم کو رہنا ہے پر یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھ کا بے نام گراں بار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

فیض کا یہ رنگ اپنے ساتھی راشد سے مختلف ہے۔ جس کے یہاں انجام کار خودکشی پر ختم ہوتا ہے۔ فیض کے ساتھ راشد کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ ترقی پسندوں میں سب سے بڑا ترقی پسند ہے کیونکہ موجودہ نظام سے بیزاری اُس کی شاعری کی روح ہے۔ اسی نظام کی بدولت وہ بھی فیض کی طرح رومان میں پناہ ڈھونڈتا ہے لیکن زندگی کا کھٹکا وہاں بھی لگا رہتا ہے۔

اُس کی نظم 'رقاصہ' کو دیکھئے ؎

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے | زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو | رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ کر مجھ کو نشاں پالے مرا | اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے ایک خونیں بھیڑیئے سے کم نہیں

راشد کی ابتدائی نظموں میں انسان پہلا سائیٹ ہے جس میں اشتراکی خیالات کی جھلک ملتی ہے ؎

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جراتِ تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی

دوسرے سائیٹ کا عنوان خواب کی بستی ہے ؎

مرے محبوب جانے دے مجھے اُس پار جانے دے
مرے محبوب، میرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو
بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو

تیسرے سائیٹ کا عنوان ستارہ ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسن و لطافت ہو | کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

اس ذہنی کشمکش اور اضطراب میں گھبرا کر راشد مذہب کے تصورات کی زنجیروں کو بھی توڑ دیتا ہے اس ذہنیت کے ترجمان چند شعر یہ ہیں ؎

اسی مینار کے سایے تلے کچھ یاد بھی ہے | اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں | ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ـــــــ اُداس | (درجے کے قریب)

تین سو سال کی ذلت کا نشان   ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

"گناہ" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں ؎

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا   بے بسی میرے خداوند کی تھی

جن حضرات نے اقبال کی نظم "مکالمۂ جبریل و ابلیس" یا "ابلیس کی مجلس شوریٰ" پڑھی ہو وہ اس کا مقابلہ راشد کے ان مصرعوں سے کریں' صرف یہی ایک نکتہ راشد کا مقام متعین کرنے کیلئے کافی ہے۔ ایک اور نظم "انفاقات" ہے۔ اس کے دو مصرعے یہ ہیں ؎

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں   اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

یا "انسان" کے عنوان والی نظم میں ؎

کسی سے دور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاج دردِ انساں ہو نہیں سکتا

مذہب کے بارہ میں اپنے ان خیالات کی وضاحت راشد نے اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے:-

"دوسرا سبب ہمارا مذہب ہے جس نے ہمیں کافی بالذات ہونا سکھاتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ اس سے ہماری انفرادیت کی نشوونما بہت حد تک مان گئی ہے کیونکہ ہر مذہبی خاندان کا بچہ اپنے جسم اور روح پر ایک ایسی مُہر لے کر پیدا ہوتا ہے جو تمر بھر اسے ایک مخصوص گروہ سے وابستہ اور ہم آہنگ کئے رکھتی ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تصورات پر خارجی اثرات قبول کرنے کے قائل ہی نہیں رہتے اور جہاں کسی خارجی تحریک کا نشان پاتے ہیں۔ محتاط ہو کر مدافعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مذہب کی تخفیف مقصود نہیں لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے مذہب نے ہماری انفرادیت کو غیر ضروری حد تک صدمہ پہنچایا ہے اور خود فکری کے اس نایاب جوہر، جو ادبیات اور تہذیب کے فروغ اور ترقی کے لئے ضرورت ہے آہستہ آہستہ محدود کر دیا ہے۔"

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہر طرف سے بیزار ہو کر راشد فرار اختیار کرتے ہیں اور دو چیزوں میں پناہ لیتے ہیں۔ 'شراب' اور 'عورت'۔ "مئے سے غرض نشاط" متقدمین کو کبھی نہ تھی وہ اسے ایک گونہ بیخودی کے لئے ہی چاہتے تھے، 'عورت' البتہ ان کے اعصاب پر سوار رہتی۔ راشد کی جن نظموں میں عورت سوار ہے وہ خاص طور پر یہ ہیں۔ (۱) ہونٹوں کا لمس (۲) ایک رات (۳) دریچے کے قریب (۴) رقص (۵) انتقام (۶) آخر الذکر نظم میں ایک نیا فلسفہ

ہے نظم یہ ہے

اس کا چہرہ اس کے خد وخال یاد آتے نہیں
ایک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت

....

اس کا چہرہ اس کے خد وخال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اس ذہنی خلفشار کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جب شراب اور عورت بھی شاعر کے غم کو بھلا نہیں سکتی تو وہ خود کشی پر آمادہ ہوتا ہے "خود کشی" ان کے مجموعہ میں آخری نظم ہے ۔

کر چکا ہوں آج عزمِ آخریں
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

....

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بیباکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے وبام کو

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی

تکنیک کے بارہ میں راشد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ 'ماوریٰ' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

(۱) "میری رائے میں جہاں تکنیک کی قیود کی متعصبانہ حمایت ایک فرسودہ قدامت پرستی کی دلیل ہے وہاں اس کے خلاف مجنونانہ احتجاج بہت بڑی حد تک بے راہ روی کے مترادف ہے۔ جو لوگ شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ ندرت پرستی کے جوش میں نہ صرف توانائی اور بحور کی تعمیری حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ اُن کو منسوخ کر کے اُن کے نقصان کی تلافی کسی بہتر یا نئی چیز سے کرنا بھی نہیں جانتے .... قدیم اسالیب بیان کا ادنیٰ مانی ہونے کے باوجود میرے نزدیک یہ اعتراض قابل پذیرائی نہیں کہ بحروں اور قافیوں کی پابندی شاعری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے .... اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کسی حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار رہی۔"

اس حیثیت سے راشد کے مجموعے کو دیکھا جائے تو اس میں باقاعدہ نظمیں، سانیٹ اور غیر مقفیٰ سب شامل ہیں لیکن بالکل آزاد اور بے اصولی کے اصول کی مثالیں راشد کے یہاں نہیں ملتیں۔ اسی لئے اس کا ایک تکنیک ہے جو اس کا اپنا ہے اور جس میں عام نوجوان ترقی پسندوں کی بے راہ روی نہیں ہے جو غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کو اظہار کا ایک سستا اور آسان ذریعہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے، اگر نئی شاعری میں کچھ جاندار چیزیں ہیں تو وہ فیض اور راشد ہی کے یہاں ہیں۔

فیض اور راشد کے بعد مجاز کو لیجیے، اُن کے یہاں بھی پہلے رومان اور خالص رومان ہے۔ رفتہ رفتہ اشتراکی خیالات آئے ہیں۔ لیکن رومان اب بھی جوش کی طرح مجاز کی شاعری کی جان ہے 'نذرِ دل' 'مجبوریاں' 'کس سے محبت ہے' 'ایک غمگین یاد' 'اُن کا جشنِ سالگرہ' 'نورا نرس کی چارہ گری' 'ننھی پجارن' 'آج کی رات' 'تبانِ حرم اصنامِ عشق' اسی قسم کی نظمیں ہیں 'ان کا جشنِ سالگرہ' ان میں اچھی نظم ہے۔

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی　　بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا ردح بہارِ گل ونسریں　　آنکھوں کی چمک رشکِ بزمِ مہ و پرویں
پیراہنِ زرتار میں اک پیکرِ سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا　　سہرے میں جھلکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساسِ فراواں کی کہانی　　خاموشیٔ محجوب میں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں ہر دوشیزہ جوانی

'نرس نورا' اُس کی مشہور نظموں میں ہے ؂

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارا　　وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر　　وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی　　ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ　　متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر　　یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی　　جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چُرا لی

مجاز کا یہ رنگ اُس کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ترقی پسندوں میں مجاز اُن چند شاعروں میں ہے جو ابھی تک غزل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔

ترقی پسندی کے عام رجحانات بھی مجاز کے یہاں ملتے ہیں، مثلاً خانہ بدوش میں ؂

بیزار زندگی سے ہیں پیر و جواں سبھی　　الطاف شہریار کے ہیں نوحہ خواں سبھی
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں　　روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں
اب کیوں شریک حلقۂ نوعِ بشر نہیں
انساں ہیں آخرش یہ کوئی جانور نہیں

یا دُوسری نظم آوارہ میں ؎

مُفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے — اے غمِ دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں
لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھکر توڑ دوں — اے غمِ دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں

'اندھیری رات کا مسافر' 'ایک سفید پوش رنگریز' 'نوجوان سے' 'سرمایہ داری' 'انقلاب' 'ہمارا جھنڈا' 'ایک جلاوطن کی واپسی پر' 'خوابِ سحر' 'مزدوروں کا گیت' 'مہمان' اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ آخری نظم میں نئی شاعری کی اشاریت کی جھلک بھی موجود ہے۔ 'رات' اور 'ریل' بھی اچھی نظم ہے۔

مجاز زیادہ تر پابند نظمیں لکھتے ہیں۔ الفاظ کی کمی جو اور ترقی پسندوں کے یہاں صاف محسوس ہوتی ہے مجاز کے یہاں نہیں۔

احمد ندیم قاسمی پُرانے کہنے والوں میں ہیں۔ اُن کا خاص کلام رومانی ہے۔ ریت کے میدان اور کھجوروں کے درخت ندیم قاسمی کی رومانی دنیا کے نشان ہیں۔ اُس کی محبوبہ گانوں کی ایک الھڑ بھولی بھالی دوشیزہ ہے ؎

کھجوروں کی اندھیری کانپتی شاخوں کے پردوں سے
رسیلا چاند۔ ٹھنڈی ریت پر چاندی بچھاتا ہے
وہ ٹیلوں سے پرے۔ ٹوٹی ہوئی کٹیا کی چوٹی پر
اُفق کے پاس اک مدھم سا تارا ٹمٹماتا ہے
پھُلا کر اپنا ننھا سا گلا' چشمے پہ اک پنچھی
نہ جانے کس نشے میں دُکھ بھری تانیں اُڑاتا ہے
مری آنکھوں میں خوں آلود آنسو تیر آئے ہیں
مرا دل اے صبوحی تیری خاطر ڈوبا جاتا ہے
یہی منظر تھا جب دو دل دھڑکتے تھے مسرت سے
مجھے اُجڑی محبت کا زمانہ یاد آتا ہے

احمد ندیم مختصر قطعے لکھتے ہیں جو زیادہ تر اسی رومانی رنگ میں ہوتے ہیں لیکن گاؤں کی پُر سکون فضا میں بھی کبھی کبھی ہنگامے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ قطعات:۔

ہے رقص طوائف کا زمیندار کے گھر پر   پردیس سے آئے ہیں کئی یار پرانے (محروم عیش)
وہ چند غریبوں کو گریباں سے پکڑ کر   بھیجا ہے زمیندار نے بیگار پہ تھانے

محتاج کسی کی بھی نہیں میری جوانی   مزدور ہوں کھاتا ہوں پسینے کی کمائی
اے ریشم و کمخواب میں لپٹے ہوئے کوڑھی   کیوں تو نے مجھے دیکھ کے یوں ناک چڑھائی

افق پر دور برفانی پہاڑوں سے اٹھی بدلی   گزر کر میرے ویراں کھیت پر سے دور جا برسی
کچھ ایسے ہیں نے دیکھا اس طرف جیسے کوئی مفلس   امیروں کی نگاہِ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی

'محلوں کے سایے' 'روشنی اور سایے' 'بھوکوں کے ووٹ' 'تہذیب کی معراج' 'مشینوں کا زمانہ' 'بے چارگی' 'مجبور مفلس' 'نوجوان بھکارن' اسی قسم کے قطعات ہیں۔ 'گم کردہ راہ' 'دنیائے خام' 'کفرانِ نعمت' نسبتاً طویل نظمیں ہیں جہاں دنیا کے آلام اور مصائب انقلاب کی خواہش ناکامی کا احساس موجود ہے۔ ندیم مذہب کے تصور سے بیزار نہیں نہ اُس کے یہاں عریانی اور ابہام ہے۔

ایک اور ترقی پسند میراجی ہیں۔ یہ بہت کچھ لکھتے ہیں اور اِن کا کلام ادبی دنیا۔ ہمایوں۔ ساقی اور ادب لطیف میں اکثر شائع ہوتا رہا ہے لیکن میرے خیال میں یہ راشد اور فیض سے بہت پیچھے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کے یہاں وہ ابہام اور اشاریت زیادہ ہے جو اس دور کے ترقی پسندوں کی ایک عام خامی ہے۔ لیکن میراجی کی یہ خامی ہی اُن کے نزدیک اُن کا فن ہے۔ سُنا گیا ہے کہ میراجی پہلے اپنی نظم لکھ لیتے ہیں اور پھر ہفتوں اپنے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں 'کالا کلوٹا کوا' 'ساون کا گرگٹ' 'دھوبی کا گھاٹ' اسی قسم کے اشارے ہیں۔ 'دھوبی کے گھاٹ' کا نمونہ یہ ہے ؎

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہو
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
اُس پر

کیوں ــ صرف اچھوتا
انجان انوکھا
اک خواب ہے خلوت
کیوں صرف تصور
بہلاتا ہے مجھ کو
کیوں صبحِ شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
سہلاتا ہے مجھ کو
کیوں خوابِ فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے
کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں
نمناک نہیں ہے
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی

جنسیات میں بھی میرا جی کا یہی رنگ ہے۔ کسی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں میرا جی کی ایک نظم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ گوری کو اشنان کرتا دیکھ کر اس کی حس شعری اس کے جسم کے کسی متناسب حصہ سے بیدار نہیں ہوتی بلکہ وہ سب سے پہلے یہی سوچتا ہے کہ وہ آج بھلا کیوں نہائی؟ ایک اور نظم کا آخری ٹکڑہ یہ ہے ؎

سنتا ہوں شہر کے ایک محلے میں
نفس کی پوجا کرنے والی ایک آوارہ عورت ہے
اور سستا ہے اُس کا کرایہ، ہاں سستے ہیں اس کے دام

اشتراکی خیالات میرا جی کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر و کاوش، یا ندیم کی سادگی، یا جوش یا مجاز کی شعریت بالکل نہیں مثلاً نادار: ؎

اک میز ہے ایک ہی کرسی ہے۔ اک الماری
اُس میز پہ کاغذ میرے ہیں اور میری چند کتابیں ہیں

اِس الماری میں ؟ رہنے دو۔ کچھ برتن ہیں کچھ کپڑے ہیں
کپڑے آخر پھٹ جائیں گے۔
کاغذ ؟ —— ردّی بھی بکتی ہے
اور چند کتابیں بھی میری بِک جائیں گی
اِک الماری رہ جائے گی
اور کرسی بھی
اور میز کی بات نہیں کہتے
کیا میز کی بات ؟ کیوں کیسے
یہ تینوں چیزیں کرائے کی ہیں، ان کی بات سے کیا ہوگا
اِن تینوں میں کوئی بھی نہیں جو اپنی ہو
کوئی بھی نہیں کوئی بھی نہیں ——

اِس وقت اس کا موقع نہیں کہ میں موجودہ ترقی پسند شعراء میں سے سب کا ذکر آپ کے سامنے کرسکوں، لیکن مجھے اُس انگریز پروفیسر کے الفاظ بیساختہ یاد آتے ہیں جس نے انگلستان کے ایسے شاعروں کی نسبت لکھا تھا کہ "اگرچہ اِن شعراء میں دلچسپ کئی ہیں لیکن اچھے چند ہی ہیں، اُن کی مطبوعات کا پڑھنا اُن کی تصنیف سے زیادہ ہمّت طلب اور صبر آزما ہے" کیونکہ اُس کا بڑا حصّہ مہمل ہے، اس میں سوائے تکرار کے کچھ نہیں۔

ان ترقی پسندوں میں سے اکثر نوجوانوں کا یہی حال ہے، بھوک اور عورت اِنکی شاعری کے محور ہیں۔ گُل و بلبل کی شاعری تو دو سو سال چلی، لیکن ان کی عورت پچھلے دس سال میں ہی سارے منازل طے کرگئی، یہی وجہ ہے کہ بالعموم ان کی شاعرانہ زندگی فلم اسٹار کی طرح ہے، ان کی شاعری میں 'عمر برق و شرار ہے دُنیا' آخر میں ان میں سے چند کا سرسری ذکر اور کرسکتا ہوں۔

مختار صدیقی کی نظموں میں 'رات کی بات' ایک پابند رُومانی نظم ہے۔ 'رسوائی' 'سُکھ میں دُکھ' بھی اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے رُومان میں پناہ لی ہے، یہ دونوں نظمیں بھی پابند ہیں۔

اختر الایمان اکثر لکھتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر کے آمد اُن کے یہاں

نہیں ملتے، انھوں نے اپنے مجموعے کا نام گرداب، خوب رکھا ہے۔ یہی حال اُن کی شاعری کا ہے۔ اُن کی نظموں میں "رقاصہ" (ساقی مارچ ۱۹۴۱ء) ایک طویل پابند نظم ہے جس میں راشد کی طرح وہ بھی آلام روزگار سے پناہ لینے کے لئے آمادۂ رقص ہیں۔ اِس رقص میں خوب و زشت بھی انھیں توہمات نظر آتے ہیں اور دُنیا کے مختلف دھوکوں اور گھاتوں کا مفصل ذکر کرتے ہیں، اِس خیال کی مزید وضاحت اُن کی نظم "مجرم" (ساقی فروری ۱۹۴۲ء) سے ہوتی ہے۔ یہاں بھی راشد کی طرح خودکشی پر انجام ہوتا ہے، 'فیصلہ' میں اختر کا یہ خیال۔ ع

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کردوں

اسی ذہنیت کا ترجمان ہے۔ غم دہر سے اُکتا کر جو خودکشی پر آمادہ ہو سکے اس کے یہاں اخلاقی قدروں کا جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے "ارادہ" والی نظم میں اخترالایمان کہتا ہے ؎

آمری جان مرے پاس ذرا اور قریب
میں غم دہر سے اکتا کے یہاں آیا ہوں
یہ جو پھرتے ہیں سر کوچہ و بازار جواں
اپنے خود ساختہ اخلاق کا انبار لئے
اپنی دُزدیدہ نگاہوں سے جھکنے والے
اپنے سینے میں نئی حسرتِ بیکار لئے
ڈھونڈنے جاتے ہیں اِک سادہ و معصوم حسین
ان کے جو دستِ تطاول سے نکل ہی نہ سکے
اور پھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ اِک پیکرِ نو
جو ابھی نسل زیاں کار کی افزائش میں
بے ارادہ کئے مصروف رہا کرتی ہے
اور ایک جھلکِ تاریک کی آرائش میں

اپنی عصمت کسی ظرف سبکسار کے پاس
رکھ کے، انگڑائی کی اِک لے میں دمک جاتی ہے

"آخری باب" ایک رومانی نظم ہے۔ ع

ڈھل چکی رات سب اب جاؤ یہ آنسو پونچھو

اسی کا ایک ٹکڑا یہ ہے ؎

رات کے کہنہ جھروکوں سے فضاؤں میں یونہی
جگمگاتے ہوئے ہنستے ہوئے نازک تارے
نوچ کر پھینک دیئے جاتے ہیں بیدردی سے
جاؤ اب جاؤ، درندوں کا خدا دیکھ نہ لے

——— ؂ ———

میرے خیال میں "جواری" اختر کی اچھی نظموں میں ہے، اس میں جذبات کی شدت اور اشاریت کے باوجود ابہام نہیں۔ اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے ؎

ہم تو اپنی سی کر ہارے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی

سب ہی جواری، سب ہی لٹیرے، کون کس سے بازی جیتے

بیت گئی جیسی بیتی، باقی چاہے جیسی بیتے

شام وسحر کی رنگ و نظر کی پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی

'وداع' اور 'پگڈنڈی' بھی اچھی نظمیں ہیں۔

قیوم نظر کی نظموں میں 'حسنِ آوارہ' (ساقی اکتوبر ۴۲ء) 'برسات کی رات' 'یہ اور وہ' رومانی نظمیں ہیں۔ "التجا" میں اپنے درد سے خطاب ہے۔ ؎

مجھ کو دے کے موت، زندگی کو مار دے

'جنگ' میں قیوم نظر جنگ کی تباہ کاریوں کو بیان کرتا ہے۔ 'جوانی' بھی انھیں خیالات کی حامل ہے، جہاں قیوم نظر اس پر نوحہ کرنے لگتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں نسل انسانی کے جوان کس طرح بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ 'بنی آدم' میں 'اشاریت' نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔

سلام مچھلی شہری کے خیالات بالکل سطحی اور اندازِ بیان خام ہے۔ اُن کے کلام میں مترک بن رہی ہے۔ 'مجھ کو آپ سے شکوہ ہے' 'اندیشہ' 'ڈرائنگ روم' اُن کے ملے جلے انداز کو ظاہر کرتی ہیں، اشتراکیت سے ہمدردی رومان اور ابہام سب موجود ہے۔ 'ڈرائنگ روم' میں وہی انداز ہے جو راشد کی نظم 'انتقام' میں ہے۔ یہاں سلام ایک مفلس عورت کو اپنے 'ڈرائنگ روم' کی سیر کراتا ہے اور پھر اس سے سیہ کاری کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے۔

اس مختصر جائزہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہمارے نوجوان شعرا کیا سوچ رہے ہیں اور کس طرح اس کا اظہار کر رہے ہیں، ان رجحانات پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ یہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ ہے اور ہمارے نوجوان شاعر گویا ایک بحرانی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس لئے اُن کے متعلق کوئی قطعی رائے دینے میں

بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ان میں ابھی بہت سی خامیاں ہیں جو ہر نئے انقلاب کے ساتھ آتی ہیں، بعض چیزیں اب بھی مبہم اور مبہم ہیں، لیکن شاعری کی تاریخ میں یہ بھی کوئی عجیب واقعہ نہیں، پہلے چیزیں ایسی ہی نظر آتی ہیں لیکن وقت اور تجربہ انھیں ان الائشوں سے پاک کر دیتا ہے ممکن ہے بعض چیزیں اس نئے تجربے میں جاندار ثابت ہوں اور انقلاب کا طوفان رک جانے پر ہمارے شعروادب کا جز بن جائیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ وقت صرف دیکھنے کا نہیں سوچنے کا بھی ہے۔ اس لئے اس نئی شاعری پر غور کرنا ہمارے اور ترقی پسند شاعروں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اس نئی شاعری کے صرف دو مرکز یا محور ہیں۔ 'انقلاب' اور عورت، یہ صحیح ہے کہ زندگی کے اکثر پہلو انہی دونوں سے وابستہ ہیں۔ لیکن جس طرح متقدمین کی شاعری اپنی حدود سے باہر نہیں نکلتی تھی اسی طرح ان شاعروں نے بھی اپنی دنیا تنگ کر لی ہے۔ اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرے یہ کہ بعض اصول اور مسلمات ایسے ہیں جو ازلی اور ابدی ہیں، بعض قدریں ہماری زندگی میں اضافی نہیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شعروادب میں بعض ابدی عناصر موجود ہیں جن میں زمان و مکان کے انقلابات سے کوئی تغیر یا تبدیلی نہیں ہو سکتی، ہر شاعری اچھی یا بری ہو سکتی ہے لیکن بڑی شاعری (Great poetry) ہر اچھی شاعری کو نہیں کہا جا سکتا۔

شعر کی اچھائی یا برائی کا تصور زمانہ کے ساتھ بدلتا رہا ہے لیکن دنیا کی ہر زبان میں بعض نام ایسے نظر آتے ہیں جنھیں حیاتِ ابدی اور قبول دوام حاصل ہو چکا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگانی کے ابدی حقائق کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی شاعری کا یہی وہ حصہ ہے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہا ہے۔ اس پہلو سے جدید شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ وقتی یا ہنگامی ہے، مثلاً بھوک کا مسئلہ، اس وقت بیشک یہ ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل میں ہے لیکن یہ صرف ایک اقتصادی مسئلہ ہے جس سے ہر کسی کو ہمدردی ہے، مسئلہ دولت کی غلط تقسیم۔ حکومت کے غلط طریقے اور بعض طبقوں کے اقتدار سے پیدا ہو گیا ہے، حیاتِ انسانی میں یا نظام عالم میں اس کی حیثیت مستقل یا ابدی نہیں۔ اگر آج یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اشتراکیوں کو اپنی فردوس گم گشتہ دوبارہ مل جائے تو آج ہی

بھوک کے مسئلہ کے ساتھ بھوک کی شاعری بھی ختم ہو جائے۔ میں اِس شاعری کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ میرے نزدیک بعض شاعروں نے اسی موضوع پر اچھی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں پھر بھی یہ بڑی شاعری نہیں۔ اس میں کسی ہمہ گیر، ازلی اور ابدی جذبہ کی تسکین کا سامان نہیں اسی لئے اس میں بڑائی نہیں۔

اس بھوک کے مسئلہ نے شاعری میں کئی عناصر کا دخل کر دیا ہے۔ مثلاً بعض لوگ جو شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ موجودہ اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ زندگی کی بعض مستقل قدروں مثلاً مذہب اور اخلاق کے بنیادی تصورات کو بھی ایک کہنہ نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ بھوک کا مسئلہ بغیر مذہب کی تضحیک اور استہزا کے بھی حل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض ترقی پسند ایسے ہیں جو اشتراکی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اُن کا آخری سہارا خدا ہی ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کا یہی رنگ ہے۔ انجام سے مایوسی اور خودکشی اسی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انسان جب کوئی سہارا نہیں پاتا تب ہی وہ خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے۔

ممکن ہے مجھے یا آپ کو اشتراکیت کے بعض پہلوؤں سے اختلاف اور بعض سے اتفاق ہو لیکن جس طرح ادب پر سرمایہ داروں، سلاطین اور فرشتوں کا اجارہ نہیں اسی طرح ادب کو مزدوروں، غریبوں اور شیطانوں کی ملکیت سمجھنا بھی غلط ہے، اشتراکی شاعری موجودہ شاعری کا ایک شعبہ تو ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف اُن کے لئے جو واقعی مزدوروں کے کامریڈ اور اُن کے درد دکھ کے شریک ہیں۔ لیکن یہ شاعری تمام شاعری نہیں ہو سکتی۔ یہ کرنا گویا شاعری سے اُس کی ہمہ گیری چھین لینا ہے، پھر ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو پیٹ کی بھوک اور جنسی خواہش کے ساتھ ایک روحانی بھوک بھی محسوس کرتے ہیں۔ اگر شاعری اُن کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہونچا سکتی تو یہ اس کی بڑی محرومی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے اِس محرومی کو ہی کامیابی سمجھا ہے۔

اگرچہ ادب میں احتساب کا میں قائل نہیں لیکن انسانیت کے ابتدائی اصول کسی اقتصادی مسئلہ کے حل کے لئے قربان نہیں کئے جا سکتے، اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کا جذبہ بے شک قابلِ ستائش ہے لیکن راشد کی نظم میرے نزدیک شاعری سے زیادہ خرافات کے تحت میں آتی ہے۔ ایک اجنبی برہنہ عورت کے ہونٹوں سے رات بھر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینا یہاں گویا تسکین ہوس کی ایک آڑ ہے جس کا اندازِ بیان

ہمارے واسوختوں سے کچھ زیادہ ہی فحش اور عریاں ہے۔ اسی طرح سلام مچھلی شہری کی نظم 'ڈرائنگ روم' یا مخمور جالندھری کی 'تالاب' ادبی خرافات ہیں۔ آخرالذکر کا نمونہ ملاحظہ ہو سے

ابھی کل ہی کا قصہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی مچھلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی، میل سے چکٹی، نزاکت سے
لگی ہنس ہنس کے میرے پاس آکر ہاتھ پھیلانے
اُدھر وہ رحم کی طالب، اِدھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے، اگر اک رات اِس کے ساتھ کٹ جائے

حقیقت نگاری شاعر کا فرض سہی لیکن کیا یہ حقائق اسی طرح منظر عام پر عمل میں بھی لائے جا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو ان کا بیان کس طرح سند جواز حاصل کر سکتا ہے۔

ترقی پسند شاعری کے ٹکنیک کے سلسلہ میں بہت کم کہنے کی ضرورت ہے۔ راشد کے بقول اجتہاد صرف یہ نہیں کہ ہر پُرانی چیز کو ترک کر دیا جائے۔ اجتہاد جب ہی اجتہاد ہو سکتا ہے جب پُرانی چیزوں کی تلافی بہتر بدل سے کر دی جائے۔ وزن، ردیف، اور قافیئے کے پُرانے قانون واقعی دقیانوسی ہیں اور ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، لیکن ہر قانون سے آزادی صرف اپنے عجز اور کمزوری کی دلیل ہو سکتی ہے۔ مثلاً وزن کے قانون سے آزاد ہونا شاعر کے بس میں نہیں۔ وزن انسانی توجہ کے لئے بڑا زبردست محرک ہے اسی وجہ سے ہم نثر کے مقابلہ میں نظم زیادہ آسانی سے یاد رکھ سکتے ہیں، اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اٹلی کی وہ شاعر جنھوں نے غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کا پہلا تجربہ کیا تھا گمنامی کی آغوش میں پہنچ چکے ہیں۔ پھر وہ نظم جو گائی نہ جا سکے یوں بھی ابدیت سے محروم ہے۔ اس اعتبار سے ترقی پسند شاعری کے دو حصہ ہو سکتے ہیں۔ ایک کتابی شاعری اور ایک شاعرانہ شاعری، آزاد نظمیں کتابی شاعری کے تحت میں ہیں۔ گیت، سانیٹ، پابند غیر مقفیٰ نظمیں گائی جا سکتی ہیں اور شاعرانہ شاعری میں داخل ہیں۔

اسی شاعری کا ایک اور غور طلب پہلو اشاریت اور اس سے پیدا ہونیوالا ابہام ہے۔ ابہام متقدمین کے یہاں بھی ملتا ہے بلکہ لوگوں نے آخر عمر میں چیستان اور معمہ گوئی بھی اختیار کی ہے۔

امانت اور محسن اس کی دو مثالیں ہیں مگر ان کی انتہا ترقی پسندوں کی ابتدا ہے۔
یہ صحیح ہے کہ انگریزی *Impressionist.* اور *Imagist.* اسکول کی طرح ان کی ایک شاعرانہ دنیا اپنی خلق کی ہوئی ہے وہاں کی چیزوں کا بیان استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے لیکن جس قسم کے چند اشاروں کا ذکر میں نے اوپر کیا وہ شاعر کے عجز کا اظہار کرتے ہیں۔

اب جب کہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ کی ابتدائی منازل سے کچھ آگے نکل چکی ہے اور اس کے بعض میلانات اور رجحانات مسلم ہو چکے ہیں، ضرورت ہے کہ ترقی پسندی کا کوئی معیار مقرر کیا جائے۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ ترقی پسند کوئی ایسا ادارہ اکیڈمی قائم کریں جو ترقی پسند تحریک کی نگرانی اور صحیح ترقی پسند ادب کی اشاعت کے لئے ذمہ دار ہو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ترقی پسند شاعری نام نہاد ترقی پسندوں کی مہمل گوئی، عریاں نگاری اور فحاشی کی وجہ سے بدنام ہو جائے اور نئی شاعری کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو۔ ترقی پسند تحریک میں زندگی کے آثار ہیں کیونکہ ترقی کا راستہ کبھی مسدود نہیں ہوتا:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

۱۰ مارچ ۱۹۴۳ء

ابو اللیث

سچی اور جھوٹی شاعری

(از ابو الکمال مولانا سید عبد الودود صاحب درد بریلوی مرحوم)

آج کل کی شاعری ہے منقسم دو قسم پر
ایک سچی شاعری اور ایک جھوٹی شاعری

ہو اگر شاعر کے دل میں کوئی وجدانِ صحیح
اور کیفیت ہو طاری کوئی اس پر واقعی

چوٹ کھائے دل میں پیدا ہو گیا اس سے گداز
پڑ گئی چلتے چلاتے اک نگہ جادو بھری

بس کہ لایا تھا ازل سے وہ دلِ ایذا پسند
ہو گئی جس پر کہ کوئی کارگر جادوگری

یا کسی محبوب کا واقع میں ہے اس کو خیال
اور وہ کرتا ہے اس جانب سے قطعاً بیرخی

صدمۂ ہجراں سے اس کا حال فی الواقع ہے غیر
اور دل مجبور مائل ہے بسوئے ابتری،

قدرتی منظر نظر آیا ہے یا اس کو کوئی
جس کی خوبی سے تخیل کو ہوئی ہے رہبری

یا کوئی اس کے علاوہ اور وجہ انبساط
پیش آئی جس سے دلمیں ہوگئی اِک گدگدی

اتفاقاً یا کہ کچھ اسباب غم پیدا ہوئے
مٹ گئی جس سے دلِ شاعر کی ساری خرمی

الغرض اِس قسم کی کچھ وارداتِ قلب کو
جب کرے شاعر ادا، تو ہے وہ سچی شاعری

جس کے دلمیں واقعاً کچھ شائبہ ہو درد کا
زیب دیتی ہے حقیقت میں اسی کو شاعری

اور جو برعکس اس کے شاعری آورد ہو
واقعیت مطلقاً جس کو نہ ہو چھو بھی گئی !

عشق والفت سے نہ ہو شاعر کو کچھ بھی واسطہ
کاروبارِ دل سے اس کو ہو نہ ذاتی آگہی

ہو بچھونا اوڑھنا جس کا کہ زہد و اتقا
بادۂ احمر کی چکھی ہو نہ جس نے چاشنی

جو کہ واقف ہی نہیں ہوتا ہے کیا دل کا لگاؤ
اور حسینانِ جہاں کرتے ہیں کیا غارتگری

ماجرائے دل جسے کہتے ہیں وہ کیا چیز ہے
اور کیا ہوتی ہے حالت جبکہ ہو دل پر بنی !

باوجود اِس بدمزاقی کے اگر شاعر کوئی
عشقیہ غزلیں لکھے تو ہے یہ جھوٹی شاعری

ایک مصنوعی سی حالت دلمیں پیدا کرکے جو
شعر کہنے بیٹھ جائے کیا ہے اسکی شاعری

کوئی پوچھے اُن سے کس کا حال کرتے ہو بیاں
تم تو کورے ہو بتاؤ کس پہ یہ بپتا پڑی

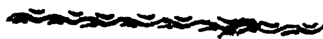
کونسا معشوق ہے جس نے ستایا ہے تمہیں
اور اگر کوئی نہیں تو کیوں ہے آشفتہ سری

جب رہ و رسم ومحبت سے نہیں تم آشنا
من گھڑت یہ داستاں پھر کس لئے تم نے گھڑی

عمر بھر جس کو میسر ہو نہ چلو بھر شراب
اک دفعہ خلوت میں آئی ہو نہ جس کے یہ پری

پھر بھی وہ باتیں بنائے میگساروں کیطرح
آپ ہی فرمائیے آئے نہ کیوں اس پہ ہنسی

کوئی خوش ہو یا کہ ناخوش اِسکی کچھ حاجت نہیں
بات جو کہدی ہے میں نے ہے وہ سچی اور کھری



مقالاتِ مجلسِ مصنّفین علی گڑھ

مکمل سٹ کی قیمت علاوہ محصول ڈاک تین روپئے بارہ آنے (۳ روپے ۱۲ آنے)

ملنے کا پتہ

کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علیگڑھ